سب رنگ
ڈائجسٹ کا مقبول
ترین سلسلہ

بازیگر

چوتھا
حصہ

راوی
بابر زمان خان

تحریر
شکیل عادل زادہ

امنگوں حوصلوں آنسوؤں اور پامردی کی داستان

پیرو اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ منیر علی تیزی سے بولے۔
"خدا انہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ یہ خدا اور رسول کا واسطہ دے رہے ہیں۔ شاید ہمارا یہی سلوک ان کے قلوب بدلنے کا سبب بن جائے۔" منیر علی جانے کیا کیا کہتے رہے۔
پیرو کے شانے جھک گئے۔ اُس کی شعلہ بار آنکھیں بھی بجھ بجھ گئیں۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا، پھر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆

باہر راہ داری میں روشنیاں دھندلانے لگی تھیں۔ صبح کاذب کا وقت ہو گا۔ وہ اتنی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلے تھے جیسے صدیوں سے ہماری قید میں ہوں۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ راہ داری میں اندھا دھند بھاگے تھے۔ دروازے سے بھی وہ ایک ہی وقت میں ایک ساتھ نکل جانا چاہتے تھے۔ اُن کی بندوقیں خالی کر کے انھیں لوٹا دی گئی تھیں۔ چار تمنچے چھوڑ کے باقی تمنچے بھی انھیں واپس کر دیے گئے تھے۔ راہ داری سے وہ چبوترے پر آئے تو اُن کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ اندر عمارت کی نسبت باہر سبزہ زار میں اندھیرا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ اُن کی بھگدڑ کی آوازیں اِدھر اُدھر چھپے ہوئے اُن کے پانچ منتظر ساتھیوں تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ شاید اسی لیے انھوں نے کوئی اشارہ کیا تھا، نہ صدائیں بلند کی تھیں۔ یقیناً وہ انھیں بھول تو نہیں گئے ہوں گے۔ اُن کا رُخ سیدھا صدر دروازے کی طرف تھا اور ہم بھی اُن کے پیچھے تمنچے تانے چلتے رہے تھے لیکن ہم دالان کے چبوترے سے آگے نہیں گئے۔ میں نے اسی اثنا میں دو بندوق بردار آدمیوں کو صدر دروازے کے بائیں طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار میں درختوں کی اوٹ سے نکلتے دیکھا تھا مگر روشنی اتنی نہیں تھی کہ وہ ہمیں صاف نظر آ سکتے۔ عمارت سے بھاگنے والوں نے چبوترے سے صدر دروازے کا فاصلہ آناً فاناً طے کیا تھا اور آخر میں صرف ایک بار ہمیں مڑ کے دیکھا تھا۔ اتنی دیر بھی انھیں اپنے زخمی ساتھیوں کی وجہ سے لگی۔ اُن میں سے دو سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے تھے۔ کچھ دیر پہلے پیرو نے

جس شخص پر ضربیں لگائی تھیں، اُس کی حالت بھی بہت ابتر تھی جلد
دروازے کے قریب پہنچ کے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے
اور سناٹے میں لمحوں تک اُن کے بھاگتی چاپوں کی گونج سنائی
دیتی رہی۔ شاہو نے کمرے میں اُن کے نکلنے سے پہلے ابا جان سے
اجازت مانگی تھی کہ انھیں کسی نشانی کے بغیر نہیں جانے دینا چاہیے
جمرو اور مارٹی نے بھی اشارۃً ابا جان سے یہی اصرار کیا تھا۔ اُن کی
مراد تھی کہ کم از کم اُن سب کی ناک چاقو سے کاٹ دی جائے۔ یہ سن
کے ابا جان خاموش رہے۔ اُن کے چاقو جیبوں سے نہ نکلے، البتہ کمرے
سے رخصت اور اُس کے ساتھیوں کے باہر آتے وقت جو بھی مارٹی اور
شاہو کے سامنے آیا، اُسے انھوں نے ٹھوکروں اور لاتوں سے بے
دریغ جھکایا۔ بندوقیں انھیں واپس کی جا چکی تھیں۔ کمرے میں پڑی
ہوئی چھوٹی گول میز شنگو کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اُس نے اُچھل اُچھل کے
اُسی سے اُن کی کمر اور کولھوں کو نشانہ بنایا۔ مزہ نے اتنی تیزی سے
ایک آدمی کے سر سے اپنا سر ٹکرایا تھا کہ خود اُس کے سر میں بھی گومڑا
پڑ گیا ہو گا۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کمرے سے نکل کے وہ بس
بے تحاشا بھاگتے رہے۔ اُن کی اس حواس باختگی کا ایک سبب یہ بھی تھا
کہ صبح ہونے والی تھی۔ ہمارے لیے بھی یہی بہتر تھا کہ وہ اندھیرے ہی میں
یہاں سے نکل جائیں اور جتنی دور جا سکتے ہوں، چلے جائیں۔

کچھ دیر پہلے ہلکی ہلکی پھوار پڑی تھی، جھلا سا درختوں کے پتے
اور سبزہ جگمگاتی ہوئی بادل کی ٹکڑیاں پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی تھیں
اُن کے جاتے ہی چبوترے اور سبزے پر دھوپ اتر آئی تھی۔ نکھری
چمکیلی دھوپ، لیکن ابھی تیز نہیں تھی۔ حیدر آباد کی دھوپ ویسے بھی
نرم ہوتی ہے۔ اس وقت دس بجے ہوں گے۔ سبھی سبزہ زار پر آ کے بیٹھ
گئے تھے۔ ابا جان کے آ جانے سے اُن کی کمی بھی پوری ہو گئی۔ کالے
بھی وہاں موجود تھا۔ اُس کے ماتھے اور ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں
ابا جان کے چہرے پر بھی جگہ جگہ جلد ہی کے دھبے پڑے تھے۔ اُن کا
سارا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ادھر ادھر سے ہونٹ کٹے پھٹے تھے، کہیں
کسی تکلیف کے آثار بظاہر نظر نہیں آ رہے تھے لیکن انھیں اپنی تکلیفیں
چھپانے کا خوب ملکہ تھا۔ تجمل آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا حقے
کی منال چوس رہا تھا۔ سب دُھلے دھلائے اُجلے اُجلے لگ رہے تھے۔
کسی کی آنکھیں بوجھل تھیں اور جسم بھاری بھاری۔ اُن لوگوں کے
جانے کے بعد کوئی بھی ایک لمحے نہیں سو سکا تھا۔ تجمل کے کہنے پر اُس وقت
سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے لیکن نیند کسی کو بھی نہیں آئی۔ صبح
ہونے میں وقت بھی کتنا لگ گیا تھا۔ جیسے ہی دن نکلا سب نہا دھو کے
باہر آ گئے۔ تجمل اور پیرو دالان میں کرسی بچھائے وہاں پہلے سے موجود
تھے۔ انھیں یوں قریب بیٹھے دیکھ کے اب شاید کسی کو کوئی حیرت نہ ہوئی
ہو۔ علی الصباح اُن لوگوں کو صدر دروازے سے جاتا دیکھ کے ہم اندر
آئے تھے تو پیرو اندر داخل ہوتے ہی تجمل کے گلے سے لگ گیا تھا۔
اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُس وقت مجھے شائبہ تک نہیں
ہوا تھا۔ غالباً کسی کو بھی گمان نہ ہو گا کہ یہ سب کچھ عمداً تھا اور تجمل کے
اشارے پر تھا۔ اسی طرح اُن پر یہ تاثر قائم کیا جا سکتا تھا کہ انھیں چھوڑ
دینے کا فیصلہ کسی سوچے سمجھے ارادے سے نہیں بلکہ حادثاتی ہے۔ اُن
کی قسمت اچھی تھی کہ ہمارے درمیان وہ بزرگ موجود تھے۔ انھیں اچھی
طرح جتا دیا گیا تھا کہ اُن کی سزائیں کتنی سنگین اور شدید ہو سکتی ہیں۔
ہمارے باہمی اختلاف کے بعد ہی اُن پر ایسا کوئی تاثر قائم ہو سکتا تھا۔
ابا جان اور نذیر علی کا فیصلہ سُن کے انھیں خوف تھا کہیں دوسرے ہی لمحے
ہم میں سے کسی کے سر میں کچھ سما جائے۔ کوئی بھی سرکشی پر آمادہ ہو سکتا
ہے۔ بزرگوں کی پاس داری بھی ایک حد تک ہوتی ہے۔ اسی لیے اس
کے وقت انھیں ایسی دہشت تھی۔ انھیں یہ خیال نہ رہا ہو گا کہ جانے
پاس انھیں یوں چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم نے تو ایک طرح سے
اُن کی حفاظت کی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر واپس جا سکیں اور اُن کے
جسم ضربوں کے نشانات سے محفوظ رہیں۔ یہ نشانات جا کر راستے میں
نہ جانے اور کیسی کیسی دیواریں حائل کر سکتے تھے۔

جن تین ملازموں کو رات انھوں نے سب سے پہلے اپنے حصار
میں لیا تھا، اُن میں سے دو سبزہ زار میں مصروف تھے۔ ایک کے سر پر
پٹی بندھی ہوئی تھی، دوسرا کسی قدر بہتر تھا۔ تیسرے کی حالت کچھ زیادہ
ہی ابتر ہو گی، وہ وہاں نہیں تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ابھی تک دہشت
بیٹھی ہوئی تھی، آہٹ پر چونک پڑتے تھے۔ تاہم ہماری کرسیوں کے
آگے رکھی ہوئی گول میزوں پر انھوں نے چائے لا کے رکھ دی تھی
اور ناشتے کی قابیں سجا دی تھیں۔ خاص دان میں پان بھی لگے ہوئے تھے۔
سبھی نے بس رسمی سا ناشتہ کیا اور مسلسل چائے پیتے رہے۔ نذیر علی وہیں
کچھ دور درخت کے سائے میں جا نماز پر بیٹھے آہستہ آہستہ کلام پاک
کی تلاوت کر رہے تھے۔ باقی سب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جیسے اپنے آپ سے
باتیں کر رہے ہوں۔ سب بار بار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے اور نگاہیں
جھکا لیتے۔ پیرو نے درمیان میں کئی مرتبہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کی
کوشش کی مگر سب ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتے۔ وقت گزرنے
کے بعد اب اندازہ ہو رہا تھا کہ گزری ہوئی رات کتنی کالی تھی۔ کسی نے

اتنی طویل رات کبھی نہ کاٹی ہوگی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سورج اپنی سمت
بھول گیا ہے۔ کسی سے ذرا بھی لغزش ہو جاتی تو ہم اس وقت یہاں اس طرح
نہ بیٹھے ہوتے۔ یقیناً وہ ہم میں سے کسی کو ختم کرنے کے ارادے سے
نہیں آئے تھے لیکن اُن کے پاس ہتھیار بھرے ہوئے تھے۔ اُن سے
نہیں تو ہتھیاروں سے چوک ہو سکتی تھی۔ اُن کے لیے ہم میں سے کسی
ایک کو کم کر دینے یا سب کو ختم کر دینے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ جس
طرح آئے تھے، اُسی طرح دندناتے ہوئے چلے جاتے۔

صبح کی گاڑی کا وقت نکل چکا تھا۔ اب رات ہی کو کہیں بمبئی
کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ یہ پورا دن ہمیں اسی حویلی اور اسی شہر
میں کاٹنا تھا۔ رات تک اتنی جلد دوبارہ کسی کے آنے یا راستے
میں مزاحم ہونے کا امکان بظاہر نہیں تھا۔ انھیں اب صبر آ جانا چاہیے
تھا۔ حویلی کی تلاشی کے لیے رات آنے والے آدمیوں کو تجمل نے خود
گھسایا تھا اور انھوں نے اچھی طرح تلاشی لی ہوگی۔ سارے کمرے اجڑے
ہوئے تھے۔ انھوں نے کمرے کی ہر چیز اُلٹ پلٹ کے رکھ دی تھی۔
بستر اُلٹے ہوئے تھے اور آرائشی گل دان ٹوٹے ہوئے۔ اوپر کی منزل
پر جس کمرے میں نذیر علی ٹھہرے ہوئے تھے، اُس کی مقفل الماری انھوں
نے توڑ دی تھی۔ الماری میں رکھے ہوئے شیشے اور چینی کے قدیم برتن
توڑنے میں انھوں نے کوئی احتیاط نہیں کی تھی۔ یہ برتن حویلی کے
پرانے مالک کے تھے اور ابا جان کے پاس امانتاً رکھے ہوئے تھے۔
انھوں نے ہر کونے کھدرے کی تلاشی لی تھی۔ یہاں تک کہ دیواروں پر نصب
تصویروں اور قدِ آدم آئینوں کے پیچھے کسی خفیہ روزن یا طاقچے کے شبے
میں بھی تسلی کر لی تھی۔ آرائشی چیزوں، فرنیچر اور برتنوں کے سوا گھر میں
دوسری قسم کی چیزیں تھیں بھی نہیں۔ ملبوسات اور ضروریات کی دیگر اشیا
ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اُن لوگوں نے اپنے آقا کے پاس
جا کے تلاشی کے بارے میں بڑھ چڑھ کے بیانات دیے ہوں گے کہ
بس حویلی کے در و دیوار کھودنے کی کسر رہ گئی تھی۔ دوبارہ یہاں آنے
کا خیال اُن کے لیے کچھ کم دہشت ناک نہ ہو گا اس لیے انھیں اپنے
آقا کو ہر طرح مطمئن کرنا چاہیے۔ اُن کے آقا کو بھی اتنا اندازہ ضرور ہو
گیا ہو گا کہ ہم سے مطلوبہ پتھر حاصل کرنا ایسا آسان نہیں۔ ہماری حویلی
میں ہیروں کی موجودگی کے متعلق اگر اُسے اتنا ہی یقین تھا کہ اُس نے
اپنے آدمی بھیجے تھے تو اب اس یقین میں دراڑیں ضرور پڑ گئی ہوں
گی کہ دوسرا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہر پہلو پر غور کر لینا لازم ہے۔
اپنے آدمیوں کی بہ سلامت واپسی ہی کو اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے اگر
وہ واپس نہ آتے یا تجمل کے کہنے کے مطابق پولیس بلا لی جاتی تو
صورتِ حال بہت کچھ مختلف ہو سکتی تھی۔ وہ یقیناً کوئی صاحبِ حیثیت
شخص ہی ہو گا جس نے اتنا بڑا قدم اُٹھانے میں کوئی عار محسوس نہ
کی مگر وہ کیسا بھی شخص ہو، ریاست میں اپنے نام اور عزت کے سلسلے
میں ایسا بے پروا نہ ہو گا، اتنے بہت سے ہتھیار بند بھیجنے کا یہی مطلب
ہو سکتا ہے کہ وہ ناکامی اور رسوائی کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں
چاہتا تھا۔ اُسے ہماری تعداد کا اچھی طرح علم ہو گا۔ کئی دن سے اُس
کے آدمی حویلی کے باہر ہماری نگرانی کر رہے تھے، جیسا کہ میرا خیال تھا
حویلی کے کسی ملازم کو ضرور اعتماد میں لیا گیا ہو گا اور ہمارے پاس
جوابی ہتھیاروں کے بارے میں بھی اطمینان کر لیا گیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ حویلی کے کسی ملازم ہی نے انھیں اندر آنے کا اشارہ کیا ہو کہ
یہ وقت سب سے مناسب ہے، سب اپنے اپنے کمروں میں جا کے سو گئے
ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حملہ آور بھیجنے والے کو
اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ مقصد حاصل کرنے کے
بعد یا کسی غیر متوقع صورتِ حال سے دوچار ہونے پر اُس نے اپنے
آدمیوں کو ہمیں یکسر ختم کر دینے کا حکم دیا ہو۔ وہ چشم دید گواہی مٹا دینے
کے تمام انتظامات سے لیس تھے۔ بہر صورت ہم نے اپنے طور پر اُن کے
آقا کو کسی انتقامی ردِ عمل سے روکنے کے لیے ہر ممکن حجت کی تھی۔
تلاشی کی حسرت پوری کر دینے کے علاوہ تجمل نے اُن لوگوں سے اُن
کے آقا کا نام پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہم نے اپنی طرف سے
سارے جتن کر دیے تھے لیکن کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ریاست میں
وہ صرف ایک شخص تو نہیں تھا، پتھروں کے لیے جس کی طلب اتنی
شدید تھی اور بھی نواب راجا لوگ یہاں کم نہیں ہیں جو آدمیوں پر
پتھروں کو فوقیت دیتے ہوں گے۔ نہ جانے اور کس کس کو ریاست میں
ہماری موجودگی کی خبر اور نواب نصرت جنگ کو دیے جانے والے پتھر

کی وجہ سے بے قراری ہو۔ کل رات مہاراجا کے علاوہ اور دو آدمی آئے تھے۔ کسی اور کی آمد آج بھی ممکن ہے۔ بہتر یہی تھا جو اباجان نے رات کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی کیوں نہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں منتقل ہو جائیں۔ وہاں سے ہم زیادہ محفوظ طور پر بمبئی کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں لیکن شاید وہ اباجان کا مشورہ بھول گئے تھے۔ اباجان کو بھی یاد نہیں رہا تھا اسی لیے وہ یوں فراغت سے بیٹھے تھے۔

میرے سر میں طرح طرح کے وہم اُمڈ رہے تھے۔ پیرو کی تیز آواز پر میں چونک پڑا۔ وہ نواب حشمت جنگ کے بارے میں مخمل سے کہہ رہا تھا کہ نواب کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اُس نے اباجان سے صبح آنے کے لیے کہا تھا، اب گیارہ بج رہے ہوں گے۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ پیرو کا مطلب کچھ اور تو نہیں ہے؟ ممکن ہے، وہ نواب حشمت جنگ کے متعلق اباجان کو پھر کوئی اشارہ کر رہا ہو کہ اُس کی آمد میں یہ تاخیر معنی خیز بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے پیرو کا لہجہ ٹٹولنے کی کوشش کی مگر اُس کے لہجے میں ایسی کوئی معنویت نہیں تھی۔ کسی اور وجہ سے بھی نواب کو دیر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو نواب کو وقت کا خاص رکھنا چاہیے۔ مجھے بھی اس کی آمد کا انتظار تھا۔ میں اُس کی آنکھیں، اُس کا چہرہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر پیرو کا گمان صحیح نکلا تو؟ اِس خیال ہی سے میرا جسم کھنچنے لگتا تھا، مجھے چور اُس کے سامنے اپنا چہرہ نہ چھپایا جائے گا۔

کانتے کے شانے جھکے جا رہے تھے۔ اُس کے زخم ٹیس دے رہے ہوں گے۔ وہ بار بار کرسی پر کلبلانے لگتا۔ منع کرنے کے باوجود وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ ماری اور شامو کے اُٹھ جانے پر ٹنگو بھی اُٹھ گیا۔ میں اور زورا کانتے کی وجہ سے رُکے رہے۔ پیرو کو نواب حشمت جنگ کا ذکر کیے ہوئے ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ صدر دروازے سے گاڑی کا شور سنائی دیا اور روشوں کے درمیان گزرتی ایک سیاہ گاڑی ہماری طرف بڑھتی دکھائی دی۔ سب اپنی اپنی کرسیوں پر سیدھے ہو گئے۔ وہ نواب حشمت جنگ ہی کی گاڑی ہو سکتی تھی۔ ہاں، وہ نواب ہی تھا۔ میری رگوں میں خون دھڑکنے لگا۔ گاڑی سبزہ زار کے قریب ٹھہر گئی۔ ڈرائیور کے دروازہ کھولنے سے پہلے نواب جلدی سے نیچے اُترا۔ اُس کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی تھی جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی۔ نیچے اُتر کے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اباجان کے پاس آ کے ٹھٹک گیا۔

"قبلہ گاہی! یہ کیا! یہ کیا ہے؟" اُس کی زبان اٹکنے لگی اور اُس کی متوحش نظریں کانتے پر مرکوز ہو گئیں جس کی کلائی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور سارا منہ سوجا ہوا، اُدھڑا ہوا سا تھا۔ زورا کے چہرے پر بھی ہلدی کے دھبے پڑے تھے۔ شامو کی باچھوں کی خراش اور جھرو کی چھپی ہوئی چوٹیں بھی اُسے نظر آ گئی تھیں۔ "ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں والا جناب؟" وہ متوحش لہجے میں بولا۔

اباجان کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ نواب کا بازو پکڑ کے وہ بھرّائی آواز میں بولے۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" نواب نے بے چینی سے کہا۔ "ہماری عقل حیران ہے کہ ہم یہ کیسا منظر دیکھ رہے ہیں۔"

"آپ تشریف رکھیے۔" اباجان پُرسکون آواز میں بولے۔

"ذرا سی چوٹ لگ گئی ہے۔"

"یہ ذرا سی چوٹ نہیں معلوم ہوتی جناب والا!" اور وہ کانتے، زورا، شامو اور جھرو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں بتائیے کہ یہ سب کیا ہے؟"

"پہلے آپ بیٹھیے تو سہی۔" اباجان نے کرسیوں کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ اُس کے آنے پر سبھی کھڑے ہو گئے تھے۔ اباجان کو خیال آیا اور اُنھوں نے اُسے اندر نشست گاہ میں چلنے کے لیے کہا مگر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُس کے ماتھے پر شکنوں کا جال پڑ گیا تھا اور وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔ چلتے ہوئے ایک نہایت ضروری سرکاری کام پیش آ گیا۔ وہ نمٹا کے ہم سیدھے یہاں پہنچے ہیں مگر یہاں..... یہاں تو..." وہ بے ترتیب لہجے میں بولا۔ "ازراہِ کرم ہماری تشفی کیجیے۔ یہ کس قسم کا حادثہ تھا؟"

مجھے جستجو تھی کہ اباجان حادثے کی نوعیت کیا بتاتے ہیں۔ نواب کی طرف رُخ کر کے اُنھوں نے گہری سانس لی اور کہنے لگے۔ "رات کو یہاں کچھ لوگ آ گئے تھے۔"

"کچھ لوگ! کون لوگ؟"

"چور! رات کو اور کون آ سکتا ہے۔"

"چور آ گئے تھے۔" نواب اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا واقعی؟"

"جی ہاں۔" اباجان نے پھیکی ہنسی سے کہا اور مخمل اور پیرو کی طرف بے اختیار اُن کی نگاہیں اُٹھ گئیں۔ وہ دونوں ساکت بیٹھے رہے۔ اباجان ہی کسمساتے لہجے میں بولے۔ "چھوٹا موٹا سا واقعہ ہے۔ یقین کیجیے، ہم سب خیریت سے ہیں۔"

"ہمیں تفصیل سے بتائیے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

اباجان کے ہونٹ لرزنے لگے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کیا اور کس طرح بتائیں، اُنھیں کتنا حذف کرنا چاہیے۔ پیرو کی بات بھی اُنھیں اچھی طرح یاد ہو گی، گو وہ شدت سے اُسے مسترد کر چکے تھے لیکن شبے کی ایک کھٹک تو اُن کے دل میں ضرور ہو گی۔ اُن کی جھجک سے نواب کچھ اور بے چین ہو گیا۔ "اتفاق سے ہم لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔" اباجان نے شگفتگی سے کہنے کی کوشش کی۔ "اور چوروں کو مکینوں کی بیداری سے پالا پڑ گیا۔"

"حویلی کی اونچی فصیل، چوکی داروں کی نفری عبور کر کے چور کیسے آ گئے تھے؟ ہمارے علم میں نہیں کہ اس حویلی میں پہلے ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔"

"پہلے حویلی میں ایسے مکین بھی نہیں تھے۔"

نواب نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں۔ "اوہ!" وہ متاسف آواز میں بولا۔ "ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کیسے..... کیسے چور تھے؟"

"چور تو چور ہی ہوتے ہیں جناب والا! سر پر سینگ نہیں تھے۔"

اباجان کے لہجے میں کسی قدر تندی آ گئی تھی، فوراً سنبھل گئے اور مسکرا کے کہنے لگے۔ "آدمی ہی کے بچے تھے۔"

نواب نے اباجان کی تندی پر توجہ نہیں دی۔ "ہماری مراد ہے کہ کیا چاہتے تھے؟"

"زر و مال۔"

نواب حشمت جنگ اباجان کے جواب پر خفیف سا ہو گیا۔ پہلو بدل کے بولا۔ "یہ ایک نہایت سنگین واقعہ ہے۔ آپ سے ربط خاطر کے علاوہ ہم اس ریاست کے منصب دار بھی ہیں۔ ازراہِ کرم ہمیں ساری بات بتائیے۔" اُس کی آواز میں غم و غصے کی لرزش نمایاں تھی۔

"کیا عرض کریں نواب صاحب!"

"جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک تکلیف دہ رات گزاری ہے۔"

"مگر ہم اپنے محترم نواب صاحب کو اس واقعے کے ناگوار بیان سے کیوں مکدر کریں۔ رات گئی، بات گئی۔ میں نے عرض کیا نا کہ زر و مال کے لیے کچھ چور چکار حویلی میں گھس آئے تھے۔ مسلح تھے اور شوریدہ پشت بھی۔ سوچا ہو گا نئے لوگ ہیں، ابھی گھر میں مکینوں جیسا نماذ نہیں ہوا ہو گا۔ حویلی کے چوکیداروں کو اُنھوں نے پہلے ہی قابو میں کر لیا تھا۔ ہم لوگ جاگ گئے یا یوں کہیے کہ اُنھوں نے ہمیں جگا دیا۔ اُن کا خیال تھا جیسے ہم کوئی خزانہ اُن سے چھپائے ہیں، مطلب برآری کے لیے اُنھوں نے دست درازی بھی کی۔"

"اور اس جارحیت کی حد تک!" نواب اداسی سے بولا۔ "یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟ پھر اُن لوگوں سے نجات کیسے ملی؟"

"رات تمام ہی ڈھل چکی تھی جب اُن کی آمد کا کھٹکا ہوا۔" اباجان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہاں کچھ ہوتا تو اُنھیں ملتا اور ہمارے پاس کچھ ہوتا تو اُنھیں بتا بھی پاتے۔ اُنھیں ہماری بے سروسامانی کا مشکل سے یقین آیا۔ اُنھوں نے ساری حویلی کی تلاشی لی اور چلے گئے۔"

نواب سوچ میں پڑ گیا۔ میری نظریں مسلسل اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر پریشانی اور دکھ کے آثار تھے اور بظاہر مصنوعی معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بعض لوگوں کو اپنی شکلیں بدلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ابھی ہم اُسے جانتے ہی کتنا تھے۔ آدمی کو جاننے میں کبھی ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔ اباجان نے نہایت آسانی سے سب کہہ دیا تھا مگر نواب مطمئن نہیں تھا، چونک کے بولا۔ "کس قسم کے لوگ تھے؟"

"ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ بعد میں اُن کے چہرے بھی ہمیں دیکھنے کو مل گئے۔ شکل و صورت سے اُجڈ، غیر شہری اور جنگجو معلوم ہوتے تھے۔ مگر جانے دیجیے، زندگی میں طرح طرح کے تجربوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی ایسی نئی بات تو نہیں۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ بتائیے، آپ کیسے ہیں۔ ایک رات درمیان میں گزری ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ بیت گیا۔ جمالی میاں کا کیا حال ہے؟ اُس طرف جانا ہوا؟"

"ہاں، جی ہاں۔ رات کو جانا ہوا تھا۔ جمالی میاں آپ کے جانے سے بہت دل گیر نظر آئے تھے۔ اُن کے لیے اب ہمی کو زیادہ وقت دینا ہو گا۔ عالم شباب سے اُن کا رشتہ بھائی کا کم، دوست کا زیادہ تھا۔ کچھ عاشقی کی سی کیفیت تھی۔ برسوں لگیں گے اس صدمے سے سنبھلنے میں۔" نواب نے ڈوبتی آواز میں کہا اور لمحاتی توقف کے بعد کہنے لگا۔ "کاش آپ وہیں سے روانہ ہوتے تو یہ سب اس طرح پیش نہ آتا۔"

"مگر یوں ہی کچھ ہونا تھا تو کون روک سکتا تھا۔"

"معاف کیجیے، ہمیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری ذمے داری مزاحم ہو رہی ہے مگر اس طرح تو ہم پر اور بوجھ پڑے گا۔ بہتر ہو گا اگر آپ ہمیں اُن مجرموں کے متعلق کچھ اور بتائیں، مثلاً اُن کی زبان، لب و لہجہ، طور اطوار۔ ہمارے ہاتھ اتنے کوتاہ نہیں کہ اُن کی گردنوں تک نہ پہنچ سکیں۔ یقیناً وہ اپنی بعض نشانیاں یہاں چھوڑ گئے ہوں گے۔ ریاست میں ایسے واقعات کی ہم قطعاً اجازت نہیں دے سکتے۔ یہاں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ برسوں میں اکا دکا واقعات پیش آتے ہیں۔

ریاست کے قوانین رہ زنوں اور ڈاکوؤں کے لیے کسی قسم کی لچک نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے انھیں اُن کی سزاؤں تک نہ پہنچایا تو یہ نہ صرف ہماری سُبکی ہوگی بلکہ ساری ریاست کی توہین۔ ہمیں حیرت ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ یہاں سے کچھ لے گئے ؟"

"جی نہیں! انھیں خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑا۔"

"آپ کے پاس نقدی وغیرہ تو وافر ہوگی ؟"

"تھوڑی بہت ہے، یہی کوئی لاکھ سوا لاکھ کے بہ قدر۔"

"ہونہہ!" نواب سر ہلانے لگا اور بولا: "کتنی دیر وہ یہاں ٹھہرے؟"

"خاصی دیر۔" اباجان نے تذبذب سے جواب دیا۔ "حویلی کے ہر کمرے کی تلاشی میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

"پھر نقدی اُن کی نگاہوں سے کیسے اوجھل رہی ؟" نواب نے تیکھے لہجے میں کہا۔ اُس کے تیکھے پن میں طنز نہیں تھا۔

"شاید اس لیے کہ نقدی چھپا کے نہیں رکھی گئی تھی۔ بدحواسی میں انھیں سامنے رکھی ہوئی چیز کا خیال نہیں آیا حالانکہ اُسی کمرے میں تھی جہاں میں تھا۔"

نواب نے تعداد پوچھی تو اباجان بے اختیار تجمّل اور پیرو کی صورت دیکھنے لگے اور بولے: "باقاعدہ شمار تو نہیں کیا لیکن پندرہ سولہ کی نفری تو ضرور تھی۔"

"پندرہ سولہ اور مسلح!" نواب اچھل سا گیا۔

نواب حشمت جنگ ایک باراں دیدہ شخص تھا۔ اباجان کی آواز میں کوئی لکنت نہیں تھی مگر اُن کے لہجے میں گرہیں پڑی ہوئی تھیں، اور نواب کے سامنے اُن کا چہرہ بھی تو تھا جس پر اُن کے بیچنے کی تمام گتھیں سمٹ آئی تھی۔ نواب نے واضح طور پر اُن کے بیان میں ابہام کا شکوہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ اباجان اپنے موہوم جوابوں کے بارے میں کوئی صفائی پیش کرتے، نواب کسی پولیس والے کی طرح اُن سے پے درپے سوال کرنے لگا۔ اباجان ہر بات صاف صاف بتا سکتے تھے لیکن اگر یہی تھا تو پھر رات اُن آدمیوں کو یوں جانے دینے کا کیا جواز رہ جاتا۔ جس وجہ سے انھیں جانے دیا گیا تھا، وہ نواب بھی موجود تھی اگر وہ خفیہ ہاتھ نواب حشمت جنگ کا نہیں تھا تو یہ ساری رُوداد نہ صرف اُس کا سکون غارت کرتی، ہمارے پیروں کی بھی زنجیر بن جاتی۔ یہ سب کچھ ٹُن کے اُس کے عالمِ غضب کا ایک تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔ یہ حقیقت اُسے چین نہ لینے دیتی کہ سب اُسی ہیرے کا کرشمہ ہے جسے اباجان نے بہ کمال قلندری اُس کی نذر کر دیا تھا اور یہ تمام محض اِس ایک سازش کا شاخسانہ ہے کہ اُس نے ریاست کے بعض امرا کو خود نمائی کے کسی مطلوب وقت میں اُس ہیرے کی جلوہ نمائی کرائی تھی۔

یہ سب جان کے اُس کی نگاہوں میں جن لوگوں کی تصویریں اُبھر سکتی تھیں، اُن میں سب سے پہلا شخص غالباً مہاراجا ہی ہوتا، اُس کے بعد ریاست کے ایسے تمام نوابین جن کی ہتھیلیوں سے رعونت جنون کی حد تک ہے۔ نواب کی اُن لوگوں سے تب آشنائی ہوگی، سو اُن تک پہنچنا اُس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ اباجان کی ایک ذرا سی لسّانی ریاست کے نوابوں، راجاؤں میں کسی بھی قضیے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اباجان کو اُن کے مابین اُس فساد سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی حیدرآباد سے بہ عافیت نکل جانے کی بے چینی تھی۔ نواب انھیں بچپ روک لیتا اور اُس وقت تک نہ جانے دیتا جب تک اباجان کی نظروں میں مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دینے کی شرح روئی اُسے حاصل نہ ہو جاتی۔ اباجان کی کم آمیزی اُس کے تجسس کو اور ہوا دے رہی تھی اُس کا بار بار بدلتا رنگ اندر کی بے سکونی کی غمازی کر رہا تھا اور اباجان کے پاس کہنے کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ مزید ایک پہر بھی اس شہر میں ٹھیرنا نہیں چاہتے ہوں گے۔ ہیروں سے وابستگی اونچے لوگوں سے وابستگی، شہر میں اہمیت اور غنائم کی آمد کا واقعہ بھی نوابین سے روپوش نہیں رہا ہوگا۔ ایک پہر جانے کتنے روزن کھول دیتا۔ رات آنے والے آدمیوں کے اصل مقصد کی جھلک نواب کو بے لگام کر سکتی تھی۔ اباجان کو اپنی روانگی تک اُسے اسی تذبذب و کشمکش کی حالت سے دوچار رکھنا تھا اور بہتر یہی تھا کہ وہ کسی طرح اُس وقت تک اُس کے ساتھ ہی رہیں۔ سبزہ زار میں زخمی ملازمین بھی نواب کی نظروں کے سامنے تھے لیکن ہماری موجودگی میں اُن سے کچھ پوچھنا وضع کے منافی تھا۔ اس میں ہماری بھی توہین تھی، نواب کی بھی۔ اباجان کو اب احساس ہو رہا ہوگا کہ رات انھوں نے تجمّل کی بات نہ مان کے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ رات اگر وہ تجمّل اور پیرو کو چھوڑ کے پیچھے سے بمبئی کے لیے نکل کھڑے ہوتے تو انھیں دس بجے ہی ڈبے جا رہی گی سے دوچار نہ ہونا پڑتا لیکن شاید انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ انھیں تجمّل اور پیرو کو چھوڑ کے کہیں نہیں جانا چاہیے تھا ورنہ وہ خود سے ہمیشہ شرمسار رہتے۔

نواب کی حیران و مضطرب کیفیت سے اُس کی ناآسودگی جھلک رہی تھی مگر اباجان نے احتیاطاً وہ کانٹا اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہوگا جو رات پیرو نے انھیں چبھو دیا تھا۔ بے شک نواب کی تکرار عمداً بھی ہو سکتی تھی، اپنی آلودگی کے احساس سے۔ کہیں اباجان کی بے التفاتی اور درگزری نے اُسے کچھ مشتبہ نہ کر دیا ہو اور اُسے اباجان کی آنکھوں کے آئینے میں اپنے لیے کوئی بال نظر آ گیا ہو۔ یہ بال پراگندہ آنکھوں ہی کو نظر آ سکتا ہے۔ اس صورت میں نواب کے لیے یہی لازم تھا کہ وہ شدومد سے اس الزام کی تردید کرتا۔ اپنے دامن کے دھبّے دھونے کے لیے اُسے رات کے واقعے کی جزئیات و تفصیلات جاننے کے سلسلے میں اتنی ہی وحشت اور بے تابی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ اُسے زندہ واپس جانے والے آدمیوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اُن کی مہمّ کے بارے میں ہمیں کچھ جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یوں نواب کو دلیلیں دینے کا گداز حاصل تھا، نواب کو کیا معلوم کہ یہ گداز بھی ہمی نے فراہم کیا تھا۔ جان بوجھ کے، بہت بہتر کر کے۔

"اتنی بڑی تعداد!" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا: "جناب والا! ہمارا تجربہ ہے کہ چور اور ڈاکو کوئی گھر منتخب کرنے سے پہلے اُس کے مکینوں کی دولت و ثروت کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں انھیں اس کا موقع نہیں ملا ہوگا۔"

"شاید وہ راستہ بھول گئے تھے یا انھیں اس گھر کے بارے میں کوئی بڑی خوش فہمی ہو گئی ہوگی۔" اباجان اُٹھتے ہوئے بولے۔

"ہم ابھی نکتے پر غور کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں ریاست میں خدانخواستہ آپ کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے دماغ میں طرح طرح کی باتیں آ رہی ہیں لیکن یہ ہمارے اقتدار و تمکنت کے سبب بھی ہو سکتی ہیں۔"

"آپ کس نہج پر سوچ رہے ہیں؟" اباجان نے بے ترتیبی سے کہا۔

"کیا عرض کریں، سر پھٹتا ہے ایسی کون کون ایسا...." وہ زیرِ لب بولتے بولتے رکا۔ سب اُس کی طرف متوجہ تھے۔ نواب ایک لمبی سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"جانے بھی دیجیے۔" اباجان نے خوش دلی سے کہنے کی کوشش کی۔

"کیسے جانے دیں، یقین کیجیے، ہمیں بہت صدمہ ہے۔ یہ ہمارے منصب کے لیے تازیانہ ہے۔ ہمیں آپ کے سامنے ندامت محسوس ہو رہی ہے۔" نواب کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں قبلہ نواب! اس میں آپ کی ندامت کا بھلا کون سا پہلو نکلتا ہے؟"

"ہمارے محسن، ہمارے مربی پر انھوں نے ہاتھ اٹھایا۔ وہ کیسے شقی القلب لوگ تھے، جنھوں نے ایک بزرگ کا لحاظ نہیں کیا۔"

"انھیں مراتب کا خیال ہوا کرے تو وہ یہ مذموم کام ہی کیوں کریں۔ اُن سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟" اُسے بہلانے کے لیے اباجان کی سمجھ میں جیسے نقد نہیں آ رہے تھے۔ "آپ نے دل پر بہت اثر لے لیا ہے حالانکہ یہ تو ایک عام سا...."

"ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ہماری کسی کوتاہی کا خمیازہ ہے۔"

"آپ کی کوتاہی!" اباجان سراسیمگی سے بولے۔

نواب نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور آنکھیں سکڑ سی گئیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ "ریاست میں رہنے والے ہر شخص کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری ہماری ہے اور آپ تو ہمارے مہمان، ہمارے......" وہ یقیناً کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا اور بولا: "ہماری حاکمی کس کام کی۔ یہ گھر ہمارا ہی تو ہے۔ انھوں نے ہمارے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کی۔ انھوں نے آپ سے ہماری نسبت کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔"

"انھیں اس نسبت کا علم ہوتا بھی تو......" اباجان شائستہ لہجے میں بولے۔

"ہم انھیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اگر ہمارے بس میں ہوا تو اُن کے ہاتھ قلم کرا دیں گے۔"

"نواب صاحب! ازراہِ کرم اب یہ ذکر درگزر کیجیے۔" اباجان نے عاجزی سے کہا: "آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے کل ہم سے کیا کہا تھا اور آپ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔"

"یاد ہے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ یہاں آ کے یہ کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ کاش آپ ہمیں یہ رات ہی اطلاع دے دیتے۔"

"صبح آپ نے خود آنے کو فرمایا تھا، اس لیے ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ اگر ہم اپنے یہ نشان مٹانے پر قادر ہوتے تو ویسے بھی کبھی یہ ذکر نہ کرتے۔ آخر آپ کو اس قدر کبیدہ خاطر کیوں کیا جائے۔"

"اِن نشانوں کی اذیت ہم اپنے جسم و جاں میں محسوس کر رہے ہیں۔" نواب نے آزردگی سے کہا۔

"آپ کی عنایت ہے کہ آپ ہمیں ایسا عزیز رکھتے ہیں۔ آپ کی یہ گرم گستری ہم سب کے لیے مرہم کے مترادف ہے۔ اس کے بعد کیا چاہیے، یہی ہمارے لیے سب سے بڑا مداوا ہے۔"

نواب سر جھکائے لمحوں تک خاموش رہا۔

"ہمیں یاد ہی نہیں رہا۔" اباجان نے پھر اُس کی توجہ مبذول کرانا چاہا اور ندامت آمیز لہجے میں بولے: "آپ کو آئے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ ہم نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ آپ کیا پئیں گے بلکہ کھانے کا وقت ہوا جاتا ہے۔"

"ہمارا کچھ بھی نہیں چاہ رہا۔" نواب نے بھاری آواز میں کہا: "جب سے یہاں آئے ہیں طبیعت میں کچھ گراوٹ سی ہے۔"

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں، ہاں، الحمدللہ کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ سنبھل کے بولا مگر دوسرے لمحے اُس کی آنکھیں بجھ سی گئیں اور وہ دل گیر آواز میں کہنے لگا۔ "رجّی میاں کے جانے کے بعد سے جیسے کسی چیز کی کمی ہو گئی ہے۔ جسم جیسے کسی نے شکنجے میں کس دیا ہے۔ ہم تو کھل کے رو بھی نہ سکے۔ دوسروں کو سنبھالا دیتے، اُن کے آنسو پونچھتے ہیں۔ رجّی میاں کی موت کے بعد سے ہم نے ٹھیک طرح آئینہ بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"ساتھ ہی ایسا تھا۔ آپ کے بیٹے تو میرا صدمہ تھا جیتے جی عزیزہ کی اس عمر میں ہوگی....." ابا جان کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے، دل گرفتہ آواز میں بولے: "مگر والا جناب تو ایک حوصلہ مند آدمی ہیں۔ یہاں کون رکنے کے لیے ہے۔ سب قطار میں ہیں اور کسی کو اپنی باری کا علم نہیں۔"

"ہاں، اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

ابا جان اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ابا جان نے دبے لہجے میں کہا: "چائے کی ایک پیالی تو لیجیے گا۔"

"ضرور، ضرور۔" نواب لجاجت آمیز مستعدی سے بولا۔

ابا جان نے شامو کو چائے کے لیے اشارہ کیا ہی تھا کہ نواب کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ فکرمندانہ انداز میں بولا: "آپ کو کوئی گہری چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں، معمولی خراشیں ہیں۔"

"کسی طبیب کو بھی دکھایا؟"

"ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

ابا جان کے چہرے پر چھائی ہوئی لکیریں کچھ دیر کے لیے نرم پڑ گئی تھیں۔ وہ پھر گہری ہونے لگیں۔ نواب کے ذہن میں ابھی تک وہی سب کچھ گردش کر رہا تھا: "ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن وحشیوں نے سب سے زیادہ آپ ہی کو اپنا ہدف بنایا۔"

"نہیں۔" ابا جان نے عجلت سے کہا اور کلائی کی طرف انگلی اٹھا کے بولے: "آپ نے نہیں دیکھے ہیں۔"

"یقیناً۔ انھوں نے دست اندازی کی ہوگی۔ آپ کی طرف اُن کے اُٹھتے ہوئے ہاتھ اِن سے برداشت نہیں ہوئے ہوں گے۔"

"ہاں، شاید کچھ یہی تھا۔" ابا جان شکستہ لہجے میں بولے۔

"کیا انھوں نے ساری حویلی کی تلاشی لی؟" نواب کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں جناب والا سے عرض کر چکا ہوں۔"

"ہوں۔" نواب کے ہونٹ بھینچ گئے۔ "آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ وہ کچھ اور تو نہیں، ہمارا مقصد ہے، کوئی نادر قسم کی چیز لے جانے میں کامیاب تو نہیں ہو گئے؟"

"یہاں تھا ہی کیا۔ نقدی کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ گھر میں کوئی خاتون موجود نہیں تھی اس لیے زیورات کی طرف خود انھوں نے توجہ نہیں دی ہوگی۔"

ملازم نواب حشمت جنگ کے منصب و ثروت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ وہ منتظر ہی تھے۔ شامو کو گئے چند لمحے ہوئے تھے کہ خوان پوشوں سے ڈھکے چائے، پھل اور مٹھائی کے طشت اٹھائے ملازم سہ دری میں داخل ہوئے۔ اُن میں ایک رجّی کا ملازم بھی تھا۔ نواب کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹھہر گیا اور ترکی ٹوپی اتار کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ اپنا اضطراب متوازن رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ ابا جان اور ہم سبھی کی خوش گمانی تھی۔ نواب نے کچھ دیر کے لیے از خود موضوع بدلنا مناسب سمجھا ہوگا۔ ابا جان کے اور اپنے مراسم کی لطافت کے خیال سے یا وہ اس طرح ابا جان کو اپنے تعلق خاطر کا اعتماد دلانا چاہتا ہوگا۔ اسے تجدید اعتماد کی لئے بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ اسے کون سمجھاتا کہ ابا جان اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا پائیں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ کوشنے اور ملازمین وغیرہ نواب کے سامنے آتے ہی نہیں۔ ایسے ابا جان اپنی خواہشوں کا کوئی بھی عذر پیش کر سکتے تھے۔ نواب کی آمد جس سے متوقع تھی مگر اس طرح کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ ملازم طشت رکھ کے چلے گئے۔ ابا جان نے اپنے ہاتھ سے نواب کے لیے چائے بنائی۔ "کل شام یہاں آنے کے بعد آپ کی کیا مصروفیت رہی؟" ایک دم نواب نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"مصروفیت؟" ابا جان سٹ پٹا سے گئے۔ "ہم نہیں سمجھے۔ نہیں، آرام کرتے رہے۔" "کل شام آنے والے دونوں آدمیوں اور سواروں کے بارے میں ابا جان مجھے بتا سکتے تھے۔" "مگر..... مگر آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟" انھوں نے بے جانی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس یوں ہی ہمارے ذہن میں آ گیا۔" نواب بے رخی سے بولا۔ "آپ نے پولیس وغیرہ میں تو رپورٹ درج نہیں کرائی؟"

"جی نہیں۔" ابا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"درج کرا دینی چاہیے تھی۔"

"مگر اس سے کیا حاصل تھا؟"

"احتیاط۔" نواب کے ہونٹ باہر نکل آئے۔

"میں نہیں سمجھتا ہوں کوئی ضروری نہیں ہے۔"

"ضروری ہے۔" نواب سخت لہجے میں بولا

"شاید اب تو وقت بھی گزر گیا ہے۔"

"کیا آپ کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہتے؟"

"بے شک، بے شک۔" ابا جان نے منتشر آواز میں کہا: "مگر اس میں ضیاع وقت کا بھی اندیشہ ہے۔ آپ جس تشریف لانے والے تھے۔ خیال تھا کہ مشورے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھایا جائے۔ پولیس کے طریقہ کار تحقیق و تفتیش کے طول طویل عمل سے ایک دو بار واسطہ پڑ چکا ہے۔ اصل میں آج ہی روانگی کا قصد تھا۔ یہاں پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔ ورنہ تو بڑے نواب صاحب کے ہاں ٹھیرے رہنے میں کیا حرج تھا۔ وہ تو ہمیں روک رہے تھے اور ایسے وقت میں ہمیں اُن کی بات نہیں ٹالنی چاہیے تھی۔ انھیں بھی ہم نے آزردہ کیا۔ صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ روانگی از بس ضروری ہے۔ ہم تو کل ہی روانہ ہو جاتے لیکن ادھر آپ نے......"

"ہاں، ہاں۔" نواب اُن کی بات کاٹ کے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا: "ہمیں احساس ہے۔ کاش ہم آپ کو نہ روکتے مگر جہاں آپ اتنی دیر ٹھیرے ہیں، وہاں چند دن، ہماری درخواست ہے کہ چند دن اور سہی۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" ابا جان نے بے چینی سے کہا: "لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ مزید رکنے کے لیے نہ فرمائیں۔"

"ہم بھی اصرار نہ کرتے۔ ہم تو یہاں آپ کو وداع کرنے ہی کی غرض سے آئے تھے۔" نواب ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا: "آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آپ کا ٹھیرنا کس قدر ضروری ہے۔ گھر سے کچھ نہیں گیا، کوئی نقصان نہیں ہوا مگر کسی بڑے نقصان ہی کے ارادے سے وہ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگوں کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے۔ آج وہ یہاں آئے تھے، کل کسی اور شریف زادے کے گریبان پر اُن کا ہاتھ دراز ہو سکتا ہے۔ آپ کی مجبوریاں اپنی جگہ مگر یہ تو ایک ریاست کے نظم و نسق کا معاملہ ہے اور دوسری طرف ہماری اطمینان قلب کا بھی۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ پولیس کو بے جا کارروائیوں کی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ دیکھیے تو سہی ہم کیا کرتے ہیں، کیا کچھ کر سکتے ہیں۔"

"جناب من!" ابا جان کی آواز اُڑی اُڑی سی تھی: "ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ اُدھر بھی وقت پر نہ پہنچنے میں کسی بڑے نقصان کا احتمال ہے۔ آپ سب کچھ درست فرما رہے ہیں۔ ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن کیا عرض کریں، کچھ ایسی ہی صورت ہے اور آپ تو یہاں موجود ہی ہیں، پھر ہماری موجودگی کی کیا ضرورت۔ اور یہی ہے تو ہم جلد واپس آ جائیں گے۔ ہفتے عشرے کے اندر اندر۔"

"مگر آپ کا یہاں ہونا بھی ضروری ہے۔"

ابا جان نے کشمکش و پیچ کی حالت میں شجیل کو دیکھا، پیرو کو دیکھا، پھر مجھے مگر انھیں کوئی کیا اشارہ کرتا۔ انھیں ہر طرف چلنے ہی جیسے چہرے نظر آئے ہوں گے۔ انکار کر دینا ایسا مشکل نہیں تھا مگر ابا جان کے سامنے ریاست کا ایک اقبال مند نواب ہی نہیں ریاست کا حاکم بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اب تک اُس نے ہم سے بظاہر ایک ہم نشین ایک دردمند کی حیثیت سے بات کی تھی لیکن کسی بھی لمحے اُس کی آنکھوں کا رنگ بدل سکتا تھا۔ اُس پر اپنے عہدہ و منصب کا کوئی رنگ غالب آ سکتا تھا۔ اس کے شائستہ طور طریق میں کبھی تندی و بڑائی کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ آلودگی واقعے کی سنگینی، نزاکت احساس اور ہم سے اپنے تعلق کی پاس داری کے سبب سے بھی ہو سکتی تھی یا اپنی دولت و ثروت، اپنے عزّ و وقار کی کوئی لہروں ہی اُمڈ آئی ہوگی مگر ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ ہم اُسے اُس کی حاکمیت کے فرو زور پر محمول کریں۔ ابا جان کا اب و لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اُن پر نواب کی اس دوسری ہی حیثیت کا غلبہ ہے۔ انھوں نے اُسے ایک حاکم سے کم یا زیادہ رتبہ نہیں دیا ہے اور نواب کی جنبش ابرو کی فتنہ گری

اور اپنی زبان سے نکلے ہوئے کسی بھی لفظ کی ہنگامہ خیزی کا انھیں خوب احساس ہے۔ وہ اب تک ایک ہوش مند آدمی کی طرح محتاط تھے۔

ممکن ہے اب نواب کی وہ حیثیت بھی اُن کے وہم و گمان میں دوبارہ جگنے لگی ہو جس کی نشان دہی پیرو نے کی تھی۔ نواب کے اصرار کی وجہ کہیں خود اُس کی پسپائی تو نہیں؟ وہ ضروری نہیں کہ صبح اپنے آدمی خالی ہاتھ واپس آجانے پر اُس کی خلش دور ہوگئی ہو۔ ہو سکتا ہے چنگاری باقی ہو اور نواب اسی ایندھن پر اندھیرے میں تیر چلا رہا ہو اور پولیس کے ذکر اور چند دن مزید قیام کی درخواست سے وہ کوئی حجت پوری کرنا چاہتا ہو۔ ابا جان کا یہ اجتناب اور گریز جیسے احتفا بھی کہا جاسکتا تھا، اُس کی جھجک کا پردہ اور مضطرب کر رہا ہوگا اور فرض کیا کہ اگر پہلے نہیں تو اب، رات وہ آدمی اُس کے بھیجے ہوئے نہیں تھے، حویلی میں گزرنے والی رات سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اب یہ سب پکڑ میں کے جاوا اُس کے اندھیرے سینے میں ہوس کی کوئی چنگاری بھی ہو۔ جیسے کسی کی آنکھیں کھل جائیں، جیسے کوئی جھینگا دکھائے اُسے ملال ہوگا کہ رات تجیا بند آدمی بھیجنے والے کے چاہنے پر، تب اب پرکھنے کا خیال اُسے کیوں نہیں آیا۔ اُسے بہت سی خرس ہو رہی ہوگی مگر ابا جان کو نہ ہیروں کے لیے اُس کی حرص و ہوس سے کوئی غرض تھی نہ اُس کے بیلے پیرو کے الزام کی تائید و تردید سے کچھ سروکار تھا۔ رات اگر وہ جیب بہتان لگتا تھا اور اب وہ خود نواب کے دل میں ایسا کوئی ملال ہو رہا ہو تو دیکھ رہے تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ ملے کیسے مدرک سکتے تھے۔ نجات اگر اسی طرح ممکن تھی تو ابا جان کسی پیش و پس کے بغیر ہیروں سے بھری تھیلی نواب کی نذر کر دیتے مگر نہ ہیرے نذر کیے جاسکتے تھے، نہ نواب کی خواہش کے مطابق یہاں مزید قیام مناسب تھا۔ نواب اُن سے کوئی عجیب اور بے جواز بات نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک حساس اور مروت مند شخص اور ایک مستعد منصب دار کی حیثیت سے اُس نے جو کچھ کہا تھا، وہ ابا جان کیا، کوئی بھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ ابا جان کے پاس روانگی میں عجلت کے سوا کوئی سہارا جواز نہ تھا۔ روانگی ایک بڑے مقصد کے لیے ملتوی کی جاسکتی تھی، پہلے بھی کی جاچکی تھی۔ ابا جان کھوئی کھوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اپنی مجبوری کا احساس بڑھانے کے لیے اب یہی اضطراب آمیز خاموشی باقی رہ گئی تھی۔ بے زبانی کی زبان۔ اس میں اُن کے ادب اور احترام کا پہلو مضمر تھا اور اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کی گنجائش بھی نکل آتی تھی تاہم ابا جان کو منہ سے بھی تو کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ انھوں نے خوش اطواری سے کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز کی پژمردگی چھپائے نہ چھپی۔ انھوں نے کہا "بہتر درست ہے، جیسا آپ کا حکم ہے ہم ......"

"حکم نہیں قبلہ گاہی! ہماری درخواست ہے۔"

"درخواست ہے تو اجازت ہی دے دیجیے۔"

"ہماری کوشش ہوگی کہ وقت کم سے کم صرف ہو" نواب تیزی سے بولا "انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔"

ابا جان نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ ہو سکتا ہے انھوں نے وہ تیکھی نواب کی نگاہوں میں اپنے لیے کوئی گرہ دیکھی ہو، پھر سوچا ہو کہ نواب کی طرف سے کوئی فیصلہ صادر ہونے کے بجائے انھوں نے اپنا فیصلہ خود سنا دیا: "مناسب ہے، پھر میں ان لوگوں کو واپس کر دیتا ہوں" ابا جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں رک جاتا ہوں۔"

انھوں نے جیسے کوئی ناقابلِ فہم بات کہہ دی ہو۔ نواب چونک سا گیا۔ ابا جان کے چہرے پر اس کی نگاہیں منڈلانے لگیں۔ ابا جان کے چہرے پر ایسا بوجھل سکون تھا جو عدالت میں کھڑے ہوئے مجرم پر اپنے مقدر کا لکھا سُن کے ہوتا ہے۔

"آپ چلے جاؤ گے" یکایک [illegible] میں جھنجل کی آواز گونجی "سب کرسیوں پر بیٹھے ہوں گے۔ آپ کا اُدھر جانا ضروری ہے" جھنجل نے [illegible] کی کوشش لیتے ہوئے کہا "ہم اسی طرف رہیں گے۔ نواب صاحب سب ٹھیک ہی بول رہے ہیں۔"

نواب نے اب تک ہم میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دی تھی حالانکہ ہم اُس کے لیے نئے نہیں تھے۔ بڑے نواب کی حویلی میں کئی دن تک وہ تقریباً ہمارے ساتھ رہا تھا۔ ہم سے باتیں کرتا رہا تھا مگر آداب خاص۔ غالباً ابا جان کی موجودگی میں ہم سے کوئی بات چیت آداب کے منافی تھی۔ ابا جان نے بھی ہمیں اس کا موقع نہیں دیا تھا۔ جھنجل کی دخل اندازی پر نواب کی آنکھوں کی چمک عود کر آئی۔

"سمجھ گئے ہیں کہ ہم یہ اصرار کس لیے کر رہے ہیں" وہ جوشیلے لہجے میں بولا "وہ کہیں سے بھی آئے ہوں، ہماری دسترس سے دور نہیں۔ ہمیں یقین ہے ہم جلد ہی اُن تک پہنچ جائیں گے۔" پھر وہ جھنجل سے پوچھنے لگا "آپ نے انھیں دیکھا تھا؟"

"اچھی طرح دیکھا تھا" جھنجل نے گرجیلی آواز میں کہا۔

"ہماری مراد ہے، آپ کا اُن لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نواب کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اپنے کر اوپر سے نیچے تک بالکل اُٹھائی گیرے لگتے تھے" جھنجل

نے ترش آواز میں جواب دیا "بالکل جنگلی لوگ ......"

جھنجل کی بات پوری ہونے سے پہلے پیرو نے تیزی سے کہا "اپن آپ کو بولے نواب صاحب! اپن کو شبہ ہے، ابھیا بابا بولا ہے، کہ کالا اور رستم بھول کے آیا تھا یا کسی نے ایدھر کے لیے اُن کے ساتھ مخول کیا تھا؟"

"مخول! آپ کا مطلب ہے مذاق!" نواب نے تاسف آمیز درشتی سے کہا۔

"کتا بول تک مذاق! اگر ہم ان سے کوئی مذاق نہیں کریں گے۔"

"اپن کو پتہ ہے، آپ بہت کچھ کر سکتا ہے نواب صاحب اور آپ کو کرنا بھی چاہیے۔ آپ اتنی باتیں نہیں کرتا تو اپن کو شکایت ہوتا" پیرو نے موت دبا لہجے میں کہا "اپن بھی ایسا ہی چاہتا ہے پر اپن ابھی آپ سے کیا بولے۔"

"نہیں، نہیں آپ فرمائیں۔"

"اپن ابھی آپ سے ایک بات پوچھنا مانگتا ہے" مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں پیرو کی زبان نہ بہکنے لگے مگر اُسے خود بھی احساس ہوگا۔ وہ نپی تلی آواز میں بولا "آپ بولتے ہو تو اپن ٹھہر جاتا ہے۔ پر اپن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایدر رکے کیا کرے گا جب آپ ایدر ہے۔ سب جانتا ہے۔ اپن کو رکے ہوئے بہت دن ہو گیا ہے۔ ایدر کا سیدھا کرنے سے ابھی اُودھر کا اُلٹا ہو گیا تو ......"

"تم لوگ چلے جاؤ" ابا جان نے کسی قدر تنبیہی لہجے میں پیرو سے کہا "میں ایک دو دن بعد آجاؤں گا۔ وہاں تم میری تاخیر کا کوئی بھی معقول عذر کر دینا۔ ویسے بھی تو کسی اور وجہ سے دیر ہو سکتی تھی۔"

"ابھی آپ کیسا بولتا ہے بابا!" پیرو نے احتجاجی آواز میں کہا "آپ کو اپن سے زیادہ اُودھر ہونا چاہیے۔ اپن کیا منہ لے کے جائے گا، کس کو کیا جواب دے گا۔ ابھی سب چوپٹ ہو سکتا ہے۔ آپ نہیں جائے گا تو اپن کے جانے سے کیا ہوئے گا؟"

"یہاں نوکر چاکر لوگ بھی تو ہیں" جھنجل نے آہستگی سے نواب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اُس کا انداز ٹوکنے کا سا تھا "رات تین آپ کے ساتھ گھیرے ہوئے تھے۔ سب اُن کا جانا بوجھا دیکھا بھالا ہے۔"

نواب حشمت جنگ جزبز سا ہونے لگا۔ وہ ابا جان، جھنجل اور پیرو کے چہرے دیکھا کیا "کوئی ایسی مجبوری ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے کم و بیش بھی کچھ عرض کر دیا ہے۔ ہم آپ کو بتائیں، ہمیں سکون نصیب نہیں ہوگا۔ ہم اپنی سی کوشش تو بہرحال کریں گے ہی لیکن آپ لوگوں کی موجودگی میں صورت حال مختلف ہوگی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مدعی خود موجود نہ ہوں۔ عجب نہیں کہ ہمیں آپ کو ساتھ لے کے حضور نظام کے دربار میں فریاد کے لیے جانا پڑ جائے۔ ہمیں یقین ہے، اس کی نوبت شاید ہی آئے تاہم طرح طرح کے شکوک و شبہات ہمارا ذہن منتشر کر رہے ہیں۔"

"میں، میں تو یہاں رک ہی رہا ہوں قبلہ من!" ابا جان نے بہ عجلت کہا "میں اپنے معزز و محترم دوست کی تجویز کیسے رد کر سکتا ہوں؟"

"پھر ابھی اپن میں سے کوئی نہیں جائے گا" پیرو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اپن ایسا اکیلا اُودھر نہیں جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، یہ بھی ٹھیک ہے بابا!" "ہم سب پھر اُدھر ہی رہیں گے" جھنجل نے زیر لبی سے کہا "اور جب اُدھر ہی ٹھہرے تو بڑے نواب صاحب کی حویلی میں کیوں نہ چلیں۔ وہ ہم کو بہت روک رہے تھے، دیکھ کے خوش ہو جائیں گے۔" جھنجل نے ضرور کسی مقصد سے یہ بات کہی ہوگی۔ نواب حشمت جنگ نے جواب نہیں دیا، جھنجل نے انتظار بھی نہیں کیا اور نواب کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا "اور اگر سیدھے اپنے نواب صاحب کے محل میں جاکے ہی ڈیرا لگائیں تو کیسا ہے؟"

نواب نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اچھل کے کہا "کیا کہنے! یہ آپ کیا فرماتے ہیں، یہ تو آپ نے ہمارے دل کی بات کہہ دی۔ ہم تو پہلے ہی گزارش کر رہے تھے، ہمیں موقع ہی کہاں دیا گیا۔"

"ابھی موقع ہی موقع ہے نواب صاحب!" پیرو خلقی آواز میں بولا "اپن ایک دم اکتا شکایت نکال کے جائے گا۔ جب تک آپ بولے گا آپ کے پاس ہی رہے گا۔"

"زہے نصیب! زندگی بھر" پیرو کا یہ اندازِ تخاطب نواب پر گراں گزرنا چاہیے تھا۔ نواب نے اُس کے طرزِ کلام کا [illegible] شاید اس لیے کہ پیرو کے لہجے میں طنز کم، متحمل زیادہ تھا [illegible] کی احتیاط کی تھی "ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی اس [illegible] کیا ہو سکتی ہے۔" نواب انکسار سے بولا۔

"جتنا بڑا آپ ہے، دل بھی آپ کا اتنا ہی بڑا ہے۔ ایسا کیسے ہوتا ہے نواب صاحب! یہ آپ کا نہیں، اپن کا عزت ہے" پیرو نے سر جھکا کے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "اپن آپ لوگ کے لیے نواتھو آدمی ہے۔ آپ اپن کے بارے میں ابھی کتنا جانتا ہے، قسم سے کچھ بھی نہیں جانتا۔ ایسا کیدر ہوتا ہے نواب صاحب!"

"معلوم نہیں، جاننے سے آپ کی کیا مراد ہے" نواب تمتماتے لہجے میں بولا "اگر شناسائی اور یک دلی کسی معین مدت سے مشروط ہے تو ہما ہم اس کے قائل نہیں۔ اس مختصر مدت میں آپ حضرات نے جو نقش ثبت کیے ہیں اُن سے ہم آشنا نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے ہم کھا اور جانتا بھی

نہیں چاہتے۔ یقیناً اس سے کہیں بیش ہوگا۔ مگر ہمارے لیے آپ سے
آپ کی آگہی کی سرشاری کیا کم ہے۔"

"اپن کو آپ جیسا بات کرنا نہیں آتا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا۔
"پر اپن آپ سے کچھ بول رہا تھا۔ ابھی ہو سکے تو ذرا دھیان سے سن لو
نواب صاحب!"

"جی، جی، فرمایئے۔" نواب سنبھل کے بولا۔

"اپن بول رہا تھا کہ سدا کے لیے تو کوئی اپن ادھر سے نہیں جارہا
ہے۔ ادھر یہ حویلی خریدا ہے۔ ادھر اپنا خانم موجود ہے اور آپ لوگ ہے۔
ادھر ابھی اپنا تین تین گھر ہے۔ بابا کا یہ تو حویلی، بڑے نواب صاحب
کا اور آپ کا۔ بابا بہت دن سے ادھر شہر حیدرآباد میں آنے کا بولتا تھا۔
ادھر آکے اپن کو پتہ چلا کہ بابا ٹھیک ہی بولتا تھا۔ یہ شہر ادھر کا لوگ، ادھر
کا موسم، آدھا نرم، آدھا گرم۔ ادھر آپ جیسا لوگ ہے جو اپن کے ذرا
سے دکھ پر اتنا گھبرا جاتا ہے۔ ادھر آکے اپن کا من ابھی لوٹنے کو ایک دم نہیں
کرتا۔ پر اپن آپ کو کیا بولے۔ یہ ایک نہیں، اپن کے ساتھ اکھا زندگی ایسا
ہی تنگی ہوتا رہا تھا۔ کبھی وقت ملا تو اپنا کہانی سنائے گا۔ آپ کو تو تنگی
کا ہی مزا آئے گا۔ یہ رات اپن نے جیسا کاٹا ہے، ابھی اپن ہی جانتا ہے۔
معاف کرنا، اپن کا آپ سے کوئی میل نہیں بنتا ہے۔ اپن بہت کچی آدمی
ہے۔ کیدر بھی آپ کا آگے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پر اپن ایک
بات میں ایک دم کچی نہیں ہے۔ اپن کا خون آپ سے تھوڑا کم گرم نہیں
ہے۔" پیرو کی آواز میں لکنت آنے لگی۔ "پر ابھی کیا کرے۔ اُودر دیکھا
ہے تو اپنے کو نوچ کے رہ جاتا ہے۔ اُودر اپن کا لوگ آس لگائے کھڑا
ہوگا۔ اتنے دن کا بول کے نہیں آیا تھا اور ادھر ہی میں نکل پڑا تھا۔
اُودر سب بکھر اپڑا ہوگا۔ وقت پر ابھی نہیں پہنچا تو بہت کچھ خراب ہو
جانے کا، خلاص ہو جائے گا۔

نواب جھپکتی پلکوں سے سنتا رہا۔ ابا جان نے کئی مرتبہ دخل دینا
اور اشاروں اشاروں میں پیرو کو ٹوکنا چاہا مگر پیرو غالباً دانستہ اُن کی
اُن کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ نجل بھی چپ بیٹھا رہا۔ سب دم بخود سے تھے
اور نواب کے چہرے پر ابھرتی مٹتی لکیریں اور اُس کے چہرے پر بدلتے ہوئے
رنگ دیکھ رہے تھے۔ پیرو چپ ہوا تو ابا جان نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ نجل
بھی نہیں بولا۔ نواب کے نتھنے بار بار پھڑکنے لگے تھے۔ چند ثانیے یوں ہی
گزر گئے۔ نواب گم صم سا بیٹھا رہا پھر جھرجھری کے سے انداز میں چونک کے
بولا۔ "ہمیں اپنی غرض سے شرمندگی ہو رہی ہے۔ اصل میں ہم نے.....
ہماری نظر محض عواقب کی طرف تھی۔ غالباً اس لیے کہ ہم پر ریاست کے
بعض اہم فرائض بھی عائد ہوتے ہیں لیکن یقیناً ہم پر اپنے محسنوں، دوستوں
کے حقوق بھی لازم ہیں۔"

معلوم نہیں، پیرو کی سن کے ابا جان کے دل کا کیا حال ہوا ہوگا۔ میرا
دل تو بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میری طرح ابا جان کو بھی اپنے کانوں پر
یقین نہیں آیا ہوگا۔ نواب رُکی رُکی آواز میں بولا۔ "ہم عرض کریں، ہماری
معروضات محض گزارشات تھیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ وقت گزر نہ جائے۔"

"وقت ہی کی تو بات ہے۔ ہمارے خیال میں اُن شورہ پشتوں کی
جلد سرکوبی نہ کی گئی تو اُن کے حوصلے اور بلند ہوں گے۔ کل کسی گھر سے کسی
الم ناک سانحے کی خبر آئے گی۔"

"آئے گا، ضرور آئے گا۔ کل کسی گھر سے اور پرسوں کسی اور گھر
سے خبر آسکتا ہے۔ پر اپن لوگ کیا کر سکتا ہے؟" پیرو نے اپنی آواز قابو
میں رکھی تھی۔ اُس نے نشتر بہتے میں نواب سے پوچھا کہ کیا ہماری شہر
میں موجودی اُن لوگوں کے عزائم میں حارج ہونے کی ضمانت ہے۔ "ہم
یہاں رہیں گے تو وہ کسی اور گھر کا رُخ نہیں کریں گے؟" پیرو نے اُس
سے کہا کہ وہ یہاں اپنی کوئی نشانی یا اتا پتہ چھوڑ کے نہیں گئے ہیں۔ ہم لوگ
کو ہتھیں لوٹنے میں مدد دے سکے۔ جہاں تک اُن کی تلاش کا تعلق ہے تو
یہ کام کسی طور ہمارا نہیں، سراسر پولیس کا ہے اور پولیس کی کامیابی کے
لیے اُس کے ارادے کی سچائی نیز ساری تگ و دو میں اخفا شرط ہے۔ پیرو
نے نواب کی توجہ اُن تین ملازموں کی طرف دلائی جن کا ذکر کچھ دیر پہلے ہم
نے کیا تھا کہ وہ گزشتہ رات کے ایک ایک لمحے کے شاہد ہیں۔
اگر صرف شہادت و شناخت کا معاملہ ہے تو وہ بھی یہ کام بحسن و
خوبی انجام دے سکتے ہیں کیونکہ اب وہ زندگی بھر اُن کی صورتیں بھول
نہیں سکیں گے۔ اگر نواب کا مقصد ہماری موجودی سے پولیس اور متعلقہ
حکام کی فعالیت، اُن کا خون گرم رکھنا ہے تو نواب خود کوئی چھوٹا حاکم
نہیں ہے۔ دربار سرکار میں اُس کا اثر و رسوخ مسلم ہے۔ ریاست کی پولیس
اُس کے مرتبے سے خوب آگاہ ہے۔ اُس کے اشارے اچھی طرح پہچانتی
ہے۔ پیرو نے اُس سے کہا کہ رات حویلی میں اُن لوگوں کی اچانک یلغار ہمارے
تئیں نواب کی کسی کوتاہی کا خمیازہ نہیں ہے، جو نواب کی بجری کا سبب
ہے۔ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے اُنھیں عبرت ناک انجام سے دوچار
کرنے کی کوئی آرزو نواب کے دل میں تڑپتی ہے اور یوں اپنے دوستوں
کی خوشنودی، اُن کی نگاہوں میں سرخ روئی مقصود ہے تو وہ خاطر جمع
رکھے۔ نواب کے دوستوں کو اپنی عدم موجودی میں اُس سے اسی حسن سلوک
اور شدت احساس کی توقع ہے۔

نواب انہماک اور خاموشی سے پیرو کی باتیں سنتا، اُس کی صورت
تکتا رہا۔ درمیان میں وہ ضرور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ہونٹ
پھڑک کے رہ گئے۔ پیرو نے رات آنے والے آدمیوں کے سلسلے میں نواب
کی طرف اشارہ کیا تھا مگر خود پیرو کے ذہن میں نواب کے جلد مراتب
پوری طرح محفوظ تھے۔ نواب کی ہر حیثیت، ایک دوست جسے
رات کا حادثہ جس کے لیے حد صدمہ ہوا ہے۔ ایک حاکم جس کے اثر و اقتدار
کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ ہے۔ ایک حاکم دوست جو کبھی
دوست اور کبھی حاکم کے طور پر نتائج اخذ کرنے کے سلسلے میں
متردد ہے۔ کبھی رنج و ملال اُس پر غالب آتا ہے، کبھی اشتعال و غضب۔
ایک ایسا منافق جو بزدل ہے، جس نے رات ہیروں کی طلب میں سینے آدمی
بھیجے تھے۔ ایک حریص جس کے دل میں یہ رُوداد سُن کے ہیروں کی ہوس
جاگی ہے۔ ایک ایسا شخص جو رات آنے والے آدمیوں کا مقصد بخوبی سمجھ
چکا ہے اور ہم پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے ہم رتبہ نواب یار اجا کو اُس
کی جرات و جسارت کا معقول جواب دینے کے لیے جس کا خون کھول رہا
ہے۔ نواب کی کوئی ایک حیثیت پیرو کے ذہن میں واضح ہوتی تو شاید
اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ خانم اور حویلی کا ذکر اُس نے دانستہ کیا تھا جتانے
کے طور پر کہ شہر میں ہماری دوبارہ آمد کسی یقینی ہے۔ نواب کو ہم سے
اپنی نسبت کی مروت کا واسطہ دینے ہی سے گلو خلاصی کی کوئی صورت پیدا ہو
سکتی تھی۔ وہ یقین دہانیوں کا اعادہ از بس لازم تھا کہ ہماری روانگی
کے التوا سے کسی بڑے نقصان کا احتمال ہے اور ہم جلد واپس آرہے
ہیں۔ ابا جان بھی نواب کو یہی باور کرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔
لیکن غالباً یہاں قیام کی آمادگی کے بعد ہی پیرو کی یہ تکرار کچھ اثر پذیر
ہو سکتی تھی۔ ابا جان ٹھہرنے کی آمادگی ظاہر کر چکے تھے مگر انھیں اچھی
طرح معلوم تھا کہ یہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے برابر ہے۔ ایک دن
کی تاخیر کتنے بڑے عرصے پر محیط ہو سکتی ہے۔ پولیس کی چھان بین کا سلسلہ
کہاں تک دراز ہو سکتا ہے۔ پولیس کو اڈوں سے وابستہ لوگوں کو پہنچنے
میں ایک گھڑی کی بھی دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی گنجائش باقی تھی، کوئی
بھی زعم گوشہ تو پیرو کو ذرا بھی چوک نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پیرو جیسے
حالات میں نکرا دلیلیں دے رہا تھا۔ وہ نواب کو کس طرح یقین دلا سکتا
تھا کہ وہ لوگ اب کسی اور گھر کا رُخ نہیں کریں گے۔ وہ صرف ہمارے
پاس آئے تھے۔

نواب کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ ہر چند ٹھنڈی
ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور اطراف میں پھیلی ہوئی دھوپ بھی ابھی
تیز نہیں تھی۔ نواب کی آنکھوں سے مترشح تھا کہ پیرو کی کوئی دلیل
اُسے قائل کر گئی ہے یا اُس نے جان لیا ہے کہ اپنے دوستوں کے
راستے میں مزاحم ہونے سے انھیں مزید اذیت ہوگی یا اُسے یقین آ
گیا تھا کہ ہمارے پاس وہ شے ہی نہیں ہے جس کی آرزو میں رات
لوگ آئے تھے۔ ہمیں روک کے گویا آیندہ کے امکانات بھی ختم کرنا
ہے۔ ہو سکتا ہے شے کچھ اور اندیشوں نے بھی گھیر لیا ہو کہ کہیں یہ
وضع و مروت بیچنے میں پاؤں اُڑانے کے مصداق نہ ہو۔ پیرو نے
اُس سے کہا کہ بہتر ہے، وہ حاکم کے بجائے ایک دوست کی حیثیت سے
ہماری عرض پر غور کرے۔ اگر مدعی خود در گزری اور معافی پر آمادہ ہے
تو منصف کو بھی خاموش ہو جانا چاہیے۔

نواب نے کچھ نہیں کہا تاہم جب تک وہ موجود تھا،
کسی بھی لمحے کوئی حکم صادر کر سکتا تھا، کسی بھی لمحے اُس
کا دماغ کروٹ بدل سکتا تھا۔ اس کے بعد پیرو یا کسی اور کو زبان
کھولنے کی توفیق نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پیرو نے اُس کے بیچنے میں بچا
کھچا دھواں تحلیل کرنے کے خیال سے ایک اور کوشش کی۔ نواب
نے نظام سرکار کی بات کی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ابا جان کو ساتھ
لے کر دربار تک رسائی ہونے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ "اور آپ
نظام سرکار کی بات بولا ہے نواب صاحب!" پیرو نے کسی
قدر رازدارانہ انداز میں اُس سے کہا۔ "اپن پہلی بار اُس کے پاس
شکایت لے کے جائے گا اور ایسا خالی ہاتھ جائے گا؟ کچھ ساتھ ہوگا
تبھی اُودر جانا تھوڑا ٹھیک لگے گا۔ بار بار ابھی وہاں جانے کا موقع تو اپن
لوگ کو نہیں ملے گا نا! بابا کے پاس ابھی اور دو ایک چیز ایسا کھرا ہے
کہ نظام سرکار نے بھی کبھی..." پیرو نے اپنی ہکلاتی ہوئی زبان تھام لی اور
جھجکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی شاید اُس کو بھی کچھ پسند آئے۔" پیرو کے
لہجے میں بہت سادگی تھی بلکہ کسی حد تک حماقت بھی۔ کہیں بھی نواب کو یہ تاثر
نہیں ملا ہوگا کہ پیرو نے دانستہ یہ ذکر کیا ہے اور مقصود کچھ اور ہے۔

نواب حشمت جنگ نے بظاہر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ
ساکت بیٹھا جیسے اپنے آپ کو گھورتا رہا۔ کسی اور نے بھی لب کشائی نہیں
کی۔ لمحوں تک سبزہ زار پہ سناٹا چھایا رہا پھر نواب ہی کے جسم میں
جنبش ہوئی کیونکہ یہ خاموشی نہایت ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے
رومال سے اپنا چہرہ خشک کیا، آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور سامنے
رکھی ہوئی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پیالی میں بچی ہوئی چائے رکھے رکھے
برف ہو گئی ہوگی۔ "میں دوسری بناتا ہوں۔" ابا جان ملتجی لہجے میں بولے۔
"ہمیں ٹھنڈی چائے زیادہ مرغوب ہے۔" اُس نے کھوئی ہوئی
آواز میں کہا۔

"اب تو واقعی کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

نواب نے شیروانی کے بٹن سے پیوستہ نقرئی زنجیر کھینچ کے

بھی گھڑی نکالی۔ "ڈیڑھ بجنے کو ہے۔" وہ تعجب سے بولا۔ "اور آپ! آپ کس وقت جانا چاہتے ہیں؟"

سب کو جیسے کسی نے چٹکی بھری اور سب نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "رات نو بجے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔" ابا جان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"پھر تو وقت کم رہ گیا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ دوپہر کا کھانا آپ غریب خانے پر تناول فرماتے لیکن اب اس میں اور وقت صرف ہو جائے گا۔ ہمیں بازار بھی جانا ہے۔"

"میری درخواست ہے کہ یہ تکلف اگر مناسب ہو..." ابا جان کی آواز اُن کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"تکلف کیسا! ہم تو کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔" ابا جان نے وفورِ مسرت سے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ حویلی ہے۔ بناتے بناتے ایک عمر لگ جاتی ہے۔ اور اور آپ کا اتنا وقت دینا۔ اتنی پرسش کرنا کچھ کم ہے کیا۔ یہی ہمارے لیے سب سے بڑی سوغات ہے۔ اس سے بڑی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ میری عرض ہے۔ اب ہمیں جلد واپس آنا ہی ہے۔ پھر بہ اِز موقع آئیں گے۔"

"تاہم یہ موقع کیوں جانے دیا جائے۔" بہت دیر بعد نواب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔ "دیکھیے قبلہ گاہی! کل بات طے ہو چکی ہے۔ بس اب ہمارے ساتھ چلیے۔ یہی ہماری خوشی ہے۔"

"بہتر ہے۔" ابا جان نے سر جھکا کر کہا۔ "گزارش صرف یہ تھی کہ جب سب کو یہاں آنا ہی ہے تو آگے..... مگر۔" ابا جان کو خیال آگیا کہ انھیں اتنی ردوقدح نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جلدی سے بولے۔ "ہم تیار ہوں لیکن اب کھانے کے بعد ہی چلا جائے تو مناسب ہو گا۔"

"ہمیں قطعاً بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔"

"یہاں بھی کچھ یہی کیفیت ہے لیکن وقت تو کھانے ہی کا ہے۔"

"جی ہاں۔" نواب ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"وقت تو بھوک پر منتا ہے بابا!" بجنل نے حقے کی منال ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں۔" نواب خوش گواری سے بولا۔

"وقت تو خود بھوک طے کرتی ہے۔"

ابا جان بجنل کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھ گئے لیکن ابھی آدھے بھی نہ اُٹھ پائے ہوں گے کہ انھیں کرسی کا دستہ پکڑنا پڑا۔ ایک ثانیے کے لیے اُن کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ نواب کی نگاہیں اُنھی کی طرف مرکوز تھیں۔ کرسی سے اُٹھنے کے دوران اُس نے ان کی کراہ بھی سن لی ہو گی مگر ابا جان فوراً سنبھل گئے۔ پھر اُنھوں نے منیر علی سے پیر زمین پر جمائے ہوں گے۔ نواب نے انھیں آرام کا مشورہ دیا اور معذرت چاہی کہ اُن کی تکلیف کا احساس ہی نہیں رہا۔ ایسی حالت میں کہیں جانے سے تکان اور سوا ہو گی۔ رات بھی وہ مسلسل جاگتے رہے تھے۔ ابا جان اُس ایک شکستہ لے کی زد سے نکل آئے۔ اُنھوں نے ہاتھ پھیلا کے شگفتگی سے کہا کہ وہ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ باہر نکلنے سے یہ تھوڑی بہت کسل مندی بھی دور ہو جائے گی۔ نواب نے خوش دلانہ لہجے میں ایک مرتبہ پھر انھیں آرام کرنے کی ہدایت کی اور بولا کہ اُن کا ہمراہ جانا ایسا ضروری نہیں ہے۔ صرف اس خیال سے وہ انھیں لے جا رہا تھا کہ انتخاب میں ابا جان کی پسند شامل رہے۔ ابا جان نے مارتی کو شیروانی لانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ آرام ہی کرتے تو زیادہ ٹھیک تھا لیکن رات گاڑی میں بیٹھنے تک انھیں نواب کو زیادہ سے زیادہ وقت تک مصروف بھی رکھنا چاہیے تھا، مبادا نواب کا سر پھر کسی اور طرف بھٹکنے لگے۔ مارتی اندر سے مکلف شیروانی لے آیا۔ ابا جان نے صبح ہی نئے کپڑے پہنے تھے اس لیے انھیں اندر جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی۔ موٹر میں دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش اور تھی۔ نواب نے رسماً سہی بجنل اور پیرو سے بھی کہا۔ پھر میری طرف مڑ کے بولا۔ "آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیے گا؟"

جواب میں میری نگاہیں غیر ارادی طور پر منیر علی کی جانب اُٹھ گئیں۔ منیر علی نے بھی دوبش بھی نہیں کیا۔ تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ آگے والی نشست پر بیٹھ سکتا تھا لیکن سب کو چھوڑ کے اُن کے ساتھ جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ڈرائیور نے موٹر پہلے ہی موڑ لی تھی۔ ابا جان اور منیر علی کے بعد نواب بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ پیرو کی آواز پر رُک گیا۔ پیرو نے اچانک اُسے آواز دی تھی۔ نواب دو قدم پیچھے ہٹ کے اُس کے پاس آگیا۔ ادھر پیرو بھی تیزی سے آگے بڑھا۔ اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں مختصراً نواب سے کچھ کہا۔ نواب مسکرانے لگا۔ میں اُن سے دُور تھا۔ کچھ موٹر کے انجن کے شور میں پیرو کی آواز دب گئی تھی۔ پیرو کے اندازِ تخاطب سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے نواب سے کوئی درخواست کی ہے جسے کشادہ دلی سے نواب نے قبول کیا ہے۔ اُس نے پیرو کے شانے پر تھپکی دی اور موٹر میں بیٹھ گیا۔ ممکن ہے پیرو نے اپنے لب و لہجہ کی معذرت کی ہو۔ بہرحال کوئی ایسی بات ضرور کہی تھی جس نے نواب پر اچھا اثر مرتب کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے موٹر ہماری آنکھوں سے دُور ہو گئی مگر سب دیر تک کھڑے صدر دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔

ادھر دروازے کے پار سڑک سے موٹر کی پوں پوں کی آواز آئی

تبھی جیسے سب بیدار ہوئے۔ پیرو جسم ڈھیلا چھوڑ کے اتنی زور سے کرسی پر بیٹھا کہ کرسی ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ بائیں طرف سے زور آ کے مجھ سے لپٹ گیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ پیچھے سے مائی نے آ کے میری کمر جکڑ لی اور شامو نے آگے مجھے بھینچ لیا۔ اُن سب کی سانسیں اکھڑی ہوئی سی تھیں جیسے وہ دُور سے چل کے آ رہے ہوں اور جیسے بہت دنوں بعد ایک دوسرے سے مل رہے ہوں۔ زورا، شامو جبرو میری طرف سے ہٹ کے پیرو کی کرسی کی طرف بڑھے اور اُس کے ہاتھ پیر چومنے ، دابنے لگے۔ پیرو نے انھیں جھڑکا لیکن اُن میں سے کوئی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ پیرو انھیں گالیاں بکنے لگا۔ میں سیدھا کانتے کے پاس چلا آیا۔ جانے کتنی بار مجھے اُس کا دھیان آیا تھا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کے رہ جاتا تھا۔ نواب کی موجودگی میں وہ اپنے آپ پر جبر کیے ہوئے تھا۔ اُس کے جاتے ہی اب وہ کرسی سے ڈھلکے، آنکھیں موندے بے حال نظر آ رہا تھا، بکھرا ہوا سا۔ میں نے اُس کا بازو چھوا تو وہ اچھل گیا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اُسے وہاں سے اٹھا کے اندر لے آیا۔ اُسے اب چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ بری مشکلوں سے وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند لمحوں میں بے سُدھ ہو گیا۔

❁

سب اندر چلے آئے تھے۔ جبرو اور شامو نے ملازمین سے کہہ کے کھانا لگوا دیا تھا۔ کسی نے منع نہیں کیا۔ کانتے وہاں نہیں تھا۔ باقی سب نے پیٹ بھر کے کھایا۔ ملازمین نے نواب حشمت جنگ کے خیال سے اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک دسترخوان سجا ہوا تھا۔

میں کانتے کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد عمارت میں یونہی گھومتا رہا۔ کبھی اس کمرے میں، کبھی اُس کمرے میں۔ اندر حویلی میں کسی جگہ میرا جی نہیں لگا۔ میں نے اُن سب کی طرح سیر ہو کے کھا لیا تھا لیکن بہت جلدی جلدی میں۔ سب سے پہلے میں نمٹ گیا تھا پھر بھی اُن کے ساتھ آخر تک دسترخوان پر بیٹھا رہا۔ کھانے کے دوران بھی میرا جی اُڑا اُڑا سا تھا۔ کچھ ایسا گمان ہوتا تھا کہ کہیں کچھ ہو رہا ہے اور ہم سب یہاں بے خبر بیٹھے ہیں، ہم سے کوئی چوک ہو رہی ہے۔ میری نگاہیں بار بار اُن سب کی طرف اٹھتی تھیں اور اُن کے چہروں پر چھایا ہوا قرار بھی مجھے جھوٹا معلوم ہوتا تھا۔

ابا جان کو گئے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو رہا تھا۔ تجمل کے کہنے پر آرام کرنے کے لیے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ کانتے کو ایک نظر دیکھ کے میں نشست گاہ میں واپس آ گیا۔ یہاں پیرو اور تجمل کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تجمل وہیں دیوان پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ پیرو بھی اُس کے قریب صوفے پر نیم دراز تھا۔ اُن کی باتیں سننے اور کچھ اخذ کرنے کی غرض سے میں بھی چپ چاپ ایک صوفے پر لیٹ گیا مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے رات کا سفر تھا اور خاصا طویل سفر۔ اچھا ہی تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لیں اور تازہ دم ہو کے یہاں سے نکلیں۔ میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔ لیٹتے ہی میرا سارا جسم اکڑنے لگا لیکن نیند ایک پل کے لیے بھی نہیں آئی۔ سامنے دیواری گھڑی ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ گاڑی رات کو ۹ بجے کے قریب روانہ ہوتی تھی۔ کم از کم آدھ گھنٹے پہلے ہمیں اسٹیشن پہنچنا اور ایک گھنٹے پہلے حویلی سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ گویا ابھی پورے چار گھنٹے اور یہیں رہنا ہے۔ ابا جان بھی واپس آتے ہوں گے۔ بازار میں انھیں اور کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ سارا بازار تو اٹھا کے لائیں گے نہیں اور نواب حشمت جنگ بھی آخر کتنی دیر اُن کے ساتھ رہے گا۔ میری نظریں گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ وقت بوڑھا ہو گیا ہے یا جیسے گھڑی تھک گئی ہے۔ میں کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے آپ کو بھینچے، باندھے لیٹا رہا لیکن آرام کے بجائے میری رگیں اور کھنچنے لگیں۔ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میری نظر سامنے کے صوفے پر دراز پیرو کی طرف گئی۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا میری آہٹ سے کھل گئی تھیں۔ میں دبے قدموں کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا، سامنا پیرو کی آواز آئی: "کیدھر کو جا رہا؟"

وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"کانتے کو دیکھنے۔ اُس کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہے دادا!"

وہ بھی اٹھ گیا: "ابھی لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو جائے گا سالا!"

"میرا خیال ہے اُسے کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے۔"

"سُور کا کھال کا بنا ہے راجا!" پیرو نے مسکراتے ہوئے کہا: "ابھی ضرورت پڑا تو اودر جا کے اکھاڑا دکھائے گا۔"

"بمبئی ہی چل رہے ہیں ہم لوگ؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں راجا! اور کیدر؟" وہ سانس بھر کے بولا: "ابھی بہت دن ہو گیا۔"

"تمھیں گیتا وغیرہ کی تو بہت یاد آتی ہو گی؟"

"ہاں!" اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں: "اپن اتنی دیر کبھی گیتا سے دور نہیں رہا۔ اودر کبھی لمبا چھٹی کو گیا بھی تو پندرہ بیس دن بعد اُس کو جا کے دیکھ آتا تھا۔ لوٹ کے اپن سیدھا ٹیم پہ واپس پہنچ جاتا تھا تو سنتری لوگ بھی اپن کا دھیان رکھتا تھا۔"

"مگر اب کے تو یہ بھی ممکن نہیں ہوا، اب کے تو بہت دن ہو گئے۔"

"پر اپن بول کے آیا تھا، ابھی آئے گا کر نہیں بھی آئے گا۔ اپن سب خلاص کر کے چلا تھا۔ کیا اپن کے لیے یہ تھوڑا ہے کہ ابھی پھر لوٹ کے اودر جا رہا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ میری خاطر ایسا کہہ رہا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے کے لیے وہ گن گن کے دن کاٹ رہا ہوگا۔ اُن دونوں سے اُس کی وابستگی کا حال مجھے اچھی طرح معلوم تھا: "تم نے فیض آباد کلکتے وغیرہ سے خط تو لکھ دیا ہوگا؟"

"نہیں، اپن سوچا، ابھی بس ایک دم سامنے جائے گا۔" پیرو کی آواز چہکنے لگی: "اور راجا! اپن ابھی تیرے بارے میں سوچتا ہے۔ اودر بمبئی میں اتنے دن بعد بھائی بہن لوگ سے ملے گا تو کیا ہوئے گا؟"

"وہ اب کیا پہچانیں گے دادا!" میں نے آہستگی سے کہا: "مجھے تو اُن کے سامنے جانے کے خیال ہی سے خوف آتا ہے۔"

"ٹیم بھی تو بیچ میں بہت بڑا ہے۔"

"ہاں دادا! اور وقت کا تو یہ ہے کہ کس پر کیسا گزرتا ہے۔ اسی حساب سے اس کی پیمائش ہونی چاہیے۔ کبھی ایک پل بھی برسوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہر ایک کے لیے تو اس کا حساب الگ ہے۔ یوں تو دس سال ہوئے ہیں لیکن کیا یہ ٹھیک ہے؟"

پیرو پلکیں پٹ پٹانے لگا اور چلتی آواز میں بولا: "اپن بھی اودر تیرے ساتھ چلے گا راجا!"

"تماشا دیکھنے دادا؟"

"کیسا ہوتا ہے؟" وہ ٹھنک کے بولا۔

"تماشا ہی ہوگا دادا! میں کس منہ سے اُن کے سامنے جاؤں گا۔ انھیں تو اپنے بھائی کی حیثیت سے مجھے پہچاننے سے انکار کر دینا چاہیے۔"

"کیوں راجا؟"

"سب کچھ میری ہی وجہ سے تو ہوا ہے۔ میری وجہ سے وہ بے گھر ہوئے، دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ مجھے کسی کا کوئی خیال نہیں آیا۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ میں نے اُن سے اُن کی ماں چھین لی۔" میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

"ابھی بار بار کیوں دُہراتا ہے اس کو؟"

"دُہراؤں بھی نہیں دادا؟ اپنی خطائیں خود سے چھپاؤں، اپنے آپ کو دھوکا دوں؟ یہ تو اب ہمیشہ کا عذاب ہے۔ سوچتا ہوں تو سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں کوئی غلط کہتا ہوں۔ امی کی عمر بھلا ابھی جانے کی تھی؟ میں انھیں اچھی بھلی چھوڑ کے نکلا تھا۔ میری وجہ سے وہ زندہ نہ رہ سکیں۔ وہ ایک میری ہی ماں تو نہیں تھیں، اُن سب کی بھی تھیں۔ میں نے اُن سے اُن کی ماں چھین لی۔ باپ بھی اُن کا اپنا نہیں رہا۔ ابا جان کا وہ داغ میں نے جھٹکایا تھا۔ نہ انھیں نیت کے وہ نوٹوں کا عقدہ ملتے، نہ وہ اپنا گھر برباد کرتے اور نہ امی! امی بھی تو میری وجہ سے بے پردہ ہوئی تھیں اور جہاں گیر......" میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

"ہو جاتا ہے جانی! ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ آدمی سالا ابھی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ سارا کچھ آدمی کا بس میں تو نہیں ہوتا۔ آنکھ ہونے کا مطلب سدا دیکھتے رہنے کا اور کان کا مطلب سدا سننے کا نہیں ہے۔ ٹھیک دیکھنے، ٹھیک سننے کا۔ ابھی ایسا کوئی ادھر کو ہے تو اپن کو بولو۔"

"دادا! میرا جی چاہتا ہے مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ خنجروں سے میرا جسم چھلنی کر دیں۔ میں کسی طرح اُن کا بھائی کہلانے کا مستحق نہیں ہوں۔"

"کیا!" اُس نے بڑھ کے مجھے دبوچ لیا: "راجا! تُو نے سب جان کے کیا ہے کیا؟ اودر خون کا بات ہے۔ وہ ایسا کرے گا؟ ابھی دیکھنا وہ تو تجھ کو دیکھتے ہی پاگل ہوا پڑے گا۔" میں نے اپنے آنسو اپنی آنکھوں تک گھونٹنے کی بہت کوشش کی۔

پیرو مجھے اپنے بازو میں بھینچے ہوئے باہر لے آیا۔ باہر راہداری

میں ملازم موجود تھے۔ پیرو نے مجھے کسی مار کے اُن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے انھیں دیکھ لیا تھا اور اُن سے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا مگر میرا سینہ جیسے کوئی گھونٹ رہا تھا۔ آگے ملازموں کی طرف جانے کے بجائے پیرو مجھے دالان میں لے آیا اور وہاں سے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کے باغ کی جانب نکل آیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح میرا دھیان بٹائے۔ باغ میں کون سا پھول، کون سی چڑیا دکھائے۔ وہ مجھے اس طرح تسلیاں دے رہا تھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں، جیسے میں خود کچھ نہیں سمجھتا۔ شاید میں سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ وہ آرام سے نشست گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بھی تنگ کیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ سب دہرانے سے کیا حاصل جس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ میں خود بھی دہرانا نہیں چاہتا تھا مگر کیا کروں، میری آنکھیں خود بخود امڈنے لگتی تھیں۔ پیرو باغ کی منڈیر پر بٹھا کے تھپکیاں دیتا رہا پھر میں نے ہی اُسے کانتے کے پاس چلنے کا مشورہ دیا۔ پیرو کو بھی تو میری دل داری کی ضرورت تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب دہرا کے مجھے اعتراف کا کوئی سکون ملتا تھا یا میں اس خود آزاری سے اپنی سزا کا قرض ادا کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اذیت بھی تو آدمی کو آرام پہنچاتی ہے۔ مگر قرض کم کب ہوتا ہے وہ تو اپنی جگہ رہتا ہے۔ بعض قرضے کبھی ادا نہیں کیے جا سکتے۔

کانتے پر غفلت طاری تھی۔ پیرو نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے کئی آوازیں دیں۔ کانتے نے نہیں سُنا۔ اُس کا سارا منہ سوجا ہوا تھا۔ پیرو نے اُس کی کلائی ٹٹول کے دیکھی۔ ہتھیلیاں گرم تھیں لیکن بخار نہیں تھا۔ ایک ملازم کو ہدایتیں دے کے پیرو باہر آ گیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ پیرو بھی اُس کی حالت سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی حکیم ڈاکٹر کو بلا کے اُسے دکھایا جائے ورنہ سفر اُس کے لیے اور بھاری ہو سکتا تھا۔ پیرو اور تجمل اپنے طور پر ان ضربوں کا علاج کسی نہ کسی حد تک کر لیتے تھے لیکن وہ باقاعدہ حکیم ڈاکٹر تو نہیں تھے۔ میں نے پیرو سے کہا کہ ملازم کے ساتھ جا کے میں کسی طبیب کو بلا لاتا ہوں۔ طبیب کے یہاں آ جانے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے مگر مجھے اجازت دینے کے بجائے پیرو نے نشست گاہ میں آ کے تجمل کو جگا دیا۔ تجمل ایسا سویا ہوا بھی نہیں تھا۔ وہ پیرو کی ایک دھیمی آواز پر اُٹھ بیٹھا اور ہم دونوں کے ساتھ کانتے کے کمرے میں آ گیا۔ اُس کا کانتے کے پاس بیٹھنا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے آواز دینا تھا کہ کانتے نے آنکھیں کھول دیں۔ "چربی ختم ہو رہی ہے رے۔" تجمل نے اُسے کمال تعجب چھپاتے ہوئے کہا۔

کانتے کی بجھی ہوئی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ تجمل کے ہاتھ پر اپنا چہرہ ٹکاتے ہوئے وہ ہانپتی آواز میں بولا: "ابھی بہت ہے استاد!"

"کھینچ کے ہی رکھو۔"

کانتے کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ سر ہلا کے رہ گیا۔

"تھوڑی چائے پی لے۔"

"کچھ جی نہیں چاہ رہا سالا۔"

"پی لے رے۔ ابھی رات میں دیر پڑی ہے۔"

کانتے نے اُٹھنا چاہا تو تجمل نے اُس کے سینے پر دباؤ ڈال کے اُسے روک دیا اور کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کے اُسے اُٹھا دیا۔ کانتے اپنی کراہیں نہ روک سکا۔ مسہری کے تکیے سے کمر لگا کے وہ کچھ بہتر نظر آیا۔ پیرو کے اشارے پر ملازم سادہ چائے لے آیا تھا۔ تجمل نے اپنے ہاتھ سے پیالی اُس کے ہونٹوں سے لگائی۔ کانتے منہ بنا کے وہ ایک گھونٹوں میں پی گیا۔ اُس کی خواہش پر ملازم نے اُسے پان کا بیڑا کھلایا۔ تجمل نے بیڑی سلگا کے اُس کے منہ سے لگا دی۔ کانتے نے دو ایک ہی کش لگائے ہوں گے کہ تجمل نے بیڑی اُس کے ہونٹوں سے کھینچ لی۔ تجمل اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا۔ کانتے اپنے آپ تکیے سے کھسکتا ہوا مسہری پر لیٹ گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے پلٹ کے دیکھا، اُس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

نشست گاہ میں واپس آ کے میں نے گھڑی دیکھی، چار بج کے پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ابا جان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، میرے دماغ میں طرح طرح کے وہم سر اُٹھا رہے تھے۔ نواب حشمت جنگ انھیں کہیں اور تو نہیں لے گیا؟ مگر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ راستے میں اُس کے دل میں کچھ اور نہ سما گیا ہو؟ ابا جان کے ساتھ میر علی کے سوا کوئی نہیں تھا اور میر علی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اب وہ کھل کے اُن سے باتیں کر سکتا ہے جو یہاں اتنے لوگوں کی موجودی میں ممکن نہ تھا۔ کہیں وہ انھیں تھانے نہ لے گیا ہو۔ رپورٹ درج کرانے پر اُسی نے زور دیا تھا۔ میں کچھ تھا اور خود اپنے وہم ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، دوپہر کا کھانا کھلائے بغیر اُسے ابا جان کو گھمانے لیے پھرنا اچھا نہیں لگا ہوگا۔ وہ انھیں اپنے گھر لے گیا ہوگا یا کسی کلب وغیرہ میں۔ بمبئی کی طرح یہاں بھی صاحب حیثیت لوگوں کے لیے کلب اور اعلا درجے کے طعام خانے ضرور ہوں گے۔ یقیناً یہی بات ہوگی۔ ابا جان آیا ہی چاہتے ہوں گے۔ کسی بھی لمحے موٹر کی آواز آ سکتی ہے۔

تجمل نے وہیں چائے منگالی تھی۔ ملازموں نے تازہ حقہ لا کے اُس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ تمباکو کی بھینی بھینی کڑوی کڑوی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں اندر نشست گاہ میں ہونے کے باوجود وہاں نہیں تھا۔ میری نگاہیں صدر دروازے کے اردگرد بھٹک رہی تھیں اور میرے کان ابا جان کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ معاً مجھے بڑے نواب کی حویلی کا خیال آیا اور میری نگاہ سیدھی گھڑی پر گئی۔ ابھی سوا چار بجے ہیں۔ ہم یہاں سے ساڑھے سات بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوں گے۔ درمیان میں ابھی پورے تین گھنٹے ہیں۔ اس عرصے میں بڑے نواب کی حویلی جا کے واپس آیا جا سکتا ہے۔ اگر میں جا کے آدھا گھنٹہ بھی وہاں گزاروں تو اطمینان سے واپس آ سکتا ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ برجیس کا سراپا میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا جیسے کل سہ پہر کی طرح اب بھی وہ میرے سامنے حرم کی آڑ میں کھڑی ہو۔ اُس کی وہ ڈوبی ڈوبی آنکھیں، اُن میں سمندر سا موج زن تھا اور اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا۔ اُس کے سارے وجود پر سوگ طاری تھا۔ آئینے پر جیسے نمی جم جائے یا پھول تیز دھوپ میں کھلا ہو۔ کوئی بھی تشبیہ موزوں نہیں لگتی۔

مجھ سے صوفے پر نہ بیٹھا گیا اور میں یک لخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ابھی وہاں میرے سامنے موجود تھی اور مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔ مجھے دوبارہ دیکھ کے وہ خوش ہو جائے گی۔ وہ بھی کیا کہتی ہوگی کہ لوگ اس طرح چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسی ہی اجنبیت تھی جو میں اجنبیوں کی طرح چلا گیا۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ایک تو ماحول درمیان آ رہا تھا، دوسرے میں اُس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میرے حواس یکجا نہیں تھے۔ اُسے اُس حال کے عالم میں دیکھ کے مجھ پر بجلی سی گر رہی تھی اور لفظ میرے سر پر منتشر ہو گئے تھے تو کیا کرتا۔ مجھے ویسے بھی نہیں آتا مگر خانم تو اب بھی موجود ہوگی۔ زنان خانے میں اب میں خانم کے نام ہی سے جا سکوں گا۔ بالائی منزل کے مہمان خانے میں پہلے کی طرح کوئی کنیز اب میری منتظر نہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے بھی میرے آنے کی اطلاع ملے گی، حویلی میں وہ جہاں بھی ہوگی، مجھ تک آنے کی کوشش کرے گی۔ یہ وقت بھی نامناسب نہیں ہے۔ اگر وہ منزا کی تو میں خانم سے کہہ کے اُسے بلاؤں گا۔ چاہے خانم کچھ بھی کہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو میں اُسے نہیں بلا سکتا۔ اب کے میں خانم کی موجودی کی ذرا بھی پروا نہیں کروں گا۔ یہ موقع دوبارہ نصیب نہ ہوگا۔ میں اُس سے کہوں گا کہ اُس کی اور چھوٹی بیگم کی آدا کی ایک ایک بات میرے سینے میں محفوظ ہے اور یہ محض اُس کی خواہش نہیں، خود میرا بھی جی چاہتا ہے کہ دوبارہ یہاں آؤں۔ جب حویلی میں میرے لیے کوئی زنداں نہ ہو، نہ وقت کی یہ کبیدگی، نہ یہ ماتمی فضا ہو، جب وقت کی ہوا حویلی کے مکینوں کے زخم بھر چکی ہو۔ وقت تو بہت سے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ مجھے کچھ ویسا گمان ہے کہ میری آمد شاید کسی درماں کا سبب بن جائے۔ نواب عالم اب تو واپس نہیں آ سکتا، نہ کوئی اور اُس کی جگہ لے سکتا ہے۔ مگر آدمی کی اپنی پرچھائیں، اپنا سایہ ہوتا ہے، اپنی صورت مگر آدمی کا مداوا بھی تو آدمی ہی ہے۔ مجھے یاد ہے بھیجی آرا نے اُس دن کیا اشارہ کیا تھا کہ اس "نا مہربان" بے اماں وقت میں کسی کو دریافت کرنے کی سرخوشی ہے۔ اُس کا مطلب کوئی اور نہیں تھا۔ بڑا نواب بھی شدومد سے یہی یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم خود کو اسی حویلی کا فرد سمجھیں۔ کون اس طرح عزیز رکھتا ہے، کون ایسا احترام دیتا ہے کہ اجنبیوں کے لیے اپنے زنان خانے کے دروازوں سے پہرے اٹھائے۔ اس سے بڑھ کر قربت کیا ہو سکتی ہے۔

مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے۔ وہ نہ ملی تو بعد میں اُسے میری آمد کی اطلاع تو مل ہی جائے گی، یہ بھی بہت ہوگا۔ کل یہاں چلے آنے سے اُس کے دل پر کوئی غبار ہے تو اُسی طرح وہ چھٹ سکے گا۔ غبار ضرور ہوگا کیونکہ وہ تو یوں بھی نسیم کے مذہب، شیشے کے مانند۔ ذرا نظر بھر کے دیکھو تو شیشہ ٹوٹ جانے کا ڈر ہے۔ اُس کی آنکھیں میں نے اچھی طرح دیکھی تھیں۔ وہ انھیں یہاں سے واپسی پر تمام راستے میرا تعاقب کرتی رہی تھیں۔ یہ کانٹا میری رگ جاں میں چبھتا رہے گا کہ میں اُس سے منہ چھپا کے چلا آیا، منہ چھپا کے لٹے کتے ہیں۔ مجھے اُٹھتا دیکھ کے پیرو بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ "راجا!" اُس نے ہچکتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"دادا!" مجھے تجمل کی موجودی کا خیال آیا۔ "دادا ذرا باہر چلو۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

تجمل نے شاید سنا نہیں، پیرو آگے لے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آ گیا۔ "دادا! ابھی خاصا وقت ہے۔ کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لیے بڑے نواب کی حویلی چلیں اور خانم۔ خانم آپا کو دیکھ لیں۔" اُس سے میں خانم ہی کا نام لے سکتا تھا۔

"ہاں راجا! چلے گا، ضرور چلے گا۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی تیار ہو جائے گا۔ "تو پھر دیر کاہے کی ہے۔ اس وقت ہمیں آسانی سے سواری بھی مل جائے گی۔"

"ابھی کچھ دیر ٹھیر جا۔" پیرو اطراف میں دیکھتے ہوئے الجھی آواز میں بولا۔

"کیا تمھیں ابا جان کا انتظار ہے؟"

"وہ آ جائے گا راجا!"

"پھر چلو دادا! جتنی جلدی ہم چلیں گے، اتنی جلدی واپس آجائیں گے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"یہ تجھ کو ابھی ایک دم آپی کا دھیان کیسا آگیا؟"

"بس، کل اُن سے کوئی بات ہی کہاں ہونے پائی تھی۔ اِدھر بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا، ابھی یہاں ہیں اور وقت بھی ہے تو کیوں نہ آپی کو دیکھ آؤں۔" میری وضاحت پر وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میرے لہجے میں ویسے بھی بڑی بے ترتیبی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے تندی سے اُسے ٹوکا۔ "تم نہیں جانا چاہتے تو میں کسی اور کو ساتھ لے جاتا ہوں، اکیلا بھی جا سکتا ہوں، راستہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"چلے گا راجا! اپن ساتھ ہی چلے گا۔ ابھی تیرے کو ایک دم..... تھوڑا سانس لے کے بول۔ اپن کو اودر دیری بھی لگ سکتا ہے، اودر بڑا نواب بھی ہے۔ بس خانم کے پاس جا کے لوٹ آئے گا کیا؟"

بڑے نواب کے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا جو حویلی جانے کے بعد کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھنا بھی تو ضروری ہے۔ "اُس سے کہہ دیں گے کہ بس ہم تو سلام کرنے آئے تھے، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چلو دادا!" میں نے منت سے کہا۔ "سواری ملنے میں وقت بھی لگ سکتا ہے۔"

"تھوڑا ٹھیر جا جانی!" وہ کسی قدر ترشی سے بولا۔ "ابھی ٹیم کتنا ہوا ہے؟"

"اندر گھڑی میں سوا چار بج رہے تھے، پانچ چھ منٹ اور اوپر ہوگئے ہوں گے۔"

"ابھی ٹیم ہے، اپن جا سکتا ہے۔"

"تو پھر چلو دادا!" میں نے بے کلی سے کہا۔ "کیا تم تجمل بھائی سے پوچھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں! پر ابھی بول کے چلے تو اچھا ہے۔"

"اگر انھوں نے منع کر دیا؟"

"منع بول دیا تو اپن نہیں جانے کا۔"

"انھیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی ایسی اہم بات تو نہیں ہے۔ ہم وقت پر واپس آجائیں گے۔ آکے بھی بتا سکتے ہیں۔ کسی غلط جگہ تو جا نہیں رہے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ کوئی بھی اڑنگا ڈال دیں گے۔"

"تجھ کو ابھی کیا ہو گیا ہے راجا؟"

"مجھے کیا ہوتا!" میں نے تلخی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، پھر جانے دو، تم اندر جا کے آرام سے بیٹھو۔"

"اپن کو تیرا اکھڑپن ابھی کچھ گھومتا پڑا لگتا ہے۔"

میں نے اُس سے جرح نہیں کی۔ وقت اور نکل گیا تھا۔ میں اُسے وہاں چھوڑ کے اندر کی طرف جانا چاہتا تھا کہ صدر دروازے سے موٹر کی آواز سنائی دی۔ ابا جان واپس آ رہے تھے۔ اگر پیرو کو اُن کی طرف سے کوئی فکر تھی اور وہ میری خاطر چھپا رہا تھا تو اب وہ آہی گئے تھے۔ اُن کی آمد کے بعد فوراً نکلنا ممکن نہیں تھا۔ نواب بھی اُن کے ساتھ ہو گا تو تھوڑی دیر تو اخلاقاً اُس کے سامنے بھی ٹھیرنا پڑے گا اور ابھی یہ اندازہ بھی ہو سکے گا کہ اِس دوران نواب رپورٹ درج کرانے کے لیے ابا جان کو تھانے وغیرہ تو نہیں لے گیا۔ چند لمحوں میں موٹر ہمارے سامنے آگئی لیکن یہ وہ موٹر نہیں تھی جس میں نواب ابا جان کو یہاں سے لے گیا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سبز تھا اور طرز بھی دوسری تھی۔ یہ نواب کی موٹر جیسی نئی بھی نہیں تھی۔ کیا کل شام کی طرح ہیروں کی جستجو میں کوئی اور شخص ابا جان کے پاس آ رہا ہے؟ مگر یہ مہاراجا کی موٹر بھی نہیں تھی۔ قریب آنے پر اُس میں مٹیالی وردی پہنے، سفید پگڑی باندھے ایک شخص بیٹھا نظر آیا۔ وہ ڈرائیور ہی ہو سکتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی پیرو نے ہاتھ ہلائے۔ تیزی سے آگے بڑھا۔ موٹر پورچ میں آکے ٹھیر گئی اور کسی تاخیر کے بغیر ڈرائیور نیچے اتر آیا۔

"ابھی نواب صاحب نے اس کو ایدر بھیجا ہے؟" پیرو نے بلند آواز میں اُس سے پوچھا۔

ڈرائیور نے متانت سے سر جھکایا اور دھیمے لہجے میں تاخیر کی معذرت کی اور عذر کرنے لگا کہ موٹر میں ذرا سا کام تھا۔ اُس نے مناسب سمجھا کہ درست کرا کے ہی چلے تاکہ بعد میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

پیرو تجمل کو مطلع کرنے کے لیے اندر بھی نہیں گیا۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ صدر دروازہ عبور کرکے موٹر حویلی کی چار دیواری کے آگے پھیلی ہوئی سڑک پر آگئی۔ کچھ ہی فاصلے پر چوراہا تھا اور وہیں سے بائیں طرف مڑ کے نواب کی حویلی کے لیے راستہ جاتا تھا۔ مجھے پیرو پر حیرت ہو رہی تھی۔ گویا اُسے مجھ سے پہلے بڑے نواب کی حویلی جانے کا خیال آیا تھا۔ دوپہر نواب حشمت جنگ کے چلتے وقت اُس نے موٹر ہی کے متعلق نواب سے بات کی ہو گی۔ کاش موٹر کچھ پہلے آجاتی۔ بہرحال اب بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ اب ہم وہاں آدھ گھنٹے سے زیادہ ٹھیر سکتے ہیں۔ موٹر کی رفتار بھی تیز معلوم ہوتی تھی۔ صدر دروازے سے باہر سڑک پر چہل پہل تھی۔ چہل پہل سے مراد ہے، ایسا سناٹا نہیں تھا جو بڑے بڑے مکانات کی وجہ سے یہاں عموماً رہتا تھا۔ سواریاں آجا رہی تھیں اور سائکل سوار بھی گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پیدل چلنے والے بھی سڑک پر موجود تھے۔ باہر تک میری طرح پیرو نے بھی ادھر اُدھر نظر دوڑانا ضروری سمجھا ہو گا کہ گردوپیش میں نگرانی کے لیے آدمی تو تعینات نہیں ہیں۔ ہاں کوئی نہیں تھا۔ موٹر تیز رفتاری سے چوراہے پر آگئی اور ڈرائیور نے پیرو سے سمت معلوم کی۔ میرے جی میں آئی کہ موٹر سے کود پڑوں کیونکہ پیرو نے جواب میں ڈرائیور کو بڑے نواب کی حویلی جانے والے راستے کے بجائے مخالف سمت میں چلنے کی ہدایت کی تھی۔

"یہ راستہ نہیں ہے دادا!" میں نے بے چینی سے کہا۔

"اپن کو پتہ ہے۔" پیرو نے تحمل سے جواب دیا۔ "اپن بعد کو اودر بھی چلے گا۔"

"اب تم کہاں چل رہے ہو؟"

"ایدر تھوڑا کام ہے۔"

"کام ہے؟" میں نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر وقت نکل نہیں رہے گا دادا!"

"اپن کے پاس یہ اکھا چار ٹانگ کا گھوڑا ہے، وہ کیا بولتا ہے اُس کو؟" وہ مجھ سے پوچھنے لگا، پھر خود اُچک کے بولا۔ "ہاں سالا ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ اُودر سے اپن سیدھا اسٹیشن بھی جا سکتا ہے۔"

"اور یہاں جو سب انتظار کریں گے؟"

"وہ سمجھ جائے گا، ابھی اپن سیدھا اسٹیشن کو ہی پہنچے گا۔"

"اور اگر وہ انتظار کرتے رہے؟"

"تجمل بھائی کو پتہ ہے کہ موٹر آنے پر اپن کو تھوڑا باہر جانے کا تھا۔"

مجھے اُس کا اطمینان زہر لگ رہا تھا مگر میں اُس سے اور کس طرح کہہ سکتا تھا کہ کہیں اور جانے کے بجائے پہلے وہ بڑے نواب کی حویلی ہی کی طرف چلے۔ میرے اصرار کا خانم کے سوا کوئی اور جواز بھی تو ہونا چاہیے تھا۔ چوراہے سے گزر کے موٹر دائیں طرف والی سڑک پر آگئی اور شہر رفتہ رفتہ گنجان ہونے لگا۔ دھوپ ہلکی پڑ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح شام نہیں ہوئی تھی۔ میں پھر چپ بیٹھا رہا۔ مجھے اگر ذرا بھی شائبہ ہوتا کہ اُس کا ارادہ کسی اور طرف جانے کا ہے تو میں کبھی موٹر میں نہ بیٹھتا۔ موٹر چار مینار، چار کمان سے ہوتی ہوئی پتھر گٹی کے پل سے بھی گزر گئی۔ حویلی سے نکلنے کے بعد بہت دور تک پیرو کی نگاہیں ادھر اُدھر منڈلاتی رہی تھیں مگر اب شاید اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اِس وقت کہاں جا سکتا ہے۔ کیا وہ عابد شاپ روڈ کی بڑی بڑی دکانوں سے اپنی بیوی اور بچی کے لیے کچھ خریدنا چاہتا ہے، اتنے دنوں بعد اُن کے لیے کچھ نہ کچھ تو لے جانا چاہیے تھا۔ پتھر گٹی کے پل کے پار دھوپ اور نحیف تھی اور ہلکی ہلکی شام اطراف میں چھانے لگی تھی۔ لائبریری کے قریب ڈرائیور کے استفسار پر پیرو نے نام پلی اسٹیشن کا نام لیا۔ میں سمجھا کہ وہ مقررہ وقت کی زحمت سے بچنے کے لیے ٹکٹ خریدنے اور نشستوں کا انتظام کرنے جا رہا ہے۔ سب کا ایک ہی ڈبے میں انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ موٹر عابد شاپ روڈ کے قریب آگئی تھی۔ پیرو نے اچانک ڈرائیور سے بائیں ہاتھ کی سڑک پر مڑنے کو کہا۔ گویا اُس نے پھر ارادہ بدل دیا تھا اور نام پلی جانے سے پہلے وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے دوبارہ اُسے ٹوکا۔

"ابھی رات کے آٹھ بجے بھی اپن اُودر سے نکلے تو گاڑی پکڑ لے گا۔" وہ بھنّاتے لہجے میں بولا۔ "اپن نے پتہ کر لیا ہے، ایدر گاڑی ایک دم پچیس منٹ اوپر نو بجے چلنے کا ہے۔ سامان وامان اپن کے پاس ایسا نہیں ہے جو سالا دیری لگے۔"

"کیا تم پہلے بڑے نواب کی طرف نہیں چل سکتے تھے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

"اُودر جانا ابھی ایدر سے زیادہ ضروری نہیں ہے۔"

بے شک اِسے بھی کوئی اہم کام ہو سکتا ہے۔ میں نے خود کو سرزنش کی، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مجھے اپنے سوا کسی کا خیال ہی نہیں آتا۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "مگر تم جا کہاں رہے ہو دادا؟"

اُس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔ "اپن ابھی ایدر قریب ہی اتر جائے گا۔"

مجھے اور وحشت ہونے لگی تھی لیکن پھر میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ موٹر کچھ اور آگے چلی آئی تھی۔ رنگ کوٹھی سے کچھ آگے پیرو نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اُسے رک جانے کو کہا اور موٹر رکتے ہی ڈرائیور کو وہیں انتظار کرتے رہنے کی ہدایت کرکے اتر گیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ اترا تھا۔ میں نے گھوم کے اطراف میں نظر ڈالی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ جہاں موٹر ٹھیری تھی، وہیں قریب ایک گلی میں پیرو مڑ گیا۔ اُس کی رفتار نہ اتنی تیز تھی، نہ کم۔ گلی کے اندر آگے جانے کے بجائے وہ دوسری گلی میں مڑ کے پھر عام سڑک پر آگیا۔ اسی سڑک پر موٹر کھڑی تھی لیکن ہم ڈرائیور کی نظروں سے دور آگئے تھے۔ ڈرائیور کو اپنی منزل کا نشان نہ بتانے ہی کے لیے پیرو نے یہ پھیر کیا ہو گا۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ کوئی دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پیرو ایک گلی میں مڑا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور ایک لمحے کے لیے میرا سارا جسم سُن ہو کے رہ گیا۔

یہ حمایت نگر کا علاقہ تھا، وہی جگہ جہاں میں اور پیرو حیدر آباد آتے ہی مولوی محمد شفیق کی تلاش میں آئے تھے۔ پیرو کا رخ بھی اُسی مکان کی طرف تھا، خرم منزل کی طرف جس کا پتہ اپنی منزلِ مقصود کے طور پر مولوی صاحب نے مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے میں درج کرایا تھا۔ اگر یہ پتہ نہ ملتا تو سب کچھ اس طرح نہ ہوتا جس طرح ہوا، نہ ہم راستہ بدل کے حیدر آباد آنے کا فیصلہ کرتے، نہ سونیا کو موت آتی، حیدر آباد ہی کی گاڑی میں بیٹھنے کی وجہ سے سونیلے سے میرا آمنا سامنا ہوا تھا۔ پھر شاید نواب عالم تاب کو بھی کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی، نہ خانم اتنی منتشر ہوتی۔ اُس نے یہاں ٹھیرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر نریں اور جہاں گیر کے بغیر وہ کتنے دن تک خود پر جبر کرسکے گی اور اُدھر اُس کے یوں چلے آنے سے اُن کا قرار بھی چھن گیا ہو گا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ میری اور پیرو کی گم شدگی کے دوران اُنھوں نے وقت کس طرح کاٹا ہو گا۔ حویلی کے تہ خانے کے گیارہ بارہ دن ہمارے لیے گیارہ بارہ برسوں سے کم نہ تھے۔ پلنے زخمی پاؤں پر مجتل کا بیان آنا، ہم نے تو زنداں میں جیسے تیسے وقت گزار دیا تھا، باہر کی کھلی فضا مجتل کے لیے ہمارے محبس قید خانے سے کہیں زیادہ عذاب ناک ہو گی اور ثروت یار کی ذلت، اُنھوں نے میری آنکھوں کے سامنے ابا جان کا گریبان چاک کیا تھا اور اُن کی داڑھی نوچی تھی اور میں تماشائی بنا دیکھتا رہا تھا۔ ابا جان، امیر علی، مجتل، پیرو، زورا کلاتے، شاہ زجرد نگو مارٹی اور خانم حیدر آباد آنے کے لیے میری ایک ضد سے متاثر ہوئے تھے۔

نواب کی کوٹھی نزدیک آ رہی تھی۔ ہر قدم پر فاصلہ اور کم ہو جاتا تھا۔ میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیرو اب یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا اُسے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر کس طرح؟ ہوٹل سے نکلنے کے بعد تہ خانے سے حویلی کے تذکرے اور وقفے تک۔ اڈے سے پھر بڑے نواب کی حویلی تک، ہم دونوں مستقلاً ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ نواب عالم تاب کے عزاداروں میں مجھے نواب ثروت یار کا چہرہ کبھی دکھائی نہیں دیا جس کے مکان کی طرف ہم بڑھ رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ثروت یار ہی اُس کا نام تھا۔ ممکن ہے، وہ کسی ایسے وقت وہاں آیا ہو جب میں نیچے نہ ہوں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ میں مجتل، پیرو اور ابا جان کو چھوڑ کے بالائی منزل کے مہمان خانے میں آگیا تھا۔ اپنی کال نواب ثروت یار اگر آیا ہو گا تو اُس نے پیرو کو اور پیرو نے اُسے ایک نگاہ میں پہچان لیا ہو گا۔ شاید اسی سے پیرو کو کچھ معلوم ہوا ہو لیکن اگر مولوی صاحب کے بارے میں ذرا بھی سن گن پیرو کو ملی ہوتی تو وہ اتنی دیر تک خاموش نہ رہتا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو مجھے ضرور بتاتا۔ یہ بات وہ مجھ سے کیسے چھپا سکتا تھا۔ میرا ریچکچانے لگا۔ "دادا!" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "تم پھر اس طرف کیوں جاتے ہو؟"

"ابھی ایک بار اور جا کے دیکھنے سے اپن کا کیا جاتا پڑا ہے۔"

وہ اُلجھے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"کیا تمھیں کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"نہیں، پر اپن ابھی ایک تسلی کرے تو ٹھیک ہے۔"

"بیکار ہے، بالکل فضول۔ تم وقت ضائع کرو گے۔"

"ابھی دیکھ لینے میں اپن کا کیا بگڑتا ہے۔"

"نہیں دادا! کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"دیکھتا ہے راجا!"

"وہ نواب بھی خواہ مخواہ مشکوک ہو گا۔"

"اپن اُس سے بھی تو ملنے نہیں جا رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے دادا! کچھ نہیں ہو گا۔"

"تو ابھی ایسا ہی سمجھ راجا!"

"دادا! شاید اُن کا ملنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ میں اُنھیں اب کبھی تلاش نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔"

"کیا بولتا ہے؟"

"بہت خاک چھان لی ہے دادا! میں نے دوسروں کو الگ پریشان کیا ہے۔"

"دوسرا کون؟" وہ ترشی سے بولا۔

"سبھی لوگ دادا!" میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ "مجتل بھائی، تم، ابا جان کس کس کا نام لوں۔"

"اپن دوسرا لوگ ہے راجا؟"

"تم تو بات پکڑ رہے ہو۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کیا ایک میرے لیے سبھی بے گھر اور خوار نہیں ہوئے؟"

"تو اپن کا لاڈلا ہے راجا!"

"دادا! خدا کے لیے بس کرو۔ یہ تلاش مجھے راس نہیں آتی۔ جیسلمیر میں کیا ہوا تھا، بمبئی میں اور یہاں کیا ہوا۔ میں نے طے کر لیا ہے، اب کہیں نہیں جاؤں گا، کسی کو پریشان نہیں کروں گا، دادا! یقین کرو، میں نے اپنے آپ بہت کچھ طے کیا ہے۔ تم دیکھنا۔"

"یہ تو ایک دم اچھا بات ہے۔"

"تو پھر لوٹ چلو دادا!" میں نے عاجزی سے کہا۔

کوٹھی ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ پیرو میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "ابھی اپن اِدھر آ ہی گیا ہے راجا!"

"پھر تم جا کے تسلی کر لو۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔ "میں یہیں کھڑا رہتا ہوں۔"

اُس نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا اور کہنے لگا کہ میرے بقول جہاں اتنا وقت برباد ہوا ہے، وہاں کچھ اور سہی، جانے میں کیا حرج ہے۔ ہم کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ وہی سیاہ فام دربان وہاں موجود تھا جس سے پہلی مرتبہ ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ پیرو نے نواب کے بارے میں پوچھا تو دربان اوپر سے نیچے تک ہمیں دیکھنے لگا۔ پیرو نے اُسے کسمسانے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور بولا کہ نواب صاحب سے ہمیں چند لمحوں کا کام ہے، بہتر ہے کہ اندر جا کے بتا دیا جائے۔ پیرو نے مزید تاکید کی کہ وہ نواب پر واضح کرے کہ وہی لوگ آئے ہیں جو سترہ اٹھارہ دن پہلے اُس سے ملنے آئے تھے۔ دربان بھی ہمیں پہچان گیا تھا۔ کہنے لگا کہ نواب کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے، شاید مشکل سے ملاقات ہو۔ ہم کسی اور وقت آجائیں تو مناسب ہے مگر پیرو کے اصرار پر وہ بادلِ ناخواستہ آمادہ ہو گیا۔ ہم موٹر میں یہاں آتے تو دربان کبھی اتنی حجت نہ کرتا۔ اُس نے ہمیں پیدل آتے جو دیکھا تھا۔ ہم باہر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ دربان نے واپسی میں پانچ منٹ اور لگا دیے۔ واپس آ کے اُس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ احاطے میں قدم رکھتے ہی میرا سارا جسم دھڑکنے لگا۔ ہمیں اُس کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ کمرے میں روشنیاں جلا دی گئی تھیں حالانکہ ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ میری نظر گھڑی پر گئی، ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

یہاں آنے کے بعد اب مجھے بھی کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں پیرو کا قیاس درست نہ ہو اور مولوی صاحب ابھی موجود نہ ہوں۔ اُنھوں نے ثروت یار سے کہا تھا کہ مراد آباد سے واپسی پر وہ سیدھے اُس کے گھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے راستے میں اُنھیں کوئی مجبوری پیش آگئی ہو، وہ اپنے پروگرام کے مطابق یہاں نہ پہنچ سکے لیکن وہ بعد میں بھی تو آسکتے ہیں۔ نواب ثروت یار سے ہمارے ملنے کے بعد گزشتہ سترہ اٹھارہ روز میں کسی دن بھی۔ نواب کے والد سے اُن کے بڑے مراسم تھے اور اُس کے بقول جب مولوی صاحب نے حیدر آباد میں سکونت کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اُس نے اُنھیں اپنی کوٹھی میں رہنے کی پیش کش کی تھی۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے یہ پیش کش قبول کر لی ہو۔ نواب کی اس جدید طرز کی کوٹھی میں جگہ کی تنگی نہیں ہے۔ کیا معلوم اندر دروازے سے نواب ثروت یار کے بجائے مولوی صاحب ہی برآمد ہوں۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ اُسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی، میں کرسی سے اُچھل پڑا۔ وہ خادم تھی۔ اُس نے پہلے کی طرح ہمارے سامنے چائے لا کے رکھ دی اور پھلوں کا طشت۔ پیرو میرے پاس ہی بیٹھا تھا اور اُس نے زور سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اُس کی گرفت بتا رہی تھی کہ اُس کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے۔

اگر مولوی صاحب آگئے ہیں تو کیا نواب نے اُنھیں بتایا ہے کہ ہم دونوں چند دن پہلے اُن کی تلاش میں آئے تھے۔ نہ معلوم مولوی صاحب نے کیا ردِ عمل ظاہر کیا ہو۔ ہو سکتا ہے جیسا کہ نواب نے ساری روداد سن کے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ہماری آمد کے متعلق اُنھیں کچھ نہ بتایا ہو۔ پیرو نے نواب ثروت یار سے کہا تھا کہ مولوی صاحب کی ایک امانت لوٹانے کے لیے ہمیں ایک مدت سے اُن کی تلاش ہے۔ نواب کی تشویش دُور کرنے کے لیے پیرو کو کچھ نہ کچھ تو بتانا چاہیے تھا۔ پیرو نے مجھے مولوی صاحب کا رشتہ دار بتایا تھا اور کہا تھا کہ میری ماں مولوی صاحب کی بہن نے اُن کی جائداد ہتھیا لی تھی اور مولوی صاحب دل برداشتہ ہو کر عرصے سے مراد آباد کی سکونت ترک کر چکے تھے۔ یہ سُن کے نواب نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور مولوی صاحب کو ہماری آمد کے متعلق کچھ نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ مولوی صاحب کے آنے پر وہ خط کے ذریعے ہمیں مطلع کرے گا تاکہ ہم یہاں آجائیں اور بچھڑے ہوئے مل جائیں۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے میرے اور مولوی صاحب کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے، رفاقت کا وسیلہ بننے میں خوشی ہو گی۔ میں نے خط کے لیے اُسے بمبئی میں ہوٹل کا پتہ دیا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ مولوی صاحب کے آنے پر اُس نے اپنے وعدے کے مطابق ہمیں کوئی خط لکھا ہو، یا اُس کے لیے ہماری آمد کی اطلاع ایسی غیر متوقع نہ ہو۔ مولوی صاحب کو اُس نے کچھ بتایا تو نہیں ہو گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو مگر یہ سب مفروضے ہیں۔ اصل میں مولوی صاحب کی آمد شرط ہے تبھی یہ سب کچھ ممکن ہے۔ مولوی صاحب اگر نہ آئے ہوتے تو نواب کو ہمیں اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ دربان سے کہہ سکتا تھا کہ اگر ہم صرف اس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو دونوں کا وقت ضائع ہو گا۔ کوئی بات ہی ہو گی جبھی اُس نے ہمیں اندر بلایا ہے۔

اُس کے آنے میں جتنی دیر ہو رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن معدوم ہوتی جاتی تھی۔ خادمہ کے جانے کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے اتنی دیر نہیں ہوئی تھی مگر لگتا تھا جیسے پہر گزر گیا ہو۔ پیرو بھی بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ سامنے دروازے پر پردے کی سرسراہٹ پر اُس کی انگلیاں میرے بازو میں اُلجھ گئیں۔

چند منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دروازے پر آہٹ گونجی۔ مردانہ جوتوں کی چاپ تھی۔ دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں دھند سی اُتر آئی تھی۔ دوسرے لمحے جو شخص اندر داخل ہوا وہ نواب ثروت یار تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری سانسیں ایک لمحے کے لیے رک گئی تھیں۔ اس کے نظر آنے پر مجھے سکون سا ملا۔ مولوی صاحب اگر سامنے ہوتے تو شاید میرا دم نکل جاتا۔ پیرو نے مجھے کہنی ماری تو میں ہڑبڑاتا ہوا صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نہ جانے کس طرح نواب کو سلام کیا۔ اُس کے بیٹھ جانے پر ہم دونوں بھی جلدی سے بیٹھ گئے۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ مسکراتے ہونٹوں سے اُس نے ہمارا مزاج پوچھا۔ اُس کے دیکھنے کے انداز میں تجسس بھرا ہوا تھا اور وہ پہلے سے کچھ زیادہ جوان اور تر و تازہ لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، پیرو نے بے وقت آنے کی معذرت چاہی اور بولا اُسے دربان سے معلوم ہو گیا تھا کہ نواب کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ نواب نے شائستگی سے کہا کہ اُسے کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ یہ وہ تکلفاً ہی کہہ رہا تھا۔ مکلف شیروانی، پاجامے اور جوتیوں سے ظاہر تھا کہ ہم اگر ذرا دیر سے آتے تو وہ گھر سے نکل گیا ہوتا۔ اُس کے سر پر صرف ٹوپی نہیں تھی۔ سیاہ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔

"اپن آپ کو یاد ہے نا؟" پیرو نے جھجکتی زبان میں پوچھا۔

"خوب!" نواب مستعدی سے بولا۔ "ہمیں خوب یاد ہے۔ دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ یہ عمر بھول جانے کی تو نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم آپ کے منتظر تھے۔" میرے کان کھٹکنے لگے۔

"اپن، اپن کا انتظار میں تھا آپ؟" پیرو نے سٹ پٹاتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" نواب نے ہچکچاہٹ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا اپن کو آپ نے کوئی خط پتر لکھا تھا؟"

نواب نے تامل کے بعد جواب دیا۔ "نہیں۔"

پیرو حیرانی سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہم آپ کو خط لکھنا ہی چاہتے تھے۔"

"کیا مولوی صاحب آ گئے ہیں؟" پیرو کے بولنے سے پہلے میں نے بجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب کی سُرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ اُن میں چنگاریاں سی چمک رہی تھیں۔ وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ "ہم آپ سے کیا کہیں۔"

"اپن کو بولو نواب صاحب! کیا وہ ایدر آ گیا ہے؟" پیرو نے بے چینی سے کہا۔

"ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ اپنے وعدے کے مطابق آپ کو خط نہ لکھ سکے۔" نواب کی آواز تپتی ہوئی سی تھی۔

"کوئی بات نہیں، پر وہ آ گیا ہے نا؟" پیرو نے تیزی سے پو[چھا]۔

"اپن کو ابھی صاف صاف بولو۔"

"آپ کی اس بے تابی سے ہمیں اور خجالت ہو رہی ہے۔" نو[اب] نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔ "بے شک وہ آ گئے تھے۔"

"آ گیا تھا؟" پیرو نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ "آپ کیا بول[تا] ہے نواب صاحب!"

"وہ آ گئے تھے لیکن چلے گئے۔"

"چلا گیا! کدھر؟"

"ہم آپ کو ساری بات بتاتے ہیں۔ یقین کیجیے، آپ کے د[...] یہاں دیکھ کے ہمیں اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس ہو رہا [...] لیکن، لیکن ہم نے....."

"اس کو ابھی چھوڑو نواب صاحب!" پیرو اُس کی بات کا[ٹ] کے ترشی سے بولا۔ "اپن بھی ابھی اُودر نہیں گیا تھا۔" ایدر [...] ہی تھا۔"

"آپ یہیں تھے؟" نواب نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پو[چھا]۔

"اپن نہیں جا سکا تھا۔"

"تو پھر آپ نے درمیان میں یہاں زحمت کیوں نہیں کی؟"

"اپن نہیں آ سکتا تھا۔" پیرو نے تندی سے کہا۔ "آپ بولو ابھی بات کیا ہے؟"

"آپ کے جانے کے بعد مولوی صاحب تشریف لائے تھے۔" نواب نے تاسف سے کہا۔ "اُس کے کوئی چار پانچ روز بعد ہی وہ آ گئے تھے مگر چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ میری آواز کچھ دبی تھی۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"آپ کو کچھ بول کے نہیں گیا؟"

"ہم سے رخصت ہونا بھی ضروری نہیں سمجھا انھوں نے۔"

"آپ کیا بول رہا ہے؟"

"یہی سچ ہے جناب من!" نواب شرمندہ لہجے میں بولا۔ "وہ ا[چانک] چلے گئے۔ ہم سکندر آباد میں اپنے ایک ہندو دوست کی شادی میں گئے [...] اُن سے کہہ کے گئے تھے۔ واپس آئے تو وہ یہاں نہیں تھے۔ [...] پاس مختصر سا سامان تھا۔ ملازمین سے بھی اُنھوں نے کچھ نہیں [...]

پیرو نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔ میرا سارا جسم ڈھیلا جا رہا تھا۔

"کیا وہ اکیلا تھا؟" پیرو نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" نواب نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔"

"وہ لڑکی تھا!" پیرو تیزی سے بولا۔ "پھر ایسا کیا بات ہوا جو وہ چلا گیا؟"

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ صبح دس بجے کے قریب اُن سے مل کے گئے تھے اور یہ کہہ کے کہ شام کو واپسی میں دیر ہو سکتی ہے، وہ رات کے کھانے پر ہمارا انتظار نہ کریں۔ ہم شام ہی کو واپس آ گئے تھے لیکن وہ جا چکے تھے۔"

"ایسا کیسا؟" پیرو نے مایوسی سے کہا۔ "ابھی آپ نے اپن لوگ کے بابت اُن سے کچھ بولا تھا؟"

جواب میں نواب ہمارے چہرے دیکھا کیا۔ اُس کی تذبذب آمیز خاموشی پر پیرو نے دوبارہ اُس سے پوچھا۔ "اپن لوگ کا آپ کوئی بات کیا تھا؟"

"پہلے آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے ہمیں جو روداد سنائی تھی کیا اُس میں کوئی......" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "ہماری مراد ہے، شاید ہمی سے کوئی فروگزاشت ہو گئی۔"

"آپ کیا بولا تھا اُن کو؟"

"ہم نے آپ سے کہا تھا کہ ہم آپ کی آمد کی بابت انھیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ ہم اس پر کاربند بھی رہے تھے۔ جس روز وہ تشریف لائے انھوں نے اصرار کیا کہ شرفا کے علاقے میں ہم اُن کے لیے کسی چھوٹے سے کم چھت مکان کا بندوبست کر دیں تو نہایت مناسب ہو۔ ہم نے اُن سے گزارش کی حضرت اتنی بڑی کوٹھی ہے، یہاں آپ جس جگہ چاہیں قیام فرمائیں۔ یہاں افراد خانہ ہی کتنے ہیں۔ ایک بھائی، ایک بہن، ایک ماں۔ باقی سب ملازم ہیں۔ ایک بھائی یورپ تعلیم حاصل کرنے گیا ہے۔ باقی بہنیں اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔ آپ کے آنے سے کوئی تنگی نہیں ہو جائے گی۔ خیر! اس یقین دہانی پر وہ یہاں ٹھہرنے کے لیے آمادہ ہو گئے مگر ہم جلد ہی اُن کے لیے الگ مکان کا بندوبست کر دیں گے یا اگر وہ خود اپنی ضرورت کے مطابق مکان کی تلاش میں کامیاب ہو گئے تو چلے جائیں گے۔ انھوں نے عمارت کے پچھلے والے حصے میں رہنا پسند کیا۔ یہ جگہ اُن کے لیے موزوں بھی تھی۔ عمارت سے ملحق ہونے کے باوجود اصل عمارت سے بڑی الگ تھلگ۔ ہمیں کچھ اندازہ تھا کہ وہ ایک گوشہ نشین کم گو شخص ہیں، ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ اس حصے سے ملحق لائبریری

بھی ہے چناں چہ لائبریری بھی اُن سے قریب رہے گی۔ پہلا دن تو یوں ہی گزر گیا، دوسرے دن ہمیں آپ کا خیال آیا۔ ہم نے سوچا، آپ کو خط لکھ دیں لیکن پھر سوچتے ہی رہ گئے۔ کچھ یہ اطمینان بھی اپنی جگہ تھا کہ مولوی صاحب تو اب یہیں قیام فرما ہیں۔ ہم کسی وقت بھی آپ کو اطلاع دے سکتے ہیں۔ اصل میں ہمارا ذہن ایک اور بات سے منتشر ہو گیا تھا کہ آپ کی اچانک آمد مولوی صاحب کو گراں نہ گزر جائے۔ اچھا ہو گا کہ پہلے اس نئی جگہ سے اُن کی ذہنی مطابقت ہو جائے اور بہتر ہے کہ پہلے ہم اسی سلسلے میں اُن کا عندیہ لے لیں۔ وہ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ کسی نئی جگہ رہنے میں غالباً یہ اضطراب و تردد ہونا بھی چاہیے۔ انھیں یہاں وسیلۂ معاش کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا، حالانکہ اس معاملے میں انھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہاں اللہ نے بہت کچھ دیا ہے مگر یہ بات اُن جیسے غیور اور حساس شخص سے ہم کیسے کہہ سکتے تھے۔ وہ یہاں قیام ہی کی مشکل سے راضی ہوئے تھے، معاف کیجیے، اس بدگمانی نے بھی ہمارے دل میں جگہ لی کہ آپ کی روداد میں کوئی پہلو ادھورا ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب اگر کسی سے مطلق تعلق رکھنا نہیں چاہتے تو ہم درمیان میں پڑنے والے کون، بہتر ہے کسی موقع پر ہم اُن سے کنایۃً ذکر کر کے دیکھیں پھر آپ سے کوئی سلسلہ جنبانی کریں۔ یوں آپ کے اچانک آ جانے سے وہ مکدر نہ ہو جائیں، ہماری طرف سے اُن کے دل میں کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ جانے کیسی کیسی گتھی سینے میں بھری ہو، والدِ محترم کی نسبت اُن کے اور ہمارے درمیان ادب و لحاظ کی ایک حد تو بہرحال قائم کرتی تھی۔"

خادم کے کمرے میں آنے پر نواب کی بات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوئی اور خاص دان میز پر رکھ کے فوراً چلی گئی۔ اُس کے آ جانے سے نواب کو سامنے میز پر رکھی ہوئی چائے نظر آ گئی اور وہ خفیف لہجے میں بولا: "آپ نے چائے کو تو ہاتھ ہی نہیں لگایا، ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"ٹھنڈی ہو جائے گا تو دوسرا آ جائے گا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا: "ابھی آپ کیا بول رہا تھا نواب صاحب؟"

نواب نے چائے پوش اُٹھا کے چائے دانی چھو کے دیکھی: "ابھی گرم ہے، ہمارا خیال ہے ایک پیالی پی لیجیے۔"

"ابی ابھی بعد کو پی لے گا۔"

نواب نے چائے دانی ڈھک دی اور تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "بس کچھ احتیاط و آداب نے ہمیں روکے رکھا لیکن جب بھی اُن کا سامنا ہوتا تھا، آپ دونوں حضرات کے چہرے ہماری آنکھوں میں گھومنے لگتے تھے۔ دوسرا دن گزرا، تیسرا دن بھی۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ انھیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو، ملازمین کو خاص طور پر اُن کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ خود والدۂ محترمہ نے جا کے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اب وہ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف فرما دیں، اُن کے آنے سے گھر کی رونق بڑھ گئی ہے، گھر میں اب ایک بزرگ موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں توقع تھی کہ مولوی صاحب کو یہاں تھوڑی بہت یکسوئی ضرور نصیب ہو گی۔ اُن کے چہرے سے عیاں تھا کہ یا تو انھیں بہت صدمے پہنچے ہیں یا انھیں آیندہ کی فکر کچھ زیادہ لاحق ہے۔ گھبرائے گھبرائے، کھوئے کھوئے، سفر کی تکان بھی اس کی وجہ ہو سکتی تھی یا جیسے کہ ہم نے عرض کیا، نئی جگہ کی اجنبیت بھی سبب ہو سکتی ہے۔ بہر حال ایک بات ضرور تھی۔ ان تمام شکستگیوں کے باوجود اُن کا چہرہ عزم سے عاری نہیں تھا۔ غالباً یہی عزم انھیں متحرک اور مستعد رکھے ہوئے تھا۔ سفر، نئے گھر کی تلاش، خودداری اور بجا طور پر کو اسی عزم کی علامتیں کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے دل میں، یقین کیجیے، اُن کے لیے بڑی عزت تھی، بھی کیا، بلکہ ہے۔ اُن کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی تھی مگر انھوں نے اپنے مخلصین کو موقع ہی نہیں دیا۔ شاید ہم اُن کے کسی کام آ سکتے۔ چوتھے دن شام کے وقت ہم اُن کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ والد مرحوم کا تذکرہ تھا۔ ہم نے پہلے کی نسبت انھیں کسی قدر مجتمع اور مطمئن دیکھا تو وقت مناسب سمجھا۔ آپ کی بات ہمیں یاد تھی کہ آپ اُن کی کوئی امانت بھی لوٹانا چاہتے تھے، جائداد وغیرہ۔ ہم نے سوچا، مولوی صاحب ہم سے کبھی اپنا حال بیان نہیں کریں گے، اُن کی مالی الجھنوں کے تدارک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُن کی جائداد اُنھیں مل جائے۔ شاید اسی طرح زخموں کا کچھ اندمال ہو سکے اور برسوں کا حبس دُور ہو جائے۔ ہم نے جھجکتے جھجکتے اُن سے آپ کا نام لیا۔"

"آپ اُن کو اِس کا نام بول دیا تھا؟" نواب سانس لینے کے لیے رکا تھا کہ پیرو نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں، ہم نے سرسری طور پر اُن کے خاندانی معاملات کا ذکر چھیڑا۔ انھوں نے بُرا نہیں مانا، ہمیں اور جرأت ہوئی، ہم نے کسی ہیر پھیر کے بجائے سیدھے سادے انداز میں بابر زماں صاحب کا نام لیا۔ یہی نام بتایا تھا آپ نے؟"

"جی، جی، یہی بولا تھا، ایک دم یہی۔" پیرو نے بے تابانہ کہا۔

میرے ہاتھ پیر شل ہوتے جا رہے تھے۔ نواب کی نظریں بار بار مجھ پر آ کے رُک جاتیں، میں سر جھکاتا تو میرا دم اور گھٹنے لگتا۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہوا،" نواب ثروت یار بولا۔ "مولوی صاحب کی اس کیفیت کا حال بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ بے ساختہ اچھل پڑے، پھر اُن پر جمود سا طاری ہو گیا۔ وہ مبہوت ہو کے ہمیں دیکھنے لگے۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ آٹھ نو سال سے اُن سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے چناں چہ اُن کا استعجاب ہمارے لیے اتنا غیر متوقع نہیں تھا لیکن ہم کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہم آگے زبان کھولنے کے لیے اُن کے مثبت منفی ردِ عمل کا ایک اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے اسی لیے چپ رہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"ہاں ایک دم سمجھ رہا ہے نواب صاحب!" پیرو نے تیزی سے کہا۔

نواب ٹھہر گیا جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ اُس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہو گئی تھی، چہرے پر بھی دھواں سا چھایا ہوا تھا۔ پیرو نے دخل نہیں دیا۔ چند لمحے بعد وہ خود ہی بوجھل آواز میں بولا: "ہم نے اُن سے کہا تھا کہ آپ اس نام کے کسی شخص سے واقف ہیں؟ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکے۔ ہم نے انھیں ٹوکا کہ آپ چپ کیوں ہو گئے۔ چونکہ ہم نے ذکر چھیڑ دیا تھا لہٰذا اب ہمیں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ہمارے ٹوکنے پر وہ چونک پڑے اور عالمِ اضطراب کے باوجود انھوں نے بہ کمال تحمل ہم سے وہی سوال کیا جس کا ہمیں علم تھا لیکن جس کا جواب ہمارے لیے آسان نہیں تھا۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم یہ نام کس طرح جانتے ہیں؟ ہم کہہ سکتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی خط آیا تھا یا کسی واقف کار نے ہم سے مراد آباد کے اِن صاحب کا تذکرہ کیا تھا یا ہمیں خود کہیں یہ مراد آبادی صاحب ملے تھے۔ مراد آباد ویسے بھی اتنا بڑا شہر نہیں ہے، چھوٹے شہروں میں ایک دوسرے کے واقف کار نکل ہی آتے ہیں مگر ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ انھیں صاف صاف بتا دیا جائے تاکہ بعد میں اُن کے سامنے کوئی خفت نہ ہو۔ ہم نے کہا، یہ صاحب یہاں آئے تھے۔ یہ سُن کے ہمیں کہنا چاہیے کہ اُن پر سناٹا سا طاری ہو گیا مگر اُن کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ انھوں نے ہم سے پوچھا، یہاں آئے تھے؟ اُن کی آواز سے کپکپی اور حیرت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ہم نے کہا، جی ہاں، یہیں آئے تھے اور آپ کے بارے میں معلوم کر رہے تھے اور آپ نے کیا فرمایا؟ انھوں نے ہم سے پوچھا۔ ہم نے عرض کیا، ہم نے انھیں بتا دیا تھا کہ مولوی صاحب قبلہ یہاں تشریف لائے تھے، مدتِ دراز کے بعد انھیں کسی ضروری کام سے مراد آباد جانا تھا، یہیں واپس آنے کے لیے فرما گئے تھے لیکن اب کوئی ڈیڑھ ماہ کے قریب ہو رہا ہے، وہ نہیں آئے ہیں۔ ہم سے پوچھا کہ ہم نے اور کیا کہا۔ ہم نے اُن سے عرض کیا کہ اس کے سوا بھلا ہم کیا کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے سوال کیا کہ آپ کی آمد کا آخر کیا مقصد تھا؟ ہم نے کچھ تو اس بابت معلوم کیا ہو گا۔ ہم نے کہا، جی ہاں، یہ تو ہمیں پوچھنا ہی چاہیے تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ مولوی صاحب اُن کے قریبی عزیز ہیں، جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، خالو کا رشتہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ ہماری والدہ نے مدت ہوئی اپنے بھائی کے مکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی بہن سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ کچھ اور تو نہ کر سکے، مراد آباد کو خیرباد کہہ گئے۔ اس کے بعد اُن کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی۔ بابر زماں صاحب بھی اب مراد آباد میں نہیں رہتے، بمبئی میں قیام ہے، تاہم عرصے سے وہ آپ کی تلاش میں تھے۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر مراد آباد ہی سے انھیں آپ کا پتہ ملا اور وہ یہاں تک آن پہنچے۔ ہم نے مولوی صاحب سے یہ بھی بیان کی کہ بابر زماں آپ سے ملنے کے لیے بڑے بے تاب ہیں کیونکہ وہ آپ کی امانت آپ کو لوٹانا چاہتے ہیں۔"

"مولوی صاحب نے کامل انہماک سے ہماری باتیں سنیں اور کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا۔ ہم ابھی تجسس میں تھے کہ پہلے آں سے کچھ جان سکیں تو اچھا ہو لیکن بہرحال وہ ہمارے بزرگ تھے۔ انھوں نے ہمیں اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ سوال کرتے رہے، ہم جواب دیتے رہے۔ ہم نے زندگی اُن کے مقابلے میں ظاہر ہے، نہایت کم گزاری ہے، نصف سے لگ بھگ۔ مولوی صاحب کی عمر کے لوگوں میں تو ایک بردباری اور بُرد باری لازماً آ جاتی ہے مگر ہم اُن سے بہت ناپختہ کار ہونے کے باوجود اتنا تو اندازہ لگا سکتے تھے کہ اس ذکر سے وہ مضطرب اور منتشر ہو گئے تھے، بلکہ تزلزل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ آدمی ایک حد تک ہی اپنے احساسات چھپا سکتا ہے اور کم ہی لوگوں کو یہ قدرت حاصل ہے۔ ہمیں اُن سے ایک طرح کی ندامت ہو رہی تھی کہ ہم نے اچھا نہیں کیا۔ اُن کے زخم کرید دیے۔ ہر چند مولوی صاحب نے کسی طرح کا اظہار نہیں کیا تھا۔ خاصی دیر بعد انھوں نے پوچھا کہ کس تاریخ کو وہ لوگ آئے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ دو صاحبان آئے تھے، ایک بزرگ کا تعلق بمبئی سے تھا اور معلوم بھی یہی ہوتا تھا۔ دوسرے نوجوان تھے، اُنھی کا نام ہمیں بابر زماں بتایا گیا تھا۔ نہایت مہذب، وجیہ، کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور اچھی قامت کے آدمی تھے۔ سادہ لباس مگر طبیعت میں قرار نہیں تھا۔ ہمیں وہ اچھے لگے۔ وہ ایسے لوگوں میں تھے جن سے ایک ملاقات میں سیری نہیں ہوتی اور جو اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ معاف کیجیے،" وہ شائستگی سے بولا۔ "کم از کم ہمارا یہی تاثر تھا۔"

مجھ سے اُس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا۔ میں بس ٹکٹکی لگائے نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میرے اس رویے پر شاید اُس نے اپنے لہجے میں ترمیم

کرلی ہوگی۔ اپنے اندازوں کے بارے میں اُسے بہت خوش فہمی تھی میرے
لیے اُس کے اندازے ابھی یہیں تک تھے۔ چہرے اور قد و قامت تک کوئی
نہیں جانتا کہ ان کے پیچھے کیسے کیسے رنگ اور کیسی کیسی قیامتیں ہوتی ہیں۔
میرے جی میں آئی کہ اُس سے اپنا پورا تعارف ہی کرا دوں "جمیل بھیا" تو
بازی "اقی گیری" میں لے کیا کیا بتاتا۔ ان اجالوں کے پیچھے کیسے کیسے
اندھیرے چھپے ہیں۔ یہ بھی تو میرا ہی حصہ ہیں۔ انھیں جانے بغیر اُسے
کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔

"مولوی صاحب کو ہم سے ایک سوال کرنا چاہیے تھا۔" وہ ٹوٹی
ہوئی سی آواز میں بولا "کہ کیا وہ لوگ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں، وہ
اب کہاں ہیں۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد انھوں نے ہم سے یہی پوچھا۔
ہم نے اُن سے کہا کہ اب تو وہ بمبئی کے لیے واپس چلے گئے ہوں گے۔ اپنا
بمبئی کا پتہ دے گئے تھے جو ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم سے کہہ گئے ہیں کہ
اگر اس دوران آپ تشریف لے آئیں تو براہ کرم انھیں مطلع کر دیا جائے۔
ہم انھیں خط لکھ دیتے لیکن آپ سے مشورہ کیے بغیر اُن سے کوئی
رابطہ ضابطہ مناسب نہیں تھا۔ سُن کے دیر تک چُپ رہے۔ پھر بے نیازانہ
انداز میں بولے کہ وہ پتہ ہمیں دے دیجیے گا۔ ہم نے جسارت کی کہ آخر یہ کون
صاحب ہیں۔ کیا آپ اُن سے تجدید تعلق پسند کریں گے اور ہم نے اُن
سے یہ بھی کہا کہ اب بھول بھی جائیے۔ وہ صاحب بہت نادم تھے خطائیں
آدمیوں سے ہوتی ہیں، معاف کر دیں تو احسن ہوگا۔ ہمیں بھی خوشی ہو
گی۔ بس سنتے رہے۔ ہم نے اُن سے دوبارہ پوچھا تو صرف اتنا کہا کہ آپ
ہمیں پتہ دے دیجیے۔ مناسب ہوا تو کسی وقت اُن سے رابطہ قائم کر
لیا جائے گا۔ ابھی دماغ کچھ حاضر نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کچھ کہنے
سننے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔ باقی ہمیں دخل در معقولات والی بات
معلوم ہوئی۔ میزبانی کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ ہم نے زبان بند رکھی رات
کے کھانے پر ہماری اُن سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہم سے پتہ طلب
نہیں کیا۔ ہم نے بھی اس سلسلے میں اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ رات
کو وہ مطالعے کا عُذر کر کے جلد ہی ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد کا
حال ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔ دوسرے دن ہم سکندر آباد چلے گئے۔ واپس
آئے تو وہ موجود نہیں تھے۔"

نواب چُپ ہو گیا۔ پیرو اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر شاید
اُسے خیال آ گیا کہ اب اور کیا پوچھنا باقی رہ گیا ہے۔ اُس نے میرے ماتھے پر
تھپکی دی۔ میرے جی میں آئی کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ نواب کی گرم
آنکھیں ابھی پیرو پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ میرا سینہ چھلا جا رہا تھا۔ "ایدر کسی سے
ذکر کے بھی نہیں گیا؟" پیرو نے نواب سے پوچھا۔ پیرو کا دماغ بھی چل گیا
تھا۔ اتنی دیر سے نواب اور کیا کہہ رہا تھا۔

"یہاں صرف والدہ محترمہ تھیں۔" نواب نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔
"ہمشیرہ بھی ہمارے ہمراہ سکندر آباد گئی تھیں۔ جانا تو امی جان کو بھی تھا مگر
اُس دن اُن کا مزاج کسی قدر ناساز تھا۔ ملازم کہتے ہیں کہ مولوی صاحب
نے والدہ کے بارے میں اُن سے پوچھا۔ کھانے کے بعد انھیں قیلولے کی عادت
ہے۔ ملازموں نے بتایا کہ سو رہی ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا پھر بہتر
ہے انھیں جگایا نہ جائے۔ ملازم سے انھوں نے تانگہ منگایا۔ ملازم اُن سے
کیا کہہ سکتے تھے۔"

"ابھی ابھی آپ کیا سمجھتا ہے۔ اپن کا مطلب ہے وہ ایسا ایسے
کیوں چلا گیا؟" اتنا کچھ سننے کے بعد پیرو نے پھر ایک فضول بات کی۔
نواب کے چہرے کا رنگ لال ہو گیا۔ "ہم کیا کہہ سکتے ہیں،
کیا کہہ سکتے ہیں۔" وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم نے آپ کو بتایا
تھا کہ ہم نے اُن کی دل جوئی کی کوشش کی تھی۔ اُن کے آنے سے
ہمیں بڑی مسرت ہوئی تھی مگر جانے کیوں، کون سی کوتاہی ہم سے سرزد
ہوئی۔ اگر صرف یہی وجہ تھی کہ ہم نے انھیں آپ کے بارے میں بتا دیا
تھا تو کیا یہ ہم نے اچھا نہیں کیا تھا۔ سب کچھ انھی کی آمادگی پر منحصر تھا۔
وہ آمادہ نہ ہوتے تو بخدا ہم بھی آپ کو نہ لکھتے۔ اس میں ایسی کیا بات
تھی جو وہ اتنے دل برداشتہ ہو گئے یا یوں کہیے کہ برہم ہو گئے۔ ہمارے آنے
کے بعد وہ جا سکتے تھے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک و مختار تھے۔ کسی وقت
بھی جانے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ یوں سامان اُٹھا کے گھر کے مکینوں سے
کہے بغیر چلے جانا۔ کوئی رسمی سا خدا حافظ کہنے کی بھی کلفت گوارا نہیں کیا۔ اسے
کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنی خطا سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ ہی کچھ بتلایئے۔"

"اپن کیا بولے نواب صاحب!"

"ہم آپ سے سچ کہیں، ہماری عقل میں کچھ نہیں آتا۔ یہ تو ایک
بہت سیدھی سادی بات تھی۔ کچھ لوگ اُن کی عدم موجودگی میں اُن
سے ملنے آئے تھے۔ ہم نے اُن کے آنے پر تذکرہ کر دیا۔ یقیناً کوئی اور
ہی بات ہوگی۔"

"ابھی اور کیا ہو سکتا ہے نواب صاحب!"

"دیکھیے! آپ خود ہی سوچیے، جو کچھ ہم نے آپ کے گوش گزار کیا۔
یقین کیجیے، من و عن یہی پیش آیا ہے۔ اس میں آپ کو ہماری
کون سی لغزش نظر آتی ہے۔ یہ ہماری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ امی جان
کو بھی رنج ہوا ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے۔ ہم سے پوچھتی ہیں لیکن ہم کوئی
جواب نہیں دے پاتے۔ ہمارے آنے سے پہلے امی جان کو ملازموں سے اُن
کے جانے کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا سکندر آباد سے آنے پر ہم مولوی صاحب

کی اچانک روانگی کے بارے میں اُن سے کوئی بہانہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم تو آپ کے خود ششدر رہ گئے تھے۔ ہم نے پوری طرح تصدیق کرلی ہے کہ جانے سکندر آباد جانے کے بعد کوئی شخص اُن سے ملنے نہیں آیا۔ کسی خط یا تار وغیرہ کی موصولی کا معاملہ بھی خارج از بحث ہے۔ فرض کیجیے اُنھیں کوئی بھولا ہوا کام یاد آگیا تھا اور اُن کا جانا اتنا ہی ضروری ہو گیا تھا اور والدہ سو رہی تھیں تو یہاں ملازم موجود تھے۔ وہ دو لفظی رقعہ تو لکھ سکتے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں، ہم نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ آپ کا ذکر اُن کے لیے ایسا ہی ناقابلِ برداشت تھا یا اُنھیں آپ کا کوئی خوف لاحق تھا اور آپ نے ہمیں جو رُوداد سنائی تھی، معاف کیجیے، ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ وہ رُوداد حقائق پر مبنی نہیں تھی تو کیا...... نہیں نہیں، وہ ہمیں اعتماد میں لے سکتے تھے۔ اُنھوں نے سب کچھ سن کر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ہم اُن کی نظروں میں اتنے نامعتبر تھے؟ اشارہ کر دیتے تو یہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا۔"

"اپن سمجھتا ہے کہ آپ کو کیسا دکھ ہوگا۔" پیرو نے افسردگی سے کہا اور یکایک نواب سے پوچھنے لگا۔ "اور وہ، وہ لڑکی! آپ نے اُس کو دیکھا تھا نواب صاحب؟"

"دیکھنے سے کیا مراد ہے آپ کی؟" وہ تیزی سے بولا۔

"اپن کا مطلب ہے، وہ کیسا تھا، ابھی تو بہت بڑا ہوگیا ہوگا؟" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

نواب کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے پیرو کو تکتا رہا پھر دبے لہجے میں بولا۔ "ہاں، جی ہاں، اُسے اتفاق کہیے، اُس روز حسبِ عادت دستک کی ضرورت سمجھے بغیر ہم اندر گھر میں داخل ہوئے تو وہ والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیں بڑی ندامت ہوئی اور ہم فوراً واپس ہوگئے۔ یوں ہمارا اُن کا آمنا سامنا ہوا تھا، بس چند لمحوں کے لیے۔" یہ کہہ کے وہ جیسے کہیں گم ہوگیا۔

"ابھی کیسا تھا وہ؟" پیرو نے اٹکتی زبان سے ٹوکا۔

پیرو کے سوال پر وہ جزبز سا ہوگیا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے ماتھے کی شکنیں دور ہوگئیں اور وہ معذرتی لہجے میں بولا۔ "ہاں آپ نے تو اُنھیں عرصے سے نہیں دیکھا ہوگا۔"

پیرو نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماشاء اللہ، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اب تو وہ ایک مکمل دوشیزہ نظر آتی تھیں، ایک ایک قلی گُرمن اپ خاتون......" لفظ آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بات بدلنے کے انداز میں پیرو سے پوچھنے لگا۔ "کیا وہ مولوی صاحب کی دختر تھیں؟"

"ابھی مولوی صاحب نے کیا بولا آپ کو؟"

"اُنھوں نے یہی فرمایا تھا۔"

"پھر آپ ایسا کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"نہیں، یوں ہی۔" نواب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کا سارا جسم بل کھا گیا۔ "یوں ہی ہمیں خیال آگیا۔" وہ سنبھل کے بولا۔ "یعنی کہ وہ متبنّیٰ لے پالک بھی ہوسکتی ہیں۔"

"وہ اُسی کا بیٹیا ہے۔" اچھا ہوا جو پیرو نے یہ کہہ کے نواب کے غیر ضروری سوالوں سے نجات حاصل کرلی۔ نواب اُس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ پیرو نے اُسے مزید تذبذب و کشمکش کی مہلت نہیں دی اور عاجزانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ "ابھی آپ کا ماں، بہن تو اُس کو زیادہ دیکھا بھالا، بات کیا ہوگا۔ وہ اُس کے لیے کیا بولتا ہے۔"

"اُن کی زبانیں تو مدح سرائی کرتے نہیں تھکتیں۔" نواب نے مشتاق آواز میں کہا۔ "اُنھیں تو گویا اپنا کوئی کھویا ہوا مل گیا تھا۔ امی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اُنھیں مسلسل اپنی نظروں کے سامنے رکھیں۔ بجا، دن ہی میں وہ اُن سے اس قدر مانوس ہوگئی تھیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ہمشیرہ کا بھی یہی عالم تھا، نرجس بانو......" نرجس بانو سے نواب کی مراد گوری ہی ہوگی۔ مولوی صاحب کا رکھا ہوا یہ نام مجھے زبیر نے بتایا تھا۔ نواب بھی یہی نام لے رہا تھا، کہنے لگا۔ "نہایت حسین، مکمل لڑکی ہیں۔ امی جان کا خیال تھا کہ ماں، بہن نہ ہونے سے اُن پر گہرا اثر ہے۔ امی جان نے اُن کی یہ خلش دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ عموماً خاموش خاموش رہتی تھیں، ڈوبی ڈوبی، ہمہ وقت کسی سوچ میں گم۔ اگر ہم یہ کہیں کہ چند دنوں میں وہ امی جان اور ہمشیرہ کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہمارا یہ گمان بھی شاید غلط نہیں ہے کہ اس توجہ کا نرجس بانو پر اچھا اثر مرتب ہو رہا تھا۔ ہمشیرہ کا کہنا ہے کہ اُن کا جی یہاں لگنے لگا تھا۔ اُن کے لیے اُن دونوں کی محبتوں کا احوال ہم کیا بیان کریں۔ امی تو بہت جذباتی ہوگئی تھیں۔ اُنھوں نے مولوی صاحب سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارا جی چاہتا ہے، نرجس بانو کو مستقل اپنی بیٹی بنالیں۔ امی جان نے اپنے جذبات کے اظہار میں خاصی جلدی کی تھی لیکن وہ بھی اپنی جگہ درست تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ نرجس بانو کی طرف سے مولوی صاحب کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ ہے تو شاید اس طرح کم ہوسکے۔ اس سے پہلے متعدد بار ایسے مواقع آئے، اُنھوں نے ہماری رائے جاننی چاہی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُن کے حکم سے سرتابی کی مجال ہم میں نہیں ہے۔ اس بار اُنھوں نے ہم

سے کوئی ذکر نہیں کیا، شاید اس لیے، اس لیے کہ ہم بھی کوئی اعتراض نہ کرتے۔" نواب کی آواز بھر بھرانے لگی تھی۔ "کتنی بار امی جان نے ہم پر زور دیا تھا اور جانے کہاں کہاں وہ دوڑ دھوپ کرتی رہی تھیں اور خود ہی مسترد کردیتی تھیں۔ خاندانی نجابت اور شرافت اُن کے ہاں پہلی شرط ہے لیکن اس مرتبہ تو اُن پر جیسے جادو ہوگیا تھا۔" نواب لفظ چباتے ہوئے بولا۔ "ہم آپ کو یہ سب یوں بتا رہے ہیں کہ آپ مولوی صاحب کے لیے اس گھر کی عزت و احترام کا اندازہ کرسکیں۔ بے شک امی جان نے عجلت کی تھی لیکن یہ عجلت مولوی صاحب ہی کی طمانیتِ قلب کی خاطر تھی۔ وہ سُن کے چپ رہے اور منکسرانہ کہنے لگے کہ نرجس بانو تو آپ ہی کی بیٹی ہیں۔ وہ اس سے کوئی بھی مفر کرسکتے تھے۔ یہی کچھ ہوتا ہے۔ امی جان نے تو ایک اشارہ کیا تھا، اپنی خواہش کا اظہار۔ بعض عرض گزاری تھی۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دیکھے بغیر وہ دوبارہ ایسی بات کبھی زبان سے نہ نکالتیں۔ مولوی صاحب کو تحمل کرنا چاہیے تھا۔ وہ شرفا میں آتے تھے۔ سمجھتے ہیں آپ؟"

"ہاں، ہاں۔" پیرو اچھل کے بولا۔ "اپن ابھی سب سمجھ رہا ہے۔"

"بس یہی کچھ احوال تھا۔" نواب تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی دیکھو، شاید وہ لوٹ کے آجائے۔"

نواب کے ہونٹ تک گئے۔ تندی سے بولا۔ "نہیں نہیں، اب شاید وہ کبھی نہ آئیں۔ واپس آنے والے اس طرح نہیں جایا کرتے۔"

"ابھی آپ ٹھیک ہی بولتا ہے پر آ بھی سکتا ہے۔ مجھ لاچار کا کبھی ادھر کو جانے تو اپن کا منتی ہے، ابھی آپ اپنے کو اُس کو بولے بنا چٹھی لکھ دینا، اپن پر بڑا احسان ہوگا۔"

"پہلے وہ آ تو جائیں۔" نواب نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

پیرو کی پُرتشویش نظریں میری طرف اُٹھ گئیں۔ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ میری طرف سے تسلی کرلینا چاہتا تھا کہ کوئی اور سوال جواب تو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ میرے دماغ میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں نواب سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ گوری جتنے دن یہاں رہی، زیادہ تر اُس کی ماں اور بہن کے ساتھ رہی۔ اُن دونوں نے اُس سے جانے کتنی باتیں کی ہوں گی۔ گوری اصل تو خاموش نہیں رہی ہوگی۔ جیسپر سے نکلنے کے بعد مولوی صاحب جانے اُسے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے۔ کتنے گھر، کتنے شہر بدل چکے ہیں۔ وہ کب تک پنجہ کو باندھے بیٹھے ہوئے رکھ سکے گی۔ مگر میں جیسے ہی نواب سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کرتا، میری آنکھوں میں دھند سی اُتر آتی۔

جب پیرو نے نواب سے اجازت چاہی، اُس وقت مجھے کچھ ہوش آیا۔ دوبارہ یہاں آنا ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے اوسان مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ میں نواب سے ایک التجا کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کچھ دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن سے ملا سکتا ہے۔ یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم مجھے اُن کمروں ہی میں لے چلے جہاں جہاں گوری رہی تھی، وہ مجھے اُس کمرے میں لے چلے جہاں وہ ٹھہری تھی۔ میں بس وہاں جاکے فوراً واپس آجاؤں گا۔ نواب نے اچھی طرح دیکھ بھی لیا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنی کوئی چیز بھول گئی ہو۔ مگر میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میری زبان تھر گئی تھی۔ میرا سارا وجود منجمد ہوگیا تھا۔ نواب کے حکم پر تازہ چائے آگئی تھی۔ نواب نے پیالی میری طرف بڑھائی، وہ میرے لرزتے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔ میں بمشکل ایک دو گھونٹ حلق سے اُتار سکا۔ نواب ہمیں روکنا چاہتا تھا لیکن پیرو اُٹھ گیا۔ اُس نے نواب کو بتا دیا تھا کہ ہمیں رات والی بمبئی کی گاڑی پکڑنا ہے۔ اب وقت کم رہ گیا ہے، دوسرے کچھ کام بھی نمٹانے ہیں۔ نواب عمارت کے باہر تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ اُس نے پیرو سے وعدہ لیا کہ جب بھی حیدرآباد آنا ہوگا، ہم اُس سے ملنے ضرور آئیں گے۔

مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ نواب ثروت یار کے گھر سے موٹر تک ہم کتنی دیر میں پہنچے۔ پیرو راستے بھر خاموش رہا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ دکانیں اور کھمبے روشن ہوچکے تھے۔ میں اپنے ہی پیروں پر موٹر تک آیا تھا لیکن بیٹھتے ہی میرا جسم ڈھیر ہوگیا تھا جیسے گلے میں پڑا ہوا پیرو کا ہاتھ بھی مجھ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے دابے رکھا تھا۔ موٹر تیز رفتاری سے سڑکوں پر گزرتی رہی۔ پھر وہ چارمینار کا علاقہ تھا جہاں پیرو نے ڈرائیور کو بڑے نواب کی حویلی چلنے کی ہدایت کی، میرے کان بجنے لگے۔ اُس نے ڈرائیور کو بڑے نواب ہی کی حویلی چلنے کے لیے کہا تھا۔ "نہیں دادا!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "سیدھے گھر چلو۔" میری آواز بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا رے بابا!" وہ چونکتے لہجے میں بولا۔ "ابھی تم نے چارمینار کا گھڑیال دیکھا ہے۔ ابھی اٹکے اپن سیدھا گھر پہنچ کے گھر ہی چلو دادا!"

"ابھی بس جاکے ایک دم ٹوٹ پڑے گا۔ اُدھر خانم دیکھ کے خوش ہو جائے گا۔ اُدھر سے اپنا ٹھکانے کا رستہ اتنا دور نہیں ہے۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اپن جانتا ہے، پر اپن ابھی یہ تو اُدھر جانے کا بولتا ہے۔ اُدھر جاکے ابھی جی بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔"

"نہیں دادا! میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اب کہیں اور مت چلو۔"

پیرو نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ ڈرائیور کو گھر کی طرف چلنے کا اشارہ کردیا۔ موٹر زیادہ دور نہیں آئی تھی، ڈرائیور نے وہیں سے موڑ لی۔ ابھی

سنبھل کے رہا جا!" پیرو نے سرگوشی میں کہا: "ابھی اپنی سوچتا ہے، اور وہ نہیں جاتا تو ٹھیک تھا۔ سمجھ کے نہیں گیا تھا۔ تو تو پہلے ہی نااہل ہاتھا۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ پیرو بھی چپ ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد موٹر آبا جان کی حویلی کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ حویلی میں دو موٹریں اور کھڑی تھیں۔ ہم اندر پہنچے تو نواب حشمت جنگ بھی موجود تھا۔ شامو، نورا اور مارفی وغیرہ نشست گاہ کے درمیان رکھے ہوئے چمڑے کے سوٹ کیسوں میں سامان رکھ رہے تھے۔ ہر طرف مختلف چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ساڑیاں، دوسرے کپڑے، چینی اور چاندی کے برتن، انگریزی بسکٹوں اور مٹھائیوں کے ڈبے، بلوری گل دان، سنگھار دان اور زیورات کے بکس، جانے کیا کیا بکھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آبا جان کو آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی نواب صوفے سے اٹھ کے لپکتا ہوا ہماری جانب بڑھا اور دونوں بازو پھیلائے وہ مجھے اور پیرو کو لیے ہوئے سامنے کی نشست پر بیٹھ گیا: "ابھی آپ تو پورا بازار اٹھا لایا نواب صاحب!" پیرو نے حیرت سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہے، ہمیں وقت ہی کتنا ملا، جو سامنے نظر آیا، جلدی جلدی اٹھا لائے۔" نواب حشمت جنگ نے انکسار سے کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: "ہم نے آپ کے لیے بہت سوچا کیا چیز لائیں۔ آپ کی پسند کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال کچھ لائے ہیں، شاید آپ کو پسند آئے۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میری زبان پر الفاظ لا کے رہ گئے۔ میں وہاں سے اٹھ جانا چاہتا تھا لیکن ایسے کس طرح اٹھ سکتا تھا۔ نواب نے اسی وقت جیب سے ایک مخمل پوش ڈبیا نکالی۔ اس میں ایک سنہری دستی گھڑی جگمگا رہی تھی۔ میرا ہاتھ تھام کے اس نے کلائی پر گھڑی باندھ دی: "کیسی ہے؟" وہ شگفتگی سے بولا۔

"بہت بہت اچھی ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اچھا ہوا جو پیرو نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور چینی کے برتنوں کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں فوراً وہاں سے اٹھ آیا اور باہر سبزہ زار کے سامنے چبوترے کی کرسی پر آ کے بیٹھ گیا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر میں وہاں بیٹھا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ ملازم آ جا رہے تھے اور ہر کوئی ٹھٹھک کے مجھے گھور کے دیکھتا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں آ کے بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر آ کے میرا سینہ اور دھڑکنے لگا۔ کورا کی مالا کے دانے جیسے میرے سینے میں پیوست ہوئے جاتے تھے اور جیسے مالا زنجیر بن کے میرے گلے کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر رہی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، جیسا کہ پیرو کہہ رہا تھا اگر ہم وہاں جانے کا ارادہ ہی نہ کرتے! مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ میں وہاں گیا ہی نہیں۔ کوئی فرق تو نہیں پڑا۔ میں تو خود پیرو کو وہاں جانے سے روک رہا تھا اس لیے کہ مجھے اُن کے بلاوے میں کسی حسن ظن کی توقع ہی نہیں تھی۔ میں دیر تک خود کو تسلیاں دیتا رہا لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ میرے سر میں اچانک شور مچنے لگتا اور بار بار بس یہی سودا سماتا کہ کسی طرح نواب ثروت یار کی کوٹھی پر پہنچ جاؤں اور جا کے اس سے التجا کروں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن سے بات کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ جب تک وہ مجھے یہ اجازت نہیں دے گا، اس کے دروازے پر پڑا رہوں گا۔ وہ نوجوان ہونے کے باوجود ایک سنجیدہ اور معقول آدمی ہے، میری بات نہیں ٹالے گا۔ میں اس سے کچھ چھین تو نہیں رہا، فقط یہی نہیں کہ اس کی ماں اور بہن نے کورا کی ساری باتیں اسے بتا دی ہوں۔ نواب ضرور سمجھ جائے گا۔ بصورت دیگر دوسرے طریقے بھی ہیں۔ میں رات کو کسی وقت کوٹھی کی دیوار پھلانگ کے اندر داخل ہو سکتا ہوں، پھر زنان خانے کا راستہ تلاش کر لینا ایسا مشکل نہیں ہوگا، تو اور تیجے کے سامنے وہ کچھ نہیں چھپا سکیں گی۔ میرا مقصد انھیں کوئی نقصان پہنچانا تو نہیں۔

بے اختیار میں بستر سے اٹھ گیا، پھر اس سے پہلے کہ دروازے سے نکلتا، میرے پیروں کو جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ اب میں کہاں جا سکتا ہوں، بیٹے یہاں حیدرآباد سے نکلنے کے لیے نواب حشمت جنگ کو کیا وہ کرنے میں سب کس عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ میرے رک جانے سے کیا وہ ٹھیر جائیں گے؟ وہ اب یہاں ایک پہر بھی مزید ٹھیرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نواب کے راضی ہو جانے پر سب نے سکون کی سانس لی ہے جیسے انھیں قید سے نجات مل گئی ہو۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سید کے بمبئی جاتے جاتے میں نے ہی ایک ساعت کے لیے مراد آباد رک جانے کا شوشہ چھوڑا تھا اور وہاں سارنگانے کے ذریعے مولوی صاحب کا پتہ ملنے کے بعد حیدرآباد آنے کے لیے ضد کی تھی اور ان کا راستہ کھوٹا کیا تھا ورنہ یہ سب کچھ یوں پیش نہ آتا۔ میں بمبئی جانے کے بعد بھی حیدرآباد آ سکتا تھا۔ اب میں کس منہ سے ان سے کہوں گا۔ ان سے کہے بغیر جاؤں گا تو انھیں اور آزمائش میں ڈالوں گا۔ اتنی مشکلوں کے بعد کہیں یہاں سے نکلنا ہو رہا ہے۔ میں وہیں بستر پر پڑا اپنے آپ کو کھسوٹتا رہا۔ نواب کی وسیع کوٹھی، محترم منزل کا نقشہ میری آنکھوں میں کھنچنے لگتا تھا۔ اسی عمارت کے در و بام میں وہ گھومتی پھرتی رہی ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس

کے اس قدر قریب ہوں، ایک گھنٹے سے کم کی مسافت میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ وہ ابھی دنوں اس شہر میں تھی جب میں اور پیرو بڈھے نواب کی حویلی کے زنداں سے فرار ہونے کے لیے دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے۔ اگر ہم اور چند دن پہلے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو پیرو اسی طرح روانہ ہونے سے پہلے ایک بار نواب ثروت یار کی کوٹھی کا رخ ضرور کرتا اور، اور ...... یہ سوچ کے میرا جسم لرزنے لگتا۔ وہ بھی تو ادھر زنداں ہی میں تھی، گھٹے ہوئے زنداں کے زنداں میں۔ وہ دن اس کی دعاؤں کی قبولیت کا بھی ہوتا مگر قبولیت کی گھڑی تو طے ہوتی ہے۔ وہ گھڑی آئی ہوتی تبھی تو ایسا ہوتا۔

مارفی کی آواز سن کے میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ وہ مجھے بتانے آیا تھا کہ سب روانگی کے لیے تیار ہیں۔ میں کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ چبوترے پر سبھی میرے منتظر تھے۔ میرے آنے کی دیر تھی کہ سب سامنے کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ حویلی کے کئی ملازم صدر دروازے پر موجود تھے، موٹریں چند ثانیوں کے لیے اُن کے وداعی سلام کا جواب دینے کے لیے ٹھیریں اور سڑک پر آ گئیں۔ میں، مارفی، نورا اور شامو پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ جھبرا و لنگو تھے۔ موٹر میں خاموشی تھی۔ سب مضطربانہ ادھر ادھر سڑکوں پر چلتی گاڑیوں اور گزرتے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ انھیں اپنی روانگی کا یقین نہیں آ رہا ہوگا اور ان کی دہشت زدہ خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں ابھی تک اپنے تعاقب کا اندیشہ لاحق ہو۔ وہ پلٹتے میں پیش آنے والی کسی رکاوٹ کی طرف سے شاید ابھی تک مطمئن نہیں تھے۔ کبھی کبھی آدمی اپنے سائے پر بھی شک کرنے لگتا ہے۔ موٹر جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، ان کی بے چینی فزوں ہوتی گئی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ دکانیں یا تو بند ہو گئی تھیں یا بند ہو رہی تھیں۔ پھر جب دور سے اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں تب انھیں کچھ قرار آیا۔ مارفی مجھے کہنیاں مارنے لگا اور اگلی نشست پر لنگو کے نتھنے دیہے دیکھ کے سب ہنس پڑے۔ میں نے بھی ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن میں جھکی جھکی آنکھوں سے انھیں دیکھا کیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر موٹریں ٹھیرائی جا رہی تھیں کہ شیروانیوں میں ملبوس دو ادھیڑ عمر آدمی تیزی سے ہماری طرف بڑھے، انھوں نے ہی دروازہ کھولا اور آبا جان اترے تو سلام کیا۔ ان کے اشارے پر کسی تاخیر کے بغیر ایک جانب انتظار میں کھڑے قلیوں نے سامان اٹھا لیا۔ پلیٹ فارم پر گاڑی لگی ہوئی تھی اور ہر طرف شور اٹھا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے دروازے سے ریلوے کا ایک افسر بھی اُن دو آدمیوں کے ساتھ ہو گیا اور کچھ دیر بعد ہم فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے رک گئے۔ یہاں ہجوم نسبتاً کم تھا۔ برابر برابر دو ڈبے ہمارے لیے مخصوص کیے گئے تھے، ان کے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ مجھل کی ہدایت پر مارفی نے کانتے کا بازو پکڑ کے سب سے پہلے اسے ڈبے پر چڑھانا چاہا۔ مجھے کانتے کا دھیان ہی نہیں رہا تھا، اب جو اس پر نظر پڑی تو میں ٹھٹک کے رہ گیا۔ اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ سفید شال سے اس کا سارا جسم چھپا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کی سوجن اور تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اسے تیز بخار ہے۔ مارفی نے اس کا بازو پکڑا تو اس نے اسے جھٹک دیا اور اپنے ہاتھ سے ڈنڈا پکڑ کے اوپر چڑھا۔ وہ اپنے سہارے سے ڈبے پر چڑھ تو گیا لیکن اسے پوری قوت مجتمع کرنی پڑی ہوگی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور لگتا تھا کہ جسم پیروں پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ اندر جا کے وہ نشست پر لیٹ گیا۔ مارفی نے ڈبے سے اتر کے سرگوشیانہ انداز میں مجھل کو بتایا کہ کانتے کا بدن بری طرح جل رہا تھا۔ مجھل سن کے رہ گیا۔

ہم ڈبے کے باہر کھڑے تھے، ہمیں وہاں آئے چند منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ دو آدمی بڑے بڑے ناشتے دان اور سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی ٹوکریاں اٹھائے تیز تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ جن آدمیوں کی رہنمائی میں ہم ڈبے تک آئے تھے، انھوں نے بعجلت دونوں چیزیں اپنی تحویل میں لے کے ڈبوں میں رکھ دیں۔ کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ نواب حشمت جنگ نے زادِ راہ کے طور پر کھانے پینے کا سامان بھیجا تھا، چند قدم کے فاصلے پر وہ خود بھی موجود تھا اور کشاں کشاں ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ عین وقت پر آیا۔ ادھر وہ آیا، ادھر گاڑی کی روانگی کے لیے پلیٹ فارم کی گھنٹی بجنے لگی۔ نواب حشمت جنگ باری باری سب سے بغل گیر ہوا۔ سب سے آخر میں میرے پاس آیا کیونکہ میں سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ نواب کو وقت بھی نہیں ملا۔ سب جلدی جلدی ڈبوں میں چڑھ گئے۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی تھی۔ جب تک نواب حشمت جنگ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا، پیرو اور شامو دروازے پر کھڑے رہے۔

میں کانتے کے پاس اس کے ڈبے میں

لیکن اس طرف آبا جان، مجھل اور

ارادہ بدل دیا اور دوسرے ڈبے میں آ گیا۔ یہاں

جھبرو، مارفی اور لنگو موجود تھے۔ اسٹیشن پر

کہ ہجوم میں کہیں گم ہو جاؤں، وہ گاڑی میں بیٹھ جائے

بات کر رہا تھا کہنے لگا کہ اپنی بیوی کے آرام کی خاطر اُس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا ہے۔ اُس کی بیوی ڈبے کے پاس کچھ فاصلے پر ہی کھڑی ہوگئی تھی۔ سر سے پیر تک سفید برقع بلکہ کسی قدر زمین کی طرف مائل ڈھلکا ہوا۔ اس دوران میں ٹی ٹی بھی نیچے اُتر کے اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"آپ کو اُدھر تکلیف ہوگی میاں صاحب!" پیر نے تحمل سے کہا۔

"تکلیف تو آپ کو ہوگی۔" وہ لجاجت سے بولا۔

پیر نے قجل کی طرف دیکھا۔ قجل کا مذبذب دیکھ کے وہ شخص کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ قجل نے ہاتھ اٹھا کے کہا: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے میاں صاحب! پر اگلے اسٹیشن پر آپ کو ٹھکانا ڈھونڈ لینا۔"

اُس نے ممنونیت کی نگاہ سے قجل کو دیکھا اور بے ترتیب لفظوں میں شکریہ ادا کرنا چاہا۔ ساتھ ہی اُس نے قلی کو حکم دیا کہ وہ سامان اندر رکھ دے اور جلدی کرے۔ قلی نے ہینڈ بیگ دروازے میں بڑھا دیا۔ معاً قجل نے اُسے روک دیا: "ابھی ایسا کرو میاں صاحب! آپ اپنے برابر کے ڈبے میں بیٹھ جاؤ۔ اُدھر آپ زیادہ آرام سے بیٹھے گا۔"

"جی جی ہاں۔" وہ انتشار زدہ مستعدی سے بولا۔

"اُدھر سے ہم آدمی تھوڑے کم کر لیں گے۔ اچھی جگہ آپ کو مل جائے گی۔"

"جگہ کیا جناب! آپ کی مہربانی ہے کہ……" اُس نے سوالی آواز میں کہا۔

"ہم کو یہاں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تھوڑی دور کی تو بات ہے۔"

"اُدھر اپنے ساتھ ایک بیمار بھی ہے۔ عورت کے سامنے اُس کا ایسا لیٹے پڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ کسی توقف کے بغیر بولا۔ "وہ بے شک آرام کر لیں۔"

"پرائے کو اچھا نہیں لگتا۔ اگلا ڈبا بھی اپنا ہی ہے۔ آپ بولنگے تو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"جی جی۔" اُس نے کسی قدر بدحواسی سے کہا۔

"جلدی کرو میاں صاحب! سیٹی بج گئی ہے۔" قجل نے تندی سے کہا اور قلی کو ساتھ والے ڈبے میں سامان رکھنے کی ہدایت کی اور مجھ سے کہا کہ میں ٹامو، جمرو اور ٹنگو کو وہاں بھیج دوں۔

"آدھ گھنٹے کی تو بات……" مگر اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ قجل تیزی سے اُتر گیا۔ قلی کو جھڑکنے کے انداز میں اُس نے عجلت کی تلقین کی۔ عورت قلی اور اپنے شوہر کو بڑھتا دیکھ کے چند قدم اور آگے آگئی۔ اِدھر میں نے لپک کے جمرو، ٹامو اور ٹنگو کو ڈبا خالی کرنے کا اشارہ کیا۔ ٹامو پہلے ہی نیچے تھا۔ تینوں بھی دروازے پر کھڑے تھے۔ فوراً اُتر گئے۔ قلی نے آدمی اور عورت کے ڈبے میں چڑھنے سے پہلے سامان رکھ دیا تھا۔ پہلے وہ دونوں اوپر گئے، پھر قجل اور پیر۔ مجھے پیر سے پوچھنے کا موقع نہیں ملا کہ اُسے آیا جان کے ڈبے ہی میں رہنا چاہیے۔ وہاں

سے دونوں کا آ جانا مناسب نہیں تھا۔ اُن کی عدم موجودگی میں زورا، جمرو، ٹامو اور ماسٹی وغیرہ کوئی الٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے تھے۔ اُس وقت کسی کا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ مجھے قجل نے کچھ نہیں کہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ آیا جان کے ڈبے میں چلا جاؤں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا اور قجل سے پوچھے بغیر اوپر آ گیا۔ قجل نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ عورت منہ دوسری طرف کیے ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ برقع کے باوجود صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت سہمی ہوئی ہے۔ بیگانے مردوں کے درمیان بیٹھنے کا اُسے پہلی بار اتفاق ہوا ہو۔ قجل نے اوپر جا کے اُس شخص سے کہا: "آپ بولو تو ابھی ہم تینوں بھی اُدھر دوسرے ڈبے میں چلے جائیں؟"

"نہیں نہیں۔" وہ معذرتی آواز میں بولا۔ "آپ کو ہماری خاطر بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ شاید مجھ سے جلدی ہوگئی۔ ابھی کچھ وقت تھا۔ میں کوئی معقول جگہ تلاش کر سکتا تھا۔"

"اُدھر بھی کیا جاتا ہے۔" قجل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں، پیر اور قجل تینوں مخالف برتھ پر بیٹھ گئے۔ ہم نے کوشش کی کہ عورت کا آمنا سامنا نہ ہو لیکن وہ ایک مختصر ڈبا تھا۔ قجل نے ٹھیک جلدی کی تھی۔ گاڑی کو پیچھے جانے نہ دینے میں تیری نے کا انتظار تھا۔ چند ہی لمحوں بعد انجن نے سیٹی دی اور گاڑی جھٹکے لیتی ہوئی کھسکنے لگی۔ قجل نے مجھے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ پلیٹ فارم کی طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بند کر دیا اور دوسرے پر کھڑا ہو کے انہیں گزرتے دیکھتا رہا۔ دوسرے ڈبے کے دروازے پر لالی اور شامو مجھے دیکھ کے ہاتھ ہلانے لگے۔ اُس سے اگلے ڈبے پر دھاڑی بھی موجود تھا۔ وہ اُس کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ دروازے کے ڈنڈے پر اُس کا ہاتھ جما ہوا تھا لیکن جسم اندر ہی کی جانب تھا۔ پھر روشنیاں کم ہونے لگیں اور گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ اُترے چلے جاتے تھے۔ گاڑی چھوٹنے پر بھی اپنا وجود دھکا دیکھا کے رہ ہو رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کے دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ یکایک میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ قجل اور پیر کے ہاتھوں میں تپنچے دبے ہوئے تھے۔

اُس شخص کا منہ کھلا ہوا تھا اور دیدے باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ بالکل ہکّا بکّا ہو رہا تھا۔ میرے حواس گنگ ہو گئے تاہم بے اختیار میں نے بھی اپنا تپنچا نکال لیا۔

"اس سے بولو کہ منہ سے آواز بھی نہ نکالے۔" قجل نے اونچی آواز میں کہا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کیسی ہے۔ میرے کان سنسنا رہے تھے۔ قجل نے اُسی شخص کو مخاطب کیا تھا مگر اُس پر سکتہ طاری تھا۔ اُس کے لب پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

"دادا! اس کو سنائی نہیں دیتا شاید۔" قجل نے نرم لہجے میں کہا۔ "مرد کو کبھی کو بھی کچھ دینا پڑتا ہے کھانے کو۔"

"دُوں، ہاں! قجل بھائی! اُٹھے گا! ابھی مزہ آئے گا۔" پیر کی آواز جل رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور گرج کے بولا: "سنا نہیں تو نے؟ چلے کتنا پہن لیا ہے۔ ابھی تو تھوڑا جسم ہے۔ اُتار دے اس کو۔"

"کیا کیا جناب آپ کیا…… آپ کیا فرماتے ہیں……" اُس آدمی کی زبان گویا حلق میں اٹک گئی۔

"تپنچہ نکال کے ابھی اِدھر کو ڈال دے۔" پیر نے دہاڑ کے کہا۔ "دیر کی تو ہم کو نہیں۔"

"تم لوگ، آپ کیا بولتے ہیں؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "ہتھیار؟ اپنے پاس ہتھیار بھلا کیا؟"

"دیر کرنے کا نقصان زیادہ ہو جائے گا اسے۔" قجل نے کہا۔

اُس شخص کا پورا جسم دھڑک رہا تھا۔ عورت بھی الف ہو کے بیٹھ گئی تھی اور اُس نے برقع کو کس کے لپیٹ لیا تھا۔ پیر تپنچا تانے اُس کی طرف بڑھا اور تین چار قدم میں اُس کے سر پر جا پہنچا: "ابھی ایسا تماشا نہ لگانے کا۔ بھی کوئی ڈراما نہیں ہے کہ تھوڑا لکھا لیا ہے کر انہیں……!" پیر نے انتظار نہیں کیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا تپنچے والا ہاتھ برقع پوش کے سر پر پڑا۔ برقع پوش کا جسم اضطراری حالت میں پیچھے کی طرف گرا جیسے ڈبے کی دیوار تھی۔ نتیجہ برقع کی جالی بھی اوپر ہوگئی۔ پیر نے جالی والا حصہ پکڑ کے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ نیچے گریبان تک کپڑا چر گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے اُبل آئیں۔ برقع کے پیچھے اُس کا چہرہ ایک مرد کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ گھنی مونچھیں، چمکتی آنکھیں اور سیاہ بھرے ہوئے ہونٹ۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ گورا گندمی تھا۔ پیر نے دوسرے جھٹکے میں برقع ٹانگوں تک چیر دیا۔ پیچھے وہ کیا ہی ناقابلِ یقین منظر تھا لیکن میں پوری تندہی سے اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کھلے ہوئے نتھنے اور انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اُس کا تپنچا نہ جانے کہاں دبا ہوا تھا۔ اُس کی حشمت میں بھی فرش پر گر پڑا۔ پیر نے اُس کے گال پر پوری طاقت سے طمانچہ مارا اور پھر لات ماری۔ نہ سہہ سکا۔ کھڑکی کے کونے سے اُس کا سر ٹکرایا۔

قجل جلنے کی برتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ دوسرے آدمی کے پاس بھی ہتھیار ہونے چاہئیں۔ مگر ناگہانی دیکھ کے وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ اُس کے پاس ہتھیار ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر احتیاطاً بہتر تھا کہ میں نے جھپٹ کے اُس کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹ گیا۔ میرا ہاتھ اُس کے گریبان پر چلا گیا لیکن میں نے فوراً گریبان چھوڑ دیا۔ اِس طرح میرا ہاتھ گھوم گیا۔ ایک ہاتھ تپنچے کی وجہ سے پہلے ہی گھرا ہوا تھا۔ تپنچا بائیں ہاتھ میں لے کے میں نے اُس کی واسکٹ کی بیرونی جیبیں ٹٹولیں۔ اُن میں کچھ نہیں تھا۔ البتہ اندر کی جیب سے چار انچ کا کھلنے والا چاقو برآمد ہوا۔ چاقو فرش پر پھینک کے میں نے اُس کی شال کھینچی اور کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس نے بھی بلند ہو کے مزاحمت کی لیکن میری ایک ہی ضرب سے وہ سنبھل گیا۔ کرتے کی جیب میں تپنچا پڑا ہوا تھا اور ہتھیاں کے نیچے کے گرد کارتوسوں کی پیٹی بندھی تھی۔

پیر نے برقع پوش کو بھی خالی کر دیا تھا۔ اب وہ عجب بیٹ کوائی کے عالم میں تھا۔ برقع جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اُس کا ایک حصہ شانے پر جھول رہا تھا۔

پیر اُس پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ میرے جانے والا شخص بھی بری طرح گھگھیانے لگا۔ اُس کی بانہیں بھیگی ہوئی اور زرد رنگ ہو گئی تھیں۔ میں نے اُس کے زیرِ ناف پر ٹھوکر ماری۔ وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ اُسے اپنے پیروں سے دور کرنے کے لیے میں نے اُس کے سر پر تپنچے کے دستے سے ضرب لگائی۔ وہ چیختا ہوا اُچھلا۔ اُس کے ہاتھ جیسے ہی میرے پیروں سے چھٹے، میں نے اُس کی ٹھوڑی پر گھٹنے کی ضرب رسید کی۔ وہ فرش پر کمر کے بل لوٹ گیا۔ میں اُسے اور ٹھوکریں لگانا چاہتا تھا کہ قجل کی آواز نے میرے ہاتھ پیر جکڑ لیے: "ابھی تھوڑا وقت دے دے اس کو۔" اُس نے درشتی سے کہا۔ آدمی کی ٹوپی کب کی گر چکی تھی۔ میں نے بال پکڑ کے اُسے فرش سے اُٹھایا اور برتھ پر دھکیل دیا۔ وہ بلبلاتا ہوا سکڑ کے بیٹھ گیا۔

"اُدھر کو آ جائے۔" قجل نے مجھ سے کہا۔ "ابھی ان سے اُن کی ماں کے یاروں کا پتہ بھی کرنا ہے کون کون ہیں وہ زندگی کے بھنے۔"

پیر نے بھی سُن لیا تھا۔ وہ برقع پوش کے پاس سے ہٹ آیا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے سے گز بھر کے فاصلے پر بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ برقع پوش کے ہونٹوں سے خون کی لکیر ٹھوڑی تک بہہ چلی تھی۔ اُس کی ناک بھی سوجی ہوئی تھی۔

"ابھی کتنا ساتھ میں ہے کتنا آدمی؟" پیر نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"کوئی نہیں کوئی بھی نہیں۔" برقع پوش آدمی گڑگڑا کے بولا۔ "ہم بالکل اکیلے ہیں مائی باپ!" صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"ایں، پوچھتا ہے ابھی کتنا آدمی ساتھ ہے؟"

"سات۔" برقع پوش کے بجائے شال والے آدمی نے سٹپٹائی آواز میں کہا: "اپنے ساتھ سات آدمی اور ہیں۔"

"یہ تھوڑا اپنے کو مسخرہ لگتا ہے۔"

"دھوپ زیادہ لگی ہے دادا اس کو۔"

"کیدر کیدر بیٹھا ہے؟"

"پانچ اس طرف والی بوگی میں ہیں۔ باقی دو پیچھے کی بوگی میں ہیں۔ سارے انٹر کلاس میں ہیں۔"

"اور اُدھر بازو والا فرسٹ کلاس میں بیٹھا اپنے باپ کو بھول گیا؟"

"بازو والے میں کون؟" وہ بدحواسی سے بولا۔

"یہ بھی ابھی ایکٹنگ بولے گا۔" پیر نے غضب آلود لہجے میں کہا۔ "دیکھ سالا! ابھی سیدھا سیدھا بولے گا تو اپنے ساتھ ہی بھلا کرے گا۔ بات تھوڑا کم کرو اور سیدھا کرو۔"

"ہم اُن کو نہیں جانتے جناب!"

"نہیں جانتا؟" پیر نے بڑھ کے اُس کی دونوں کنپٹیاں پکڑیں اور انھیں سے ہلانے لگا: "نہیں جانتا تھا؟"

"ہم کو نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں۔" وہ سسکتی آواز میں بولا۔ "ہم کو اپنی ماں کی قسم، اپنے خدا کی قسم، آپ کو ضرور دھوکا ہوا ہے۔ ہم قسم کھاتے ہیں۔"

ہاتھ مارا، پھر گردن دبوچ کے اسے جھٹکا دیا اور ایک ٹائینے ... کر کرسی سے گھسیٹ لیا۔ درمیان میں رکھی ہوئی کرسی کی جگہ سے مجید کے جسم میں چوٹ ہوئی ہوگی۔ اس اچانک افتاد پر کسی کے بھی ہوش و حواس برقرار نہیں رہ سکے۔ مولوی اکرم کی بھی چیخ نکل گئی۔ وہ پیر کا ہاتھ روکنے کے لیے اس کی طرف جھپٹے اور واویلا کرنے لگے۔ جمیل نے بڑھ کے ان کا بازو پکڑ لیا اور جھڑکتی آواز میں انھیں ایک طرف کھڑے رہنے اور خاموش رہنے کی تاکید کی۔ مولوی اکرم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ مجید کو کرسی سے گھسیٹ کر پیر کاؤنٹر کے باہر لے آیا۔ اس نے اسے ایک لمحے کا موقع بھی نہیں دیا۔ پے در پے اتنی ضربیں لگائیں کہ اس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس کا گلا اور منہ لہولہان ہو گیا۔

ہوٹل میں افراتفری پھیل گئی۔ سب لوگ کرسیاں چھوڑ چھوڑ کے چیختے چلاتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دوڑے۔ ایک ساتھ کئی چاقو کھلنے کی آوازیں آئیں مگر جمیل اور حبیب تیار کھڑے تھے۔ ہم نے بھی چاقو نکال لیے لیکن کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مجید سے نمٹ کے پیر چشم زدن میں پلٹا اور اپنی طرف دوڑتے ہوئے آدمیوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس نے غراتے ہوئے کہا: ”ابھی ایک ایک آگے آئے گا یا سب ساتھ میں؟“

یکایک وہ سب ٹھٹک کے رک گئے۔ ایک جانب سے کسی نے چیخ کر کہا۔

”دادا پیر دلوا!“ اسی لمحے ہوٹل پر سناٹا چھا گیا۔

”آؤ باپ! ابھی تم رک کیوں گیا کتے کا اولاد۔“ پیر دوبارہ دہاڑا لیکن وہ لوگ حیرت بھری نظروں سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ ان میں سے کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ جو شخص سب سے پہلے آگے آیا تھا اس کا چہرہ دیکھا ہوا جانا پہچانا تھا مگر اس کا نام مجھے یاد نہیں آیا۔ وہ سر جھکائے چاقو بند کیے آہستہ آہستہ پیر کے قریب آیا اور جھک کے اس نے اپنا چاقو پیر کے قدموں میں ڈال دیا۔ مجید ایک طرف نڈھال سا پڑا تھا۔ پیر کے نام پر اس نے بھی سر اٹھا کے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ وہ بری طرح بلکنے لگا۔ پیر نے ٹھوکر مار کے اسے خود سے دور کردیا۔ مجید نے کاؤنٹر کے پاس سراسیمہ کھڑے ہوئے مولوی اکرم کے پاؤں پکڑ لیے اور دہائیاں دینے لگا۔ مولوی اکرم تو خود ہی لرزاں تھے۔ انھوں نے وحشت سے جمیل کی جانب دیکھا۔ جمیل نے مجید کے بال پکڑ کے اٹھایا اور اسے اپنے چہرے کے سامنے کر کے غور سے دیکھا۔ میں نے چاہا کہ کاش جمیل اس کے منہ پر تھوک دے مگر جمیل نے اسے دوبارہ پیر کی طرف دھکیل دیا۔

وہ زمین پر لڑھک گیا۔ پیر نے اس کے منہ پر پنجہ مار کے انگلیاں گاڑ دیں اور جب اس نے پنجہ کھینچا تو مجید بھی ساتھ ساتھ اٹھتا گیا: ”ابھی بولے تو یہ سارا بے چٹیا الو تیرا اماں بہن کو اٹھا کے ادھر لائے؟“

مجید کا چہرہ جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا۔ خون چھلکنے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیایا: ”اپن کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ تمھارا آدمی ہے، پیر دادا کا آدمی۔“

”جو اپن کا آدمی نہیں ہے گا، اس کو تم بھگوڑی آنہ دے گا؟ اس کا نام

داڑھی نوچنے لگا۔ ”ابے سالا ابھی تم کو کس نے بولا ہے کون زندگی کا جنا ادھر کا دادا ہے؟ اپن جانے سے پہلے بالے کو ادھر چھوڑ کے گیا تھا۔“

”ابھی وہی ادھر ہے دادا۔“ عکسی نے دبی زبان میں کہا۔

”وہی ہے تو پھر اس کا دوسرا ابھی پھوٹ گیا کیا؟ ابھی وہ کدھر ہے؟ بن گیا کیا؟ اپن اس واسطے بسوا کا جگہ اس کو دے کے گیا تھا کہ وہ علاقے کے سب لوگ پر ہاتھ ڈالے؟“ پیر بالے کو گالیاں بکنے لگا۔ پھر ایکا ایکی مڑ کے مجید سے بولا: ”وہ حرام کا جنا تیرا دادا بنیا ابھی کدھر ہے؟“

”اس کا کوئی دوش نہیں ہے دادا۔“ مجید گڑگڑا کے بولا۔ تکلیف کی شدت میں اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

”ابھی کدھر ہے وہ؟“

”وہ گھر پہ ہوگا مائی باپ!“

”اس کو ابھی ادھر بلاؤ۔“

”اپن اس کا منہ کالا کر کے ابھی آنکھاں دادر میں گھمائے گا۔“

”ابھی رحم کر دو دادا! ایک موقع اور دو، اپن دوبارہ ایسا نہیں کرنے کا۔“ مجید ہذیانی انداز میں بولا۔

پیر نے بڑھ کے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور چہرہ اوپر اٹھا کے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ مجید بلبلا اٹھا اور فرش پر لوٹنے لگا۔ ”تیرا حساب ابھی لیا ہے سور کا اولاد۔“

سب ساکت کھڑے تھے۔ سبھی نے اپنے چاقو جیبوں میں رکھ لیے تھے۔

اچانک باہر سے شور اٹھا۔ سب ہڑبڑا گئے۔ وہ بالے تھا۔ ایک تنومند قد نکلتے ہوئے گندمی رنگ کا بالے۔ اس کی ایک آنکھ پیدائشی بند ہی ہوئی تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا مگر سامنے آنے کے بعد ہی پہچان سکا۔ بالے تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کی نظر سیدھی پیر پر گئی۔ اپنے ساتھ آنے والوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا وہ بے تابانہ پیر کی طرف لپکا: ”دادا! دادا تم کب آئے؟ خبر بھی نہیں دی۔“ اس کی آواز پر اضطراب طاری تھا۔ آتے ہی وہ پیر کے پیر چھونے کے لیے جھکا۔ پیر پیچھے ہٹ گیا: ”تیرا ایم آگیا ہے بالے!“

”کیا..... کیا ہوا دادا! کیا بول رہے ہو؟“ بالے نے جنونی انداز میں پوچھا: ”ایسا کیا ہوگیا جو تم ادھر آئے ہو؟ پیر دلوا ادھر آیا ہے؟“

”ہاں اللہ کی آیا ہے اور اس واسطے آیا ہے کہ تو ابھی بادشاہ سلامت بن گیا ہے۔“

”اپن کو بولو دادا!“ بالے نے گڑگڑا کے کہا: ”اپن کا سر اتار لینا پر اپن کو خطا بولو۔“

”خطا؟“ پیر بھڑک کے بولا: ”ابھی خطا پوچھتا ہے کٹی کا! اس کتے کو پالا کو نہیں جانتا؟“ اس نے مجید کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ذہنی حالت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ بالے کو چیتے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ چیتے کی شہرت سے وہ خوب واقف تھا مگر چیتا اُسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ بالے نے یہ فن کہاں سے سیکھا ہے۔ بالے کو بتایا گیا تھا کہ وہ ہر بار آخری معرکہ سمجھ کے چاقو اٹھائے۔ نوجوانی کے باوجود بالے استقامت کا ثبوت دیتا رہا۔ وہ چھیڑ چھیڑ کے چیتے کو پہلے سے زیادہ مشتعل اور منتقم کرتا رہا۔ اس دوران چیتا ایک اور کاری وار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے بالے کی بائیں بھنوں کھول دی۔ چاقو بالے کے ماتھے پر نشان ڈالتا ہوا بھنوں کو بیچ سے کاٹ گیا۔ بالے کی بائیں آنکھ میں خون بھر گیا۔ چہرہ لال ہو گیا۔ کپڑے بھی تر بتر ہو گئے لیکن بالے کا عزم زخمی نہیں ہوا۔ وہ چیتو چنار۔ اُس نے بھی ایک غلطی کی تھی اور وہ یہ کہ مدافعت کرنے اور چیتے کو مشتعل کرنے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگا دیا۔ اس کا اندازہ اُسے بعد میں ہوا جب پہلی بار مدافعانہ رویہ ترک کر کے اُس نے چیتے پر حملہ کیا۔ اتنی شگفتگی اور اتنی تیزی کے بعد چیتے کو یقیناً ایسی توقع نہ ہوگی۔ جو شخص مسلسل جاری رہا ہو اُسے مدافعت پر آجانے میں کچھ لمحے ضرور لگتے ہیں۔ انہی منتشر لمحوں میں بالے نے اس پر کاری وار لگائے۔ بالے کا چاقو بہت بے پناہ تھا۔ معدے سے ناف تک چیتے کا پیٹ چاک کر کے ہی اُس کی تشفی کچھ ہوئی۔

چیتا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اُس کے دونوں ساتھی وہاں سے بھاگ لیے۔

بالے بھی زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ اگر مدافعت ترک کرنے کا فیصلہ کچھ دیر پہلے کر لیتا تو اتنا خون نہ بہتا اور اُس کی آنکھ بھی بچ جاتی۔ بھنوں کا زخم آنکھ تک کھل گیا تھا۔ آنکھ میں خون الگ جم گیا تھا۔

بالے گرفتار کر لیا گیا لیکن گلابی اور سازندوں کی شہادتیں اُس کے حق میں تھیں۔ بالے اکیلا تھا۔ مخالفوں کی تعداد تین تھی اور پہلے چیتے نے بالے پر وار کیا تھا۔ اُس وقت تک خوش قسمتی سے بالے کسی بھی جرم میں جیل نہیں گیا تھا۔ اُس کی عمر بھی کم تھی۔ دوسری طرف چیتا اور اُس کے ساتھیوں کا مکمل ریکارڈ پولیس کے پاس محفوظ تھا۔ مقدمے میں زیادہ دن نہیں لگے۔ بالے کو پانچ سال کی سزا ہو گئی۔ جیل میں گلابی تواتر سے اُس کے پاس جاتی۔ اُس نے بالا خانہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ بالے کو جیل سے جلد ہی چھٹی مل گئی۔ اپنے اچھے کردار اور سزا میں عام تخفیف ہو جانے کے سبب وہ جیل کے دروازے سے نکلا تو گلابی اُس کی منتظر تھی۔ پھر بالے پاڑے کی طرف نہیں گیا۔ چند دنوں بعد دونوں نے پیر کی موجودگی میں شادی کر لی۔ بالے کو علاقے کے کسی تاجر کے مکان میں ایک مختصر کوارٹر مل گیا۔ یہ ایک مشکل زندگی تھی لیکن اس نئی زندگی سے دونوں بہت خوش تھے۔ پیر اُن کے گھر دو تین بار گیا۔ گزر بسر کے لیے پیر کی اعانت سے بالے نے بندر بازار میں ایک چائے خانہ کھول لیا۔ یہ چائے خانہ ایک مکان سے بڑا نہیں تھا مگر دکان اچھی چل نکلی۔ بالے کو گھر بسائے دو ماہ کے قریب ہوئے تھے کہ ایک رات

وہ دن بھر چائے خانے میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچا تو گلابی زندہ نہیں تھی۔ اُس کی برہنہ لاش کمرے میں پڑی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ گلابی آخر تک مزاحمت کرتی رہی۔ بالے کے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہ رہ گئی۔ پیر اُسے پاڑے لے آیا اور پھر اُسے وہاں سے نہیں نکلنے دیا۔

بعد میں بالے نے کھار کے علاقے میں چیتے کے ایک ایک ساتھی کو ڈھونڈ کے ختم کر دیا۔ پیر سمجھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا لیکن اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی بالے کو قرار نہیں آیا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایک دم دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ اب پیر کو فکر لگی ہوئی تھی کہ اُس نے بالے سے کچھ زیادہ تو نہیں [illegible] ڈر رہا تھا کہ اگر بالے پر پھر جنون طاری ہو گیا تو [illegible] نہ جانے کون کون اُس کا نشانہ بن جائے۔ وہ عید کے ہوٹل کو کہیں پھونک نہ ڈالے۔

بالے کو میں نے کئی بار دیکھا تھا اور تھوڑی دیر پہلے بھی دیکھا لیکن یوں ہی سرسری۔ اب اُسے قریب سے نہ دیکھنے کا مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ ہم کتنے لوگوں سے بس سرسری گزر جاتے ہیں۔ ہر آدمی سائے کی طرح ایک کہانی ساتھ لیے پھرتا ہے۔ "سرسری ہم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا"

بالے کو دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لیاری کا کوئی اتنا بے انتہا شکستہ ہے، اتنا زخمی ہے۔ تجمل بھی پورے انہماک سے اُس کی روداد سنتا رہا۔ راستہ گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کوچوان نے ایک جگہ گاڑی آہستہ کر کے ہم سے اپنی منزل کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو ہم کچھ نہ سمجھ پائے۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں کرشنا جی کے زمانے میں اور پھر بلندے میں یہاں کے گھر بننے کے بعد اُنہی راستوں سے آیا جایا کرتا تھا۔ میں نے ٹم ٹم سے اُدھر نظر دوڑا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جولین کا گھر پیچھے رہ گیا تھا۔ کوچوان نے گاڑی روک لی۔ اُس نے بروقت پوچھ لیا تھا۔ ابھی ہم زیادہ آگے نہیں آئے تھے۔ سامنے تھوڑا آگے چوراہا ہے، کچھ ہی دور ہماری منزل تھی۔ ہم نے چوراہے پر ٹم ٹم والے کو رخصت کر دیا اور باقی راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ پورا علاقہ رہائشی تھا اس لیے سڑکوں پر اتنی روشنی نہیں تھی۔ سات آٹھ منٹ کی چہل قدمی کے بعد ہم جولین کی گلی میں داخل ہو گئے۔ پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ اُس نے صبح ہی سے ہمارا انتظار شروع کر دیا ہو گا اور اب رات ہو جانے کے بعد بھی مایوس نہیں ہوئی ہو گی۔ کاش کاتے اور ماریا نے اُسے میرے اور تجمل کے بارے میں کچھ نہ بتایا ہو۔ ہم اچانک پہنچیں گے تو اُس کا عالم دیکھنے کا ہو گا مگر کاتے اور ماریا سے اس ضبط برداشت کی توقع نہیں تھی۔

گھر قریب آنے پر میری بھی گھبراہٹ سی لگی۔ جولین کے خیال سے آنکھوں میں کرشنا جی کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ مکان کے باہر خاموشی تھی۔ دروازے کے قریب لگا ہوا ناریل کا درخت خوب بڑا ہو گیا تھا۔ کرشنا جی کو ناریل کے درخت سے کوئی خاص نسبت تھی۔ جولین نے اُنہی کی یاد میں یہاں ناریل لگایا تھا۔ اندر

سے کوئی آواز، کوئی چہکار نہیں آ رہی تھی۔ اگر وہ لوگ ہوتے تو دروازہ کھلا ہوا، بیٹھک کا کمرہ کھلا ہوتا۔ وہ ایسے خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ابھی رات بھی اتنی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کے تجمل کو دیکھا۔ کہیں جولین نے مکان تو نہیں بدل دیا۔ وہ یہاں ٹھہر نہیں سکے، کہیں اور چلے گئے۔ تجمل نے مجھے گھنٹی بجانے کا اشارہ کیا۔ گھر پہ بجلی کی گھنٹی لگی تھی۔ میں نے اُسے بجانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پائل بجنے سی لگیں۔ اندر سے گھنٹی کی آواز آئی۔ دوسری گھنٹی بجانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پر میں نے ہاتھ روک لیا۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے جولین کھڑی تھی۔ اپنے اسی پسندیدہ لباس میں۔ سفید ساڑی میں لپٹی ہوئی چنبیلی کی طرح کھلی ہوئی۔ ایک لمحے کو تو جیسے اُسے چپ سی لگ گئی۔ میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ گویا میری آمد کے بارے میں اُسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ پہلے تو دروازے پر حیران پریشان سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی رہی پھر جیسے اچانک سنبھل گئی۔ وہ بے تحاشا میری طرف اُمڈی، بازو بھی اُٹھ گئے لیکن میرے قریب آ کے وہ سمٹ سی گئی اور اُس کی چمکیلی آنکھوں نے مجھے دیکھا۔ میرا تجمل سامنے آگیا اور اُس نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "کیسی ہے میم؟" تجمل اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اتنا کیوں لگا رہا ہے دیدی؟"

جولین سے ذرا دیر بھی ضبط نہ ہوا۔ تجمل کا سر پر ہاتھ رکھنا اور پوچھنا تھا کہ وہ پھوٹ پڑی۔ تجمل نے جھجکتی آواز میں کہا: "لوٹ جا اس رات؟ یہ تیرا اپنے بچے کی طرح نہیں ہیں۔"

جولین کا سسکنا اور پھوٹ پڑا۔ تجمل اُسے بازوؤں میں لیے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں کرسیاں رکھی تھیں۔ ابھی ہم بیٹھے نہیں تھے کہ اندر سے چمپا بیگم کی آواز آئی، یہ اُسی کی آواز تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ کون آیا ہے؟ کسی نے جواب نہیں دیا تو چمپا بیگم خود وہاں آگئی۔ پہلے اُس کی نظر مجھی پر پڑی۔ اُس کا حال ابھی کچھ حالت نہیں ہوا۔ بے اختیار اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "اللہ! یہ تم ہو پیارے میاں! یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟" وہ ٹوٹتی آواز میں بولی۔ میرے پاس آ کے اُس نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا۔ میری پیشانی چومی اور بلائیں لیں۔ "پوچھو تو جیا ہے۔ کل سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ معلوم تھا کوئی شاید پیارے یہاں آ جائیں۔ اتنے دن کہاں رہے؟ خط بھی نہیں لکھا۔ کوئی خیر خبر، ہم کیا دکھیا جانیں؟" وہ ایک ہی سانس میں بولی۔

چمپا بیگم جب بھی سامنے آتی تھی میرا سینہ کوئی نوچنے کھسوٹنے لگتا تھا۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اور بے کل ہو گئی۔ "ٹھیک تو ہو؟ کیسے طبیعت ہے؟"

"ہاں اب ٹھیک ہے۔" میں نے جھجکی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم تو ٹھیک ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے، بہت بہت احسان ہے اُس کا۔"

چمپا بیگم کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ چہرہ نکھرا ہوا تھا۔ اچکتی پیشانی کا رنگ کچھ اور اُجلا ہو گیا تھا۔ سفید دوپٹے اور سُرخی کرتے پاجامے میں وہ ایک مرد ولی ہو رہی معلوم ہو رہی تھی۔ بیگم اور شامل آدمی پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ آدمی کا چہرہ بدل دیتے ہیں، رنگ بدل دیتے ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں کے چہرے پر نور ہے، چمپا کے چہرے پر یہی کیفیت تھی جیسے اُسے کسی نے سر تا پا دھو دیا ہو۔ پاس پہنچ کے وہ میرے ہاتھ چومنے لگی۔ پھر جولین کی ماں بھی اندر سے آگئی۔ وہ بھی اسکرٹ کے بجائے ساڑی پہنے ہوئے تھی۔

بیٹھتے بیٹھتے سارے گھر میں چل پل سی مچ گئی۔ گھر کا پورا نظام بکھر گیا۔ جولین، اُس کی ماں بھی اِدھر اُدھر بے قرار سے پھر رہے تھے۔ مکین متحرک ہوں تو گھر کے در و دیوار متحرک ہو جاتے ہیں۔ مکین خاموش رہیں تو در و دیوار بھی گونگے بن جاتے ہیں۔ آدمی صحرا ہو تو گلزار بھی صحرا ہو جاتا ہے۔ تجمل اور میرے منع کرنے کے باوجود اُنھوں نے دریائی بیر، ہر قسم کی چیزوں کا انبار لگا دیا۔ تجمل نے کھانے کے لیے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس پر بات تھی۔ میں حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ اتنی جلد اتنی بہت سی چیزیں اُنھوں نے کس طرح فراہم کر لی ہیں مگر جولین کو یہ کرتب خوب آتا تھا۔ جھٹ پٹ طرح طرح کی چیزیں تیار کر لیتی تھی۔ مجھے یاد تھا، اِدھر وہ مجھ سے کچھ پوچھتی، اُدھر تیار کر کے لے آتی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی، وہی شام سی چہرے پر چھائی ہوئی، وہی چمکیلی اور حیران بڑی آنکھیں۔ تجمل نے ٹھیک کہا تھا، وہ پہلے سے کچھ گھٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی لیکن کبھی کبھی یہی خوبی بن جاتی ہے۔ لگتا تھا جیسے کسی ہنرمند نے اپنے مجسمے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ اُس میں وہی تیزی اور وہی [illegible] نظر آ رہی تھی جس پر مجھے تعجّب ہوتا تو بڑی حیرت ہوتی تھی۔ یکے بعد دیگرے وہ ہر کام اس پھرتی سے نمٹا رہی تھی کہ گمان ہوتا کتنے ہی لوگ کیوں نہ آ جائیں اُس کی پیشانی پر شکن نہیں پڑے گی۔ زیبائی میں بھی تو یہی خوبی تھی۔ دونوں میں ہزار مشابہتیں تھیں پھر بھی کوئی ایک بات دونوں میں بہت مختلف تھی۔

شارہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ کاتے اور ماریا وغیرہ دکھائی دیے۔ مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی بات ہی ہو گی، جبھی ان میں سے کوئی ان کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ یہاں آئے ہی نہ ہوں۔ میں پہلے ہی منع کر رہا تھا، ممکن ہے وہ پاڑے کی طرف چلے گئے ہوں۔ چائے لانے کے بعد وہ کسی قدر اطمینان سے ہمارے سامنے بیٹھیں تو تجمل سے نہ رہا گیا۔ اُس نے کاتے کے بارے میں پوچھا۔ "ابھی وہ کیسے ہے؟ اپن کا دادا ابھی تک نہیں آیا؟"

چمپا بیگم نے سر جھکا لیا اور ہچکچاتے ہوئے بولی: "وہ اسپتال میں ہیں۔"

"اسپتال میں؟" تجمل نے چونک کے کہا۔ "کیا بولتی ہو؟"

"انہیں سویرے ہی اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔"

"ابھی کیسا ہے وہ؟" پیرو نے بے چینی سے پوچھا۔

تجمل اور پیرو کے چہرے بھاری ہو گئے۔ وہ ابھی اُس کا ذکر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ پیرو کے پوچھنے پر چچا بیگم نے بتایا کہ رات ہی ڈاکٹر کو گھر پر بلا لیا گیا تھا۔ وہ دیر تک معائنہ کرتا رہا اور ناراض ہونے لگا کہ اتنی دیر کیوں کر دی گئی ہے۔ اُس نے سوئی لگائی اور کئی قسم کی دوائیں تجویز کیں۔ مارٹی اُسی کے اسپتال سے فوراً دوائیں لے آیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ اگر رات طبیعت نہ سنبھلے تو صبح کسی تاخیر کے بغیر کالے کو اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ رات بھر سب جاگتے رہے۔ کسی دوا نے اثر نہیں کیا۔ کالے ساری رات بستر پر تڑپتا رہا۔ صبح ہوتے ہی جولین اور مارٹی اُسے ڈاکٹر شرما کے اسپتال لے گئے۔ دوپہر تک جولین اُس کے پاس رہی۔ پھر شام تک چچا بیگم اور ابھی کچھ دیر پہلے مارٹی شرما جو کو اسپتال لے گیا ہے۔ وہ رات بھر مارٹی کے ساتھ وہاں رہے گی۔ کالے کے لیے الگ کمرہ لیا گیا ہے۔ دو تیمارداروں سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر کو اچھی طرح بتا دیا گیا ہے کہ روپے پیسے کی قطعاً فکر نہ کی جائے۔

"ابھی بولا کیا ہے ڈاکٹر؟" پیرو نے تشویش لہجے میں پوچھا۔

چچا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے سر کی کسی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ کوئی رگ زخمی ہوئی ہے اور خون جم جانے کا بھی امکان ہے۔ ضرورت پڑی تو دو تین روز بعد آپریشن کیا جائے گا۔

"ابھی کون ڈاکٹر ہے وہ؟" پیرو نے بجھے بجھے منہ سے کہا۔

"ڈاکٹر شرما یہاں کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔" جولین نے پہلی بار زبان کھولی۔ پیرو کا لہجہ ضرور اُسے گراں گزرا تھا۔

"سنا ہے اللہ نے اُس کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔" چچا بیگم افسردگی سے کہنے لگیں "شہر کے کونے کونے سے لوگ اُس کے ہاں آتے ہیں۔ صبح سے شام تک مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مریضوں کی کثرت نے اُسے تند خو بنا دیا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا لیکن لوگ اُس کی بدمزاجی سہ لیتے ہیں۔ بڑی مشکل سے اُس تک رسائی ہوتی ہے اور اُس کے اسپتال میں جگہ ملتی ہے۔ رات بھی اُسے بلانے کے لیے جانے کتنی منتیں کی گئیں۔ جولین نے باقاعدہ بُرا بھلا کہا تب کہیں ڈاکٹر شرما کو مریض کی نازک حالت کا کچھ احساس ہوا۔" چچا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی زورا، جمرو، شامو اور منگو یہاں سے چلے گئے تھے حالانکہ انھیں روکنے کی بہت کوشش کی گئی تھی۔ چاروں صبح کسی وقت آنے کا کہہ گئے تھے۔ دوپہر کو صرف منگو آیا اور اسپتال میں کئی گھنٹے ٹھہر کے شام کو چلا گیا۔ اُنھوں نے پیرو کے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا البتہ تجمل کے لیے صرف اتنا کہا تھا کہ اُس کی آمد کسی وقت بھی متوقع ہے۔

پیرو کچھ دیر اور کالے کے بارے میں نہ پوچھتا تو ٹھیک تھا۔ ابھی ہمیں آئے وقت ہی کتنا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اُسے فوراً کسی طبیب کو دکھا دینا چاہیے۔ اب اُس سُور کی اولاد دُسری کی کھال کے جانور کو کیا ہو گیا ہو۔ دونوں اتنے فکرمند ہو رہے ہیں۔ سارا سفر اُس نے نہ جانے کس عذاب میں کاٹا ہو گا۔ محض ہمارا راستہ کھوٹا نہ کرنے کے لیے وہ جانے کس طرح خود کو باندھے بیٹھا رہا ہو گا۔ کسی ٹھکانے پر پہنچ کر ظاہر ہے سب کچھ بکھر جانا چاہیے تھا۔ جانور کی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پیرو نے اُسی وقت اسپتال چلنے کا مشورہ دیا لیکن چچا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے ملاقاتیوں کی آمد پر پابندی لگا دی ہے۔ خصوصاً رات کے وقت تو اسپتال میں داخلہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شرما نہایت سخت آدمی ہے۔ اتنی منت کے بعد تو کہیں وہ راضی ہوا ہے۔ اب اگر اُس کی مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو وہ علاج سے ہاتھ اُٹھا لے گا۔ وہ ایسا ہی بدمزاج ہے۔

تجمل کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔

"ابھی چل کے دیکھتے ہیں تجمل بھائی!" پیرو نے بے تابی سے کہا۔

"بہتر ہے آپ اِس وقت یہ ارادہ ملتوی کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی یہ پابندی لگائی ہے۔" چچا بیگم نے دبی زبان سے کہا۔ "صبح تک اور انتظار کر لیجیے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہاں اگر دوائیں بھاری ہیں تو یہاں بھی کالے کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ مارٹی کے علاوہ وہاں شیاے بھی موجود ہے۔ جلد بچا اُس کی ٹوپی میں کسی کی ضرورت نہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ کالے کا دم بھرتی ہے جو اُس کے بقول اُسے اِس جنت میں لے آیا تھا۔ کالے کو اِس حالت میں دیکھ کے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ بہت اچھی بچی ہے۔ جب سے آئی ہے سارے گھر میں رونق آ گئی ہے۔ جولی کو وہ کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتی۔ دونوں میں ایسی دوستی ہو گئی ہے کہ لوگ دیکھیں تو رشک کریں۔ جولین نے اُسے پڑھانا شروع کیا تو ایسی فرفر ٹِٹ پٹ کرنے لگی کہ نہ پوچھیے۔ دیکھیے کالا دبی کالے کی سماعت ہوگی۔ اُس سے زیادہ کون اُس کا خیال رکھ سکتا ہے۔ اپنے محسن کی خدمت کا ایک تو موقع ملا ہے اُسے۔"

تجمل بت بنا بیٹھا رہا۔

چچا بیگم اور جولین کے کہنے پر ہم تینوں نے سیب کی چند قاشیں کھائیں اور انڈے کے حلوے کے دو چار چمچ حلق میں اُتار لیے۔ اُنھوں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ چائے پینے کے کچھ دیر بعد پیرو نے اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بھی حیران رہ گئیں۔ "کیا مطلب؟" جولین سٹ پٹا کے بولی "آپ یہاں نہیں ٹھہریں گے؟"

"نہیں بیٹا! ابھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ آتے رہیں گے۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔ "ابھی ہم کو جانا ہے۔"

"کہاں! اب آپ کہاں جائیں گے؟"

"تھوڑا کام ہے۔" تجمل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"اِس وقت کہاں جائے گا؟"

"لالہ ٹیلے کے گھر۔"

"لالہ ٹیلے کے گھر؟" جولین اضطراب سے بولی۔

"ہاں رنی! کل تم کو بھی اُدھر لے جائیں گے۔ وہ سب لوگ مل گئے ہیں۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔

"بھیا! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" جولین کی آواز ستانے لگی۔ اُس نے بیتابی سے تجمل کی طرف دیکھا اور مضطربانہ پوچھا: "سچ مچ؟"

"ہاں رنی!" تجمل نے مسکرا کے کہا۔

"کب کب؟"

"کل رات ہی کو کالے کو اِدھر بھیج کے ہم اُدھر چلے گئے تھے۔"

"مگر ہمیں تو کسی نے کچھ نہیں بتایا؟"

"ابھی کیسے بتاتے؟ اُدھر جا کے اور سب کو دیکھ کے ہی تو بولتے نا؟"

"کہاں ہیں وہ؟"

"اِدھر ہی ہیں۔" تجمل نے کہا۔ "اِدھر ہی شہر میں۔ دلاور کے علاقے میں۔"

چچا بیگم، جولین اور اُس کی ماں کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

"پہلے بتانا تھا بیٹا!" چچا بیگم شکایتی آواز میں بولی۔ "یہ خوش خبری تو تمھیں آتے ہی سنانی چاہیے تھی۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ تجمل نے شرمندگی سے کہا: "سب کیوں نہیں پوچھا۔"

"ہاں ہاں بتاؤ نا ہمیں یہ سب کیسے ہوا۔ اللہ نے ہماری سُن لی۔ خدا جانتا ہے کوئی وقت ایسا نہیں جاتا تھا جو اُن کا خیال نہ آتا ہو۔ ہائے میرے صاحب ....."

چچا بیگم کی آواز ڈوب گئی۔

"اُدھر چلو تم۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"ابھی وہ ... ابھی ہیں نا؟" جولین کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ہاں جی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر کیسے؟ یہ سب کیسے ہوا؟"

"بہت لمبا کہانی ہے۔" پیرو نے درمیان میں کہا۔

"ارے!" جولین غیر ارادی طور پر کرسی سے اُٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر سُرخی بکھر گئی اور آنکھوں میں قمقمے سے جلنے بجھنے لگے۔ وہ کبھی مجھے دیکھتی کبھی اِن دونوں کو کہ کہیں ہم مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں بہت غور سے اُس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ خود پر قابو رکھنا جانتی تھی۔ اتنا بے اختیار اُسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ہم ابھی جائیں گے۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"ابھی؟" میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"کیوں؟ ابھی جانے میں کوئی حرج ہے؟"

"نہیں! وہ گھر دوسرا تو نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں اپن سب ابھی چلیں گے۔" جولین کی ماں اشتیاق سے بولی۔ "اپن سب لوگ جائیں گے۔ کتنا اچھا ہو گا! او گاڈ!"

"ابھی جاتے جاتے دیر بہت ہو جائے گا۔ ہمیں فوراً اور بھی جانا ہے۔" تجمل نے زیرلبی سے کہا۔ "کل ٹھیک رہے گا۔"

"ہمیں پتہ بتا دیجیے۔" جولین تیزی سے بولی۔ "ہم خود چلے جائیں گے۔"

"اب سویرے ہی جانا بیٹا!" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"سویرے تک شاید ہی کسی کو نیند آ سکے۔" جولین کی ماں بولی۔

"صبح میں خود لے جاؤں گا۔"

"کیسے ہیں وہ لوگ؟" جولین کی آواز سنسنا رہی تھی۔

"خود دیکھ لینا ری! تیری طرح سارے کیسے تیتے ہیں۔"

"اوہ اوہ!" وہ آنکھیں میچ کے بولی۔ "یہ کتنا عجیب ہے۔"

"شنکلا جی آج کل کہاں ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"شنکلا جی! انہیں بمبئی میں ہیں۔ اُن کی ترقی ہو گئی ہے۔ آتے رہتے ہیں اور جب بھی آتے ہیں اپنے دوست کو ضرور پوچھتے ہیں۔"

اُس کی طرح یہ طور رسمی ہو گئی تھی افرادی کیفیت سے کچھ لطف آنے لگا تھا۔ تجمل اور پیرو سامنے بیٹھے تھے ورنہ میں اُسی کا انس اور قرب ہوتا لیکن میں نے اُسے بتایا کہ اصل میں یہ سب شنکلا جی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

"اُن کی وجہ سے؟ نہیں!"

"کرشنا جی کے بعد وہ مسلسل اُدھر ہی لگے رہے۔ شنکلا جی کے سوا کوئی ہوتا تو اتنی فکر کیوں کرتا۔ اُنھوں نے نیل آباد لکھا تھا کہ بابا جان کو قطعے کے ایک صاحب آسام کی طرف لے گئے ہیں۔ ہم فوراً روانہ ہو گئے۔" میں نے اُسے تبت کا واقعہ نہیں بتایا یا اتفاقاً کہا۔ "بس اُدھر ہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دن ہم اُن تک پہنچ گئے۔"

اُسے وہ سب یاد تھا۔ کہنے لگی "دو سال کے قریب ہو گئے تھے نا؟"

"ہاں کم و بیش۔"

"یہ سب کسی خواب جیسا ہے۔" وہ لرزتی آواز میں بولی۔

اِس وقت انھیں گھر جانے اور سب کو دیکھنے کے لیے بے پناہ ارادے سے روکنے کے لیے تجمل اور پیرو کو حسبِ معذرت کرنے پڑے۔ وہ کچھ دیر اور ٹھیرنے کے لیے کہہ رہی تھیں لیکن تجمل اُٹھ گیا۔ چلتے چلتے وہ تینوں صبح جلد آنے کے لیے تکرار کرتی رہیں۔ اُن کا بس چلتا تو ہمیں رخصت کرنے کے لیے گلی کے کنارے تک آتیں۔ گلی سے نکلتے ہی پیرو نے ایک اور ٹیکسی لی۔ ڈاکٹر شرما کے اسپتال کا پتہ پوچھا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی چلتے تو ایک اور جگہ پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ آدھ گھنٹے سے پہلے ہم اسپتال پہنچ گئے۔ جدید طرز کی ایک بڑی اور صاف ستھری عمارت تھی جو پر کرن دھیمی دھیمی روشنیاں۔ عمارت سڑک سے خاصی دور تھی۔ لوہے کے جالی دار گیٹ پر پہنچ کے ہم

کو ہم تینوں نے ہر طرح سے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ انکار میں سر ہلاتا اور گیٹ پر آویزاں بورڈ کی طرف اشارہ کرتا رہا۔ بورڈ پر اسپتال کے اوقات کے بارے میں صاف لکھا تھا صبح ۹ سے ۱۰ بجے تک شام ۵ سے ۶ بجے تک۔ پیرو کی طرف سے پانچ روپے کا نوٹ بڑھانے پر چوکیدار کی آنکھیں کھل گئیں لیکن اس نے نوٹ بھی واپس کر دیا۔ وہ ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔ چار دیواری بھی اتنی اونچی نہیں تھی کسی طرف سے بھی پھاندی جا سکتی تھی مگر یہ اسپتال تھا کوئی اور جگہ ہوتی تو بات دوسری تھی۔ پیرو نے دس منٹ کے لیے صرف ایک آدمی کے اندر جانے کی اجازت مانگی۔ چوکیدار اس پر بھی راضی نہیں ہوا اور اپنی نوکری کا واسطہ دینے لگا۔ کوئی صورت نہ دیکھ کے آخر پیرو نے کمرہ نمبر بتا کے مارٹی کو بلانے کی بات کی۔ نوٹ پیرو کے ہاتھ ہی میں تھا۔ چوکیدار نے اُسے جیب میں رکھا اور دروازہ اندر سے بند کیا اور دو تین منٹ میں واپس آ گیا۔ اس نے آگے جا کے کسی اور شخص کو اندر بھیج دیا تھا۔ جتنی دیر ہم باہر کھڑے مارٹی کا انتظار کرتے رہے پیرو ادھر ادھر ٹہل کر کہتا رہا کہ اگر ہم دس بجے تک بھی آ جاتے تو وہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیتا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ حادثے کی صورت میں آنے والے مریضوں کا راستہ پچھلی طرف سے ہے۔ ہمیں پہلے اسی جانب جا کے کوشش کرنی چاہیے تھی۔

پانچ چھ منٹ کے اندر اندر مارٹی ہمارے سامنے تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بکھر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ احساس سے کچھ جاننے کو اب کیا رہ گیا تھا۔ جمل اور پیرو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ "ابھی ادھر ایک بڑا اسپتال بھی ہے۔" پیرو نے مشورہ دیا۔ "بولے تو اُدھر جا کے بات کرے۔"

"اس جگہ بھی کوئی کوتاہی نہیں ہے دادا!" مارٹی روتے روتے بولا۔ "ابھی ہر گھنٹہ بعد کوئی ڈاکٹر وزٹ کر کے جاتا ہے۔"

"بولتا کیا ہے؟" پیرو نے تنک کے پوچھا۔

"ٹھیک سے کچھ نہیں بولتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بول کے گیا تھا کہ کل شام تک اور دیکھے گا۔ آپریشن کرنے کا ہے کہ نہیں۔"

مارٹی کے منہ پر کچھ کہنے سے پہلے میں نے جمل سے کہا کہ مارٹی کے بجائے آج رات کانتے کے پاس میں ٹھیروں گا لیکن جمل نے منہ بنا کے ایسے رد کر دیا جیسے میں نے کوئی فضول بات کہہ دی ہو۔ کوئی احمقانہ بات کہنے لگا کہ مجھے گھر واپس جانا چاہیے۔ بابا جان اور وہ سب میری راہ تک رہے ہوں گے اور کہنے لگا کہ مارٹی کے بجائے وہ خود اندر جائے گا۔

"اپن جائے گا۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔ "اپن کا بات وہ بہت مانتا ہے۔ ابھی اپن اس کا پورا دھیان رکھے گا۔"

"نہیں دادا! تم کو اب اپنے گھر اور پاڑے کی طرف جانا ہے۔" جمل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ادھر اس کو بچپن سے جگت ہے ہی۔ کبھی وہ ایسا ہی ہٹی ہو جاتا ہے۔ مجھ کو اس کی رگ رگ معلوم ہیں۔"

"ابھی تم پاڑے نہیں گیا دادا؟" مارٹی متردد لہجے میں بولا۔

"چلا جائے گا ماسٹر! اُدھر بھی جائے گا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔

"ادھر منگو آ کے بولتا تھا۔ اُدھر سب پاڑے میں جیسا تمہارا انتظار کرتا ہے۔ بمبئی اور گجرات اُن دو ریل والا لوگ کو بھی پاڑے میں لے آیا ہے۔"

"وہ لوگ پاڑے میں ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"منگو ابھی اپن سے یہی بولا تھا۔" مارٹی نے متاسف لہجے میں جواب دیا۔ "اُن کو اُدھر الگ کمرے میں ڈال دیا گیا ہے اور سب دادا کا انتظار کر رہا ہے اور دادا! ....." وہ پیرو سے مخاطب ہو کے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رک گیا۔

"کیا ہے ماسٹر؟" پیرو نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا بولے دادا!" مارٹی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "منگو بولتا تھا کہ جب سے تھا ایدر دادا کے پیچھے بمبئی میں بہت الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ تلاب اُدھر پیرو کے ایدر والی کالا دادا لوگ نے پاڑے کا حصہ بھیجنا بند کر دیا ہے۔ بولا ابھی پیرو دادا نہیں ہے تو حصہ بھی نہیں ہے۔ اپن پیرو دادا کو جانتا تھا ابھی وہ لوٹ کے آئے گا تو دیکھے گا۔ تینوں نے سالا بیکار کیا ہے۔ منگو بولتا تھا کہ ابھی اُدھر چاقو لے کے جانے کا تھا پر دو لوگ نے ابھی تھوڑا روک کے رکھا۔"

"ایسا!" پیرو کی آواز ایک دم بھڑک گئی۔ "ایسا! اپن دیکھے گا۔ اپن سیدھا ابھی اُن کی طرف جائے گا۔"

"دیکھیں گے دادا! اُن لوگ کو بھی دیکھیں گے۔" جمل نے تحمل سے کہا۔ "ابھی جلدی تو نہیں پڑی ہے۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"اُن لوگ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ اپن ادھر آ گیا ہے۔ ابھی دیری سے پہنچو تو سالا اُلٹا سمجھنے لگے گا۔ ایدر اُدھر پاڑوں کا دادا لوگ بھی ہے۔ اپن کو اُن کا بھی دھیان رکھنے کا ہے۔ ابھی بچا جمل بھائی!"

"اور ابھی تم کانتے بھائی کے پاس ٹھیرنے کا جو بولا تھا۔" مارٹی کے منہ سے جانے کس طرح نکل گیا۔ اسے پیرو کے منہ پر ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ پیرو نے کانتے کے پاس ٹھیرنے کی خواہش کا اظہار پہلے کیا تھا۔ پاڑوں کے بارے میں مارٹی نے اسے بعد میں بتایا تھا۔

پیرو نے اس کی طرف گھور کے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی اسے غصہ نہیں آیا۔ اسے مارٹی کے منہ پر طمانچہ مار دینا چاہیے تھا۔ "وہ بات دوسرا ہے۔ مرا کانتے کے لیے اپن دس دن ٹھیر جائے گا۔ دس سال ٹھیر جائے گا۔ پھر اپن کچھ اور رستہ نکالے گا۔ ایدر جمل بھائی اور اپن کا راجا دادا ہے۔ اُن کو اُدھر بھیجے گا پر زیادہ دیری ٹھیرے سے اُن کے پاس جانے کا نہیں ہے۔"

"کانتے کے پاس ابھی ماسٹر ہی رہے گا۔" جمل نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"اپن کا بھی یہی بولنے کا تھا۔ اپن کا دل ابھی کیدر کو بھی نہیں لگے گا۔ ایدر ڈاکٹر مسٹر لوگ سب اپن کا جان کا دشمن بن گیا ہے۔ اپن ہے تو کچھو تم لوگ ایدر ہے۔ اپن سے کوئی غلطی نہیں ہوئے گا۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر!" جمل نے مارٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "پر ذرا دبی ہی رکھ ورنہ کڑکی پڑ جانے کی پنے کو۔" مارٹی کا جسم لرز گیا۔ اس نے جھٹ جمل کے پیر پکڑ لیے۔

جمل آگے بڑھ گیا۔ رات اور کالی ہو گئی تھی۔ اسپتال سے کچھ دور آنے پر جمل کے دماغ میں نہ جانے کیا آئی۔ اس نے پیرو سے واپس اسپتال چلنے کو کہا۔ پیرو نے نہ ابھی کی غرض پوچھی نہ کوئی اعتراض کیا۔ چوکیدار کی طرف جانے کے بجائے گھومتے ہوئے ہم اسپتال کے پچھلے حصے کی طرف آ گئے۔ یہ حصہ ہنگامی طور پر آنے والے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس وقت کوئی مریض موجود نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے سکون چھایا ہوا تھا۔ اس طرف روشنی بھی زیادہ تھی۔ ریسیپشن، ڈاکٹر، اسپتال کا دیگر عملہ اور ابتدائی طبی امداد کے کمرے وغیرہ بھی اسی طرف تھے۔ ایک نرس نے ہمیں ڈیوٹی پر موجود خوش وضع نوجوان ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیا۔ وہ میز پر ٹانگیں پھیلائے انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے ٹانگیں میز سے ہٹائیں اور انگریزی میں پوچھا کہ وہ ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ پیرو آگے تھا۔ اس نے شانے اچکا کے میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے میں کچھ بتاتا ڈاکٹر نے ہندوستانی میں دہرایا۔ جمل نے کسی رسمی تعارف کے بغیر کہا کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔ نوجوان ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے گھر چلے گئے ہیں لیکن ایسی کیا بات ہے؟ کیا وہ ہمارے کسی کام آ سکتا ہے؟

"اپن کو اسی سے بات کرنے کا ہے۔" پیرو نے کہا۔

"بات کیا ہے؟" ڈاکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

جواب میں جمل نے بتایا کہ وہ کمرہ نمبر [illegible] کے مریض کانتے کے مرض کی نوعیت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اس طرز تخاطب کا عادی نہ ہو گا لیکن اس نے خوش اطواری سے پوچھا کہ ہم مریض کے کون ہیں؟

"ہم اس کے سگے ہیں۔" جمل نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔

"بھائی؟ آپ اس کے بھائی ہوں گے؟"

"اگر ہم چچا ہوں تو آپ نہیں بتاؤ گے؟"

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر نے خفت سے کہا اور جلدی سے پوچھنے لگا۔ "اُسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اور اپن ابھی کیا پوچھنے کو آیا ہے۔" پیرو نے برجستہ کہا۔

"میرا مطلب ہے مریض کس بیماری میں اور کب داخل ہوا تھا؟" ڈاکٹر نے تصحیح کی کہ یہاں مرض کی نسبت سے الگ الگ شعبے ہیں۔

"اس کو تھوڑا زکام تھوڑا بخار ہو گیا تھا کل داخل ہوا تھا۔ اپن کو نہیں معلوم ابھی آپ کیدر اس کو رکھا ہے۔ کمرہ نمبر ہم ابھی کیدر ہے؟"

"نزلہ بخار میں داخل ہوا تھا اور کمرہ نمبر [illegible] میں؟" ڈاکٹر بدبداتے ہوئے بولا۔ ہمیں ذرا دیر سکون سے بیٹھنے کی ہدایت کر کے اس نے فون اٹھا لیا۔ فون پر اس نے انگریزی میں کسی کو بتایا کہ یہاں تین آدمی کمرہ نمبر [illegible] کے مریض کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سے کچھ اُن کے لیے کہا گیا ہو گا۔ ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ "زخمی ہے اچھا۔" وہ چونک کے بولا۔ "مار پیٹ کا کیس ہی لگتا ہے۔" ادھر سے کچھ اور کہا گیا ہو گا۔ ڈاکٹر حیرت سے اچھا اچھا ہوں ہوں کرتا رہا اور اس کی کریدتی نظریں ہم پر مرکوز رہیں۔ "جو بات پوچھنے آئے ہیں وہ مجھے کچھ پراسرار لگتے ہیں۔ اس وقت مرض کی نوعیت کے بارے میں یہ تشویش مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔" اس کی آواز سنجیدہ ہو چکی اور گہری ہو گئی تھی۔ "کون لڑکی تھی؟ خوبصورت خواہ اور لال لڑکی خوش لباس آدی دستی سے کل ہی پہنچی پر تھا۔" دوسری طرف لیفٹیننٹ جولین کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اس کے ذکر سے نوجوان ڈاکٹر کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی تھی۔

"ایک لڑکی کا واقعہ!" وہ سانس لے کے بولا۔ "ٹھیک ہے میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ ایک ٹرمو کے ہے۔ مسٹر وارجنگلی؟" اس کی پیشانی پر لکیریں سی کھنچی اور کھنچی رہیں۔ "میرا خیال ہے یہ وارڈ اب معلوم ہے شاید مختلف تھی بہر حال میں ان سے منٹ کے تعین فون کر آیا۔ شاید مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔"

میری کنپٹیاں جلنے لگی تھیں لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ ڈاکٹر فون رکھ کے معنی خیز نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور بغیر پوچھے وہی کچھ بتانے لگا جو ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔ "مریض کے جبڑوں کے آگے نشانات ہیں ایک چوٹ سر پر بہت گہری ہے۔ کوئی اندرونی چوٹ [illegible] ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں کہ آپریشن کے بغیر ٹھیک ہو جائے لیکن امکان کم ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ بہت ہمدردانہ تھا مگر کسی پہلو بدل کے وہ ہم سے پوچھنے لگا۔ "مگر یہ چوٹ کیسے لگی؟"

"چوٹ کیسے آتا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"لڑائی دنگا؟" ڈاکٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ لڑائی دنگے والے کیس ہم نہیں لیتے۔"

"وہ لوگ پھر کیدھر جائے گا؟"

"اُن کے لیے اور بہت سے ڈاکٹر ہیں۔" ڈاکٹر رکھائی سے بولا۔ "اور ایسی صورت میں پہلے پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

پیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جمل نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور ڈاکٹر سے کہا۔ "ہم لوگ مریض کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور دیکھیے۔ صبح آٹھ بجے آ جائیے۔"

"میں ابھی کی بات کر رہا ہوں۔"

"ابھی اس وقت؟ وقت دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"وقت دیکھ کے ہی آئے ہیں۔"

"مریض کے پاس کوئی اٹینڈنٹ ....." اسے خیال آیا اس نے

گیا اور بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا: "مجھے افسوس ہے۔" "اچھا ہوا" اُس نے کچھ اور نہیں کہا۔

"تم نے اپنا وقت بھی برباد کیا، ہمارا بھی۔" اُس کی متغیر حالت دیکھ کے مجھ سے نہ رہا گیا: "نہایت سامنے کی بات تھی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود تم مریض کے کمرے سے اٹینڈنٹ کو بُلا کے تصدیق کر سکتے تھے۔"

وہ ہکا بکا رہ گیا جیسے کسی کی جان نکل جائے۔ کھلا ہوا منہ، پھٹی ہوئی آنکھیں۔ اُسے گویائی پر بھی قدرت نہیں رہی۔ اُس کے لبوں میں جنبش ہوئی مگر بس سِسک کر رہ گئے۔

ہم پلٹ پڑے۔ چند قدم چل کے ہم نے کمرے کا دروازہ عبور کیا اور مریضوں کے لیے بنے ہوئے سائبان میں آگئے۔ آگے ہم نے تین چار گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اُس کی دہشت زدہ آواز سنائی دی۔ وہ اندر سے دیوانہ وار چلا رہا تھا: "ٹھیریے، ٹھیریے۔" قیصل اور پیرو دونوں رُک گئے۔ اندر سے اُس کی ہچکی چاپ بھی سنائی دی، پھر وہ حواس باختہ انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔

"براہِ مہربانی تھوڑی دیر کے لیے اندر آئیے۔" اُس نے عاجزانہ کہا۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔" وہ آدھی ہندستانی آدھی انگریزی میں بولا۔

مجھے قیصل اور پیرو کو کچھ بتانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن وہ بہت کچھ از خود سمجھ چکے ہوں گے۔ انھیں کسی ردِّعمل کا اظہار کرنے کے لیے میری طرف دیکھنا چاہیے تھا۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر لپکتا ہوا ہمارے قریب آگیا اور سیمابی لہجے میں ہم سے وہی درخواست کی۔

اندر کمرے میں جب تک ہم کرسیوں پر بیٹھ نہیں گئے، وہ کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں اُس کے چہرے پر پسینے کے بے شمار قطرے اُبھر آئے تھے۔ اُس نے ہمیں بلا تو لیا تھا لیکن اب اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ لمحوں تک وہ ہماری صورتیں تکتا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ میں نے اُس کی مشکل حل کرنا چاہی: "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا: "میں جانتا ہوں۔" اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں: "مجھے، مجھے لفظ نہیں مل رہے۔" اُس کی آواز سے بے چارگی و بے بسی نمایاں تھی۔ "میں آپ..... آپ سے....."

"جانے دو، بہتر ہے اب کچھ مت دہراؤ۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایک تجربہ یہ بھی سہی۔"

"میں آپ سے..... آپ سے۔" اُس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"جو تم کہنا چاہتے ہو مجھے معلوم ہے اور جو بات مجھے معلوم ہے اُسے سننے سے کیا حاصل۔"

وہ سر جھٹکنے لگا اور خفقانی انداز میں بولا: "مجھے بالکل خیال نہیں رہا..... میں کتنا وحشی..... مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔"

"ہمیں اجازت دو، وقت بہت ہوگیا ہے۔"

"نہیں آپ نہیں جائیں گے، آپ ایسے نہیں جائیں گے۔"

"یقین کرو ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"آپ بڑے آدمی ہیں۔"

"عمر میں کچھ بڑا ضرور ہوں۔"

"آپ ہر طرح بڑے ہیں۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولا: "عمر ہی میں نہیں، حوصلے میں، نظر میں....."

"تم عجلت کر رہے ہو۔"

"نہیں نہیں۔" اُس نے بے قراری سے کہا: "اس بار یقیناً مجھ سے کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی۔" اُسے ہندستانی میں لفظ نہیں ملے تو انگریزی میں بولا: "اس بار سب میرا آزمودہ، سب میرا چشم دید ہے۔"

وہ نہیں مانا۔ رہ رہ کے اُس میں تلاطم سا اُٹھتا۔ وہ کیسا عجیب تھا، اُس کی مجبوری میں نازشی بھی تھی۔ وہ ابھی تک من مانی کر رہا تھا۔ ہم تینوں کو وہ کانتے کے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا۔ پیرو نے منع کیا کہ ایک آدمی کا جانا بہت ہے۔ تین آدمی نظروں میں آسکتے ہیں۔ اگر ضابطے کی خلاف ورزی کرنی ہے تو ایک آدمی تک محدود رہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ اسپتال کا ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اُسے بھی کچھ اختیار ہے۔ بعد میں ڈاکٹر شرما نے باز پرس کی تو وہ اس سے بات کرے گا، وہ استعفا دے دے گا لیکن پیرو اور قیصل تیار نہیں ہوئے۔ چناں چہ وہ صرف قیصل کو لے کے دروازے سے نکل گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے نرس کو بُلا کے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ہمارے لیے کافی تیار کرے۔ اُس نے سنا ہی نہیں، ہم انکار کرتے رہ گئے۔ میں خود کو آمادہ کر رہا تھا کہ خلوت ملتے ہی پیرو مجھ سے کچھ سوال کرے گا، مجھے اُسے کتنا بتانا چاہیے لیکن وہ زبان بند کیے بیٹھا رہا۔ میں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔

نرس صاف شفاف برتنوں سے بھری ٹرالی خود لے کے آئی تھی۔ کافی کے علاوہ کاجو، بسکٹ اور ناریل کی مٹھائی بھی تھی۔ اُس نے خوش سلیقگی سے ہمارے سامنے پلیٹیں اور پیالیاں سجادیں۔ ہم سے شکر اور دودھ کے لیے پوچھا۔ میں نے ڈاکٹر کے آنے تک ٹھیر جانے کو کہا تب وہ کہنے لگی، اُن کے لیے وہ تازہ کافی بنائے گی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے پیرو یکایک مجھ سے بولا:

"راجا! ابھی چھوکرا کیسا ہے؟"

"اچھا ہے۔" مجھے ہنسی آگئی۔

نرس کے کمرے میں آجانے کی وجہ سے وہ چپ ہوگیا۔ نرس آکے فوراً چلی گئی مگر پیرو گم صم بیٹھا رہا۔ میں نے بھی اُسے نہیں کریدا کہ وہ اس کے متعلق کیا تبصرہ کرنا چاہتا تھا۔ نرس کو دوسری کافی بنانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ پندرہ منٹ سے کچھ اوپر ہوئے ہوں گے کہ وہ دونوں واپس آگئے۔ میں اور پیرو یک لخت کھڑے ہوگئے۔ قیصل کے چہرے پر کچھ ٹٹولنا بہت مشکل تھا لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہیں دُور سے چل کے آرہا ہو، جیسے اتنی دیر میں وہ بوڑھا ہوگیا ہو۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ سے اُس کے لیے کافی بنائی۔ جتنی دیر قیصل

ایک تھکے ہوئے آدمی کے مانند کافی پیتا رہا، ڈاکٹر اُسے نرمی و شائستگی سے اطمینان دلانے کی کوشش میں لگا رہا کہ وہ اور اُس کے ساتھی ڈاکٹر ہر وقت کانتے پر نظر رکھیں گے حالانکہ قیصل نے ہمارے سامنے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

"آپ بولے تو اپن ابھی کسی اور اسپتال کو دیکھیے؟" پیرو نے ڈاکٹر سے وہی بات کہی جو وہ پہلے قیصل سے کہہ چکا تھا۔

"میری رائے آپ نے پوچھی ہے تو میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔" ڈاکٹر محتاط لہجے میں بولا: "یہ ہر اعتبار سے ایک مکمل اسپتال ہے۔ کہیں آپ آپریشن سے تو نہیں گھبرا رہے؟ اپنے ملک میں لوگ آپریشن سے جانے کیوں اتنا خوف کھاتے ہیں، ضرورت ہوتی ہے تبھی کیا جاتا ہے۔ میں ولایت میں چار سال رہا ہوں۔ وہاں لوگ خوشی خوشی آپریشن کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔"

"اور ڈاکٹر لوگ بھی ولایت کا ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر شرما کسی طرح ولایت کے کسی بڑے ڈاکٹر سے کم نہیں ہیں۔ وہ ایک ایکسپرٹ سرجن ہیں، اُن کے ہاتھ میں جادو ہے۔ شاید ہی اُن سے کبھی کوئی کیس خراب ہوا ہو۔"

کافی پیتے ہی قیصل اُٹھ گیا: "پر بڑے ڈاکٹر صاحب کو آپ بول دینا کہ کانتا کا آپریشن کرنے سے پہلے ہم سے پوچھ لیں۔" قیصل نے تندی سے کہا اور بولا: "دینا، ہم اُس کے لیے اپنے کو بھی بیچ سکتے ہیں۔"

"جی جی۔" ڈاکٹر مستعدی سے بولا: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

وہ ہمیں اسپتال کے بیرونی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اُس نے پیرو اور قیصل سے زور زور سے ہاتھ ملایا اور جب میرے سامنے آیا تو ہاتھ پھیلا دیے۔ میں نے بھی بازو کھول دیے: "تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" میں نے زیرِ لبی سے کہا: "اور دوبارہ ملنے کی آرزو ہے۔"

"آپ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ آزردگی سے بولا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"نہیں، ایسا مت سمجھو۔ میرے ذہن میں دُور دُور تک ایسا کوئی احساس نہیں ہے۔ تم میں بڑی دل کشی ہے۔ ہر شخص کی کوئی خوبی ہی اُس کی دل کشی کا سبب ہوتی ہے۔ تم میں بہت سی باتوں کے علاوہ دلیل سننے کی ایک جرأت بھی موجود ہے اور میں نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔"

"کہاں! وہ بچوں کی طرح مچل کے بولا: "مجھ میں برداشت نہیں ہے مگر آج میں نے مظاہرہ کیا، اس کے بغیر ہر خوبی بے کار ہے۔"

"برداشت تجربے سے آتی ہے اور تجربہ....." میں نے مسکرا کے کہا۔

"عمر سے آتا ہے۔" اُس نے میری بات مکمل کرنا چاہی۔

"ضروری نہیں، تجربہ تو زندگی کے سلوک سے آتا ہے کہ وہ کیسا سلوک کرتی ہے اور زندگی برتنے سے آتا ہے کہ آپ کس طرح اُسے برتتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ زندگی کے بس میں کچھ ہوتا ہے نہ آپ کے بس میں۔" جانے کیسے میری زبان پہ لفظ تراشتی رہی۔ مجھے خود بھی حیرت تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قیصل اور پیرو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، سنتے تو ضرور ہنستے۔ ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کے میں آگے چلا آیا۔

وہ سسکتے ہوئے پیچھے آگیا: "میں آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"مجھے اپنا پتہ دے دیجیے۔"

"مگر، مگر ہم ابھی تو یہاں آتے ہی رہیں گے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور مطالبہ کرتا، میں تیز قدموں سے قیصل اور پیرو کی جانب چل پڑا۔

[illegible]ت تک ہم پیدل چلتے رہے۔ چوک کی گھڑی میں ساڑھے پانچ بجے تھے۔ سڑکوں پر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے ٹرام روک لی تھی لیکن وہ باہر کھڑے اُلجھتے رہے۔ وہ مختلف سمتوں میں جانا چاہتے تھے۔ پیرو گھر کی طرف چلنے کو کہہ رہا تھا کہ سب ہماری راہ تک رہے ہوں گے اور اتنی رات تک تشویش میں مبتلا ہوں گے، خصوصاً مولوی اکرم کے دل میں تو طرح طرح کے وسوسے اُٹھ رہے ہوں گے۔ فرخ، فریال وغیرہ رات بھر سو نہیں پائیں گی۔ پیرو غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر اُسے خود بھی تو اپنے گھر جانا تھا اور پاڑے جہاں اس کے انتظار میں ان گنت لوگ بیٹھے ہوں گے۔ بمبئی کے پاڑوں کے ان گنت دادا، ماڑی کی زبانی تین پاڑوں کے رسی تڑانے کی خبر سن کے اُس نے پہلے وہیں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اُسے اُن دو آدمیوں کو بھی دیکھنا تھا جو حیدرآباد سے ہماری نگرانی کر رہے تھے اور ماڑی کے بیان کے مطابق پیرو کے پاڑے پر موجود تھے۔ اب بھی وہاں پہنچ گیا ہوگا۔ قیصل نے مجھ سے کہا کہ میں اکیلا گھر واپس چلا جاؤں، وہ اور پیرو پاڑے کی طرف چلے جاتے ہیں۔ میں نے یکسر انکار کر دیا۔ ٹرام والا منتظر تھا۔ قیصل نے سوار ہوتے ہی اُس سے بائی کلا کی سمت چلنے کو کہا۔ بائی کلا کے اُس اڈّے کی طرف جہاں کبھی بھیا مستانہ حکمرانی کرتا تھا اور کرشنا جی کے لیے مجھے اُس کے پاڑے میں نقب لگانی پڑی تھی۔ مستانہ کی ساری مستی اُسی رات ختم ہوگئی تھی جس رات اُس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑی پڑی تھی۔ اُس کے بعد وہ سنبھل نہیں سکا۔ بائی کلا کے پاڑے پر کسی اور نے قبضہ جمالیا۔ پیرو نے جب تیواڑی اور اُس کے حاشیہ برداروں کا نام و نشان مٹایا تو بائی کلا کا پاڑا بھی اُس کے پاس آگیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب وہاں کون سا دادا قابض تھا۔

وہی عمارت تھی جس کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ ٹرام عین دروازے کے سامنے رکوائی گئی۔ دروازہ بند تھا اور ایک آدمی چبوترے پر بیٹھا

اُونگھ رہا تھا۔ پیرو نے اُس کے بال کھینچے، وہ ہڑبڑا کے ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ اُس نے پہلی نگاہ میں پیرو کو پہچان لیا تھا، چنانچہ ہوش و حواس بحال کرنے میں اُسے کچھ وقت لگ گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا، اُس کی پشت پر چبوترے کے فرش سے چار انچ کے قریب اونچائی پر دو کنڈے دیوار میں جڑے ہوئے تھے۔ پرانی طرز کے دو گول کنڈے جو بعض گھروں کے دروازوں میں عموماً جڑے ہوتے ہیں۔ بظاہر اُن کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ دونوں اطلاعی گھنٹیوں کا کام کرتے تھے۔ پاڑے کا چوکی دار آنے والا آدمی دیکھ کے اُنھیں استعمال کرتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ کولھے کی طرف لے جاکے چپکے سے پہلے کنڈا گھماتا۔ گھمانے سے کنڈا کھل جاتا۔ کھلنے پر وہ اُسے کھینچتا، چھوڑ دیتا تو اندر گھنٹی بجنے لگتی۔ نہ زیادہ دُور تک اُسے کھینچنا پڑتا تھا، نہ زیادہ دیر تک، بس دو تین بار یہ عمل دہرانے سے اندر اطلاع ہو جاتی تھی۔ کنڈا کھینچنے کے بعد اُسے فوراً گھما دیا جاتا تو وہ گرفت پکڑ لیتا اور اپنے اندر کے کھانچے میں اس مضبوطی سے جکڑ جاتا جیسے تالا لگ جائے۔ پھر کوئی بھی اُسے کھینچتا رہے، اُس پر اثر نہ ہوتا۔ اِس سارے عمل میں لمحے صرف ہوتے تھے اور کسی کو آہٹ بھی نہ ہو پاتی تھی۔ چبوترے پر روشنی بھی ایسی تیز نہیں تھی اور رات کے وقت پاڑے کا دروازہ بند ہو جانے پر اسے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ پیرو کے اشارے پر چوکی دار نے دائیں ہاتھ کا کنڈا گھمایا تو یہ سارا انتظام میری سمجھ میں آیا۔ دوسرا بائیں ہاتھ کا کنڈا پولیس کی آمد کی اطلاع کے لیے ہو گا۔ پہلے یہ سارا انتظام نہیں تھا۔ اِس کا مطلب تھا کہ پاڑے کے موجودہ دادا نے مستانے سے کچھ زیادہ بڑے انتظامات کیے ہوئے ہیں۔ گویا اندر دن کا سماں ہونا چاہیے۔

دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ جو شخص باہر نکل کے آیا، وہ داود تھا۔ گویا وہ جیل کاٹ کے اپنے پرانے اڈے واپس آ چکا تھا۔ داود نے پہلے پیرو کو دیکھا، پھر جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ پیرو اُسے ایک طرف دھکیل کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر ڈیوڑھی کی طرز کا مختصر راستہ طے کر کے ہم آگے پہنچے تو طبلے، ہارمونیم کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ڈیوڑھی سے ہم صحن میں آ گئے۔ صحن میں یہ آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف دونوں کمروں میں آدھی دن کا منظر تھا۔ اندر بہت سے لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے بغلی کمرے میں تاش کی بازیاں جمی ہوئی تھیں اور سامنے بڑے کمرے میں ایک لڑکی ناچ رہی تھی، دوسری فرش پر بیٹھی گا رہی تھی۔ دونوں رنگ برنگے مراٹھی کپڑے پہنے سولہ سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ ہم نیم اندھیرے میں سے گزر کے آئے تھے اس لیے کسی کی نظر نہیں پڑی۔ ویسے بھی کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ سب گم تھے اور جھوم رہے تھے اور صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ہم دروازے پر کھڑے ہو گئے، تب بھی کسی نے توجہ نہیں دی۔ کمرے میں اگردی کی بُو پھیلی ہوئی تھی اور تمباکو کی۔ یہ تین دروازوں والا بڑا کمرہ تھا۔ آخری سرے پر بیچ میں گاؤ ٹیک لگائے جو بھاری جسم، اوسط قد، سیاہی مائل بھرے ہوئے منہ، اُٹھی ہوئی ناک کا چالیس سالہ شخص بیٹھا تھا، وہی پاڑے کا دادا ہو گا۔ مستانے کی نشست بھی یہی تھی۔ ناچنے والی سانولی کم عمر لڑکی اُس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک تنومند آدمی کے سامنے ناچ رہی تھی۔ نوٹ لڑکی پر اُچھال کے اُس آدمی نے اپنی باہیں لڑکی کے گلے میں ڈالنا چاہیں۔ لڑکی مسکراتی، شرماتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ آدمی کے ہاتھ اُٹھے رہ گئے۔ ہمیں وہاں کھڑے منٹ بھر کے قریب ہوا ہو گا کہ لڑکی کے ہٹنے اور درمیان میں آ جانے کے سبب سب کی نگاہیں منتشر ہو گئیں۔ وہ آدمی جو اپنی باہوں میں لڑکی کو سمیٹ لینا چاہتا تھا، کچھ بے تاب سا ہو گیا اور اُٹھ کے لڑکی کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ کمرے میں قہقہے گونجنے لگے اور وحشیانہ صدائیں اُبھریں مگر دوسرے ہی لمحے مسند نشین دادا کو جیسے کسی نے سوتے میں چٹکی بھر لی۔ ناچنے والی کے گھنگرو پتھر ہو گئے اور گانے والی کی آواز پر برف سی جم گئی۔ "دادا! دادا! پیرو دادا!" پاڑے کا دادا اپنی جگہ سے اُٹھ کے سیدھا پیرو کی طرف جھپٹا۔ "ابھی تم کب آیا دادا؟" اُس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "آؤ، آؤ، ادھر بیٹھو، ادھر آ کے بیٹھو۔"

"اپُن بیٹھنے کے لیے نئیں آیا ہے۔"

"ایسا کیسا! ابھی ایسا آیا ہے تو تھوڑا بیٹھے گا، تھوڑا کھائے گا، پیے گا۔ اپُن کا بھاگ کھلا ہے جو دادا اِدھر آیا ہے۔"

"دینا! ابھی زیادہ دارو نئیں چڑھایا ہے؟" پیرو نے دھمکتی آواز میں کہا۔

"تم کو دیکھ کے ابھی نشہ سالا کدھر کو بھاگنے کا ہے۔"

"ہاں ابھی ٹھیک ہے۔ اپُن کا بات سننے کا ہے۔ اپُن ابھی چلا جائے گا، پھر پورا بالٹی چڑھا کر بالٹی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دادا! پر پہلے ایدر آ کے بیٹھو۔"

"اپُن کو ایک جگہ ابھی اور جانے کا ہے۔ ایدر اپُن اشٹیم پہ بھی آیا ہے۔ تمھارا مستی کا ٹیم ہے۔"

"تمھارے لیے کیا ٹیم دادا! تم تو مالک ہے۔"

"ہا، سالا!" پیرو نے زمین پر تھوک دیا۔ "تم اکھا حرامی ہے۔ ابھی مالک بولتا ہے۔ ابھی پیچھے تم کیا سمجھا تھا؟ سمجھا تھا کہ دادا مر گیا، دادا خلاص ہو گیا۔ تم کو ایدر چھوڑ کے دادا اکلا چلا جائے گا، ہاں! کیا سمجھا تھا تم؟"

"نئیں نئیں دادا! ابھی کیسا بولتا ہے۔ پہلے اپُن کا بات سنو، تھوڑا دھیرج سے بیٹھو تو کوئی بات کرے۔"

"اپُن سننے کو نئیں بولنے کو آیا ہے۔" پیرو نے جھڑکتے لہجے میں کہا۔ "تم کو کل دوپہر ۱۲ بجے تک کا ٹیم دیتا ہے، بارہ بجے کے پیچھے ابھی اُدھر پاڑے پر دو کڑا بھیجنے کا۔ نئیں بھیجنے کا ہے تو اپُن ایدر ہی کھڑا ہے۔"

"ضرور کسی کتے کے بچے نے تمھارا کان بھرا ہے۔ پہلے اپُن کا بات سُن لو دادا۔"

"رو کڑا ملنے پہ اپُن ایک دم سمجھے گا۔" پیرو نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا اور دینا کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔ "اپُن بمبئی آ گیا ہے دینا! تم کو کوئی شک پڑا ہے تو ابھی دُور کر سکتا ہے۔"

چاقو زمین پر گر جاتا، مگر دینا نے جھک کے چابک دستی سے اُچک لیا۔ چاقو بند کر کے اُس نے پیرو کی طرف بڑھا دیا اور بے حس و حرکت اُسے دیکھتا رہا۔ کمرے میں موجود ہر شخص ساکت کھڑا تھا۔ "ابھی کوئی اور ہے تو اپُن ایڈی ہے۔ چلا جائے تو بعد کو بولیاں مت بولنا۔"

کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ پیرو نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور پلٹ کے کمرے سے نکل آیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اُسے کچھ خیال آیا، وہ دوبارہ اُن کی طرف گیا، سب جوں کے توں کھڑے تھے۔ پیرو نے چمپی کا نام پکارا، گھنگرو ہلنے والی مستی ستائی سامنے آ گئی۔ اُس کے سلام کرنے سے پہلے پیرو نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اُس کے ہاتھ میں کچھ تھما دیا۔ پیرو کی مٹھی بند تھی۔ چمپی نے بھی مٹھی بند ہی رکھی اور جھک کے دوبارہ پیرو کو سلام کیا۔

باہر ٹرم ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ ہم قلابے پہنچے تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ قلابے کے پاڑے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن پیرو کو وہیں گودی والا نامی پاڑے کا ایک آدمی نظر آ گیا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ پاڑے کے دادا جارجی نے کچی شراب اور جوئے کا ایک اور ٹھکانا بنا لیا ہے۔ یہاں کا پاڑا تھا تھا بدنام ہو گیا تھا، پولیس آئے دن جارجی کو پریشان کرتی تھی اس لیے جارجی دوسری جگہ بیٹھنے لگا ہے۔ وہ دوسرا ٹھکانا بھی زیادہ دُور نہیں تھا۔ ٹرم ابھی ہم نے نہیں چھوڑی تھی، کچھ ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ سمندر کے کنارے جھونپڑوں اور سیمنٹ کے مکانوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ مچھلی کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ٹرم ہم کو تھوڑا پہلے روکنا پڑی، باقی راستہ ہم نے دو تین اندھیری گلیوں سے گزر کے طے کیا۔ گودی والا ہمارے ساتھ تھا۔ گلی میں اندر تک وہ ایک جگہ رک گیا، یہاں گلی ختم ہو جاتی تھی۔ سامنے کی کوٹھری پر گودی والا کی تیسری دستک سے دروازہ کھل گیا۔ یہ کوٹھری بس دیکھنے کی تھی۔ اندر ایک اور دروازہ تھا، وہاں کے آدمی نے کسی تامل کے بغیر دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے پار منظر ہی دوسرا تھا۔ میری آنکھوں کے لیے ایک تماشا سا۔ بمبئی میں ایسا کوئی ٹھکانا میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک کشادہ ہال بنا ہوا تھا، کھلا ہوا بے در ہال۔ اوپر بانسوں اور لکڑیوں پر ٹکی ٹین کی چھت، نیچے اینٹوں کا پختہ فرش۔ اندر کرسیاں، میزیں اور تپائیاں فاصلے فاصلے سے پڑی ہوئی۔ ایک طرف ایک بڑے کاؤنٹر کے آگے اونچے اونچے اسٹول۔ تمام ساز و سامان رنگین، یہاں تک کہ بانس اور چھت سب مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے۔ اُس وقت وہاں زیادہ آدمی نہیں تھے مگر چہل پہل کم بھی نہیں تھی۔ خالی میزوں اور کرسیوں کی تعداد سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کتنے لوگ یہاں آتے ہوں گے۔ ہال کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی اور کھلی جگہ کے ساتھ چھوٹی بڑی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کوئی کھلی ہوئی، کوئی بند۔ گیس کی لالٹینوں اور ہنڈوں کی روشنی میں بیٹھے ہوئے گنتی کے آدمیوں کے سامنے بوتلیں اور گلاس رکھے تھے اور تاش پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے گرد بچے اُچھل کود کر رہے تھے۔ ہال میں دو عورتیں اُن آدمیوں کے بیچ میں گھسی بیٹھی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کاؤنٹر پر بھی موجود تھی۔ اِدھر اُدھر چند اور آدمی بھی ایک دوسرے سے بے نیاز الگ الگ بیٹھے تھے۔ پیرو ہال کے باہر کھڑا تعجب سے دیکھتا رہا۔

"ابھی کیا دادا! ابھی جاستی ٹیم پہ آیا ہے۔ دن بھر ایدر سالا میلا لگتا پڑا ہے اور سورج ڈوبنے پہ نہ پوچھو کیسا ماری ہوتا ہے، سالا بیٹھنے کا جگہ نہیں ملتا۔" پیرو کا تجسس بھانپ کے گودی والے کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے بتایا کہ جو لوگ ہال میں بیٹھنا نہیں چاہتے، اُن کے لیے وہ اطراف میں بنی ہوئی کوٹھریوں کا انتظام ہے۔ ایک طرف کی کوٹھریوں کے دروازے ساحل کی طرف کھلتے ہیں، جگہ نہ ملنے پر یہاں سے گزر کے لوگ ساحل پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی دارو اور جوئے کا شغل رہتا ہے۔ شام کو کچھ عورتیں بھی آ جاتی ہیں۔ کوئی ناچتی ہے، کوئی گاتی ہے، کوئی یوں ہی دارو پینے والوں کا دل بہلاتی ہے، خوش فعلیاں کرتی رہتی ہے۔

گودی والے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ پیرو نے اُسے روک دیا اور درمیان کی تین گز کے قریب کھلی جگہ کا فاصلہ طے کر کے ہال میں داخل ہوا۔ الگ الگ مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمی پہلے تو ہمیں دیکھ کے چونکتا ہوئے اور جب ہم کاؤنٹر کی طرف بڑھے جہاں تیز روشنی تھی تو وہ دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی کٹے ہوئے سرمئی بالوں اور تیکھے نقش و نگار والی عورت نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا، اُس کی عمر ۳۰، ۳۵ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ پہلے تو اُس نے منہ بنایا لیکن پھر اُس کی چیخ سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ "ہے دادا! اپُن کا دادا!" اُس کی والہانہ صدا سے سبھی کی نظریں ہم پر مرکوز ہو گئیں، کوئی بھی بیٹھا نہ رہ سکا۔

"ابھی کیسا ہے ماری تم؟......" پیرو کے لہجے میں اشتیاق شامل تھا۔

"اپُن تو ٹھیک ہے پر تم، تم؟......" اُس نے سرخوشی سے تالی پیٹی اور اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ "اپُن کیا دیکھتا پڑا ہے۔" وہ آنکھیں مسلتے ہوئے بولی۔ "کیدھر چلا گیا تھا۔ اپنا ماری کو بھی بول کے نئیں گیا۔"

"جانے دے، تم جلدی میں تھا ماری!"

"اتنے دن کیدھر چھپا رہا؟ لوگ سالا ایدر سیدھا اُلٹا بولتا تھا۔ بائی گاڈ، اپُن کتنا پرے (PRAY) کیا۔ فادر جانتا ہے کہ اپُن پیرو دادا کے لیے اُس کو کیا بولتا تھا۔"

"اپن جانتا ہے اور جبھی تو اپن لوٹ کے آگیا۔" پیرو نے ہنس کے کہا۔ "بچّہ لوگ ابھی کیسا ہے؟"

"ایک دم آل رائٹ۔" ماری چہک کے بولی۔ "ہرفورٹ نائٹ اپن اُس کو ملنے کو جاتا ہے۔ دونوں اودر بہت ہیپی ہے۔ پر دادا اپن سوچتا ہے کیا پتہ، تھوڑا پڑھ لکھ کر اپن کو پہچانے بھی کہ نہیں۔"

"نہ پہچانے سالا پر بڑے گا تو ٹھیک۔" پیرو نے بے پروائی سے کہا اور ماری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "پر تم ابھی کیسا ہے؟ رنگ تھوڑا کالا کرلیا ہے؟"

"ابھی اور کالا ہو جائے گا دادا!" ماری کی آواز بدل گئی۔ "ابھی کیا دیکھتا ہے۔ اتنا کالا ہو جائے گا کہ ابھی نظر بھی نہیں آئے گا۔"

"ایسا کیا بات ہے ماری؟" پیرو نے نرمی سے پوچھا۔

"بات کیا ہوئے گا دادا!" ماری نے سر جھکا لیا۔ اُس کی آواز ہی نہیں چہرہ بھی بگڑنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی معاً اُسے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک اندر کھڑی ہے۔ اُس نے گلے میں پڑی ہوئی ڈوری کھینچ کے ایپرن اتاری اور جھٹ کاؤنٹر چھوڑ کے باہر آگئی۔ وہ لمبے قد اور متوازن بدن کی عورت تھی اسکرٹ پہنے ہوئے۔ ہال میں سبھی لوگ ابھی تک کھڑے تھے۔ ماری نے گرجتے ہوئے اُن سے بیٹھ جانے کو کہا اور بیروں کو ڈپٹنے لگی۔ "جانتا نہیں ابھی کوئی تمھارا باپ آیا ہے۔" اُس نے اُن سے سامنے کی میز صاف کرنے اور جو کچھ ہے سب کا سب اٹھا لانے کو کہا۔ "ابھی ایدر اپن کے پاس لائی بھی ہے۔" ماری نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان پیرو سے پوچھا۔ "جو کر چلے گا کہ کالا لائی؟"

پیرو نے اُسے منع کیا کہ وہ زیادہ دیر کے لیے نہیں آیا۔

"ایسا کیسا ہوئے گا۔" ماری ناگواری سے بولی۔ "اتنے دن بعد آیا ہے اور ایدر تو پہلا دفعہ۔ تھوڑا کھا پی کے جانے کا ہے۔ اپن کیا بولے، اپن کو تمھارا کیسا انتظار تھا۔ اُودر پاڑے کا لوگ بک بک بولا ہوگا۔ اپن اودر دو دفعہ پاڑے کا طرف بھی گیا تھا۔"

پیرو نے اُسے بتایا کہ ابھی وہ اپنے پاڑے کی طرف گیا ہی نہیں۔

"پاڑے نہیں گیا، سیدھا ایدر کو آیا ہے۔"

"ہاں ابھی بھی سیدھا ایدر ہی کو آیا ہے۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اپن کو جارجی سے تھوڑا کام ہے۔ کیدر ہے وہ؟"

"کون سا جارجی؟" ماری ہونٹ سکوڑ کے بولی۔

"کیا بولتا ہے؟" پیرو نے ترشی سے کہا۔

"ابھی جس جارجی کو تم پوچھنے آیا ہے، وہ ایدر نہیں ہے۔ ایدر دوسرا جارجی ہے۔"

پیرو نے ایک لمبی ہنکاری بھری۔

"جس جارجی کو تم نے اپن کا ہاتھ دیا تھا، وہ ابھی کیدر ہے۔ وہ تو خلاص ہوگیا دادا!" ماری کی آواز ٹوٹنے لگی۔

"اپن سمجھتا ہے ماری! اپن خوب سمجھتا ہے اور ابھی اسی لیے ایدر آیا ہے۔" پیرو نے بھیری ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی کیدر ہے وہ؟"

"ایدر ہی ہے۔"

"ایدر ہی کیدر؟"

"ایدر کسی ڈربا میں الٹام پڑا ہوگا سالا۔"

"جا کے اُس کو بول دے، اپن اُس کو دیکھنے کا ہے۔ ابھی سینگ کتنا آگے کو نکل آیا ہے۔"

بیروں نے بوتلیں، گلاس، بھُنا ہوا گوشت اور مونگ پھلی جانے کیا کیا میز پر رکھ دیا۔

پیرو کا ہاتھ پکڑ کے ماری کرسی پر بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔

"اپن کو جلدی ہے ماری! اُس کو جا کے بول دے کہ دادا آیا ہے۔" پیرو نے تُند لہجے میں کہا۔

"ابھی کس کو بولے دادا!" ماری کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "وہ دو باٹلیاں لے کے اُودر کوٹھری میں بند پڑا ہے۔"

"دو باٹلیاں لے کے؟"

"دوسرا ابھی ابھی باٹلی مانگتا ہے دادا! دونوں کا نشہ ہوتا ہے۔" ماری روہانسی ہوگئی۔

"اور تُو ایدر کائے کو بیٹھا ہے؟"

"اپن تو پرانا ہوگیا۔ دونوں باٹلی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے دادا! پرانا ہونے پہ ایک کا نشہ بڑھتا ہے، ایک کا اُترتا ہے۔"

"وہ تیرا سامنے چھوکری لوگ کو لے جاتا ہے اور تُو دیکھتا پڑا ہے؟ تُو ابھی گیدڑ کا اولاد کب سے ہوگیا؟"

ماری کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ "اپن کا ٹائم نکل گیا دادا! سب ٹائم ٹائم کا بات ہوتا ہے۔" وہ ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی کہ جارجی اتنی تیزی سے آگے بڑھا کہ وہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس نے جارجی کو لوٹانے اور اُس کے ساتھ چلنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہار گئی۔ "اپن ابھی کیا کرتا؟" وہ گرفتہ آواز میں بولی۔ "اپن جارجی دادا کو جانتا تھا، جارجی سیٹھ کو نہیں۔ بھڑوا جارجی کو نہیں جانتا تھا۔"

"ابھی بھڑوا بھی بن گیا وہ؟" پیرو چونک کے بولا۔

"ایدر پھر تم کیا دیکھتا پڑا ہے۔" ماری زہرخند سے بولی۔ "ابھی پیچھے دو کنجری لوگ بیٹھا ہے۔ بہت سا کوٹھری میں بند ہے اور بہت سا ایدر یار لوگ کے ساتھ اُن کے ٹھکانے پر چلا گیا ہے۔ آدھا آدھا [illegible] کا پارٹنر ہے جارجی۔ ابھی فارس روڈ سے کئی کنجری لوگ اُٹھ کے ایدر [illegible] کے بس گیا ہے اُد

پرائیوٹ چھوکری لوگ الگ ہے۔ جارجی پہلے اُن کا ٹرائی کرتا ہے پھر ایدر دھندا کرنے کا لائسنس دیتا ہے۔"

پیرو کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ "ابھی جارجی ایسا آتا، دادا سے کتّا کیسا بن گیا ماری؟"

ماری بہ مشکل اپنے آنسو روک سکی۔ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بتانے لگی کہ کچھ عرصے پہلے ایک دشمنے دادا کی موت پر جارجی گوا گیا تھا۔ وہ پندرہ روز قیام کے بعد واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا لیکن ماری نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ چند مہینے بعد وہ خود بھی آگیا۔ پیرو اِن دنوں جیل میں تھا۔ ماری نے اُس کے پاڑے کا چکر بھی لگایا لیکن ناکام واپس آئی۔ کوئی پیرو کا پتہ بھی اُسے نہ بتا سکا۔ اُس زمانے میں پیرو کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں بستی میں گشت کر رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پیرو کو ختم کر کے ماچی اُس کے پاڑے پر قابض ہو چکا ہے یا پیرو کہیں مارا گیا ہے اور ماچی اُس کی موت کو چھپا رہا ہے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ پیرو بہت سوں سے کہہ سن کے گیا ہے۔ ماچی نہ تو یہ افواہیں دبانے میں کامیاب ہو سکا، نہ شہر کے پاڑوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکا۔ گو ابھی تک صرف تین پاڑوں نے ہفتہ بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن دوسرے پاڑوں پر بھی ماچی کا اثر کم ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ خود ماچی تھا، اُس کی ناتجربہ کاری، مزاج کی تیزی۔ لوگ اُس سے خار بھی کھاتے تھے کہ پیرو کو اپنے اتنے بڑے پاڑے کی نگرانی کے لیے ماچی ہی کیوں نظر آیا، وغیرہ وغیرہ۔

جارجی نے وکی کو روک لیا اور اُس کی مدد سے اُس نے سستے داموں یہ جگہ حاصل کی۔ یہاں علاقے میں پہلے سے شراب کی بھٹیاں کام کر رہی تھیں اور یہ جگہ ساحل پر ہونے کی وجہ سے زیادہ دل کش اور محفوظ تھی۔ وکی نے یہ کوٹھریاں خاص طور سے بنائیں تاکہ ایک تو پولیس کی نظروں سے اوجھل رہیں، دوسرے تخلیہ چاہنے والوں کو دُور نہ جانا پڑے۔ پولیس چھاپے کی صورت میں فرار کے کئی راستے تھے اور پولیس آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جارجی نے ہر طرف کا خیال رکھا تھا۔ پانچ مہینے پہلے یہ کام شروع کیا گیا تھا۔ دو مہینے میں سب کچھ تیار ہوگیا اور پیسہ بھی کوئی خاص صرف نہیں ہوا۔ جارجی کو اندازہ نہیں تھا کہ وکی نے اس کے لیے سونے کا درخت لگا دیا ہے۔ وکی نے ہر چیز کے نرخ بھی خود طے کیے اور دام بھی۔ وکی کے مشورے پر جارجی نے شہر کے بعض منتخب دادا خرید کے اس عشرت کدے میں تعینات کر دیے۔ بائی کلّا اور اندھیری کے داداؤں کو بھی اُسی نے ورغلایا اور پیرو کے پاڑے سے وابستگی ختم کرنے میں پہل بھی اُسی نے کی۔ ماچی نے جانے کیا سوچ کے یہ اہم بات درگزر کر دی۔ اس سے جارجی اور شیر ہوگیا۔ کئی موقعوں پر ماری نے ایک بیوی کی حیثیت سے اُسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جیسے جیسے جارجی بڑھ رہا تھا ماری چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں بچوں کو پونا کے ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا، اُن کے لیے اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ ادھر اُدھر خواری کے خوف سے ماری کے بہ قول وہ اپنے شوہر کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آگئی اور اب کاؤنٹر پر بیٹھی شرابیوں کے لیے پیمانے بناتی ہے اور کنجریوں کی لگار کا حساب رکھتی ہے۔ جارجی کے متعین کیے ہوئے دادا یہاں آنے والوں کو بے قابو ہونے سے روکے رکھتے ہیں۔ جارجی کی دیکھا دیکھی باندرے کے دادا نے بھی ادھر ہی ایک جگہ کھولنا چاہی تھی لیکن جارجی کے زرخریدوں نے شروع ہی میں سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ جارجی اب تلاب کے پاڑے میں دن کے وقت بس چند گھنٹوں کے لیے بیٹھتا ہے اور تیسرے چوتھے دن علاقے کا چکر لگاتا ہے۔ اُس نے ایک پرانی موٹر خرید لی ہے۔ روز شام کو وہ یہاں آ جاتا ہے اور پیتا رہتا ہے۔ رات گئے کسی بھی کوٹھری میں جا کے ڈوب جاتا ہے اور اکیلا نہیں۔ ماری بتا رہی تھی کہ تقریباً روز کا یہی معمول ہے۔

"پر سب تیرا کھوٹ ہے ماری!" پیرو جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بھول گیا اپن نے تجھ کو شادی میں ابھی کیا چیز دیا تھا؟"

"اپن نے سنبھال کے رکھا ہے۔"

"ابھی کائے کو دیا تھا؟ ایسا دبا کے رکھنے کو، زنگ لگانے کو نہیں۔ تُو ابھی اُس حرامی کا آنکھ کیوں نہیں نکال باہر کیا؟"

"پیرو! چھرا ابھی تم نے نہیں دیا تھا۔"

پیرو جزبز ہو کے رہ گیا۔ "کون سا کوٹھری میں ہے ابھی وہ کتّیا کا جنا؟" اُس نے آتشیں آواز میں پوچھا۔

ماری نے دزدیدہ نگاہوں سے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

پیرو فوراً کرسی سے اُٹھ گیا اور ماری نے جس کوٹھری کی نشان دہی کی تھی تیز قدموں سے اُس کی جانب بڑھا۔ ماری چلانے لگی۔ "نہیں دادا نہیں! اپن کا بات سنو۔ ابھی یہ ٹائم نہیں۔ ابھی تم ایدر آگیا ہے تو اپن کو ابھی کوئی فکر نہیں ہے۔"

پیرو نے توجہ نہیں دی لیکن ماری نے بھاگ کے اُس کا کرتا پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کے تڑپتی بلکتی آواز میں بولی۔ "یہ ٹائم ٹھیک نہیں ہے دادا! ابھی بہت ٹائم آئے گا۔"

"ہٹ جا ماری! اپن تیرا نہیں، ابھی اپنا حساب کے لیے آیا ہے۔ تیرا تو بعد میں چکتا کرے گا۔"

"ابھی تو اُس سے بات بھی نہیں ہوئے گا دادا! وہ شام سے پی رہا ہے۔"

"اپن دیکھ لیتا ہے، پر تو ایدر سے ہٹ جا۔" پیرو نے اُس کا بازو پکڑ کے ایک طرف ہٹا دیا۔ ماری بلبلانے لگی۔ "ابھی زیادہ لفڑا کیا تو اپن پہلے تجھ کو....." پیرو نے جھنجھلا کے کہا۔

اتنی دیر میں چار آدمی کوٹھری کے گرد پہنچ گئے۔ اُن کے تیور ٹھیک

نظر نہیں آ رہے تھے۔ ماری دم بخود سی الگ کھڑی ہو گئی۔ پیرو نے بھی اُن لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ پیرو آگے بڑھا تو اُن میں سے چوڑے ڈیل کا ایک آدمی کوٹھری کے دروازے پر ٹانگیں پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔

"تیرا ایدر ابھی کوئی نہیں ہے کیا؟" پیرو نے درشتی سے کہا۔ اُس کی آواز حیرت انگیز حد تک تھمی ہوئی تھی۔ قریب جانے کے بجائے اُس نے زرک کے دروازے پر چھائے ہوئے آدمی سے کہا کہ وہ سامنے سے ہٹ جائے۔

"جب تک اپن ایدر ہے تم ایسا اندر نہیں جا سکتا۔"

"پر تو ہے ابھی کتنا دیر کا۔"

ان کی تعداد چار تھی۔ باقی تین نے دروازے کے پاس ہی حصار سا بنا لیا تھا۔ پیرو دروازے والے آدمی کے سر پہ پہنچ گیا۔ جھل اور میں بھی چند قدم آگے ہو گئے۔ دروازے کے پاس جا کے پیرو ٹھہر گیا اور ماری کی طرف منہ کر کے بولا۔ "ماری! ابھی اسی لوگ کو پیسہ دے کر جارجی نے خریدا ہے۔ ان کو تو چاقو کھولنا بھی......" پیرو نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کی کلائی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ پیرو کے جسم میں یکا یک ایک لہر اٹھی تھی۔ میری بینائی کے لیے وہ پلک جھپکنے کی کوئی غفلت تھی یا کسی جھاکے کی خبر تھی۔ عین وقت ماری سے پیرو کے مخاطب ہونے کے سبب دروازے پر سینہ تانے اور چاقو اٹھائے ہوئے آدمی کی توجہ بھی ایک لمحے کے لیے سہی مگر منتشر ہونی چاہیے تھی۔ پیرو کو اسی لمحے کی ضرورت تھی۔ اُس نے منہ پھیرے پھیرے جھپٹتے ہوئے ہاتھ سے اُس کی کلائی پر گرفت ڈال کے اتنی زور سے زمین پر جھٹکا دیا تھا کہ کوئی بھی نہ توازن قائم رکھ سکتا تھا، نہ ہوش بجا۔

پیرو کو شبہ تھا کہ دوسرا قریب کھڑا ہوا آدمی اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے اضطراری حالت میں اُس کی طرف بڑھ سکتا ہے حالانکہ دوسرے آدمی کی طرف سے پیرو کو اتنی مہلت ضرور ملنی چاہیے تھی کہ وہ اُس کے ساتھی سے عہدہ برآ ہو سکے مگر وہ اٹھائی گیرے تھے۔ باقاعدہ کسی باڑے سے بندھے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کوئی دادا ہوتا تو پیرو کے نمٹنے کا انتظار کرتا۔ وہ چاقو تانے پیرو کی طرف جھپٹا۔ پیرو نے اپنی گرفت کے آدمی کو چھوڑنے کے بجائے دوسری مرتبہ جھٹکا دے کے اُس کے سامنے ڈال دیا۔

دوسرے آدمی کے جھپٹنے اور پہلے آدمی کو اُس کے آگے ڈالنے میں ایک لمحے کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایک لمحے کا حساب پیرو کے ذہن میں ہوگا جبھی اُس نے یہ اقدام کیا۔ ہر چند کہ اس میں اُس کے لیے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا اُس کے پنجے میں کسے ہوئے آدمی کو چاقو لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے نے پیرو پر جھپٹنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پیرو نے ادھر پہلے کو جھٹکا دے دیا۔ دوسرا بڑھنے کا ارادہ کر چکا تھا، اُس کے لیے لوٹنا مشکل تھا۔ بس یہی ہے کہ مقابل کا کوئی ارادہ اپنے لیے بہتر معلوم ہو تو اُسے اور پختہ اور یقینی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پیرو سے ایک لمحے کی جلدی ہو جاتی تو بڑھنے والے آدمی کو لوٹنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا۔ اُسے یقین تھا کہ پیرو اُسے بڑھتا دیکھ کے اُس کے ساتھی کو چھوڑ کے اپنے بچنے کی فکر کرے گا اور اُس سے کہیں بچ کے ضرور مگر اُس کے وہم و گمان میں نہ ہو گا کہ پیرو اُس کے ساتھی کو جوں کا توں تھامے رکھے گا اور اُس میں اُس گراں ڈیل کو ہاتھ کے بل اٹھا کے پھینکنے کا زور ہے۔ اندازے کی غلطیاں ہی آدمی کو پشیمان کرتی ہیں۔ آخری لمحے میں اُسے متزلزل ہو جانا چاہیے تھا۔ بالکل آخری لمحے میں اُس نے خود پر قابو پا لیا اور ہاتھ میں لیے ہوئے چاقو کے کسی بے اختیار زخم سے اپنے ساتھی کو بچانے کی کوشش کی۔ وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے اور اس پر گرتے گرتے رہ گیا۔ اُس نے ترچھے ہو کے کسی اور طرف نکل جانا چاہا۔ پیرو نے اُچھل کے اُس کے کولھے پہ ضرب لگائی۔ وہ زمین پر لوٹ گیا کیونکہ پہلے ہی اپنا توازن استوار کرنے کی کوشش میں تھا۔ جتنی دیر میں وہ زمین سے اُٹھتا، پیرو کی دوسری ضرب نے اُسے بے حواس کر دیا۔ اُس کا چاقو آگے جا کے گرا۔

پیرو کو باقی دو کا بھی خیال ہو گا جو ایک ایک کر کے یا ایک ساتھ اُس پر ٹوٹ سکتے تھے لیکن وہ پر تولے کھڑے رہے۔ اُن کے تامل کی ایک وجہ یہ بھی یا اعتماد کہ اُن کے دو ساتھی کم نہیں پڑیں گے یا اطمینان کہ میں اور جھل الگ کھڑے ہیں۔ ادھر ماری نے پیرو کو روکنے کے لیے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ میری اور جھل کی خاموشی نے بھی ممکن ہے انھیں کچھ غیرت دلائی ہو۔ اُن کی مالکہ ماری کی سامنے کھڑی تھی، ایک عورت۔ دو اور عورتیں بھی موجود تھیں کچھ دور کے اُن کے سامنے ذلت اٹھانے کا کوئی احساس اُن پر غالب آ گیا ہو۔ انھیں یہ خدشہ بھی ہو گا کہ اُن کی شمولیت پر میں اور جھل تماشائی نہیں بنے رہیں گے کیا معلوم تھا کہ ہمیں اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تو چاقو بھی نہیں نکالے تھے۔ پیرو اکیلا ہی اُن کے لیے کافی تھا۔ دو چار تو بھی پیرو کو کوئی دقت پیش نہ آتی۔ پھر انھیں موقع ہی کتنا ملا تھا۔ دیکھتے دونوں بہ یک وقت زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پہلے کا بازو شانے سے اکھڑ گیا ہو گا اپنی گراں جسمی کے سبب اُسے چوٹ اور گہری لگنی چاہیے تھی۔ دوسرے کا اتنا بھاری نہیں تھا لیکن شاید اُس کے سر پہ چوٹ لگی تھی وہ بے دم سا

چار پانچ آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی میں زیادہ حیلہ جوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔ غلط تاثر دینا اور ایک دوسرے کے فیصلے منتشر کر دینا۔ ایک دوسرے کو اشاروں کا موقع نہ دینا اور پہلے ہی ہلے میں دو ایک کو نیم جان کر دینا کی ہر وقت اور ہر مرحلے پر ضرورت ہوتی ہے لیکن زیادہ آدمیوں میں دماغ کا کی زیادہ۔ کوئی اور وقت ہوتا تو پیرو اس صورت حال کو کچھ اور طول دیتا استاد اور دادا اسے اپنی مشق سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے مرحلے میں اپنا کاری داؤ آزماتے۔ آزمائشی پینترے بدلتے رہتے ہیں۔ مشق کا یہ ایک نہایت فطری طریقہ

ہے۔ پیرو نے انھیں بس لمحوں میں نمٹا دیا، ویسے وہ زیادہ وقت کے تھے بھی نہیں۔ پیرو کو اُن کے سامنے جانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ بہتر تھا کہ وہ مجھے اشارہ کر دیتا۔ بعد میں اُسے غالباً اس کا احساس ہوا ہو۔

پیرو نے دوسرے کے کولھے پر دو مزید ٹھوکریں لگا کے تیسری ضرب دروازے پر لگائی۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اندر بہت دھیمی روشنی تھی۔ پیرو تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے بڑبڑاتی، چونکتی چیخیں سنائی دیں۔ چند لمحوں بعد ہی پیرو باہر آ گیا۔ وہ اپنے پنجے میں جارجی کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ سانولے رنگ اور سڈول جسم کا جارجی دیکھنے میں نوجوان لگتا تھا۔ اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں، زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ پیرو نے باہر آ کے اُسے زمین پر دھکیل دیا۔ وہ اوندھا گرا۔ جارجی بُری طرح بوکھلایا ہوا تھا اور جھپکتی پلکوں سے ادھر اُدھر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماری ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ شراب میں دھت پڑا ہوا تھا۔ پیرو نے جب اُس کے بال پکڑ کے زمین سے اُٹھایا تو اُسے کچھ ہوش آیا۔ "دادا! پیرو دادا!" وہ بہکتی اٹکتی زبان میں بولا۔ "تم! تم ایدر؟" اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئی تھیں۔ پیرو نے اُس کے بال چھوڑ کے بے دریغ طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ جارجی پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، چند طمانچوں میں زمین پر لوٹ گیا۔ پھر اُس نے اٹھنا چاہا تو پیرو نے ٹھوکر ماری۔ اسی اثنا میں چادر لپیٹے، سر چھپائے ایک عورت ٹھٹھکتی ہوئی کوٹھری سے برآمد ہوئی اور بے تحاشا ایک طرف بھاگ گئی۔ وہ بھاگتی چلی گئی۔

پیرو نے کچھ توقف کیا اور مضطرب نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جھل فوراً سے پاس جا کے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے میری طرف لے آیا۔ جارجی دوبارہ زمین سے اُٹھ گیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تگ و دو میں کسی طرح کھڑا بھی ہو گیا۔ اب کسی حد تک اُس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا لیکن حالت اس لائق نہیں تھی کہ اُس سے کچھ کہا سنا جا سکتا۔ اُسے خود ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہیے تھا۔ پیرو نے بھرّائی آواز میں ماری کو مخاطب کیا اور وہی کہا جو اُس نے بابی کالا کے دادا دینا سے کہا تھا۔ "اور اُس کو بول دینا کہ ایک بھی کنجری لوگ نہیں آئے گا۔ بھڑوا گیری کرنا ہے تو ابھی اس کو ڈوبے دے گا۔" پیرو نے ماری کو تاکید کی۔ "اپنے باڑے پہ آنے سے پہلے جارجی چلا لے کا باڑے نکیں جانے گا، سمجھا؟" ماری ہیجانی انداز میں سر ہلانے لگی۔

جارجی لنگ کھڑا پیرو کو گھور رہا تھا۔ پیرو نے ایک جانب رکے ہوئے کوٹھری والے کو اشارہ کیا اور اُسی کوٹھری کی طرف چل پڑا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ ہم کوٹھری سے نکل آئے تھے، ماری کی صدائیں صحن کے ٹھیر گئے۔ ماری دوڑتی ہوئی گلی میں آ گئی۔ پیرو کے قریب آ کے وہ کسی مجرم کی طرح کھڑی ہو گئی۔

اُس کا سارا بدن ہانپ سا رہا تھا۔

"ابھی کیا ہے ماری؟" پیرو نے برگشتگی سے پوچھا۔

"دادا! ابھی ابھی اپن سے کوئی غلطی ہو گیا ہے کیا؟" وہ دھڑکتے ہونٹوں سے بولی۔

پیرو کا جسم بل کھا گیا۔ اُس نے بڑھ کے دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ لیا اور ماتھے کو بوسہ دیا۔ "غلطی اپن سے ہوا ہے۔" وہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "جو اس حرامی کا ہاتھ میں تیرا ہاتھ دیا، پر اپن ابھی آ گیا ہے جانی!"

ماری اُس کے شانے پر سر لگائے سسکتی رہی۔

ٹم ٹم ابھی میں رنڈوے باڑے کی چوڑی گلی میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ اُنھوں نے ہمیں آ لیا۔ چار بجنے والے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا طاری تھا۔ گھوڑے کی ٹاپیں دُور دُور تک گونج رہی ہوں گی، اسی لیے وہ بھاگتے ہوئے سڑک پر آ گئے تھے۔ انھیں جیسے یقین تھا کہ آنے والی ٹم ٹم میں ہمارے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ بس ہم پر نظر پڑنے کی دیر تھی، ہر طرف شور پھوٹ پڑا۔ ہم وہیں اُتر گئے۔

اُن کی چیخ پکار سُن کے گلی کے اور بہت سے آدمی بھی جیسے بجر سُن کے اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے۔ ماہی گگیا، پلمبی، شاہو، جمرو، منگو، چھیدا، شیدے، گھیسے، زورا اور جانے کون کون۔ اُن سب نے ہمیں چاروں طرف گھیر لیا اور اُچھلنے کودنے لگے۔ طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ اُن کے چہروں پر خون تمتما رہا تھا، چمکتی آنکھیں، دھڑکتے سینے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیرو کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے لوٹا ہو، جیسے وہ اُس کی آمد سے قطعی مایوس ہو چکے ہوں۔ انھیں کہاں اندازہ تھا کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ کس قدر درست ہیں۔

باڑے کی عمارت روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بالکل رت جگے کا منظر تھا۔ عمارت کے ساتھ باہر لمبے چبوترے پر دری بچھی ہوئی تھی۔ رات بھر وہ یہیں بیٹھے ہمارا انتظار کرتے رہے ہوں گے۔ چبوترے کے پاس گلی اور سڑک کے نکڑ پر شرفی دادا کی چائے اور پان کی دکان اب تک کھلی ہوئی تھی۔ اُن کا زور نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم تینوں کو کندھوں پر سوار کر کے باڑے میں لے جائیں۔ شور غل سے گرد و پیش کے سوئے ہوئے مکان بھی جاگ گئے۔ دروازوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانکنے لگے۔ اندر باڑے کا دالان، صحن اور برآمدہ بھی تیز روشنیوں سے منور تھا۔ درمیان میں پیرو کی خالی چوکی چاندنی بچھائے پیرو کی منتظر تھی۔ جھل کے لیے حقہ بھی رکھا ہوا تھا۔ پیرو نے چوکی پر قدم رکھنے سے پہلے جھل کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ جھل نے کوئی تعرض بھی نہیں کیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ مٹھائی کے ٹوکرے اور ہار پھول لے آئے۔ پھول اس قدر تھے کہ چوکی پر جگہ جگہ پتیاں بکھر گئیں۔ ایک ایک شخص آ کے جھل اور پیرو کے پیر چھونے لگا۔ جھل اُن کے سلام

کے جواب میں کبھی اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا، کبھی سر پر اور کبھی زانو پر۔ پیرو کسی کے گال کی چٹکی بھر لیتا، کسی سے سر ٹکرا دیتا اور کسی کے سینے پر مکا مار دیتا۔ اُن کے ہاتھ میرے پیروں کی طرف بھی بڑھے تھے اسی لیے میں ماچی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ بابے بھی میرے پہلو میں تھا۔ تھوڑی دیر میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔

صبح تک سارا دالان لوگوں سے بھر چکا تھا۔ اُن میں پاس پڑوس کے بہت سے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ اُمڈتے اور جھکتے ہوئے آتے، آتے ہی اشتیاق، اضطراب سے پیرو کو سلام کرتے، اُس کا حال پوچھتے۔ اُس کی کمی محسوس ہونے کا ذکر کرتے اور پوچھتے کہ آخر اتنے دن اُس نے کس محرکے کس مجبوری میں لگائے؟ پیرو ہنس ہنس کے ٹالتا رہا، کہتا رہا کہ بہت دُور گیا تھا، اُدھر سے بہت دُور، کیا بتائے۔ کبھی بتائے گا۔ اُسے بہت سے محلے داروں کے علاوہ اُن کی عورتوں اور بچوں کے نام بھی یاد تھے۔ وہ ہر ایک سے پوچھتا کہ اُس کے پیچھے کسی نے انھیں پریشان تو نہیں کیا؟ کوئی اُسے اپنی ماں کے مرنے کی خبر سناتا، کوئی اپنے بچے کی بیماری کی، کسی کے ہاں چار بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا، کسی سے زندگی روٹھ گئی تھی، کسی پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ وقت نے کہیں کچھ تماشا کیا تھا، کہیں کچھ۔ وہ اُسے اس طرح سب کچھ سنا رہے تھے جیسے بس آج کا دن ہے پھر وقت نہیں ملے گا۔ گویا انھیں دھڑکا ہو کہ پیرو پھر کہیں نہ چلا جائے۔

اب ہر طرف اُجالا پھیل چکا تھا اور جیسے جیسے اُجالا بڑھ رہا تھا لوگوں کی آمد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ ختم ہونے والا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ درمیان میں پیرو نے تجمل سے اور مجھ سے کچھ دیر کسی کمرے میں آرام کر لینے کو کہا لیکن ایسے میں نیند کیسے آسکتی تھی اور اب نیند کا کون سا وقت رہ گیا تھا۔ سات بجے کے قریب باڑے کے آدمی ناشتے کا اہتمام کرنے لگے۔ وہ کسی برات کی دعوت کی طرح سرگرم نظر آتے تھے۔ پھر اتنے بہت سے لوگوں کے لیے مٹھائی، حلوہ پوری، ترکاری اور چائے پر مشتمل ناشتے کا اہتمام انھوں نے اتنی جلدی نہ جانے کیسے کر لیا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہوتے آٹھ بج گئے۔ پیرو کے جلد اُٹھنے کے آثار نہیں تھے۔ میں نے سوچا، تجمل کو یاد دلاؤں کہ اسپتال میں مریضوں سے ملنے کے لیے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کا وقت مقرر ہے لیکن یہ سوچ کے خاموش رہا کہ تجمل کو خود خیال ہوگا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، پاؤں پھیلائے حقے کے کش لگا رہا تھا اور آنے والوں کے طرح طرح کے فسانے سن رہا تھا۔ گویا دیر تک اُس کے پیر دباتا رہا تھا۔ تم کے باڑے کی طرف آتے وقت میرے جی میں آیا تھا کہ درمیان میں کہیں اُتر کے گھر چلا جاؤں۔ اُس وقت تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر اب وقت اور نکل چکا تھا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی ہوں گی، کسی نے ہمارے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ بار بار آپا جان سے پوچھتی ہوں گی لیکن آپا جان کیا بتا پاتے ہوں گے۔ ممکن ہے مولوی اکرم نے یہ دیکھ کے انھیں مجید کے ہوٹل کا سارا قصہ سُنا دیا ہو اور لوگ ہماری غیر حاضری کو اسی سلسلے کی کوئی کڑی سمجھ رہے ہوں۔ آپا جان کو جولین کا گھر بیز ہمارا کوئی اور ٹھکانا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ مولوی اکرم امیر علی اور وہ بار بار ملیر پٹرک پر آتے رہیں گے۔ میں کہیں بیچ میں تم سے اُتر جاتا تو ٹھیک تھا مگر مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔

پیرو کے خیال کے علاوہ حیدرآباد سے تعاقب میں آنے والے بھی پیرو کے ارادے میں رکاوٹ کا سبب بنے۔ وہ ماچی کی اطلاع کے مطابق باڑے میں موجود تھے۔ اس دوران مجھے ماچی سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ماچی نے اُن کی باڑے میں موجودگی کی تصدیق کر دی تھی۔ اُس نے بتایا کہ دونوں کو اوپر ایک خاص کمرے میں رکھا گیا ہے اور اُس کمرے میں دن کے وقت بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ کمرے کی آوازیں کمرے ہی میں گھٹ کے رہ جاتی ہیں۔ پیرو کے انتظار میں اُن سے کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔ تجمل اور پیرو شاید انھیں بھول گئے تھے۔ میرا خیال تھا باڑے پہنچ کے وہ سب سے پہلے انھی کے پاس جائیں گے کہ دیکھیں وہ کیا بتاتے ہیں، کس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مجھے یہی جاننے کی بے کلی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی نواب قطب الدین علی کے فرستادہ ہوں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ رہ رہ کے ایک ہی وسوسہ میرے دل میں کھٹکتا تھا کہ کہیں وہ کسی اور کا نام نہ لے دیں۔ وہ نواب حشمت جنگ کا نام بھی تو لے سکتے ہیں، پھر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس صورتِ حال میں ہمارا دوبارہ حیدرآباد جانا کس طرح مناسب ہوگا۔ کوئی اور نہ سہی خانم تو ابھی وہاں موجود ہے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ آجاتی تو کوئی بات نہ تھی۔

جب نو بج گئے تو مجھ سے نہ بیٹھا جا سکا۔ اُدھر جولین بھی فرخ فریال کے پاس جانے کے لیے صبح سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں بیٹھے بیٹھے کھسکتا ہوا تجمل کے پاس چلا گیا لیکن میرے زبان کھولنے سے پہلے ہی اُس نے سر ہلا کر کہا: "چلتے ہیں بے۔"

"اسپتال نہیں جاؤ گے؟" میں نے تنک کے کہا۔

"ابھی ٹائم ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

میں نے سوچا، کہوں کہ ٹائم تو دیکھتے دیکھتے نکل جائے گا مگر میں چپ رہا۔ پیرو نے مجھے تجمل کے پاس آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس وقت بمبئی کے [illegible] کے کئی داداؤں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور اپنے پیچھے پڑنے والے پولیس کے چھاپوں کے تذکرے سن رہا تھا۔ میں نے نہ کوئی لفظ کہا، نہ اشارہ کیا مگر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ "ابھی کیدھر، دادا!" اُس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی حیرانی سے بولے۔

"اپن ابھی جانے کا ہے۔" پیرو نے کھردری آواز میں کہا اور چوکی سے نیچے آگیا۔ سب دیکھتے رہ گئے۔ تجمل بھی کسمساتے ہوئے اُٹھا۔ کوئی شخص بیٹھا نہ رہ سکا۔ پیرو کا رُخ بیرونی دروازے کی جانب نہیں تھا۔ اُس نے تجمل کے آنے کا انتظار کیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے جسم میں کانٹے چبھنے لگے۔ اندر جانے کا مطلب یہی تھا کہ اُس نے اُن دونوں کو دیکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ انھیں زیادہ دیر باڑے میں روکے رکھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ صاف صاف [illegible]۔

باڑے کی عمارت خاصی بڑی تھی، تین منزلوں اور کئی کمروں پر مشتمل کسی سرائے کے مانند۔ عمارت کا عقبی حصہ کھلا ہوا اور کچا تھا۔ وہاں باڑے کے آدمی زور آزمائی کرتے تھے اور سال میں دو ایک مرتبہ تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ ہمارے گزرنے پر لوگ ایک طرف ہٹتے گئے۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے ہم ایک کشادہ اور پرسکون کمرے میں آگئے۔ یہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا اور پیرو کبھی کبھی یہاں آرام کرتا تھا۔ ماچی بھی ہمارے ساتھ تھا۔

"ابھی کیسا ہے دکنی جوڑا، اُس کا پوچھا!" کسی تمہید کے بغیر پیرو نے ماچی سے پوچھا۔

"کل آگے دن سے وہ ایڈی پہ پڑا ہے۔" ماچی نے کسیلی آواز میں جواب دیا اور کہنے لگا کہ ایک دن کی بندش سے وہ بڑی حد تک پگھلے ہوئے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں انھوں نے بہت چیخ پکار مچائی تھی مگر پھر خود اُن کی آوازیں دم توڑ گئیں۔ وہ اپنا جرم پوچھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انھیں یقیناً کوئی بڑا دھوکا ہوا ہے۔ وہ تو تاجر ہیں اور بمبئی میں کاروبار کی غرض سے آئے ہیں۔ ماچی کے کہنے کے مطابق پھسی اور گلیا باڑے کے دو تین آدمیوں کی مدد سے انھیں یہاں لانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پہلے انھیں ورغلا کے علاقے سے قریب کیا پھر کسی جگہ اُن سے جھگڑے اور جھگڑنے والے دوسرے تھے۔ انھیں زدوکوب کر کے نیم جانی اور نیم بیہوشی کے عالم میں یہاں لانا ایسا دشوار نہیں تھا۔ ماچی تفصیل بتانے لگا۔ پیرو نے دلچسپی نہیں لی اور ہدایت کی کہ وہ انھیں اوپر تکونے کمرے میں پہنچا دے۔

چند منٹ بعد ہم اوپر پہنچے تو وہ کمرے میں موجود تھے۔ ماچی اور باڑے کے دو اور آدمی بھی۔ انھوں نے اُن دونوں کو دیوار کے ساتھ لگی بینچ پر بٹھا رکھا تھا۔ دونوں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ شیروانی اور واسکٹ کے سوا وہ سفر کے اُنھی کپڑوں میں تھے، جو اب نہایت خستہ و شکستہ ہو چکے تھے جیسے مہینوں کے پہنے ہوئے ہوں۔ داڑھی بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، ہونٹ خشک، آنکھیں ویران، چہرے پر جا بجا خراشیں۔ کرتے پر خون کے دھبے، پرکٹے پرندوں کے مانند۔ ایک دن میں آدمی اس سے زیادہ کتنا بدل سکتا ہے۔ کہتے ہیں کبھی کان بھی سونگھنے لگتے ہیں۔ آہٹوں کی بو، زینہ چڑھتے ہوئے ہمارے بھاری قدموں کی آہٹیں انھوں نے سونگھ لی تھیں اسی لیے اُن کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے داخل ہوتے ہی دونوں کو جھٹکا سا لگا جیسے کسی بُرے خواب کی دہشت سے آنکھ کھل جائے۔

ہم کمرے کی نکڑ کی طرف بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے۔ وہ بینچ سے کھڑے ہو گئے تھے۔ "ابھی پہچان لیا اپن کو؟" پیرو نے زہرخند سے کہا۔

اُن کے دست و بازو پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔

اُنھیں اپنی منتشر توانائی سمیٹنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے ہی تھا۔ پیرو نے انھیں وقت دیا مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

"ابھی اِن لوگ کو تھوڑا پانی دکھاؤ۔"

ماچی کے پہلو میں کھڑے ہوئے آدمی نے پیرو کے حکم پر فوراً عمل کیا۔ کونے میں رکھی ہوئی صراحی سے پانی اُنڈیلا اور کٹورا اُن کے آگے کر دیا۔ وہ منع کرنا چاہتے تھے لیکن اُن میں انکار کی بھی تاب نہیں تھی۔ دونوں سے چند قطرے ہی پیے جا سکے۔

"اپن کو زیادہ بحث نہیں کرنے کا ہے۔" پیرو نے سرد لہجے میں مختصراً اُن سے کہا کہ وہ سیدھی طرح اپنے آقا کا نام بتا دیں گے تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا، ورنہ یہ اُن کا آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کے بعد اُن کے متعلق تمام فیصلے دوسرے کریں گے۔ بہتر ہے کہ وہ ہوش مندی کا ثبوت دیں، وہ یہ حقیقت جتنی جلد تسلیم کر لیں گے کہ تمام راستے اُن پر بند ہو چکے ہیں، اُتنا ہی اپنے لیے بہتر کریں گے۔

جواب میں انھوں نے یہ حقیقت شاید تسلیم کر لی ہو لیکن ہوش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ انھوں نے وہی کچھ دہرایا جو ماچی ہمیں بتا چکا تھا کہ وہ حیدرآباد دکن سے اپنے کاروبار کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ریل میں اُن کے کسی طرزِ عمل سے ضرور ہمیں کوئی غلط تاثر مل گیا ہے، وہ تو ایک بے ضرر شہری ہیں۔

پیرو نے انھیں دوبارہ کسی قسم کی تنبیہ نہیں کی، اُس کے اشارے پر باڑے کے آدمی نے پلک جھپکتے میں اُن کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک جھٹکے میں نیچے تک اُن کے دامن چاک کر دیے۔ باڑے کے دوسرے آدمی نے دیوار پر ٹنگا ہوا ہنٹر اُٹھا لیا۔ وہ چیخنے چلانے لگے۔ ماچی نے باڑے کے آدمیوں کو اُن کے سامنے سے ہٹا دیا اور خود آگے جا کر دونوں کے بال پکڑ کے اس زور سے اُن کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے کہ دونوں کی آنکھیں اُلٹ گئیں۔ انھوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن توازن قائم نہ رکھ سکے، چکراتے ہوئے فرش پر گر گئے۔ شروع کے ابتدائی لمحے نسبتاً آسان ہوتے ہیں۔ وہ غیر ارادی طور پر چکراتے ہوئے زمین سے اُٹھ گئے تھے مگر اسی اثنا میں درد اُن کی رگوں میں پھیل گیا تھا۔ درد کی شدت اُن کی گویائی پر بھی غالب آگئی۔ میرے خیال میں ماچی نے کچھ تیزی دکھا دی تھی۔ پیرو کو اُن کے اوسان کی درستی کے لیے کچھ صبر کرنا پڑا۔

"اِن کیا بولا!" کچھ دیر کے سکوت کے بعد پیرو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا کہ وہ جتنی دیر کریں گے اُن کا وقت اتنا ہی قریب ہوتا جائے گا۔

اُن میں سے ایک گھٹی گھٹی آواز میں بولا کہ انھیں کچھ معلوم ہو تو وہ بتائیں بھی۔ آخر وہ کس بات کا اعتراف کریں؟ کس شخص کا نام لیں؟

جس آدمی کے ہاتھ میں ہنٹر تھا پیرو نے اُسے اشارہ کر دیا۔ انھوں نے بھی دیکھ لیا۔ ایک دم ڈکرانے گڑگڑانے لگے اور دونوں ایک ساتھ پیرو کے پیر پکڑنے دوڑے۔ انھوں نے پیرو کے پیروں پر سر پٹخنا اور گریہ کرنا شروع کر دیا کہ خدا گواہ

ہے وہ کچھ نہیں جانتے۔

"ابھی اُٹھا آگے پیچھے کا یاد آجائے گا تم کو۔" پیرو نے ٹھوکر مار کے اُنھیں خود سے دُور کر دیا اور دُھتکارتے لہجے میں ماچی سے کہا کہ وہ ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہا ہے۔ ماچی منتظر ہی تھا۔ پیرو کی ٹھوکر سے دونوں فرش پر لوٹ گئے تھے۔ ماچی نے اُن سے نمٹنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ دونوں کمرے کے بالکل آخری بستر کی نکڑوں میں دُبک گئے۔ بدحواسی میں اُنھیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس طرح اُنھوں نے ماچی کے لیے اور آسانی کر دی ہے۔ ماچی ایک جست میں اُن کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اُس نے اُن کے اِدھر اُدھر بھاگنے کا امکان یک سر مسدود کر دیا۔ ماچی نے ایک ہی سانس میں دونوں ہاتھوں سے پے در پے اتنے مکّے اُن کے پیٹ میں مارے کہ کوئی بھی بس اسی قدر برداشت کر سکتا تھا۔ اُنھیں بلبلانے کا یارا نہ رہا۔ نہ اپنے پیروں پر جمے رہنے کا۔ ماچی بالوں سے کھینچتا ہوا اُنھیں درمیان میں لے آیا۔ ایک کو اُس نے گلے سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ اُن کے ذہن میں اپنے مقابل لوگوں کے بارے میں کوئی ابہام تھا تو اب دُور ہو جانا چاہیے تھا۔ ماچی نے اُسے بہت اوپر اُٹھایا اور اوپر ہوا میں اُچھال کے دوبارہ اپنے ہاتھوں پر لے لیا۔ اگر اُسی لمحے وہ اُس آدمی سے دست کش ہو جاتا تو اُس کے جانے کتنے جوڑ کھل جاتے۔ ماچی نے اُسے اپنے ہاتھوں پر لے کے زمین پر پھینک دیا اور پیچھے ہٹ آیا۔ ماچی نے عمداً ایسا کیا تھا کہ وہ بے رعایت تصور کریں۔ رعایت بار بار نہیں دی جا سکتی۔

چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی طاری رہی۔ درد و کرب سے اُن کے جسم دُہرے ہو گئے تھے۔ وہ تڑپتے تڑپتے اینڈتے اکڑتے ہوئے فرش پر کراہتے رہے۔ پیرو نے ایک لمحاتی توقف کے بعد ماچی سے کہا کہ اب وہ اُن سے پوچھے اُنھیں اب بھی کچھ یاد آیا کہ نہیں؟

ماچی کے سوال پر دونوں نے اپنی نیم جانی کے باوجود انکار کر دیا۔ گویا ماچی کے کس بل کے اظہار میں کوئی کسر رہ گئی تھی یا وہ مشاق لوگ تھے۔ دیکھنے میں وہ ایسے پختہ کار نہیں معلوم ہوتے تھے مگر ظاہر ہے کہ آخر وہ لوگوں ہی کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہوگی۔ شاید ماچی کی عنایت اُنھوں نے اُس کی مجبوری سمجھی کہ وہ بس اتنا ہی ستم کر سکتا ہے۔ پولیس کے سامنے پختہ کار لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ اُنھیں اطمینان ہوتا ہے کہ پولیس اُنھیں زندہ رکھنے کی ایک رعایت ضرور دیتی ہے۔ پولیس تارِ نفس منقطع ہونے تک نہیں جھکاتی ہے توڑتی نہیں۔ یہ بات بھی برداشت کا بہت کچھ حوصلہ دیتی ہے۔ پولیس کی طرف سے یہ اطمینان حاصل ہو تو بھی وہ کسی بخیل کی طرح اپنے تارِ نفس کی پونجی کو بھی بہت بچا کے رکھتے ہیں۔ اُس پر کسی طور آنچ نہیں آنے دیتے اور اپنی دہائیوں سے ستم کو داد ستم بھی دیتے رہتے ہیں۔ اُن کی ہر چیخ، ہر کراہ، اذیت کی ہر دردناک صدا اُن کی بے گناہی کے ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے حق میں ایک اور دلیل کی حیثیت۔ ہر اخفا کا سلسلہ دُور تک جاتا ہے۔ ہر زباں بندی ایک خوف سے مشروط ہوتی ہے اور بہت کچھ اس پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ یہ خوف اعصاب پر کس قدر مسلط ہے۔ دوسری طرف کون ہے؟ دوسری طرف کتنی بڑی کہانی ہے، کون سا ستم گر بیٹھا ہے۔ یہاں سے امان مل گئی تو کیا ہوا، اُدھر جو ایک جنتر موجود ہے۔ اپنے ہی لیے نہیں پسماندگان کے لیے بھی۔ پیرو بھی یہ سمجھ رہا ہو گا کہ اب اُسے اُنھیں یہی باور کرانا چاہیے تھا کہ سامنے کا یہ عذاب زیادہ مہلک، زیادہ ہولناک ہے۔ سامنے کی آگ اُن کی آہ و بکا سے اور بھڑک رہی ہے۔ پیرو نے ہنٹر بدست آدمی سے کہا کہ جب تک اُنھیں اپنے آقا کا نام و نشان یاد نہ آجائے، وہ اُن پر ہنٹر برساتا رہے۔

پاٹے کا آدمی ہنٹر ہاتھ میں لہراتا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ عین وقت پر ماچی نے اُسے روک کے اُن کے جسم پر جھولتے ہوئے کرتے کھینچ لیے۔ کرتوں کے نیچے کھادی کی بنڈیاں بھی پھاڑ دیں۔ اُن کا بالائی جسم بے لباس ہو گیا۔ ماچی نے ہٹتے ہٹتے اُن کی ننگی پسلیوں پر ترچھے ہاتھ سے کئی ضربیں لگا دیں جن کی کسک شاید اُن کے تارِ نفس تک پہنچ گئی ہو۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ماچی اور پیرو ہنٹر کی ضربوں سے کیوں پس و پیش کر رہے ہیں۔ وہ اُن کے جسموں پر نشان ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ماچی کی ترچھی ضربوں نے دونوں کو اور ناتواں کر دیا۔ اُس کے ہٹنے پر جیسے ہی ہنٹر اُٹھایا گیا، اُن میں سے ایک نے دہشت سے ہاتھ بلند کر کے ٹھہر جانے کی فریاد کی اور بہ عجلت تمام ہذیانی انداز میں سر ہلانے لگا۔

پیرو نے ماچی اور پاٹے کے آدمیوں کو اُن سے دُور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں کی سانسیں چل رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے پر اشتعال کی نگاہ ڈالی پھر گردن ڈال دی۔ جس آدمی نے ٹھہر جانے کی التجا کی تھی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پیرو نے اُسے ٹوک دیا اور کہا کہ جو کچھ اُسے بتانا ہے خوب سوچ سمجھ کے بتائے۔ اُن کے پہلے ہی بیان کو آخری بیان سمجھا جائے گا۔ ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ وہ اچھی طرح جان لیں کہ یہاں سے وہ کسی عدالت میں نہیں لے جائے جائیں گے اور اُن کی نجات اُن کے بیان کی تصدیق کے بعد ہی ممکن ہے۔

اُس نے سُن لیا تھا اور اچھی طرح ہی سُنا ہو گا۔ ماچی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے کان جلنے سے لگے، وہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ وہ شخص سر جھکائے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ پیرو نے اُسے سانسیں بحال کرنے کی مہلت دی اور عجلت نہیں کی۔ اُس نے خود بھی دیر نہیں کی۔ گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ اُن کا مقصد ہمیں ضرر پہنچانا نہیں تھا۔ اُنھیں صرف اس غرض سے ہمارے تعاقب پر روانہ کیا گیا تھا کہ وہ ......

"اپن کو نام بولو۔" پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔

اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور پھٹی پھٹی انگارا آنکھیں ادھر اُدھر منڈلاتی ہوئی اپنے ساتھی پر ٹک گئیں۔ دوسرے کی حالت اُس سے مختلف نہیں تھی۔

"اپن کو نام بولو سالا!" پیرو نے دُرشتی سے کہا۔

اُس نے جلدی سے حلق تر کیا اور لڑکھڑاتی سٹ پٹاتی آواز میں بولا۔ "نسبت شاہ خاں صاحب۔"

"نسبت شاہ خاں صاحب؟" پیرو اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی یہ کون نواب بہادر ہے کیدر کا کون ہے؟"

"یہ نواب نہیں ہیں حضور۔" اُس نے گھگھیا کے کہا۔

"پھر کیا ہے؟ نواب کا......"

"یہ ہاں ایک بڑے سرکاری عہدے دار ہیں ریاست کی نظامت میں۔"

"مطلب بڑا سرکاری آفیسر؟" پیرو تذبذب سے بولا۔

"جی، جی ہاں۔"

"کاہے کا افسر؟"

"سرکاری انتظامیہ کے دفتر میں ہیں وہ۔"

"ابھی ابھی کیا بولا تھا وہ؟"

اُس نے ہچکچاتے ہکلاتے ہوئے بتایا کہ نسبت شاہ نے اُن سے ہماری نقل و حرکت کی نگرانی، ہمارے پتے اور ہمارے مشاغل کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا۔ کہنے لگا کہ اس کے سوا اُن کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ وہ ہمیں کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

"یہ نسبت شاہ حرام کا جنا ابھی اپن کو کیسا جانتا تھا؟" پیرو نے اُس سے وہی سوال کیا جو میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

"ہم کو ہم کو نہیں معلوم۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "ہم سے جیسی بھی قسم لے لیجیے حضور، ہم کو اس بابت کچھ نہیں معلوم۔ ہم اُن سے یہ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔"

پیرو تجمل کی صورت دیکھنے لگا۔ چند لمحے سناٹا سا چھایا رہا پھر تجمل کی لرزتی آواز کمرے میں گونجی۔ "نسبت شاہ سے کس نواب ابا کا نال جُڑا ہے؟"

اُس شخص کا جواب سننے سے پہلے پیرو نے دوبارہ جتانا ضروری سمجھا کہ جھوٹ سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ اپنے ہی ساتھ زیادتی کریں گے۔ جو کچھ اُنھیں معلوم ہے صاف صاف بتا دیں۔

"اُن کے بہت سے نوابین سے تعلقات ہیں حضور!" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہاں ایک نہیں بہتیرے نواب لوگاں ہیں۔"

"قطب الدین علی سے کیسا ہے؟"

"نواب قطب الدین علی؟" وہ چونک سا گیا اور متردد لہجے میں بولا۔ "اُن سے بھی اُن کے بہت اچھے نیازمندانہ مراسم ہیں۔"

"اتنا تم جانتا ہے؟"

"ہمارا اندازہ ہے حضور!" وہ لرزیدہ ہونٹوں سے بولا۔ "ہم آپ سے کچھ چھپا نہیں رہے۔ اب چھپانے کو کیا رہ گیا ہے۔" اُس کی التجا میں احتجاج بھی شامل تھا۔

"یہ ہم کو نہیں بولتا۔" پیرو کی پھنکارتی آواز سے وہ اُچھل پڑا۔ ایک لحظے بعد پیرو نے نرمی سے کہا۔ "تم قطب الدین علی کا آدمی ہے؟"

"نہیں نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "نہیں حضور! ہم صرف اُن کے نام سے واقف ہیں۔ وہ بہت بڑے نواب ہیں۔ ہم اپنی ماں کی قسم کھاتے ہیں کہ اُن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کسی اور طرف نہ بھٹکیں۔"

"وہ آدمی ریل میں تمھارا ساتھ چل رہا تھا؟"

"کون سا آدمی؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"وہ چاقو پٹاخا والا......"

"آپ کون سے آدمی کی بات کر رہے ہیں؟"

اُس کے ساتھی کے چہرے پر بھی پریشانی و حیرانی سمٹ آئی۔ "ہم اپنے سوا کسی کو نہیں جانتے۔" پہلی بار اُس نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔

"تم نہیں جانتا؟......"

"معاف کیجیے آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم صرف دو ریل گاڑی میں تھے اور آپ کے برابر کے ڈبے میں بیٹھے تھے۔"

"ہا!" پیرو نے گرج کر کہا۔ "تم کو تم کو ابھی کیسا معلوم تھا کہ اپن اسی ڈبے میں بیٹھے گا ہے جو تم ابھی ایک دم برابر والا ڈبا کا ٹکٹ کٹایا؟"

"ٹکٹاں ہمیں نسبت شاہ خاں صاحب نے دیے تھے۔"

"نسبت شاہ کو پتہ تھا؟" پیرو نے متجسس لہجے میں کہا۔

"ہم نہیں کہہ سکتے۔"

جس بات کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا اور میرے دل کی دھڑکن بار بار معدوم ہونے لگتی تھی، آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچ رہے تھے۔ تجمل نے ایک پل کی تاخیر کیے بغیر اُس سے پوچھا۔ "نسبت شاہ نواب حشمت جنگ کا کون ہے؟"

"نواب حشمت جنگ کے؟" اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور آواز حلق میں پھنس گئی۔

"اس کو تم نہیں جانتا نا!......"

"نہیں صاحب! اُنھیں ریاست میں کون نہیں جانتا۔"

"وہ بھی اور ریاست کا بڑا افسر ہے کیا بولتا ہے اُس کو؟"

"جی جی۔" اُس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور اور نسبت شاہ خاں اُنھی کے ماتحت ہیں، اُن کے معتمد۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی اب وہاں سے بھاگ جانے کو کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا لیکن نواب حشمت جنگ سے اُن کا کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔ اُس سے ساری زندگی میں دو ایک مرتبہ ہی اُن کی ملاقات ہوئی ہو گی اور وہ بھی رسمی طور پر۔ نواب حشمت جنگ تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ نسبت شاہ خاں عرصے سے اُس کا معتمدِ خاص ہے۔ ریاست میں اپنے انتظامی تجربے، معاملہ فہمی کے سبب اُس کا بہت نام ہے اور اُس کے متعلق بہت سی روایتیں، جرأت اور ذہانت کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔

تجمل اور پیرو غور سے اُس کی ایک ایک بات سن رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر رنگ آ گیا۔ دونوں پر کسی انکشاف کی سی حیرانی طاری تھی۔ سانحے کی بھی تو حیرت ہوتی ہے اور سوگ میں بھی تو آدمی کا خون جلتا ہے مگر پیرو کی یہ حالت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اُس نے تو پہلے ہی حیدرآباد میں ابا جان کی نوخرید حویلی میں آنے والے مسلح آدمیوں کے دستے کی بابت نواب حشمت جنگ کی طرف

اشارہ کیا تھا۔ شاید پیرو کو اپنے قیاس پر خود بھی اعتبار نہیں تھا۔ ابا جان نے سرزنش کے انداز میں تردید کی تھی تو اُسے خفت بھی ہوئی تھی۔ منہ سے بات نکل جانے کا پچھتاوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہی نواب حشمت جنگ پھول اور شیرینی لے کے آگیا تھا۔ رویے بھی تو پھولوں اور کانٹوں کے مانند ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا، پیرو نے اُس رات کی ذہنی ابتری کا مآل سمجھ کے سب کچھ اپنے سینے سے کھرچ دیا تھا۔ نواب حشمت جنگ کی کوئی گرہ اُس کی رگوں میں نہیں پڑی تھی جو اب اُس کا چہرہ جل رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ مجھے اب وحشت سی ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو بہت روکنا چاہا لیکن آخر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس میں میرے ارادے کو ذرا دخل نہیں تھا۔

"کیدھر! ابھی کیدھر کو دادا؟" پیرو چونک کے بولا۔

"کہیں نہیں، بس نیچے۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نیچے جا رہا ہوں۔" اُس کے کچھ کہنے سے پہلے میں تیز قدموں سے زینے میں داخل ہو گیا۔ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز نہیں دی۔

نیچے صحن اور دالان میں لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے کسی اور طرف نکل جانا چاہا لیکن کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جہاں میں اُن کی نظروں میں نہ آتا۔ میں دروازہ بند کرکے وہیں کمرے میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں نیچے نہیں اُترے۔ جانے اب وہ اُن سے کیا جاننے کے خواہش مند تھے۔ مزید کون سی کہیلی بوجھنا رہ گیا تھا۔ ہم میں اُن کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے تنہائی سے گھٹن ہو رہی تھی۔ آدمی کبھی خود اپنی ذات کے لیے بھی اجنبی ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے یہ اپنا چہرہ، اپنا جسم نہیں ہے۔ یہ اپنی آنکھیں نہیں ہیں۔ کبھی سب کچھ بکھرا سا لگتا ہے۔ اپنا آپا بھی۔

مجھے نیچے آئے اور کمرے میں خود کو محبوس کیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے کہ کمرے کے آس پاس شور سا سنائی دیا۔ میرے جتنی دیر میں اٹھ کے دروازہ کھولا، اُدھر کسی نے دستک دی۔ رودرا، صبد، ممکو، حمرو اور شامو کے درمیان میرے سامنے مارٹی کھڑا تھا۔ سوجی ہوئی آنکھیں، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ رات بھر نہیں سو سکا ہے۔ اُس کا چہرہ دیکھ کے میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ "خیریت تو ہے؟" میں اُس کا بازو پکڑ کے اندر لے آیا۔

"ابھی دادا اُستاد کیدھر ہے؟" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"اوپر ہیں۔ مگر بات کیا ہے؟"

"اُس کو بولو راجا ابھی اسپتال چلے کانتے بھاتی۔" اُس کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ "ابھی بڑا ڈاکٹر دیکھنے کو آیا تھا۔ بولتا ہے آج ہی آپریشن کرنے کا ہے۔"

"آج ہی؟"

"اپن ابھی سویرے تمھارا انتظار کرتا رہا۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ ممکو بابا شرٹو بھی ادھر بیٹھا سستی باتاں کرتا رہا۔ کوئی ابھولین بھی نہیں آیا۔ اپن سسٹر شیالے کو بول کے موٹر میں بھاگا ادھر آیا ہے۔ اُستاد کو بولو ابھی چلنا ہے تو جلدی چلے۔ اپن کو جلدی لوٹنے کا ہے۔"

میں نے پیچھے زینے کا رُخ کیا۔ وہ ابھی اُن دونوں کو کرید رہے تھے۔ میں نے مارٹی کے آنے کی اطلاع دی تو مجھل مزید کچھ پوچھے بغیر اُٹھ گیا۔ پیرو بھی ہمارے پیچھے پیچھے آگیا۔ ہم کمرے سے نکل کے جیسے ہی صحن میں آئے، لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہماری تو کوئی بات نہیں تھی، پیرو کے لیے انھیں درگزر کرکے آگے بڑھ جانا خاصا دشوار تھا۔ وہ اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ چوکی کے پاس اپنی کلا کا دادا دینا بھی وہاں بیٹھا نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ پیرو اُس کے پاس پہنچتا، وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا یہاں آنا اور وقت سے پہلے آ جانا ہی اُس کی انفعالیت کا ثبوت تھا۔ اُس کے چہرے پر بھی محرومی لکھی تھی۔ پیرو نے بس اُس کے سلام کا جواب دیا اور پھر مجھی کو اُس کی جانب اشارہ کرکے آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی دروازے سے دُور تھا کہ ایک طرف کونے میں بیٹھا ہوا فلا بے کا دادا جارجی اُس کے رستے کی دیواروں کے کھڑا ہو گیا۔ جارجی کو دیکھ کے میرا جسم بھی اکڑ گیا۔ وہ رات سے بہت بدلا ہوا تھا۔ "ابھی کھاں ہی ہے نا؟" پیرو نے ترشی سے کہا۔

جارجی پیرو کے پیروں پر جھکنا چاہتا تھا مگر پیرو نے اُس کے شانے پکڑ کے اور سر کا پا اُس پر ایک نظر ڈالتا ہوا بولا۔ "اپن کو ابھی بھی تھوڑا ٹائم لگانا پڑے گا۔"

"نہیں دادا، نہیں۔" جارجی سید ھا ہو گیا۔

"لگتا ہے دادا، ابھی خون میں مل گیا ہے۔" پیرو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"پر ٹھیک ہے، ابھی اگلا ہے تو ٹھیک ہے۔ اپن تجھ سے اکھا بات کرے گا۔" پیرو کی آواز میں غصے کی لرزش نمایاں تھی۔

جارجی کی نگاہیں جھک گئیں۔ پیرو نے اُسے ہدایت کی کہ جب تک وہ واپس نہ آ جائے، جارجی یہیں باڑے پر حاضر رہے گا۔ جارجی بہت کمزور سنا رہا۔ پیرو نے اس سے مزید بات نہیں کی۔ دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر آ کے مجھل نے اُس سے کہا کہ باڑے میں اس کے لیے اتنے لوگ بیٹھے ہیں، وہ اپنے گھر بھی نہیں گیا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہر کے اب وہ گھر چلا جائے اور ممکن ہو تو رات کو ابا جان کے گھر آ جائے ورنہ کل صبح ہم پاڑے آ ہی جائیں گے لیکن پیرو نے ہمارے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسپتال کی موٹر دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ ہمارے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی۔ موٹر کی رفتار کبھی تیز ہو جاتی، کبھی سست۔

ہم اسپتال پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ اسپتال کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ موٹر مریضوں کے خصوصی وارڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہاں رات والا پہرے دار نہیں ہو گا مگر اب بھی ایک آدمی مارٹی اندر جا سکتا تھا۔ رات کی طرح پہرے دار سے پھر تکرار کرنا پڑتی لہٰذا مجھل نے ڈرائیور سے اسپتال کے پچھلے حصے کی طرف لے چلنے کو کہا۔ اس وقت رات والے نوجوان ڈاکٹر کے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم براہِ راست ڈاکٹر شرما سے ملنے کی کوشش کریں۔ موٹر سے اُتر کے ہم اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ ہمارا رُخ نوجوان ڈاکٹر کے کمرے کی طرف تھا۔ خلافِ توقع وہ مل گیا۔ اپنے کمرے کے باہر ہی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ "آپ آ گئے؟" وہ بے تابی سے ہماری طرف لپکا۔ "میں آپ کا منتظر تھا۔"

"مجھے امید نہیں تھی کہ اس وقت تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ تمھاری ڈیوٹی تو رات کو تھی؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ صبح ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔" وہ شائستگی سے بولا۔ "بس میں آپ کے انتظار میں رُک گیا۔"

"تم نے بڑی زحمت کی۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔ "لیکن سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر شرما آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"رات ہم کیا بولا تھا ڈاکٹر!" مجھل نے لپک کے سامنے آ کے تلخی سے کہا۔

"میں نے ڈاکٹر شرما کو بتایا تھا۔ انھوں نے آپ کا انتظار کیا۔ مریض کی حالت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ وقت برباد کیا جاتا۔" وہ نرمی سے بولا۔ "آپ ہوتے تب بھی یہی فیصلہ کرتے۔"

"کدھر ہے بڑا ڈاکٹر صاحب؟"

"وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"اُس کو بولو۔ ہم کو چیر پھاڑ نہیں کرانی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جو ہم بول رہے ہیں، ابھی اُس کو بتا ہی جا کے بول دو۔" مجھل نے دو ٹوک آواز میں کہا۔ "ہم نے پہلے ہی منع کر دیا تھا۔"

"آپریشن کی ضرورت ہے جناب۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "آپ مجھ کیوں نہیں رہے۔ رات سے وہ بے ہوش پڑا ہے۔ میں اُسے مسلسل دیکھتا رہا ہوں۔ اُس کی حالت دیکھ کے ہی میں گھر نہیں گیا۔ یہاں تمام ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے۔"

"پر اپنی نہیں ہے۔"

"آپ اس قدر کیوں گھبرا رہے ہیں، حوصلہ رکھیے۔"

"اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ دو ڈاکٹر!"

"دیکھیے، دیکھیے۔" ڈاکٹر اضطراب سے بولا۔ "ہم لوگ کوئی اور طریقہ نہ دیکھ کے مجبوراً یہ قدم اٹھاتے ہیں۔ مریض کی بھلائی کے لیے، اُسے جلد اچھا کرنے کے لیے۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" مجھل نے ناگواری سے کہا۔ "بڑے ڈاکٹر صاحب کو جا کے بول دو، ہم لوگ کی مرضی نہیں ہے۔ ہم کاغذ پر دستخط نہیں کریں گے۔"

"کاغذ پر دستخط کیے جا چکے ہیں۔"

"کس نے؟ کس نے کیے؟" مجھل نے بھڑک کے کہا۔

"مریض کے ساتھ موجود لیڈی اٹینڈنٹ نے۔" اُس کی مراد شہپارہ سے تھی جو رات مارٹی کے ساتھ وہی کاٹنے کے کمرے میں رہی تھی۔

"وہ وہ کون ہے، دستخط ہم کریں گے۔"

"لیڈی نے خود کو مریض کا عزیز بتایا تھا۔"

"ابھی دوسرا عزیز منع بولتا ہے۔"

"ایسا کب ہوتا ہے جناب!" نوجوان ڈاکٹر کے لہجے میں تندی آ جانی چاہیے تھی۔ "میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ذرا صبر سے کام لیجیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔ مریض کو کمرے سے لے جایا جا چکا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر شرما نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہو۔"

"نہیں۔" مجھل نے چیختی آواز میں کہا۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتا، ہم کو ابھی اُس کے پاس لے چلو، ابھی اسی وقت......"

"میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"وہ کہیں بھی ہو، اُس کو جا کے روک دو۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" ڈاکٹر جھنجلا کے بولا۔ "پھر آپ لوگ مریض کو اسپتال کیوں لائے تھے۔ ہم مریض کے دشمن نہیں ہیں، یہ اسپتال ہے جناب!"

"ابھی آواز دبا کے رکھو ڈاکٹر!"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا۔ اُس نے ملائمت سے کہنے کی کوشش کی۔ "ضرور آپ کو پہلے کبھی کسی آپریشن سے تلخ تجربہ ہوا ہے۔"

"ابھی ایسا ہی سمجھو۔" مجھل بھی جھنجلا کے بولا۔

"ضروری نہیں کہ دوبارہ بھی ایسا ہی تجربہ ہو۔"

"تم نہیں جانتے۔" مجھل کی جلتی ہوئی آواز میں کرب سا بھی شامل تھا۔ "سمجھو کہ ہم کو تمھاری چیر پھاڑ راس نہیں آتی۔"

"اوہ، اوہ۔" ڈاکٹر مسکرا کے بولا۔ "مگر یہ آپ کا وہم ہی ہے نا۔ ہم روزانہ کئی آپریشن کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ کیس میں کوئی الجھن ہو جاتی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، یہاں آپ کا مریض زیادہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔"

"ہم کیا بول رہے ہیں ڈاکٹر!"

ڈاکٹر کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "میں بھی کچھ کہہ رہا ہوں جناب، آپ میری بات کیوں نہیں سن رہے۔"

"تم بھی اپنی نہیں سن رہے۔"

"میں ایک ڈاکٹر ہوں۔"

"ہم بھی مریض کے کوئی ہیں۔"

میں نے دخل دینے کا ارادہ کیا لیکن اس موقع پر مجھل سے کچھ کہنا ہوا دینے کے برابر تھا۔ میں نے پیرو کی طرف دیکھا مگر وہ بھی خاموش کھڑا رہا۔ مجھل اپنی ضد سے باز نہیں آیا۔ آخر ڈاکٹر کو کہنا پڑا کہ بصورتِ دیگر ڈاکٹر شرما کانتے کو اسپتال سے خارج کر دے گا۔

"ہم اُس کو ابھی لے جائیں گے۔"

"اس حالت میں آپ اُسے لے جائیں گے؟" ڈاکٹر چیخ کر بولا۔ "یہ آپ

اُس کے ساتھ ظلم کریں گے۔ کیا.... کیا وہ جانے کے قابل ہے اور آپ کریں گے کیا؟ کیا کریں گے؟" میں سمجھتا ہوں مجھے افسوس سے کہنا چاہیے کہ آپ اُسے تن درست دیکھنا نہیں چاہتے۔

"ہم اس کے بارے میں تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر درشتی سے بولا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر شرما سے آپ کی ملاقات ہو جائے مگر وہ بہت پاگل آدمی ہیں۔"

"ہم سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں شعلے کوندنے لگے۔ اُس نے غصّے سے زمین پر پیر پٹخے اور سر جھٹک کے تجمل کو چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اور پیرو بھی اُس کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں اُس نے روک دیا۔ جاتے جاتے اُسے خیال آیا، پلٹ کے اُس نے ہم سے اپنی واپسی تک کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔

ہم اُس کے کمرے میں داخل ہوئے تو جولین پہلے سے وہاں موجود تھی۔ "تم یہاں کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو میں نے دوسرے لمحے میں دیکھا اور بس دیکھتا رہ گیا۔ وہ شہپارہ تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑی میں ملبوس، کانوں میں بالیاں پڑی ہوئی۔ شرمیلی شرمیلی سہمی سہمی۔ اُس کا شہابی رنگ نکھا اور نکھر آیا تھا۔ میں نے اُسے صرف بالاخانے پر دیکھا تھا اور وہ بھی رات کی روشنیوں میں، بالاخانے کے خاص لباس میں، ہونٹوں پر سُرخی جمائے رخساروں پر غازہ ملے۔ وہ وہاں نہ جانے سنگھار کیوں کرتی تھی۔ وہ تو خود پھول تھی۔ پھولوں کو سنگھار کیسا عجیب لگے۔ پھول مخمل میں رکھ کے پیش کیے جائیں تو اُن کی خوشبو بڑھ نہیں جاتی۔ وہ تو کوئی اور ہی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ گو چھیا بیگم نے کل رات مجھے اُس کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور اُس سے پہلے کانتے نے بھی لیکن مجھے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے کی بے چینی تھی کہ اُس نے اپنی نئی زندگی کس حد تک قبول کی ہے۔ اُس کے چہرے کی تازگی اور تابندگی دیکھ کے مجھے اپنی رگوں میں ٹھنڈک سی محسوس ہوئی تھی۔ وہ جولین ہی کی کوئی بہن معلوم ہوتی تھی۔ نقل مکانی سے آدمی کے رنگ و روپ اور صورت رنگ پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے مگر اسے نقل مکانی کیوں کہا جائے، یہ تو نقل مکینی تھا۔ مکان تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ اُس پاسکل کے چہرے جو بدل گئے تھے۔ مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور رخساروں پر خون دمکنے لگا۔ "کیسی ہو تم؟" میں نے مضطربانہ اُس سے پوچھا۔

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے نتھنے پھڑکتے رہے۔

"ارے!" میں بھرائی آواز میں کہا۔ "تم کس قدر بدل گئی ہو۔ کہیں اور ملی ہوتیں تو شاید مجھے پہچاننے میں بہت دیر لگتی۔" جی میں آئی کہ بڑھ کے اُسے سینے سے لگا لوں، اُس کے سر پہ ہاتھ رکھوں لیکن میرے قدم اٹھتے رہ گئے۔ وہ سنبھل نہ پائی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک اشارے کی منتظر ہے۔ میں نے مُڑ کے پیرو سے کہا۔ "داوا! تم نے دیکھا؟ خبر ہے یہ کون ہے؟ یہ شہپارہ ہے داوا! بھولو تمھاری ایک دن گیتا۔"

"ہاہا!" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کے بارے میں تو تُو نے کبھی بولا ہی نہیں اجا! یہ تو ایک دم ابھی اِس کا روپ دیکھ کو چلا گیا۔" پیرو نے چند قدم آگے آ کے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُس کی کمر تھپکنے لگا۔ "اید سب سمندر کے مالک ہے۔" اُس نے قریب کھڑی ہوئی جولین کو بھی اپنے پہلو میں سمیٹ لیا۔ "گیا ابھی اپنا اتنا بہن بھائی دیکھے گا تو کیا بولے گا۔ قسم ہے اجا! بالکل اُلٹ جائے گا۔"

ڈاکٹر ہدایت کر گیا ہوگا کمرے میں تعینات ملازم نے چائے کی ٹرالی ہمارے سامنے لا کے رکھ دی۔ چائے پینے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جولین نے داوا پیرو کے اور میرے آگے پیالیاں بڑھائیں تو کوئی بھی انکار نہ کر سکا۔ کچھ دیر کے لیے سب بھول گئے کہ وہ کسی اسپتال میں ایک ڈاکٹر کے کمرے میں ہیں اور اوپر ایک اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔ انتی ضد اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ وقت آدمی کو لمحوں کا یہ فریب نہ دیا کرے تو آدمی گھُٹ کے مر جائے۔ میں جولین سے صبح نہ آنے کی معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے شکایت نہیں کی ہے تو مجھے خود کہنا چاہیے مگر مجھے یہ رسمی سا معلوم ہوا۔ اُس کے لیے یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ چائے کے دوران پیرو کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کیلاش کی طلبی پر اسپتال آئی ہے۔ رات نوجوان ڈاکٹر سے اتنی باتیں ہوئیں مگر میں اُس کا نام پوچھ سکا نہ اُسے بتانا یاد رہا۔ جولین کے کہنے کے مطابق رات کو وہ کئی بار کانتے کو دیکھنے کمرے میں آیا تھا اور اُس نے شہپارہ سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اُسے طلب کر سکتی ہے کسی بھی ضرورت کے وقت۔ صبح کانتے کی حالت بہت بگڑ گئی اور انتظار کے بعد بھی کوئی نہیں آیا، خلاف توقع جولین بھی، تو شہپارہ بہت پریشان ہو گئی۔ مارٹی بھی ہمیں بلانے چلا گیا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر کیلاش کو اپنے گھر کا پتہ سمجھا کے درخواست کی کہ وہ اُس کی بہن جولین کو فوراً بلائے۔ ڈاکٹر کیلاش ہی نے مارٹی کو اسپتال کی موٹر فراہم کی تھی۔ دوسری موٹر میں جولین کو وہ خود گھر سے لے کے آیا۔ وہ آدھ گھنٹے پہلے یہاں آئی تھی۔

"اپن کو تھوڑا دیر ہو گیا۔" میں کے بجائے پیرو نے آہستگی سے کہا۔ "دیر ہو تا رہا سالا۔ ابھی تک اجا بھی گھر لوٹ کے نہیں گیا ہے۔"

"گھر نہیں گئے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "رات کو بھی؟"

"نہیں، جانا نہیں ہو سکا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہاں سے کہہ کے چلے تھے؟"

"اب تک کے لیے نہیں۔"

"وہ سب تو بہت پریشان ہو رہے ہوں گے؟"

میں ہونٹ نکال کے رہ گیا۔

"میرا خیال ہے، ہم لوگ یہاں موجود ہیں، آپ چلے جائیں۔" وہ پیرو کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں بابا؟"

"ہاں ہاں۔" پیرو نے بے ترتیبی سے کہا۔ "پر یہ نہیں جانے کا بیٹا! یہ ایسا ابھی کیسا جا سکتا ہے، کانتے اس کا بھائی ہے۔"

"یہ جا کے بھی تو آ سکتے ہیں۔"

پیرو نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میرا جواب شاید میرے چہرے پر لکھا تھا اس لیے اُس نے زبان بند رکھی۔ کمرے میں یکایک خاموشی طاری ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں اتنے لوگ ایک دوسرے سے بے گانہ بیٹھے رہیں تو خاموشی اور عذاب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اور تجمل میں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اُنھیں گئے ہوئے بیس منٹ کے قریب ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ باہر جا کے کسی نرس سے معلوم کروں۔ تجمل کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اگر ڈاکٹر شرما نے انکار کر دیا اور تجمل اگر...... میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نرس ایک بار کمرے میں آئی بھی لیکن میں اُس سے کیا پوچھتا۔ اتنی دیر میں دروازے کے باہر سے اُن کی آہٹ سنائی دی۔ وہ تجمل ہی تھا۔ میں اُس کی چاپ پہچانتا تھا۔ اُن کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی ہم سب کھڑے ہو گئے تھے اور اب ہماری مستفسر نگاہیں اُن پر منڈلا رہی تھیں۔ پیرو نے اُن کی زبانی کچھ جاننے کے لیے توقف کیا لیکن وہ دونوں گُنگ جیسے اپنے آپ کو دیکھتے رہے۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ "ابھی تم جاؤ داوا!" تجمل کی بوجھل آواز نے سکوت توڑا۔

"کیا، کیا ہے تجمل بھائی؟" پیرو نے بے تابی سے کہا۔

"ہم کو ابھی اِدھر ہی رہنا ہے داوا!"

"اور ابھی وہ، وہ کیسا ہے؟"

تجمل نے سر جھکا لیا۔ "مر رہا ہے حرام زدہ۔"

"کیا، کیا تجمل بھائی؟" پیرو دست پٹا کے بولا۔

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر کیلاش احتجاجی لہجے میں بولا۔ "ہمیں بھلائی کی توقع کرنی چاہیے۔ آپریشن ہو رہا ہے، ضرور کامیاب ہوگا۔"

مگر تجمل ناکام واپس آیا تھا۔ میں کچھ نہ طے کر سکا کہ اچھا ہوا یا بُرا۔ تجمل کا چہرا مجھے کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا مگر اُس کے اضطراب و وحشت کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ وہ بڑبڑ ہی کی حد تک تکرار کرتا رہا تھا اور یہاں آ کے اب بھی سرنگوں ہم سب سے بے نیاز بیٹھا تھا جیسے وہ ہماری موجودگی کے باوجود اکیلا ہو گیا ہو۔ میری طرح پیرو کے ذہن میں بھی طرح طرح کے سوال اُمڈ رہے ہوں گے لیکن کوئی اِس حال میں تجمل سے کیا کہہ سن سکتا تھا۔ ڈاکٹر کیلاش کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ صورت خاموشی ہی مناسب ہے۔ سب بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔

کوئی وہاں سے نہیں اُٹھا۔ ہمیں اتنی دیر تک ڈاکٹر کیلاش کا کمرہ نہیں گھیرے رہنا چاہیے تھا لیکن خود ڈاکٹر کیلاش کی یہی خواہش تھی۔ وہ کئی مرتبہ باہر گیا۔ پھر ایک بار جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر بھی تھا۔ ڈاکٹر کیلاش کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس نے فرطِ مسرت سے کہا۔ "آپریشن مکمل ہو چکا ہے اور کامیاب آپریشن۔"

سب کی نگاہیں تجمل کی جانب مرکوز ہو گئیں مگر اُس کے پتھر جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اُسے یوں ڈھیر دیکھ کے ڈاکٹر کیلاش کی چہکتی آواز بھی ماند پڑ گئی۔ "مریض کو اُس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے ہمیں بتایا۔ اُس نے کہا کہ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں تک کانتے بے ہوش رہ سکتا ہے، اُس وقت تک اُس کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے اور دعا کی بھی۔ وہ کہنے لگا کہ اب صرف دعا ہی باقی رہ گئی ہے۔

اُسے کون بتاتا کہ دعا تو اُس کے لیے ہمارا رواں رواں کر رہا ہے۔ دعا تو بے زبانی کی بھی ہوتی ہے۔

تجمل نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ٹھیرنا چاہا، پیرو نے بھی۔ سبھی نے مگر وہ مارٹی کو اپنے ساتھ لے کے خصوصی وارڈ کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر کیلاش نے خود جانے کے بجائے اپنے ساتھی ڈاکٹر سے التجا کی کہ وہ تجمل کو کانتے تک پہنچا آئے۔

وہ خود ہماری وجہ سے نہیں گیا۔ اسپتال کا بیرونی دروازہ عبور کرنے کے بعد بھی وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور مسلسل ہمیں صبر اور حوصلے کی تلقین کرتا رہا۔ جواب میں کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ دل گرفتہ سا ہو گیا۔ ہمیں وہ اسپتال کی گاڑی میں بھیجنا چاہتا تھا لیکن اُس کی اتنی نوازشیں ہی کیا کم تھیں۔ بمشکل اُس نے ہماری معذرت قبول کی۔ جب ہم ٹرام کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑے تھے، وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ "مجھے آپ کے خاندان سے مل کے عجب سا احساس ہو رہا ہے۔"

"کیسا احساس؟" میں نے تجسس سے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وہ اشتیاق آمیز حیرت سے بولا۔ "ایسے کیا نام دیا جائے۔ بہرحال۔" وہ انگریزی میں بولا۔ "اٹ لکس آل ڈریم آل مسٹری۔ سب کچھ خواب۔"

سب کچھ پُراسرار لگتا ہے۔

"مگر بس اتنا ہی رکھنا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا: "کوئی اور قیاس کرنے سے پہلے بہتر ہے تم اُس سے وضاحت طلب کر لینا۔"

"اوہ! اوہ" وہ مچل کے بولا: "ذرا ذرا آگے سے بھول جائیے۔"

ٹرام آگئی۔ ہمارے رکنے کی دیر تھی وہ مان جاتا لیکن ہم نے اُس سے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ چلتے وقت اُس نے دوبارہ سب کو سلام کیا اور پیرو کے ہاتھ بڑی دیر تک اپنے ہاتھوں میں بھینچے رہا: "مجھے آپ لوگوں سے مل کے ایک عجیب سی خوشی مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔" اُس کا لہجہ سچی [illegible] غمازی کر رہا تھا: "کاش ہم کبھی اور وقت ملے ہوتے۔" وہ حسرت بھری آواز میں بولا۔

"کاش ہمارے لیے تمھارا یہی تاثر قائم رہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"آپ ہمارے گھر تشریف لائیے گا۔" شہ پارہ نے شائستگی سے کہا: "اسپتال سے ایسا دُور بھی نہیں ہے۔"

"ضرور ضرور، یہ میرے لیے عزت کا سبب ہوگا۔"

ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سڑکوں پر جیسے کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا جن کی کوئی منزل ہوتی ہے اُن کی رفتار میں یہی بے کلی ہونی چاہیے۔ میرا اندازہ تھا کہ اسپتال سے جولین سیدھی فرخ فریال وغیرہ کو دیکھنے جانے کے لیے اصرار کرے گی لیکن وہ ٹرام میں بُت بنی بیٹھی رہی۔ چوک کے راستے مختلف سمتوں میں جاتے تھے مگر اُن دونوں کو اکیلا چھوڑ کے ٹرام سے اُتر جانے کا کوئی محل نہ تھا۔ میرے دل میں آیا پیرو کو تو کہوں کہ کم از کم اُسے چلا جانا چاہیے۔ وہ پاڑے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے جلدی آنے کا کہہ کے آیا تھا مگر جیسے اب میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اُس کا بھی یہی حال ہوگا۔ میں جولین کے گھر رہ کے اسپتال سے قریب رہ سکتا تھا مگر چلا جاؤں گا تو دل کانتے ہی میں اٹکا رہے گا لیکن جتنی دیر ہو رہی تھی اباجان اور اُن سب کو ہول آ رہے ہوں گے۔ جیسا جولین نے کہا تھا یہی مناسب تھا کہ میں اباجان کو بتا کے واپس آ جاؤں۔ کانتے کا حال سُن کے وہ مجھے روکیں گے بھی نہیں کانتے کا یہ حال بھی تو صرف اُنھی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اُن کا بیٹا تماشائی بنا دیکھتا رہا مگر کانتے اُن کی ڈھال بن کے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ سب یہاں بھی تو آ سکتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ یہاں آنے کے بعد ہی اُنھیں کچھ اندازہ ہوگا کہ یہ گھر بھی اُن کا اپنا ہے۔

نشست گاہ میں آ کے میں صوفے پر پھیل گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رات بھر ہم تقریباً چلتے رہے تھے۔ ایک پل کے لیے بھی آنکھ موندنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر یہ اعصاب شکنی بے آرامی کی وجہ سے نہیں تھی۔ پیرو کانتے پریشان کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا کہ وہ کوئی بہت ہولناک مذاق کر رہا ہے۔ اپنے پریشان حال لوگوں کا حوصلہ دیکھنے، اُنھیں چھیڑنے یا اُن کی فکر میں اپنی پیمائش کرنے کا سودا اُس کے سر میں سما گیا ہے۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے آتے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ کوئی اہتمام نہ کریں لیکن اُنھوں نے [illegible] کے ساتھ اتنا سامان ہمارے سامنے رکھ دیا [illegible]۔ اُن کی خاطر ہم بس ٹونگتے رہے۔ جولین کو میرے گھر پہنچنے کا احساس ہو رہا تھا اس لیے اُس نے بہت جلدی کی تھی۔ اتنی دیر میں اُس نے [illegible] لباس تبدیل کر لیا تھا۔ چمپا بیگم پہنے [illegible] تیار تھی۔ ملازم نے آ کے مجھے بتایا کہ [illegible] موجود ہے۔ جولین نے اُس وقت گھر جانے کی بابت مجھ سے نہیں پوچھا تھا۔ اُس نے از خود [illegible] اتنا اختیار تو وہ سمجھتی ہوگی۔ یہ اچھا لگا۔ ابھی [illegible] کوئی [illegible] احساس ہوتا ہے اپنے وجود کا احساس اپنے ہونے کی آسودگی۔ وہ شخص کبھی کبھی بہت اُداس ہوتا ہوگا جسے اپنے [illegible] خود کرنے پڑتے ہوں۔ میں اُٹھنے کے لیے اُن کی اطلاع کا منتظر تھا کہ شہ پارہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ ہلکی نیلی سی ساڑی پہنے ہوئے تھی، کام دانی کی ساڑی جس میں ایک [illegible] تھے۔ مجھ سے دبی زبان میں کہنے لگی کہ کیا وہ برقع پہن لے۔

"برقع ہے؟" میں نے چونک کے کہا اور فوراً مجھے خیال آیا کہ وہ یہ کیوں پوچھ رہی ہے۔ جولین کا تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر اپنے نام کی نسبت سے اُسے اندیشہ ہوگا کہ کہیں اباجان کو اُس کی بے پردگی گراں نہ گزر جائے۔ اس کی سادگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا: "تم برقع پہنتی ہو کیا؟"

اُس نے زیرِ لب کہا: "یہاں آ کے نہیں پہنا۔"

"پھر کیا سوال ہے۔ جب تم پہنتی ہی نہیں ہو تو تصنع کی کیا ضرورت ہے۔"

"دوبارہ بھی تو پہنا جا سکتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

مجھ سے جواب نہ دیا جا سکا: "نہیں نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا: "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" یقیناً اباجان کا خیال ہوگا، وہ دوسرے قسم کے آدمی ہیں۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ تو اپنی جوان لڑکیوں کو ایک اجنبی شخص کی تحویل میں دے کے ایک ایسے سفر پر نکل گئے تھے جہاں سے واپسی بس قسمت پر منحصر تھی۔ اُنھوں نے تو اپنا خاندان، اپنے رشتے دار، اپنا شہر سبھی کچھ ترک کر دیا تھا۔ اُن کی تو اس طرف توجہ بھی نہیں جائے گی۔

شہ پارہ لہراتی ہوئی سی کمرے سے نکل گئی۔ ٹم ٹم والا بار بار ٹن ٹن کر رہا تھا۔ میں نے سوچا پیرو کو مشورہ دوں کہ وہ لیٹنا ہے تو یہیں آرام کر لے۔ میں جلدی واپس آ جاؤں گا مگر وہ یک لخت اُٹھ گیا۔ مٹھائی کے ٹوکرے اور گل دستے ٹم ٹم میں پہلے سے رکھے تھے۔ گل دستوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پانی ڈال ڈال کے اُنھیں تازہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

کوچوان اپنی عمر گزار چکا تھا۔ گھوڑے نے بھی شاید اُس کے ساتھ ہی زندگی

کا سفر طے کیا تھا۔ جو ہانپ ہانپ کے راستہ طے کر رہا تھا۔ میری نظریں جولین کے چہرے پر بھٹکنے لگتیں۔ وہ چمپا بیگم کے پہلو میں دبکی نہ جانے کس سوچ میں گم تھی۔ اباجان کے ملنے کی خبر سُن کے وہ کیسی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ تو اُسی وقت اُن کے پاس جانے، فرخ فریال کو دیکھنے کے لیے مچلنے لگی تھی۔ اُس کے لیے اتنی بیقراری ہی حیران کن ہونی چاہیے تھی کہ شاہ جی کی زندگی میں اور اُن کے بعد اباجان کی تلاش کی کوششوں کی اُسے خوب سُن گُن تھی۔ ایسی ہی شکل اُس کے گھر مسلسل آتا تھا۔ ممکن ہے وہ اُسے کوئی تیسری ہی ہو۔ سب [illegible] کے لیے اکساتی ہو۔ لیکن رات کے برعکس اب اُس پر بڑا ٹھہراؤ تھا۔ کانتے میں بھی تو وہ اتنی ہی شامل تھی۔ کانتے نے کانتہ اُس کے لیے ایک تحفہ لایا تھا، شہ پارہ کی صورت جیسے جولین [illegible] تراش رہی تھی۔ آدمی تراشنے میں آدمی کو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ کانتے ویسے بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ شہ پارہ کی آمد سے جولین کے دل میں اُس کی وقعت اور سوا ہو جانی چاہیے تھی۔ کبھی کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ خوشی میں اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ دکھ پر غلبہ پالے۔ نہ خوشی اتنی دیرپا ہوتی ہے جتنا دکھ کا عرصہ دراز ہوتا ہے اور میں نے سُنا تھا۔ آدمی خوشی چھپا سکتا ہے دکھ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آدمی بڑے سے بڑا دکھ بھول جاتا ہے مگر دکھ اپنے وقت پر تو سارا وجود ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ جولین کو اس وقت کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کر دینا چاہیے تھا۔ اباجان کو اب کوئی اور سفر تو درپیش تھا نہیں۔

بیچ میں کوئی سڑک بن رہی تھی۔ گاڑی کو لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ مولوی صاحب ہمیں گھر کے باہر ہی مل گئے۔ اکبر بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی دونوں اتنی زور سے چیخے کہ راہ گیر بھی متوجہ ہو گئے۔ اکبر چلتی ٹم ٹم پر چڑھ گیا۔ مولوی اکرم کا بس چلتا تو گھوڑے کی راسیں پکڑ لیتے۔ اباجان اس دوپہر میں احاطے میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ ٹم ٹم رکتی دیکھ کے وہ بے تابانہ دروازے کی طرف دوڑے۔ فرخ فریال اور فارحہ بھی دروازے پر کھڑی تھیں یا کھڑکی سے جھانک رہی تھیں وہ بھی باہر نکل آئیں۔ سب کے چہروں کے رنگ ایک رات میں بدل گئے تھے۔ وہ آگے دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں۔ فارحہ تو ہچکیوں سے رونے لگی جیسے میں ایک دن کی نہیں ایک جُگ کی جدائی کے بعد اُن کے پاس آیا ہوں۔ اپنے ہیجان میں اُنھیں یہ دھیان بھی نہ رہا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم کے سامنے اُن کی یہ از خود رفتگی ہر چند کہ فطری تھی مگر مجھے کچھ نامناسب سی لگی۔ ان چند لمحوں میں جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم نے خود کو کیسا اجنبی محسوس کیا ہوگا۔ بہرحال فرخ کو جلد ہی احساس ہو گیا۔ وہ تعجب اور تپاک کی نظروں سے اُنھیں دیکھنے لگی۔ اُسی وقت پیرو نے درمیان میں آ کے میری مشکل حل کی: "ابھی بتاتے ہیں یہ کون ہے؟" اُس نے فرخ کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنے ماتھے سے ٹکراتے ہوئے بولا: "یہ تمھارا راجا کا کمائی ہے۔" کہنے لگا: "تمھارے لیے یہ لوگ اجنبی ہیں مگر تم اُن کے لیے قطعی اجنبی نہیں ہو۔ یہ تو تمھارے لیے ہر دم دعا کرتی رہی ہیں۔" اُن کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں۔ پیرو کو ایک اور بات اُن سے کہنی چاہیے تھی کہ رشتے صرف خون کے نہیں ہوتے اور خونی رشتوں کی کوئی کڑی نہیں ہے، خون کے رشتے تو جبر کے بھی ہو سکتے ہیں اختیار کے نہیں مگر جو رشتے اپنے اختیار کے ہوتے ہیں جو خود کشید کیے جاتے ہیں، اُن کے پیچھے خون سے بڑے اتفاقات، خون سے بڑے سلسلے ہوتے ہیں۔ اباجان بھی ہمارے پاس آ گئے۔ اُن کے بارے میں جولین اور شہ پارہ کو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ اُنھوں نے خود ہی سمجھ لیا۔ اُن کے جھکتے ہوئے سلام کے جواب میں اباجان نے اُنھیں رسمی دعائیں دیں، سر پہ ہاتھ رکھا اور شگفتگی سے بولے: "تم نے نام تو بتائے ہی نہیں۔" میں نے اُنھیں بتانے کی کوشش کی: "یہ جولین ہیں، یہ شہ پارہ اور ان کا نام ......" چمپا بیگم کے نام پر میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ فرخ کو ٹکر ٹکر گھورے جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہوگا کہ فہمیدہ کہیں زندہ تو نہیں ہو گئی۔

میں نے جولین کو اشارہ کیا کہ وہ پیش قدمی کرے۔ جولین کو یہ آداب خوب آتے تھے۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ دیکھ کے مجھے تسلی ہوئی۔ میرے انتظار میں رابطۂ خاطر کی اپنائیت تھی۔ اُس کے لہجے کا کھنچاؤ کچھ میرے اس گداز کے سبب بھی کم ہوا ہوگا۔ سب احاطے میں کھڑے تھے۔ مولوی اکرم نے اُنھیں یاد دلایا کہ اندر ایک گھر بھی ہے۔ سب اندر چلے آئے لیکن جھجک میں آ کے اُن کا اضطراب کچھ اور فزوں ہو گیا۔ جولین بھی میری مدد نہ کر سکی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں آنے کے بعد ایسی کوئی صورت بھی پیش آئے گی۔ کچھ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ایک دوسرے کے متعلق کیا بتاؤں جس سے اُن کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہے۔ کہاں سے وہ الفاظ لاؤں اتنے موزوں ایسے پُرتاثیر جو ایک پل میں سارے فاصلے طے کر لیں مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ آدمی کی شناسائی درونِ خانہ تنگ سا ہوتی تو یہ دشواری پیش نہ آیا کرتی۔ پہلی بار شناسائی ہمیشہ شک زدہ ہوتی ہے۔ ہزار مرتبہ دیوار کے اُس پار ندامت اُٹھانے کے بعد یہ آلودگی ہو جانی چاہیے۔ سو اُن کا یہ امتناع اتنا بے جواز نہیں تھا۔ یہی بہت تھا کہ اُن کی آنکھوں میں حیرت و تجسس کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے اشتیاق بھی موجزن تھا۔ پیرو اور اباجان اندر آ کے فوراً چلے گئے تھے۔ مجھے بھی اپنی موجودگی لایعنی سی لگی۔ لیکن بے مردوں کے سامنے عورتیں ایک دوسرے سے مغائرت محسوس کرتی ہوں لہٰذا میں اُنھیں چھوڑ کے چلا آیا۔ پیرو کا ساتھ آنا اچھا ہی ہوا۔ اباجان سے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اُسی وقت کانتے کو دیکھنے جانا چاہتے تھے مگر پیرو نے اُن سے کہا کہ اگر اس وقت وہاں جانے سے کانتے کی دل بستگی مقصود ہے تو اُس کے اتنی جلد ہوش میں آنے کا امکان نہیں اور اسپتال کا وقت بھی شام سات بجے تک ہے۔ پیرو کے سمجھانے پر وہ چپ تو ہو گئے لیکن بہت ناتواں اور منتشر نظر آ رہے تھے۔

ہمارے انتظار میں رات سے اب تک کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا مگر پیرو نے مولوی اکرم کو صاف منع کر دیا۔ اباجان کی بھوک بھی کانتے کا ذکر سُن کے مر گئی ہوگی۔ میر علی نے بھی انکار کر دیا۔ کچھ دیر تک تو ہم وہیں چبوترے پر بیٹھے

تھے لیکن بار بار کرسیاں کھسکانی پڑتی تھیں، دھوپ بار بار زاویے بدل رہی تھی۔ مولوی اکرم نے فرشی منزل کا کمرہ کھول دیا۔ وہیں باہر سے فرشی منزل کا دروازہ کھلتا تھا۔ کمرے میں آرام کرسیاں رکھی تھیں اور دیگر ساز و سامان کے علاوہ مسہری بھی بچھی ہوئی تھی۔ ابا جان کے اصرار پر پیر مسہری پر دراز ہو گیا۔ غالباً یہی وجہ ہے ابا جان نے کمرے سے چلے جانا مناسب سمجھا۔ سارا جسم چور چور تھا۔ پیرو نے مجھے مسہری پر آنے کو کہا بھی لیکن میں آرام کرسی ہی پر پھیل رہا۔ میری بند آنکھیں گھر کے اندر اُن سب پر منڈلا رہی تھیں اور آنکھیں کچھ لگ گئیں تھیں کہ مجھے نیند آ گئی۔ اگر کسی وقت پیرو نے سرہانے تکیہ رکھ دیا، ایک لمحے کے لیے میری آنکھ کھلی، پھر مجھے اپنی خبر نہ رہی۔

پیرو کی دھیمی آواز پر میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر اب چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ منہ پر دو ایک چھپکے مار کے میں نے سیدھے گھر کے اندر کا رُخ کیا۔ اندر آ کے مجھے یقین نہیں آیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ بھی میری خواب زدگی کا کوئی کرشمہ ہے۔ اُن میں اگر کوئی بھید تھا تو اُن کے چہروں کا۔ سب ایک دوسرے میں ایسی شامل تھیں جتنا آدمی خود میں شامل ہو سکتا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے پھولوں کا سا کوئی منظر تھا۔ روشنی میں اُن کے چہرے دمک رہے تھے مگر یہ سی چمک اُن کے اندر کی تھی۔ چہرے آئینہ ہوں تبھی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ گرد آلود آئینوں پر روشنی ٹھہر جاتی ہے۔ فرخ، چمپا بیگم کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی اور چمپا بیگم کی آنکھیں ابھی تک سندر رہی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بے شک اتنی ہی اجنبی تھیں جتنا کوئی ہو سکتا ہے مگر اُن کے مابین ایک حوالہ سب بڑی زنجیر تھا۔ رشتے بہت کچھ حوالوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کتنا بڑا حوالہ درمیان میں ہے۔ اُنھوں نے ایک دوسرے سے نہیں، مجھ سے اپنی شناسائی بڑھائی تھی۔

سات بجے تو میں سو کے ہی اُٹھا تھا۔ ابا جان نے کھانا کھائے بغیر کسی کو نہیں جانے دیا۔ وہ تو انھیں رات گزارنے کے لیے روک رہے تھے لیکن کالتے کے عذر پر خاموش ہو گئے۔ جولین نے اُن سے درخواست کی کہ کیوں نہ وہ سب اُس کے گھر چلیں، وہ گھر ایسا چھوٹا نہیں ہے۔ جولین کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ گھر کا کیا ہے، مکین چھوٹے نہیں ہونے چاہئیں۔ ابا جان نے اُس سے وعدہ کیا کہ کل وہ اُس کے گھر ضرور آئیں گے۔ اتنی دیر میں ابا جان اُس سے خوب مانوس ہو گئے تھے۔ اس میں اُن کے تپاک اور خوش اطواری کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا جولین کی نشست و برخاست کی شائستگی اور اُس کے لب و لہجے کے سوز و گداز کا دخل تھا۔ جولین کے لہجے میں فرخ اور فریال جیسی نانا آفرینی تھی، اُنھی جیسا اعتماد تھا۔ ابا جان نے اُسے ایک گھڑی اور طلائی نیکلس دیا۔ شہ پارہ اور چمپا بیگم کو بھی سب قیمتی چیزیں تھیں۔ ابا جان کوئی کم حیثیت چیز کسی کو کیسے پیش کر سکتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ کس وقت خریدا تھا۔ صبح تو اُن کے بازار جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے یہ خریداری حیدرآباد میں کی ہو گی۔ فرخ، فریال وغیرہ کے خیال سے۔ تینوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُنھوں نے ابا جان کو اپنا بزرگ سمجھ کے اور اپنا حق جان کے ہی انھیں قبول کیا تھا۔ حق طلبی میں ممنونیت کیسی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ پاڑے کے بہت سے آدمی ہمیں گلی ہی میں مل گئے۔ اب بھی وہاں بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے تھے۔ گو یہ تعداد وضیع جتنی نہیں تھی۔ دینا اور جارجی بھی ابھی تک موجود تھے اور اندھیری کا دلدار اجن بھی۔ رات ہم اس تیسرے پاڑے کی طرف دوری کے سبب نہیں جا سکے تھے۔ راجن اُن دونوں سے زیادہ متحمل نہ معلوم ہوتا تھا۔ پیرو گلی کے بیچ میں جا کے بیٹھ گیا۔ اُس کی نشست کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب اُس کے پاس وقت ہی وقت ہے۔ مجھے بھی اب کوئی جلدی نہیں تھی۔ جولین کو گھر چھوڑ کے تھوڑی دیر کے لیے ہم اسپتال ہو آئے تھے اور ڈاکٹر کیلاش کو مزید زحمت دینے کے بجائے ہم نے گیٹ کے چوکیدار سے کہہ کر حسن کے مارٹی کو باہر بلوا لیا تھا۔ ہمارا زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا ممکن تھا نہ اس کا کچھ حاصل تھا۔ مارٹی کی اطلاع کے مطابق کالتے ٹھیک ٹھاک پڑا تھا۔ تحمل کی بھی کچھ یہی حالت تھی۔ وہ کالتے کے سرہانے بیٹھا بس اُسی پر نگاہیں جمائے، اُس کی کسی ایک جنبش لب کا منتظر تھا۔ مارٹی نے یہ بتا کے ہم دونوں کو حیران کیا کہ شام ابا جان اور بشیر علی بھی اسپتال آئے تھے۔ دیر تک بیٹھے رہے۔ دونوں نے طرح طرح سے کالتے کو آوازیں دیں لیکن وہ اب صرف اپنی سُن رہا ہے۔ کالتے کا واسطہ خود سے کبھی نہیں پڑا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کالتے کبھی کا اُس پر حاوی آ گیا ہوتا مگر اس بار تو وہ خود اپنے مقابل تھا۔ ابا جان سے برداشت نہیں ہوا۔ جس وقت ہم لوگ مہمان کرے میں سو رہے تھے، اُسی دوران ابا جان بشیر علی کو لے کے نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ ابا جان چہرے پر اوڑھ کر ڈال کے آئے تھے۔ اُس وقت میں یہی سوچ رہا تھا۔ پیرو کی نسبت وہ اتنے بجھے بجھے، تھکے تھکے کیوں ہیں۔ اُنھوں نے چلتے وقت کالتے سے متعلق ہم سے کیوں کچھ نہیں کہا اور اسپتال چلنے کے لیے اصرار کیوں نہیں کیا۔ وہ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آئے تھے، پھر ہم سے کیا تذکرہ کرتے۔ مارٹی بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر کیلاش دن بھر گھر نہیں گیا اور اب رات کی ڈیوٹی پر بھی حاضر ہے اور ہر آدھے ایک گھنٹے بعد کرے کا پھیرا لگاتا ہے، جیسے کالتے اُس کا کوئی عزیز ہو۔

یہاں پاڑے پر آتے ہی میں نے منگو کو جولین کے گھر بھیج دیا تھا۔ اسپتال، جولین کے گھر اور پاڑے تک دوڑ بھاگ کے لیے کوئی شخص جولین کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ ابا جان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ رات کو وہ میرا انتظار نہ کریں۔ میں آ گیا تو آ گیا ورنہ نہیں۔ جولین سے بھی میں یہی کہہ کے آیا تھا۔ میں جولین کے گھر ٹھہر جاتا لیکن ایک تو پاڑے تک پیرو کے ساتھ رہنے کے خیال سے چلا آیا، دوسرے میرا جی نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں آ کے بھی وہی کچھ تھا مگر اب میں کہاں جاتا۔ اتنے گھر ہوتے ہوئے بھی آدمی کو ایسی بے امانی ہوتی ہے۔ جمرو، شامو اور نورا نے آتے ہی مجھے گھیر لیا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر کالتے کا نام تھا۔ وہ دہشت کے عالم میں مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آخر اُسے ہوا کیا ہے۔ میں انھیں کیا جواب دیتا۔ لوگ یہ سوال جانے کیوں کرتے ہیں، سب جان کے کیا اُن کی کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔

دوسرے داداؤں اور پاڑے میں بیٹھے ہوئے بہت سے آدمیوں سے نمٹ کے جب پیرو نے دینا، راجن اور جارجی کی جانب رُخ کیا تو میں نے بھی کھنی مار کے جمرو اور شامو کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہی۔ پیرو نے اُن تینوں کو پاس بلا لیا تھا۔ وہ خود بیشتر خاموش رہا اور راجن اور دینا سے اُن کے علاقوں کا حال سنتا رہا۔ ماہجی نے پیرو کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ تینوں پاڑوں کا بھتا وصول ہو گیا ہے۔ پیرو نے راجن اور دینا کو اُن کی بدعہدی پر دوبارہ نہ کوئی سرزنش کی نہ آیندہ کے لیے تنبیہ۔ وہ ان سے زمانے بھر کی باتیں سنتا گیا جیسے کوئی واقعہ ہی نہ ہوا ہو۔ رفتہ رفتہ پاڑے میں لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ راجن اور دینا بھی چلے گئے مگر جارجی وہیں بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ پاڑے میں گنتی کے آدمی رہ گئے تھے کہ پیرو نے ماہجی سے قہوے کی فرمائش کی۔ یہ تلخ اور کسی قدر کڑوا عربی قہوا دودھ اور شکر کے بغیر فنجانوں میں پیا جاتا تھا۔ پیرو کو نہایت مرغوب تھا۔ شروع شروع میں میرے حلق سے نہیں اترتا تھا لیکن اب مجھے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ میں نے ایک فنجان پیا، جارجی نے بھی۔ قہوا ختم کرنے کے بعد بھی اُس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید پیرو اُس کی طرف توجہ کرے لیکن پیرو کو جیسے وہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر جارجی نے جھجکتے ہوئے زبان کھولنے کی کوشش کی۔ "بیٹھا رہ۔" پیرو نے بے پروائی سے کہا۔ "ابھی کیدر کو جانے گا۔"

"گھر کو بھی جانے کا ہے دادا۔" جارجی دبے لہجے میں بولا۔ "ابھی دیری بہت ہو گیا ہے۔"

"یہ بھی تیرا گھر ہے سالا۔"

"ایک دم ہے دادا۔" جارجی تیزی سے بولا۔

"پھر دیری کائے کا ہے۔"

"اپن ابھی اتنا بول کے نئیں آیا تھا۔"

"بول کے۔" پیرو نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ابھی کسی کو کس کو بول کے آنا تھا تیرے کو؟"

"گھر۔" جارجی سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "اپن گھر بول کے نئیں آیا تھا۔"

"ماری کو اور اوہو۔" پیرو نے ہنس کے کہا۔ "ابھی تیرے کو ایک دم اُس کا دھیان کیسے آ گیا؟"

"اپن کو۔" جارجی ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "اپن کو ابھی تھوڑا معافی دیو۔" پیرو معنی خیز انداز سے سر ہلانے لگا۔ "ایک دم تیرے کا بھڑوے کا اولاد لگتا ہے رات اپن سے تھوڑا گستاخی ہو گیا۔"

"اپن نے جیسا تم کے بولا ہے ابھی ویسا ہی کیا ہے۔ اُودر ابھی ایک بھی چھوکری لوگ نئیں ہے اور اب کبھی نئیں آئے گا۔"

"آئے گا تو ابھی تو کیدر جائے گا۔" پیرو نے کہا۔ "پھر اپن ایدر کائے کو بیٹھا۔"

"اپن جانتا ہے۔"

"نئیں جانتا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "ابھی تیرا کھال پر چڑھا چربی اپن تھوڑا کم کرے گا تو اچھا جان لے گا۔"

"ابھی تم ایسا کیوں بول رہا ہے۔" جارجی تنک کے بولا۔ "اپن کو بولو، ابھی اپن اور کیا کرے، ابھی اور کیا رہ گیا ہے۔"

"ابھی تو رہ گیا ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "ابھی تو ایدر پاڑے پر ہی رہنے کا ہے۔"

"پاڑے پر؟ کیوں؟ کیوں دادا؟"

"یہ اپنے سے پوچھ حرام کا جنا کہ کیوں؟" پیرو بھڑک کے بولا۔ "اپن تیرے کو کہا تھا، تین دن، تین رات ایدر اُلٹا لٹکائے گا اور بولے گا 'اپن کون ہے' ایدر کیسا بیٹھا ہے۔ اپن کا پاس کون سا جادو کا چھڑی ہے جو ایدر بیٹھا ہے۔"

"تم، تم کیا بول رہا ہے؟" جارجی کی آواز سن سنا رہی تھی۔ "تم نے راجن اور دینا کو تو کچھ نہیں بولا۔"

"اُس کو بولنے کا ضرورت نئیں تھا، وہ ایدر آنے سے پہلے اکھا منکا جالا باہر جھاڑ کے آیا تھا۔"

"اور اپن، اپن، تمھارا مطلب ہے اپن ایدر...." جارجی کو خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ بُری طرح گڑبڑا گیا۔

پیرو نے اُسے دوبارہ یاد دلانا ضروری سمجھا کہ وہ چاقو کے بل اُڑے

"ہاں ایک کاشتے کیا، شاید کوئی اُسے ناپسند نہیں کرتا۔ بہت عجیب ہے وہ۔ تجمل بھائی، مجھے یقین ہے کہ تجمل بھائی کا جی بھی اب کہیں اور نہیں لگتا۔ اُنھی کے پاس رہنا چاہتے ہیں اور وہ ایک وہی ہے جو اُن پر حکم چلاتی ہے۔ تجمل بھائی کا بس نہیں چلتا کہ اُس کا حکم سُنتے جائیں۔ اب کے میں تمھیں ضرور لے چلوں گا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اُس سے بھی تمھارا تذکرہ کیا ہے۔ چلو گی نا؟"

وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی۔

"تم دیکھنا، وہ تم سے کیسے ملتی ہے، احساس ہی نہیں ہوگا کہ تم کسی اجنبی سے مل رہی ہو، وہ تو سمندر ہے، اُس کا دل سمندر ہے۔ تمھاری طرح وہ بھی نہایت نفاست پسند اور سلیقہ شعار ہے۔ پھولوں سے بنی، شیشے کے مانند۔ تم میں اور اُس میں جانے کتنی باتیں مشترک ہیں۔"

جولین کے تراشیدہ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ خاموش رہی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔ "بلکہ میرا خیال تو یہ ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ تم بھی وہیں رہو سب کے ساتھ۔ تم وہاں جاؤ گی تو خود واپس آنا نہیں چاہو گی۔"

"ابا جان اب کب جائیں گے وہاں؟"

"ابا جان؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں کب جائیں گے، اُن کا کیا ارادہ ہے اور وہ کہاں رہنا پسند کریں گے۔ وہ اب بہت بڑے آدمی ہیں۔ نوابوں کے نواب مگر انھیں زریں سے بہت اُنس ہو گیا تھا، بہت خیال رکھتے تھے اُس کا۔ زریں کی حویلی بھی بہت بڑی ہے، خاندان اُس میں سما سکتے ہیں۔ کاش وہ وہیں رہنے کا ارادہ کریں لیکن یہ سب اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ چند دن ہوئے، اُنھوں نے حیدرآباد میں بھی ایک بہت بڑی حویلی خریدی ہے۔ دیکھو، وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

"مگر ابا جان تمھاری رائے جاننا تو ضرور چاہیں گے۔"

"میں کیا رائے دے سکوں گا۔ مجھے کوئی رائے دینے کا حق بھی کہاں پہنچتا ہے۔ میں تو انھیں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ میں نے تو ....."

"اب کیوں دُہراتے ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے بولی۔ "ہو جاتا ہے۔ خدا نے یہی کچھ کرم کیا ہے کہ سب مل گئے۔ کیسا خواب جیسا واقعہ ہے۔"

"مجھے تو یہ سب اب بھی کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی خواب تو نہیں؟"

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اگر خواب ہے تو کاش یوں ہی رہے۔ خواب بھی تو ایک حقیقت ہے۔ اتنے دل کش خواب ہوں تو آنکھ کھلنے کی آرزو کوئی کیوں کرے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، خواب میں کبھی کیفیتیں تو حقیقتوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔" جولین کیسی کیسی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "تمھیں فرخ وغیرہ کیسی لگیں؟"

اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ "کیا بتاؤں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سب کچھ بیان سے باہر لگتا ہے۔"

"تم نے اتی کو نہیں دیکھا۔ یہ تو اُن کی گرد بھی نہیں ہیں۔ بس اُن کی ایک جھلک جانو ....."

"میں اندازہ کر سکتی ہوں۔"

"یہ میں اِس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری ماں تھیں۔ وہ سب کے لیے سایہ تھیں۔ اپنا کیا، پرایا کیا۔ سارے محلے، سارے خاندان میں لوگ اُن کی پوجا کرتے تھے۔ وہ سب کے لیے محبت تھیں، کاش، کاش وہ بھی ....." میری آواز ڈگمگانے لگی۔

"ہاں بہر حال یہ خوشی بھی کیا ....."

"بے شک یہ بہت بڑی خوشی ہے لیکن انھیں دیکھ کے مجھے اتی بہت یاد آ رہی ہیں۔" میری آنکھوں میں گرج سی ہونے لگی۔ "اُن کے پاس جاتا ہوں تو جیسے اتی میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اُن کی نگاہیں مجھے ہر طرف منڈلاتی معلوم ہوتی ہیں، اُن کی خوشبو مجھے ہر طرف محسوس ہوتی ہے۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ میں خود کو روک نہ سکا، میری سسکیاں نکل گئیں۔

"ارے ارے۔ تم سے پریشان ہو ہی جانا چاہیے تھا۔" وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی اور مسہری پر میرے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ "یہ کیا، یہ کیا؟" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ریشم جیسے ہاتھوں میں بھر لیے اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ میرے آنسو اُمڈے آ رہے تھے۔ وہ مجھے صبر و ضبط کی تلقین کر رہی تھی مگر خود اُس کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ "اب اتنی دور آ کے تمھیں حوصلہ نہیں کھونا چاہیے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے اب میرے اندر طاقت نہیں رہی۔"

"اب تو تمھیں خود کو زیادہ توانا محسوس کرنا چاہیے۔ اتی کا بدل کوئی نہیں مگر تم نے کچھ لوگ پائے بھی ہیں جو تمھیں بہت عزیز سمجھتے ہیں۔ کرشنا جی کو بھول گئے۔ تجمل اور پیڑ پاپا، زریں، شیالے، کاشتے، ماسٹر، کتنے لوگ ہیں جو تمھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ زندگی اسی آنکھ مچولی کو کہتے ہیں۔ کبھی آدمی کھوتا ہے، کبھی پاتا ہے۔ کھوتا کچھ ہے تو پاتا کچھ ہے مگر اچھا ہے تم خوب رو لو۔ جانے کب سے یہ دریا چھپائے ہوئے ہو۔" اُس نے بے اختیار میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور دیر تک یوں ہی بیٹھی رہی کچھ نہیں بولی پھر یک بیک اُسے کچھ خیال آیا۔ "میں تمھارے لیے پانی لاتی ہوں۔" وہ مسہری سے اُٹھ کے ایک دم باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ گلاس لے آئی۔ اُس کے کہنے پر میں نے چند گھونٹ حلق سے اُتار لیے۔ گلاس ایک طرف رکھ کے مضطربانہ اپنی ساڑی کے پلو سے آنسوؤں سے آلودہ میرا چہرہ، میری آنکھیں خشک کرنے لگی۔ مجھے عجیب سا لگا۔ وہ مجھے اپنا ہی کوئی حصہ تصور کر رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُسے گلے لگا کے بہت روؤں لیکن اُس کے چلتے ہوئے چہرے پر جیسے ہی میری نگاہیں گئیں، میرے

بازو اینٹھ کے رہ گئے۔ وہ اُسی لمحے کمرے سے چلی گئی۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے مجھ سے دُور ہو جائے، مبادا اُس کی موجودگی میرا سینہ اور نہ کرید رہی ہو۔ اچھا ہی ہوا، وہ چلی گئی۔ مجھے اپنے آپ کو ٹوکنے کا وقت مل گیا۔ آدمی خود کو شاید سب سے زیادہ مؤثر تلقین کر سکتا ہے۔

خاصی دیر بعد جب وہ لوٹی تو چائے لے کے آئی۔ کہنے لگی۔ "کھانے کا وقت تھا، سوچا تم ابھی کچھ کھا نہیں سکو گے۔" پھر تردد سے بولی۔ "بھوک تو نہیں لگ رہی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"اودھر پیڑ پاپا نے بھی انکار کر دیا ہے۔"

"صبح پاڑے سے خوب ناشتہ کر کے چلے تھے۔" میں نے چائے کی پیالی خالی کر دی۔

وہ اُٹھ کے جانے لگی تو میں نے اُسے روک لیا۔ "بیٹھو، کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ مترنم لہجے میں بولی۔

"شیالے اور چمپا بیگم ابھی تک نہیں آئیں؟"

"اب تو انھیں آ جانا چاہیے۔ ٹنگو کو بھیج کے دیکھا جائے۔"

"کچھ دیر اور انتظار کر لو، ممکن ہے سواری نہ ملی ہو۔"

"اتنی دیر میں تو پیدل بھی آ سکتی تھیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی، نظریں جھکائے ہوئے۔ اب میں اُسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ اس عرصے میں کتنی بدل گئی ہے۔ اُس کے رخساروں پر شفق سی چمک رہی تھی اور ہونٹ جیسے ہوا کے جھونکے سے بکھر بکھر جاتے۔ آدمی ہی گلستان، آدمی ہی صحرا ہوتے ہیں۔ اُسے روکنے کے جواز کے طور پر مجھے کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن سب کچھ میرے ذہن میں منتشر ہو گیا۔ میں نے سوچا، جواز کی کیا بہت ضرورت ہے، کیا میں اُس سے یوں ہی سامنے بیٹھ جانے کو نہیں کہہ سکتا؟ میں بہت دنوں بعد اُسے دیکھ رہا تھا۔ جنت میں بھی کتنی بار مجھے اُس کا دھیان آیا۔ تاہم ایک اطمینان تھا کہ چمپا بیگم یہاں موجود ہے، کاشتے بھی آتا رہتا ہوگا۔ جولین خود بھی بہت ذہین، بہت حوصلہ مند ہے۔

میں خاموش رہا تو چند لمحوں بعد اُس کا بدن بل سے کھانے لگا اور وہ اٹکتی زبان سے بولی۔ "ابا جان نے بھی آج آنے کو کہا تھا۔"

"ارے کہیں تم اُن کی خاطر داری کی تیاریوں میں تو نہیں لگی ہو؟"

"خاطر داری کیا، کچھ بھی انتظام نہیں کیا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے، تم تو اِس معاملے میں طاق ہو۔" میں نے کہا۔ "ایسا ہے پھر تم جاؤ، تمھارا دل اُسی میں اٹکا رہے گا۔"

"ممی آ گئی ہیں۔ میں یہاں کچھ دیر اور بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "کیا تنہائی محسوس ہو رہی ہے؟"

"ہاں شاید۔" میری آواز بوجھل ہو گئی۔ "تم سے بات کرنے کا وقت بھی کب ملا؟"

"اب جلدی کہیں جانا تو نہیں ہے؟" وہ زیر لب بولی۔

"اب کہاں!" میں نے سانس لے کے کہا۔ "فیض آباد ہی جانا ہوگا۔ تجمل بھائی اور ابا جان پر منحصر ہے کہ وہ کب ارادہ کرتے ہیں۔ فیض آباد تو تم بھی بہر حال ساتھ چلو گی مگر ہاں غالباً حیدرآباد کی طرف بھی جانا پڑے۔"

"حیدرآباد کیوں؟"

"آپی جو وہاں ہیں۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "مگر کیا، کیا تم خانم آپی کو جانتی ہو؟"

"کسی حد تک۔" وہ مُسکرا کے بولی۔ "کاشتے بھائی نے اُن کے بارے میں بتایا تھا۔"

"کاشتے نے کیا بتایا ہوگا۔ بس کچھ یوں ہے کہ وہ زندگی ہی کی کوئی بچھڑی ہوئی بہن معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتی بھی یہی ہیں۔ خانم تو کسی ملکہ کے مانند ہیں۔ کوئی ملکہ ہی ایسی ہو سکتی ہے۔ تمام شاہانہ القاب و خطابات اُن پر ختم ہیں۔ اُن کی ذات کوئی طلسم خانہ ہے۔ تہ بہ تہ، وہ سر بہ سر سایہ ہیں۔ پاس جاؤ تو چھاؤں کا احساس ہو۔ ستارے انھیں عشق ہے حالانکہ وہ خود کسی ساز سے کیا کم ہیں۔ آواز سے نغمگی پھوٹتی ہے۔" جانے یہ لفظ کیسے میری زبان سے ادا ہوتے گئے، سبب خیال آیا تو زبان لکنت کرنے لگی۔ میں نے بعجلت کہا۔ "ایک لمبی داستان ہے۔ بہت بڑی طویل کہانی ہے، پھر کبھی اے دوست!"

چند لمحوں بعد میں نے کہا۔ "خانم کو تو ظاہر ہے اپنے گھر فیض آباد ہی آنا ہے۔ انھیں لینے کوئی تو جائے گا۔ ضروری نہیں کہ میں ہی جاؤں۔ میں اب کہیں جانا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ تجسس سے بولی۔

"بس اب مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"کیا کوئی من کی لگن مل گئی ہے؟" وہ دبے لہجے میں بولی۔

"کاہے کی، کاہے کی من لگن؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جس کی کھوج تھی؟"

"تم ..... تم جانتی ہو؟" میں نے اضطراب سے کہا مگر میری یہ حیرت بے وجہ تھی۔ اُسے مجھ سے اگر کوئی نسبت تھی تو سب کچھ جاننا ہی چاہیے تھا۔ "میں بھول گیا، یہ تو میں نے بھی اُس سے کہا تھا کہ مجھے کسی کے لیے جانا ہے اور میرا کچھ طے نہیں ہے کہ مجھے کتنی دُور، کہاں تک جانا پڑے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں، سب بے کار ہے، یہ دُنیا بہت بڑی ہے۔"

"مگر حوصلے کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔"

"سب کہنے کی بات ہے۔ حوصلے سے آدمی دُنیا کی پیمائش کرتا ہے اور ہمیشہ دھوکا کھا جاتا ہے۔ دُنیا اور بڑی لگتی ہے۔"

"ہو سکے تو مجھے کچھ بتاؤ۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"کیا بتاؤں! بتانے کو کچھ ہو تو بتاؤں۔ کرو گی بھی کیا جان کر۔ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے۔ لوگ شاید صحیح کہتے ہیں کہ سب ستاروں کا کھیل ہے۔ اگر سچ ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"لوگ اُمید کے بارے میں بھی کچھ کہتے ہیں کہ وقت موسم کی طرح نہیں ہوتا۔" وہ جھنجھلائی آواز میں بولی۔ "اچھا وقت بہار کا پابند نہیں ہے۔"

"پھر سب وقت پہ چھوڑنا ہے، مجھ پر تو نہیں، پھر میں کیا کروں؟"

"کوشش اور ہمت تو نہیں چھوڑنا چاہیے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "ابا جان کی مثال سامنے ہے۔"

"ہاں! مگر یہ ہمت بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس کے مجھے تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ ایک میرا معاملہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر کوئی آدمی اکیلا نہیں ہوتا۔ اُس کی لپیٹ میں بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی وجہ سے بہت سے لوگ بے گھر بے در ہو سکتے ہیں۔ میں نے کتنے لوگوں کو تنگ کیا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں تو میرا رُواں رُواں لرزنے لگتا ہے۔ مجھے ہول سا آتا ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب اپنی من مانی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔ جب ہم بمبئی آ رہے تھے راستے میں میرے دماغ میں سمائی، مراد آباد آ رہا ہے ایک بار جا کے اور دیکھ لوں۔ چنانچہ میں نے پربھائی سے ضد کی کہ کیوں نہ ہم بمبئی کے بجائے ایک پہر کے لیے حیدرآباد چلیں۔ میں نے تنہا جانے کو کہا تھا مگر پربھائی مجھے اکیلا کیسے چھوڑ دیتے۔ اُنھوں نے کسی طرح ابا جان کو بھی آمادہ کر لیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا، وہ انکار کر دیتے۔ ہم حیدرآباد نہ جاتے تو یوں سب کچھ پیش نہ آتا۔ وہاں جا کے وہی جواب ملا جو اب تک ملتا رہا ہے۔ ایک پہر کی بات تھی۔ ہم دوسری گاڑی سے یا دوسرے دن کسی وقت روانہ ہو جاتے مگر واپسی کے راستے ہمارے لیے بند کر دیے گئے۔ ایک ایسا زنداں ہمارا منتظر تھا جہاں صیاد منصف بھی تھا، مدعی بھی۔ ابا جان ہماری تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھانتے پھرے۔ فضل بھائی کو اپنے زخمی پیر سے اتنا لمبا سفر کرنا پڑا۔ نعام دوبارہ منتشر ہوئیں کسی آس میں۔ نواب عالم تاب کی سانس اٹکی ہوئی تھی مگر وہ زندہ تو تھا، زندہ تھا تو ایک امید زندگی کی درازی کی بھی تھی۔ نعام کا پہنچنا اُس کی نجات کا باعث بنا مگر وہ کتنے لوگوں کو اکیلا کر گیا۔ پھر پولیس، گولیاں، خنجر، میرے سامنے ابا جان کا گریباں چاک کیا گیا، اُنھیں طمانچے مارے گئے۔ یہ جو تم کانٹے کو دیکھ رہی ہو، اُس کا یہ حال صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ ابا جان کی سپر بن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ آگے نہ بڑھتا تو اُس جگہ مجھے جانا پڑتا مگر وہ بازی لے گیا۔ ایک آدمی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اتنے گھر والوں کو بے آرام کرے، اتنے لوگوں کا سکون غصب کرے۔ کیا میں اندھا ہوں، مجھے نظر نہیں آتا کہ یہ سب کس کی وجہ سے، کس کے سبب سے ہوتا ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اتنی قیمتیں پہلے کیوں چلی گئیں اور قیمتی......" میری آواز رندھنے لگی۔ وہ دم بہ خود بیٹھی تھی

"میں تمھیں کیا کیا بتاؤں۔" میں نے اُس سے کہا۔ "سب چپکے سے ہو جاتا ہے۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کتنے گھر رو دیں گے۔ کون کون اُجڑ جائے گا۔ واپسی کے سفر میں بھی لوگ ہمارے تعاقب میں تھے، وہ یہاں تک آ گئے۔ ہم سے ذرا سی چوک ہو جاتی تو جانے کس کا وقت آیا تھا اور وہاں دلی اسٹیشن ہی سے اس کی ابتدا ہو گئی تھی۔ دلی اسٹیشن سے ہم حیدرآباد جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے تو ڈبے میں ایک اُفتادہ لڑکی موجود تھی۔ میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کم سن شیشہ اندام ایسی سرکش نکلے گی۔ سونیا نے وہیں ڈبے میں دم توڑ دیا۔"

"کیا، کیا؟" جولین چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ "سونیا کون؟"

"سونیا بھی ایک لڑکی تھی، تمھارے جیسی، شبانہ جیسی ایک لڑکی، خواب دیکھنے والی ایک لڑکی......" میری آواز جل رہی تھی۔ "بہتر ہے کچھ اور نہ پوچھو۔"

"مجھے بتاؤ، کون تھی وہ؟" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

میں نے اپنی زبان کو لگام دی۔ مجھے جولین کے ظرفِ سماعت کے مطابق ہی بتانا چاہیے۔ میری زبان پر سونیا کا نام بے اختیار آ گیا تھا۔ میں جولین کو کیا بتاتا اور کہاں سے بتاتا کہ سونیا کلکتہ جیل کے جیلر صاحب کی لڑکی تھی جہاں میں نے سات سال گزارے تھے۔ میں اُسے پڑھانے جاتا تھا اور اُس نے چپکے چپکے اپنے آپ ہی اتنا گہرا نقش بنا لیا تھا۔ میں نے جولین سے منت کی کہ مجھے مزید کچھ کہنے کا یارا ہے نہ وہ اُس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

"ہو سکے تو مجھے بتاؤ۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "کچھ اسی طرح تمھارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"بہت سے بوجھ جسم میں شامل ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم سے اب ایسا کچھ چھپا نہیں رہا ہے تاہم جو رہ گیا ہے اُسے جان کے تمھیں خوشی نہیں ہوگی۔"

اچھا ہوا اُس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شہ پارہ اور چمپا بیگم آ گئیں۔ اُسے مجھ سے اصرار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کانٹے کے بارے میں وہ کوئی نئی خبر نہیں لائیں۔ دونوں کے چہرے سُتے ہوئے تھے۔ لباس تبدیل کرنے کے لیے وہ فوراً کمرے سے چلی گئیں۔ جولین گم صم بیٹھی رہی۔ شہ پارہ اور چمپا بیگم کمرے سے گئیں تو وہ آہستگی سے بولی۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے چونک کے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"تمھارے بارے میں ہے۔"

"میرے بارے میں؟ ایسی کیا بات ہے؟"

"یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کہاں؟"

"کہیں بھی جہاں کچھ وقت مل سکے۔"

"کہیں چلیں گے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "مگر، مگر......"

"میں کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، یہ جاننے کے لیے کہ میں تمھارے کس کام

آسکتی ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "غالباً جو تم کہنا چاہتی ہو، میں نے پہلے ہی اُس کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"مگر وہ تمھارا فیصلہ ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"مگر تمھارے لیے سوچنے والے دوسرے بھی تمھارے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے، تمھارے لیے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم اُسے قبول نہ کرو۔"

"نہیں نہیں، میں تو یہی کہہ رہا ہوں۔"

"مگر شاید میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔"

"تم کیا، کیا؟..." میں نے بے دلی سے کہا۔ اُس کے چہرے پر کیسا اعتماد تھا، اتنے عرصے جیسے وہ اِس اعتماد کی افزائش کرتی رہی ہو۔ میں نے جھپکتی پلکوں سے اُسے دیکھا۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔ باہر سے کسی کی چاپ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے چچا بیگم کمرے میں داخل ہوئی پھر شہ پارہ۔ دونوں اُمڈتی ہوئی آئی تھیں۔

چند لمحوں بعد جولین وہاں سے چلی گئی لیکن جانے کے بعد بھی موجود رہی۔ چپ بیگم جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ یاد نہیں میں نے کیا سنا، کیا نہیں۔

دوسرے دن سہ پہر میں پیرو کے ساتھ پاڑے آگیا تھا۔

ابا جان، فرخ، فریال، فارہ اور اکبر کل شام جولین کے گھر آئے تھے اور رات کو بھی واپس نہیں گئے۔ ابا جان کو اگر کوئی تردد تھا تو وہ دور ہو گیا ہوگا کہ وہ کسی اور گھر میں نہیں آئے ہیں مگر صرف اتنی بات نہیں تھی۔ ٹنگو تقریباً گھنٹے گھنٹے بھر بعد اسپتال جاتا تھا اور کانتے کے بارے میں اسپتال سے ایک ہی خبر لاتا تھا۔ ڈاکٹروں کے بہ قول جتنی دیر ہو رہی تھی، اچھا نہیں ہو رہا تھا۔ ٹنگو نے یہ بتا کے سب کو اور آزردہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹروں نے ہمارے خیال سے اڑتالیس گھنٹے بتائے تھے حالانکہ خود انھیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کانتے کے ہوش میں آنے کی توقع تھی۔ ٹنگو کو یہ بات اسپتال میں اُس کے کسی واقف کار نے بتائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کانتے کے کمرے میں ڈاکٹروں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ وقفے وقفے سے ایک کے بعد دوسرا ڈاکٹر اُسے دیکھنے آ رہا تھا۔ پھر کوئی بھی رات کو نہیں سویا۔ فرخ، فریال وغیرہ کانتے کو نہیں جانتی تھیں مگر وہ اس طرح بے تعلق بھی کیسے رہ سکتی تھیں۔ ابا جان نے آتے ہی ٹنگو اور پیرو کی مدد سے غریبوں میں کھانا تقسیم کرانے کے لیے بہ عجلت انتظام کیا تھا۔ رات بھر چچا بیگم جانماز پر بیٹھی دعائیں کرتی رہیں۔ شام کو میں اور پیرو بھی تھوڑی دیر کے لیے اسپتال گئے تھے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ مجھ میں فجل کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔

جولین کے گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں مگر ہر طرف اندھیرا سا نظر آ رہا تھا۔ روشنی بینائی سے مشروط ہے مگر جتنا اُس کا تعلق بینائی سے ہے، اُتنا ہی دل سے بھی ہے۔ دل سب سے بڑی بینائی ہے۔ دل میں تاریکی ہو تو کتنی ہی بجلیاں چمکیں اندھیرا نہیں جاتا۔ پیرو کے اصرار پر ابا جان بیٹھک میں لیٹ گئے تھے لیکن ایک پل کے لیے بھی اُن کی آنکھ نہیں لگی۔ جولین، شہ پارہ رات بھر سب کے لیے چائے بناتی رہیں۔ ابا جان بار بار ٹنگو کو اسپتال بھیجتے تھے اور اُس کی آمد پر سب بیرونی کمرے میں اکٹھے ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہتے تھے۔ جولین اور شہ پارہ نے رات کے کھانے میں خاصا اہتمام کیا تھا مگر سب نے بس رسم ادا کی تھی۔ صبح ناشتہ سب نے الگ الگ کیا۔ ابا جان سویرے ہی اسپتال چلے گئے تھے اور کوئی نو بجے جب واپس آئے تو جیسے پھول ساتھ لائے تھے اور روشنی ساتھ لائے تھے۔ سبھی کے چہروں کی روشنی جیسے واپس آ گئی۔ انھوں نے آ کے مژدہ سنایا کہ آخر کانتے کو ہوش آ گیا ہے۔ اُن کے کہنے کے مطابق صبح کانتے نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولی تھیں اور فجل اور ابا جان کو مرجھائے دیکھ کے بے چین ہوا تھا۔ فجل نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا تو اُس کے ہونٹوں میں لرزش سی ہوئی۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا مگر فجل نے اُس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اُسی وقت ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اُس نے تفصیلی معائنے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا۔ گو کانتے پھر غافل ہو گیا تھا مگر ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ لمحاتی بیداری کانتے کے لیے بہت اچھا شگون ہے، طبی اور نفسی طور پر نہایت مفید ہے۔ اِس سے کانتے کے ارادے کی توانائی بحال ہوگی، زندگی کے ارادے کی۔ میر تقی چوں کہ ساتھ نہیں آئے تھے اس لیے ابا جان کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھا کے وہ پھر چلے گئے۔ مجھ سے انھوں نے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا، نہ فرخ، فریال نے۔ گویا اُن کی رائے بھی یہی تھی کہ مجھے ابھی یہیں ٹھہرنا چاہیے۔

میں پیرو کے ساتھ پاڑے چلا آیا۔ پیرو کا اپنے گھر جانے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پاڑے پر لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ماچی نے بتایا کہ کل ہمارے جانے کے بعد شام تک لوگ انتظار میں بیٹھے رہے۔ صبح بھی بہت سے آدمی آئے تھے۔ ماچی نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ ابھی چند روز تک دادا پاڑے پر نہیں بیٹھے گا، جب تک اُس کا جی نہ چاہے وہ آنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہوا کہ صبح جارجی بھی اپنی بیوی ماری کے ساتھ آیا تھا۔ وہ پیرو کے لیے مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے لایا تھا۔ پاڑے میں بہت سکون تھا۔ سکون کچھ کانتے کی وجہ سے بھی تھا۔ لگتا تھا جیسے دریچے کھل گئے ہوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہو۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کے میں، جبرو اور شامو کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سڑکوں پر شام اتنی اداس نہیں ہوتی۔ ہم دُور تک نکل آئے۔ جدھر دیکھو ایک خلقت، ایک شور معلوم ہوتا تھا۔ لوگوں کے پاس بس آج کا دن ہے، آج کے بعد زندگی کا یہ میلا تمام ہو جائے گا۔ اُن میں شاید بہتیرے بے کار تھے۔

ڈھلتے سورج کے وقت ہم پاڑے سے چلے تھے۔ چلتے چلتے اندھیرا چھانے لگا اور سڑکوں پر روشنیاں جلنے لگیں۔ شامو کی خواہش پر ہم نے ایک ہوٹل میں چائے پی اور کپلا چٹنی کے ساتھ کاندی سموسے کھائے۔ ہوٹل سے کچھ دُور

آئے تو پہلی بار شامو کو احساس ہوا کہ کچھ لوگ ہماری تاک میں ہیں۔ میں نے بھی سرسری انداز میں نظر دوڑا کے دیکھا۔ شامو کا خیال صحیح تھا۔ وہ اچکے تھے اور ہوٹل ہی سے انھوں نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا۔ شامو اور جبرو کی جیبوں میں نقدی کا اندازہ لگا لینا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ہوٹل میں جبرو کا بٹوا بھی دیکھ لیا ہوگا۔ جبرو کو کاؤنٹر پر دیر لگی تھی۔ بڑا نوٹ نکالنے پر ہوٹل والے سے تھوڑی بہت میں میں بھی ہوئی تھی۔ شامو کو مستی سوجھی۔ وہ آگے کسی کم بات جگہ پیچھے آنے والوں کو ایک موقع دینا اور اُس کے بہ قول ذرا اُن کے ہاتھ کی مہارت دیکھنا چاہتا تھا۔ جبرو کی رگ بھی پھڑکنے لگی تھی۔ میں نے انھیں روکا۔ فی الحال وہ دو ہی نظر آ رہے تھے مگر اِدھر اُدھر اور بھی ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے شامو بھی موقع پر تماشا کرتا۔ بھاگنے کی صورت نہ ہو تو ایسے وقت جواب میں فوراً ہاتھ چھوڑا جاتا ہے اور یہ دیکھ کے اِدھر اُدھر قریب ہی دُبکے ہوئے ساتھی ایک ثانیے میں سامنے آ جاتے ہیں۔ سامنے کیا، آتے ہی ٹوٹ پڑتے ہیں اور اودھم رکھنے والا اور بلا مچانے والے کو اُلٹا چور بنا دیتے ہیں۔ شامو اور جبرو کو یہ سب مجھ سے زیادہ معلوم تھا لیکن وہ صرف اُن سے بھڑنے کا مزا لینا چاہتے تھے۔ اُن سب کو بے شک ہم بھگت لیتے اور آئندہ کے لیے کوئی تلقین ضرور کر دیتے لیکن ہمیں اُن سے فضول اُلجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اِس ہنگامہ آرائی میں کوئی پولیس والا بھی ہماری طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ تعاقب کرنے والے صاف تو اُچکے معلوم ہوتے تھے۔ انھیں آدمی آدمی کی کچھ تو پہچان ہونی چاہیے تھی۔ ہمارے جسم۔ انھیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، صرف جبرو کے بٹوے پر اُن کی نظر تھی اور جیبوں میں ہماری حیثیت پر۔ بہرحال آگے آگے جبرو اور شامو کو احساس ہو گیا کہ وہ ایک حماقت سے بچ گئے ہیں۔ نتیجہ تو ایک ہی نکلتا۔

ہم پاڑے سے ابھی فاصلے پر تھے کہ دُور سڑک پر ٹنگو مجھے اپنی جانب لپکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اُس کی نگاہیں مسلسل اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں جیسے ہی ہم پر اُس کی نظر پڑی، وہ وہیں سے چیخنے لگا اور دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ "کیدر ہے تم لوگ؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" اُس کی حالت دیکھ کے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ایدر اکھا علاقے میں تم کو ڈھونڈنا پڑا ہے۔ دادا ابھی ابھی نکلا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"اُودر کانتے بھائی کے لیے ماسٹر، ماسٹر آیا تھا۔"

"کیا، کیا ہوا اُسے؟" میں نے پھٹتی آواز میں پوچھا۔

"حالت ٹھیک نئیں معلوم پڑتا، راجا بھائی! ماسٹر سالا بات نئیں کرتا تھا۔ دادا تم لوگ کے لیے تھوڑا دیر رکا، پھر ابھی نکل گیا۔ ابھی سیدھا جلدی جانے کا بول کے گیا ہے۔"

شامو نے یہ سنتے ہی ایک ٹم ٹم رکوا لی۔ مجھے چکر سا آنے لگا۔ سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی، کوچوان اِس سے زیادہ تیز گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُس نے ہمیں اسپتال پہنچا دیا۔ احاطے میں قدم رکھتے ہوئے میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اسپتال کا مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کیلاش کا حوالہ دیا۔ وہ اِس وقت وہاں نہیں تھا لیکن مزید کسی حوالے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کانتے کا نام سن کے انچارج نے سر جھکا لیا اور اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "مجھے افسوس ہے۔" میں صرف اتنا سن سکا۔

پیچھے سے جبرو نے مجھے تھام لیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیٹھک میں جانے کے بجائے میں سیدھا گھر میں داخل ہو گیا۔ سارے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے سبھی مر گئے ہوں اور میں کسی قبرستان میں آ گیا ہوں۔ جولین، چچا بیگم، جولین کی ماں، شہ پارہ مجھے دیکھ کے میری طرف جھپٹ پڑیں اور بین کرنے لگیں۔ میں نے اُن سے کچھ نہیں کہا، میں اُن سے کچھ کہہ بھی نہ پاتا۔ میرا دماغ سن ہو گیا تھا۔ میں دیدہ آنکھوں سے بس انھیں دیکھا کیا۔ شہ پارہ میرے بازو سے چمٹی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔

اندر بغلی کمرے میں کانتے کی لاش پڑی تھی۔

ماری نے مجھے اُن سے جدا کیا اور اندر کمرے میں کانتے کے پاس لے جانا چاہا لیکن اُس کے سامنے جانے کے تصور سے میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا۔ ماری نے ارادہ بدل دیا اور میری کمر تھپکتا ہوا بیٹھک میں لے آیا۔ فجل، پیرو، ماچی، ٹنگو، بھی، ژوزا، چھیدا اور بلّے کے علاوہ ڈاکٹر کیلاش بھی وہاں موجود تھا۔ میری نظریں سیدھی فجل پر جا کے ٹھہر گئیں۔ وہ پیرو کے ساتھ بیٹھا دیوار پر نگاہیں جمائے [illegible] تھا۔ میرے آنے پر اُس نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ پیرو اُٹھ کے مجھے اپنے پاس لے آیا اور بھرائی آواز میں بولا۔ "ابھی راجا آگیا ہے فجل بھائی۔"

"ہاں دادا! دیکھ لیا ہے۔" فجل کی آواز مجھے دُور سے آتی سنائی دی۔ "بیٹھ جا میرے۔"

میں اُس کے سامنے نہیں بیٹھا، نہ اُس نے مجھے پاس بلایا۔ میرے اندر میں سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔ جتنی دیر میں وہاں رہا، میرا دم گھٹتا رہا۔ سو میں وہاں سے اُٹھ آیا۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں، جا کے کس کا گریبان پکڑوں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سارا وجود ڈوبتا جا رہا ہو۔ گلی میں خاموشی تھی۔ میں باہر چوکھٹ تھامے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ جانے کب اندر سے شامو بلکتا ہوا آ گیا اور میرے شانے پر سر پٹخنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مجھ سے نہ اُسے سنبھالا دیا جا سکا، نہ میری آنکھیں اُس کا ساتھ دے سکیں۔ خود شامو نے مجھے سہارا دیا اور ہم دونوں وہیں چوکھٹ کے پاس کیاری کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ ابا جان کی ٹم ٹم آ کے رکی۔ فرخ، فریال، فارہ، اکبر، ریحانہ، سوادی، اکرم اور میر علی۔ وہ سب ٹم ٹم سے اُترتے ہی دیوانہ وار میری طرف بڑھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا ہوا؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میر علی پھڑک پھڑک کے رونے لگے۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکبر بھی وہیں میرے پہلو میں منڈیر پر آ گیا اور

سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگا: "آپ کے بہت گہرے دوست تھے نا جانی صاحب ایک بار گی میرے کمرے میں آیا کرتے تھے۔ دوسرے علاقے پوچھ رہا تھا وہ کتنی اجنبیت سے کانتے کے بارے میں پوچھ رہا تھا پھر اُس کو شاید خود احساس ہو گیا وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں ٹھہرا اور مجھ سے کچھ کہے بغیر اُٹھ گیا۔"

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اندر سے شور اُٹھنے لگتا۔ جانے کون کون آ رہا تھا۔ جوبلی کے پڑوسی پاڑے کے آدمی۔ رات گئے گلی سنسان ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کتے بھونکنے لگتے تھے۔ پہلے ہوائی قریب ہی منڈلا رہے تھے پھر دور چلے گئے۔ جمرو ماچھی اور زورا ماچھی کسی وقت میرے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ وہ کبھی مجھے دبوچتے، کبھی جھنجھوڑنے لگتے اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتے۔ میں انھیں خوب اچھی طرح دیکھ اور سن رہا تھا لیکن دیکھنا اور سننا اندر کے لیے بے معنی تھا۔ آنکھیں محض ایک وسیلہ ہیں اور کانوں کا بھی یہی ہے۔ دیکھنے اور سننے کا تعلق تو کسی اور چیز سے ہے۔ میری سمجھ میں اُن کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ میں انھیں کیا جواب دیتا۔ مجھے اپنی اس ناسمجھی اور کم خیالی پر کوئی حیرت نہیں تھی۔ دو وقت وہ مجھے تجمل کا واسطہ دیتے رہے تھے کہ مجھے اُس کے پاس بیٹھنا چاہیے اس وقت اُسے میری ضرورت ہوگی کہہ رہے تھے کہ اُس کا بیٹا جا رہا ہے۔ ابھی کچھ ہوا تھا کہ ابھی وہ حرام کے جنے دونوں آدمی پاڑے پر ہیں۔ وہ انھیں اب واپس نہیں جانے دے گا جب تک اُن سے ابا جان کی حویلی میں بھیجنے والے آدمیوں کے سرغنوں کے اصل نام کی تصدیق نہ کر لے گا اور نواب بیت حویلی میں آنے والے ایک ایک آدمی کو ختم کر کے نہ آئے گا اُس وقت تک اُسے قرار نہیں آئے گا۔ وہ اُن دونوں پر اُس وقت تک زندگی کیا موت بھی حرام رکھے گا۔ جمرو اور شامو نے بھی ابھی کی ہم نوائی کی۔

زورا کہنے لگا کہ کانتے کا وقت آ گیا تھا۔ جس کا وقت آ جاتا ہے اُس کا ایسے ہی کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ پھر کوئی بھی اُسے روک نہیں سکتا۔ کہنے لگا میاں سے بچھڑنا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو بچھڑ نہیں گا۔ میں بیٹھا سنتا گیا۔ پچھلی رات کے آخری پہر دونوں نے آ کے اطلاع دی کہ سب اندر آ جائیں۔ بیڑ دروازہ کھلا ہے۔ زندگی کی آمد کے ساتھ ہی مکان کے در و بام سے سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ مرلی نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اُٹھایا۔ میں نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ اُس نے مجھے اُٹھایا تو میں اُٹھ گیا۔ وہ میرا وجود جیسے اندر صحن میں لے آیا۔ یہاں کانتے پھولوں کی سیج پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں مندی ہوئی تھیں جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لگتا تھا ابھی بیدار ہو جائے گا۔ صحن میں شور مچا ہوا تھا۔ شبانہ اُس کے پائنتی سے لگی اپنا سر پھوڑ رہی تھی۔ کبھی اپنا منہ نوچتی تھی۔ بیر نے اُسے اُٹھایا تو وہ اور بے حال ہو گئی۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ دوپٹا کس طرف جا رہا ہے اور لباس کس قدر بے ترتیب ہو گیا ہے۔ بیر وا اُسے سب کی نظروں سے دور لے گیا۔

مگر بیر کو اُن سبھی کو دور لے جانا چاہیے تھا۔ میرے اور تجمل کے سوا اُن سبھی کو سب کا کم و بیش یہی حال تھا۔ خود بیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ جولین اور چمپا بیگم، فرخ، فریال کے ساتھ کھڑی بلک بلک کے رو رہی تھیں۔

میر علی گلاب پاش چھڑک رہے تھے جس میں اُن کے آنسو بھی شامل تھے۔ ابا جان کانتے کے سرہانے بیٹھے بچوں کی طرح بے کل ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر کیلاش میرے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنے قریب کہ اُس کی سسکیاں میرے کانوں میں بھن بھنا رہی تھیں۔ میر علی نے تجمل کی طرف دیکھا پھر ابا جان کی طرف اور کانتے کی چارپائی پر جھک کے اُس کا چہرہ چھپانے کا ارادہ کیا۔ ابا جان نے انھیں روک دیا اور اُٹھ کے بے تابانہ کانتے کی پیشانی چومنے لگے۔ دیر تک وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھامے دیکھتے اور سسکتے رہے پھر اُس کے سینے پر سر رکھ کے بلکنے لگے۔ میر علی نے بہ مشکل انھیں اُس سے جدا کیا اور تجمل کے حوالے کر دیا۔ تجمل نے ایک قدم بڑھ کے انھیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ میر علی نے کانتے کا چہرہ چھپا دیا۔

کانتے کی سواری اُٹھی تو سبھی شور مچا رہے تھے۔ جمرو، شامو، مرلی، منگو، زورا ماچھی، گنگیا، بھیمی اور چمپا بیگم، جولین اُس کی ماں۔ وہ گلی میں آ گئی تھیں اور ننگے سر آگے کئی مکانوں تک کانتے کی برات کے ساتھ چلتی رہیں۔

صبح دھوپ پوری طرح نہیں چڑھی تھی کہ ہم واپس آ گئے۔

❁

سبھی گھر واپس آئے تھے اور میں بیٹھک میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا تھا لیکن کچھ دیر بعد مرلی نے مجھے وہاں سے اُٹھا لیا اور اندر جولین کے کمرے میں لے گیا۔ جولین بھی موجود تھی۔ اُس نے جلدی سے نئی چادر بچھائی اور مجھے آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں کسی چون و چرا کے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے کا دروازہ بھیڑ کے وہ دونوں چلے گئے۔ مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں بخار میں گھر رہا تھا؟ مجھے کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ آدمی احساس کا مرکب ہے اور حواس سے عبارت ہے مگر آدمی صرف احساس ہے۔ احساس ہی زندگی ہے۔ بے خبری موت ہے مگر زندگی کی کوئی نہ کوئی رمق اُس میں باقی رہتی ہے۔ بے احساسی بیداری کی تو نیند سے بڑی ہلاکت ہے۔ اُس سے تو آدمی زندگی بھر ہلاک ہوتا رہتا ہے۔ پھر آئینہ بھی زندگی ہے اُس پر کوئی زندگی چلتی پھرتی زندگی منعکس ہوتی جاتی ہے اور آئینہ بے جان رہتا ہے۔ آدمی بھی آئینہ مثال ہو جاتا ہے۔ سب کچھ اُس پر گزرتا ہے پر آئینے کی طرح، آئینے کی طرح وہ محض تماشائی بنا رہتا ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں وہ کیا تھا۔ نہ بیگانگی کا احساس، نہ یگانگت کا۔ بس کوئی حیرت، بس کوئی فسوں۔

دوبارہ جولین چائے لے کے کمرے میں آئی تو میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں بے پردہ آئینے کی طرح۔ اُس نے مجھ سے چائے پینے کو کہا۔ میں نے اُٹھ کے پیالی تھام لی لیکن پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارا بستر خراب ہو گیا۔ جولین نے جلدی میرے کپڑے صاف کیے اور پوچھنے لگی کہیں جلا تو نہیں؟ میں نے سر ہلا کے انکار کیا۔ وہ رونے لگی اور کمرے سے بھاگ گئی پھر وہ فوراً واپس آ گئی۔ پیرو بھی اُس کے ساتھ تھا۔

"کیا ہے ابا؟ ابھی کیا بات ہے؟"

میں اُسے دیکھتا رہا کہ کیا جواب دوں۔

پیڑ کی گھونگریالی چٹیلیاں ایک شانے تک بکھر گئی رہیں۔ پھر میرا بازو پکڑ کے اُس نے
مجھے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر دھکے سے گرتے گرتے بچا۔ اُسی نے مجھے سنبھالا۔ میرے
قدم ابھی پوری طرح زمین پر نہیں جمے تھے کہ اُس نے اُلٹے ہاتھ سے میرے گال پر طمانچہ رسید
کیا۔ جولین نے بڑھ کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔ پیڑ نے اُسے
ایک طرف ہٹایا اور میرے سامنے آ کے مجھے بے دریغ طمانچے مارنے لگا۔ میں نے اُس کا
ہاتھ نہیں روکا، نہ کوئی آہ بلند کی۔ میں بُت کی طرح ساکت اُس کے مقابل کھڑا رہا۔
اُس نے پے در پے میرے سینے، میری پسلیوں پر مُکّے مارنے شروع کر دیے اور اپنا پنجہ
میرے چہرے میں گاڑ دیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ آخر اُس نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیے اور
اپنے بازو پھیلا کے بے تحاشا مجھے بھینچ لیا۔ اُس کی گرفت ایک شکنجہ تھی۔ مجھے اُس
کے سینے سے لگ کے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں یکایک آگ سی بھڑک اُٹھی ہے، جیسے
میرے مساموں میں کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے، جیسے کوئی میری رگیں مروڑ رہا ہے۔ رگ و
پے میں ایسی گرمی اُٹھی کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے صحرا
میں اتنا بڑا سمندر موجود ہے۔ آدمی کے بس میں آنسوؤں کے سوا کیا ہے۔ میرا سر پیڑ کے
شانے پر ڈھلک گیا۔ اُس نے مجھے جانے کب تک اپنی آغوش میں چھپائے رکھا۔
مجھے اپنی کوئی سُدھ بُدھ نہ رہی۔

تین دن بعد بھی جولین کے گھر سے مولوی اکرم کے سوا تیسرے دن پیڑ نجل
کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے بھی ساتھ جانا چاہا تھا لیکن شہپارہ اور جولین نے روک
لیا۔ چوتھے دن ابا جان نے جولین کے گھر سے جانے کی رسمی اجازت حاصل کر لی۔ میں
بھی اُن کے ساتھ گھر آ گیا۔ ان چار دنوں میں پہلی بار میں نے باہر قدم نکالا تھا مگر
ابا جان کے ساتھ آ کے بھی گھر میں بند رہا۔ وہ ہر وقت کسی لاچار کی طرح میری نگہداشت
کرتی رہتیں۔ میرے پاس بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں۔ کوئی میرے بالوں میں انگلیاں
پھیرتی۔ کبھی کوئی میرا جسم دباتی تھی۔ شاید اُنھیں اب تک کسی دھوکے کا گمان تھا۔ کبھی
وہ مجھے چونک چونک کے دیکھتی تھیں۔ رات کو میرا جی بہت گھبرانے لگا لیکن فرخ فریال
کے خیال سے میں نے رات گزار دی اور صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔
چلتے وقت فرخ کے کہنے پر میں نے کپڑے بدل لیے تھے اور ناشتہ
بھی کر لیا تھا۔ گھر سے دُور آ جانے پر مجھے دھیان آیا کہ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔
میں جیبیں اُلٹنا بھول گیا تھا لیکن بے پرانے کپڑوں میں کچھ نقدی پڑی ہو۔ گھر واپس جا کے
میں ابا جان سے پیسے لے سکتا تھا مگر اب کون واپس جاتا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ میرا ارادہ
پہلے جولین کی طرف جانے کا تھا، پھر نجل کو دیکھنے کے لیے پاڑے کی طرف لیکن ایک بڑا
فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے سمت کا خیال ہی نہ رہا۔ بہت دنوں بعد میں اس طرح اکیلا
سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ ایک کشادگی سی جیسے میں اپنے ساتھ چل رہا
ہوں۔ کسی شاعر کے بہ قول: دوسرا کوئی ساتھ ہوتا ہے تو میں اپنے ساتھ نہیں رہتا۔ میری رفتار
تیز تھی نہ اپنی کوئی سمت۔ چلتے چلتے میں جانے کہاں سے کہاں آ گیا۔

وہ جوہو کا ساحل تھا۔ وہاں شہر کی بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ مکانات بھی سطحِ شہر سے
مختلف تھے۔ سامنے سمندر دکھائی دیا تو میں جا کے ریت پر لیٹ گیا۔ ساحل پر دھوپ پھیلی
ہوئی تھی، نمی ملی ہوئی دھوپ۔ لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور میری طرح اُن
میں کوئی تنہا نہیں تھا۔ مسائل میں یہی ہوتا تھا۔ سمندر کی کوئی اونچی لہر شور مچاتی ہوئی آتی تو
دُور تک ریت بھیگ جاتی۔ چھینٹوں سے میرے کپڑے بھی بھیگ بھیگ جاتے۔ ان میں بڑی
ٹھنڈک تھی۔ لہریں اُمڈ اُمڈ کے آ رہی تھیں، زندگی کی طرح۔ زندگی لہروں سے کتنی مشابہ
ہے۔ دُور سے ایک لہر بڑھتی ہوئی آتی ہے۔ کسی جگہ آ کے اُس کا قامت بڑھ جاتا ہے، اُس
کا شور بڑھ جاتا ہے اور کنارے پر آ کے آخر سب کچھ ڈھیر ہو جاتا ہے۔ یہ لہریں کبھی تھم نہیں سکتیں،
زندگی بھی تھم نہیں سکتی۔ ہر بار ناکامی سے دوچار ہوتی ہے اور ہر بار اُسی شدت سے اُبھر کے
آتی ہے۔ سہ پہر تک میں یہیں اپنے دست و بازو ڈھیلے کیے پڑا رہا۔ اس دوران کئی آدمی میری
طرف آئے لیکن مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر چلے گئے۔ جیسے جیسے دھوپ پیلی پڑتی جا رہی تھی،
سمندر بھی ویسے ویسے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں ابھی وہاں سے نہ اُٹھتا اور اُٹھتی ڈوبتی لہروں
کا تماشا دیکھتا رہتا اگر ایک سپاہی آ کے مجھے نہ ٹوکتا۔ سمندر کے شور میں مجھے اُس
کی آہٹ محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اُس نے میرے شانے پر ڈنڈا چھوا۔ آخر میں ہڑبڑا گیا۔ دیکھا
تو وہ سر پہ کھڑا تھا۔

"کون ہے تم؟" اُس نے درشتی سے پوچھا۔

اُس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے اُٹھ جانا مناسب سمجھا۔ یوں بھی
بیٹھے بیٹھے جواب دینے میں وہ اپنی ہتک محسوس کرتا۔ مجھے ان لوگوں کا تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا
تھا۔ میری خاموشی سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور اُس نے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں مجھے
مخاطب کیا: "بہرا ہے تم؟ ہم کیا پوچھتا ہے۔ کون ہے تم؟"
"تمھیں کیا نظر آتا ہوں؟" میں نے بیزاری سے کہا۔
وہ چوڑے چکلے شانے، بھاری تن و توش کا آدمی تھا۔ پیٹ باہر نکلا ہوا۔ مجھ پر برسا،
بھڑک کے بولا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا کہ یہاں کوئی کیا کر سکتا
ہے۔ اُسے میرا جواب قطعاً پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا: "تم جانتا نہیں، تم سے کون بات کر رہا ہے۔"
میں نے سوچنے کی کوشش کی لیکن میرے منہ سے نکل گیا: "تم بھی نہیں جانتا۔"
سب لوگوں میں شاید ایک میں ہی اُسے نظر آیا تھا۔ کہنے لگا کہ میں اُسے سیدھا آدمی
نہیں لگتا۔ وہ مجھے تھانے لے چلے گا تو وہاں میں اُسے اچھی طرح جان لوں گا اور وہ مجھے۔
اتنی سی بات پر تھانے کا ذکر بے جا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔
وہ ٹوہ لے رہا تھا۔ اُس کا بڑا مقصود تھا میری جیب۔ میں کچھ تھا ہی نہیں، ہوتا بھی تو میں کبھی
نہ دیتا۔ وہ خاصا کھڑا جت آدمی نظر آتا تھا لیکن بے سبب جابری کرنے پر میرا دل آمادہ نہیں تھا۔
میری طبیعت سے اُسے اور شہ ملی۔ ویسے بھی جب آدمی کا جی بات کرنے ہی کو نہ چاہے تو
حجت تو بعد کی بات ہے۔ میں کسی کا کیا بگاڑ رہا تھا۔ ساحلوں پر ایسے کوئی روکتا ٹوکتا
نہیں۔ زمین، آسمان، سمندر میں آدمی کا سب سے بڑا دشمن آدمی ہے۔ میں نے ایک نظر اردگرد
دیکھا۔ دُور دُور ہی کہیں کوئی آدمی تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے اُس کی ٹانگیں پکڑ کے اُسے اُلٹ

سکتا تھا۔ اُس کی مردم آزاری سے میرے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی لیکن میں نے
تحمل کیا۔ بہرحال وہ وردی میں تھا۔ کسی داد فریاد کے بجائے منت سے میں نے کھڑے ہو کے کہا۔
"چلو کس طرف چلنا ہے۔"
اُسے مجھ سے یہ توقع نہ ہوگی۔ چند لمحوں تک وہ کشمکش میں کھڑا رہا۔ پھر
معنی خیز انداز میں سر ہلا کے بولا: "چلو، تم کوئی اونچا آدمی جان پڑتا ہے۔ ہم تم کو ضرور
لے چلے گا اور اب اُدھر جا کے ہی تم کو دیکھے گا۔"
میں نے جواب نہیں دیا اور اُس کے ساتھ ساتھ ساحل پر چلتا رہا۔ کچھ دُور جا کے
سڑک آ گئی۔ سڑک کے قریب اُس کی رفتار سست پڑ گئی۔ کہنے لگا: "یہ حق میں اچھا ہوگا
کہ کوئی بات ہو تو اُسے پہلے بتا دوں۔"
"کیا بتا دوں؟" میں نے ٹھنک کے کہا۔
"کوئی ایسا ویسا بات؟"
"تھانے ہی میں بتائیں گے۔" غیر ارادی طور پر میری آواز میں تلخی آ گئی۔ سڑک
کے ساتھ مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دھوپ سمٹتی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے
آگے کسی جگہ مجھے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے جانے کیا کچھ سمجھانے
اور یاد کرانے لگتا۔ میرے جی میں آئی کہ اُس کا گریبان پکڑ لوں مگر شاید وہ اس کے
بھی قابل نہیں تھا۔ تھانے کا فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا رہا۔ اب اگر وہ مجھے چھوڑتا بھی تو
میں نے طے کر لیا تھا کہ خود اُسے تھانے لے جاؤں گا۔ وہ نہیں جائے گا تو میں خود جا کے
اُس کے افسر سے بات کروں گا۔ افسر نے بھی بات نہ سُنی تو مجھے کچھ کرنا پڑے گا، چاہے
بعد میں کچھ بھی ہو۔ ایک بار انھیں کچھ معلوم کچھ محسوس تو ہونا چاہیے کہ یہ کوئی طریقہ
نہیں ہے۔ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ میرا قیاس
غلط نکلا۔ سڑک پار کر کے جو وہ میری طرف آئے تو مجھے تھانے کی عمارت نظر آنے لگی۔ وہ
مجھے واقعی تھانے لے جا رہا تھا۔ وہاں جا کے جواز کے طور پر اُسے کوئی نہ کوئی الزام تراشی
کرنی ہوگی۔ اس کے لیے مجھے خود کو آمادہ کرنا چاہیے۔ میرے پاس کیا ثبوت ہوگا۔
کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ تھانے والے میری بات
سُنیں گے یا میری رہائی؟ وہ شبے میں مجھے حوالات میں ڈال سکتے ہیں۔ ایک آدھ دو
دن نجل، ابا جان، پیڑ وغیرہ سبھی کو پریشانی ہوگی اور اگر پاڑے کے کسی آدمی سے
وہاں میری ملاقات ہو گئی تو؟ میں بھول رہا ہوں کہ میرا تعلق باقاعدہ پاڑے سے ہے۔
پاڑے کا آدمی تو پاڑے کا آدمی ہوتا ہے۔ اُسے تھانے سے دُور ہی رہنا چاہیے۔ میری جیب
میں اتفاق سے چاقو نہیں تھا۔ مجھے یہ معرفت میری ملاقاتی لیکن مجھے شناخت کر لینا
اُن کے لیے کیا مشکل ہے۔ بمبئی میں میں کوئی نیا نہیں ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میں
بھگے کے پاڑے کا باقاعدہ دادا رہ چکا ہوں، بالم خاں کے پاڑے کا بھی۔ وہ پرانی بات
ہو گئی تو اب بمبئی کے سب سے بڑے پاڑے سے تو میری نسبت ایسی ڈھکی چھپی نہیں
ہے۔ پاڑے کے آدمیوں کے علاوہ بہت سے پولیس والے بھی میرے صورت آشنا ہیں۔ پاڑے
کے حوالے سے نہیں تو کرشنا جی کے حوالے سے۔ کرشنا جی کی جان بچانے کے سلسلے

میں اور اُن کی موت کے وقت اخباروں میں میرا تذکرہ چھپا تھا اور بھی بہت سی باتیں
تھیں۔ ایک ذرا سا اشارہ ملنے کی دیر ہوگی۔ اگر وہ بھی مجھ پر کوئی فردِ جرم عائد کر سکے تو
میری موجودگی ہی اُن کے لیے کیا کم دل چسپی کا باعث ہوگی لیکن اب یہ سب کچھ بعد
از وقت تھا۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ بھاگنے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔
سڑک پر بھیڑ تھی اور تھانہ قریب تھا۔ مجھے سپاہی کے ساتھ اندر جانا تھا۔ پھر وہی
جگہ، وہی لوگ، وہی سب۔ میرا جسم ٹوٹنے لگا۔
مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ ہم تھانے کی عمارت سے دو ڈھائی سو قدم دُور
ہوں گے کہ دھاتی پہیوں کی رگڑ سنائی دی۔ کسی نے تیز رفتاری میں موٹر روکی تھی۔
میں نے اور سپاہی نے بیک وقت مڑ کے دیکھا۔ گاڑی تیزی سے الٹی ہوئی اور دوسرے
ہی لمحے ایک شخص دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ ڈاکٹر کیلاش تھا۔ سوٹ بوٹ میں
ملبوس وہ لپکتا ہوا سیدھا میری طرف آیا۔ "آپ؟" اُس نے تجسس و اشتیاق سے
پوچھا: "آپ یہاں کہاں؟"
"بس یوں ہی۔" میرے ہونٹوں پر کھلی ہوئی ہنسی اُسے پھیکی لگی ہوگی۔ اُس
نے اضطراب آمیز نظروں سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ میرے کپڑے پانی اور ریت سے خستہ
ہو گئے تھے۔ پھر اُس کی نظر سپاہی پر پڑی: "کیا بات ہے؟" وہ تشویش سے بولا۔
"کوئی خاص نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔
"یہ کون ہیں؟" وہ سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"یہ مجھے ذرا تھانے لے جا رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"آپ کو؟" وہ حیرانی سے بولا: "مگر کیوں؟"
"میں یہاں جوہو کے ساحل پر آرام کر رہا تھا۔"
"کیا بات ہے؟" اُس نے تحکمانہ آواز میں سپاہی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں، کچھ نہیں صاحب۔" سپاہی کے شانے سیدھے ہو گئے۔
"کچھ نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟" ڈاکٹر کیلاش نے برہمی سے کہا: "تم انھیں کیوں لے
جا رہے ہو؟ کس جرم میں؟"
"تھوڑا شک تھا صاحب، پر اب ایک دم نہیں ہے۔"
"کیا شک تھا تمھیں ان پر؟......"
"اگر صاحب پہلے ہی بول دیتا......" وہ کھسیانی ہوئی ہنسی سے بولا: "جانے دیجیے
صاحب۔ آپ کو ایسا تھانے لے جانے کا نہیں تھا۔ تھانے ایسا کون لے جاتا ہے۔ چھوڑ دیا۔"
"پھر یہ کیا ہے؟"
سپاہی آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ کس ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا کہ میں تو
صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اُدھر بیچ پر ایک لچا لفنگا ہوتا ہے، وہ صاحب کا
جگہ نہیں تھا۔ اُسے میرے سامنے ہونے کا بھی خیال نہ رہا۔ جتنی آسانی سے اُس نے مجھے
تھانے چلنے کا حکم دیا تھا، اُتنی ہی آسانی سے دست بردار بھی ہو گیا۔ میں اُسے دیکھتا
رہ گیا۔ ڈاکٹر کیلاش سے اُس کی کوئی جان پہچان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لگتا

تھا جیسے ڈاکٹر پولیس کا کوئی افسر ہو مگر افسری صرف تمکنت کی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر کیلاش تو اپنی افسری برتری کے تمام تر تمغوں تمام علامتوں کے ساتھ تھا۔ سپاہی کو اس کا اعتراف کر ہی لینا چاہیے تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ڈاکٹر کیلاش نے ترشی سے پوچھا۔

"گنپت رائے بولتے ہیں صاحب کو۔"

"اسی جوہو والے تھانے میں ہو تم؟"

"جی جی ہاں صاحب۔"

"ادھر انچارج راجندر بابو ہیں نا؟"

سپاہی نے اضطراری انداز میں سر ہلایا اور پھر ہکلانے لگا کہ اسے محض شک ہوا تھا۔ اس کا ارادہ مجھے تھانے لے جانے کا نہیں تھا۔ وہ چپکے چپکے سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ آگے ہماری کے ہوٹل میں صاحب کے ساتھ ایک پیالی چائے پیتا اور بس۔"

ڈاکٹر بگڑ گیا۔ "ایسے تمہیں کسی پر بھی شک ہو جاتا ہے۔ تمہاری آنکھیں نہیں ہیں کیا۔ یار حالی ہے۔ آدمی تمہاری ... نہیں ... کیا نظر آتا ہے۔" وہ مشتعل لہجے میں بولا۔ "تمہیں ان کے چہرے پر کیا نظر آتا ہے؟"

بس سپاہی کو معذرت کرتے ہی بن گیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور اس نے یہی بہتر جانا کہ جلد سے جلد ہمارے سامنے سے ہٹ جائے۔ چلتے چلتے وہ ہم دونوں کو سلام کرنا نہیں بھولا۔

"میرا خیال ہے تھانے چل کے انچارج راجندر بابو سے اس کی شکایت کرنا چاہیے۔" ڈاکٹر بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اپنے واقف کار ہیں اور بھلے آدمی ہیں۔"

"میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ ......"

"میں کیا پوچھتا ......" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ!" اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ آپ نے اس سے کچھ نہیں کہا ہوگا بھی تو ...... لیکن آپ گھر سے کیوں آ گئے؟ ابھی آپ کو وہیں رہنا چاہیے تھا۔"

"وہاں پڑے پڑے جی گھبرا گیا تھا۔"

"بے شک، بے شک۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "میں صبح مس جولین کے ہاں گیا تھا۔ معلوم ہوا اب آپ وہاں نہیں ہیں، بادا جان کے ساتھ چلے گئے۔"

وہ گزشتہ تین دن تک مسلسل جولین کے گھر آتا رہا تھا۔ اس رات بھی وہیں رہا تھا اور کاٹیج کو وداع کر کے ہمارے ساتھ ہی گھر آیا تھا۔ اب کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اس کا گھر یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں چلوں۔

"پھر کبھی سہی۔ اب دیر بہت ہو گئی ہے۔ صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں اور کہیں بھی نہ جا سکا۔ بس یہاں ساحل پر آیا۔ آ ہی جاتا ہوں۔ کچھ وقت نہیں گزر جاتا۔ پھر دیر کا احساس ہی نہیں۔"

"آپ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں آپ کو لے کے آ جاتا۔"

"پہلے سے کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"یہاں آ کے نہایت پرسکون جگہیں ہیں بہت حسین۔ کبھی چلیں گے۔"

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے اسے بتایا کہ جولین کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ وہ مصر ہو گیا کہ مجھے اپنی موٹر میں پہنچا کے آئے گا۔ میں نے بہت منع کیا لیکن اس نے موٹر کا دروازہ کھول دیا۔ پہلے اس نے مجھے بٹھایا پھر دروازہ بند کر کے دوسری طرف سے خود بیٹھ گیا۔ وہ اسی سمت جا رہا تھا جس طرف موٹر کا رخ تھا۔ میں نے تعرض نہیں کیا۔ چند منٹ بعد موٹر کوٹھیوں کے علاقے میں داخل ہو گئی اور ایک بھی نامی بڑی کوٹھی کے گرد ... کے پھیری کی۔ "گھر کے نزدیک آ کے آپ لوٹ جائیں یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔" وہ ... سے بولا۔ "ہم زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔ چائے پیتے ہی چل پڑیں گے۔" مجھے پھر اپنے گھر ... کا خیال آیا لیکن اب میں اس کے دالان کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ قدیم و جدید طرز کی دو منزلہ عمارت تھی۔ تعمیر ہوئے چند برس سال سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے۔ رنگ و روغن کو بھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ سبزہ ترشا ہوا تھا۔ پودے ترتیب سے لگے تھے اور رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ گیٹ کے گارڈ ... کے دستوں کے درمیان بنی ہوئی مختصر گزرگاہ میں ایک بھی خشک پتا نظر نہیں آیا۔ نہ کوئی تنکا۔ موٹر ٹھہرتے ہی ایک ملازم کسی جانب سے بھاگتا ہوا آیا مگر ڈاکٹر کیلاش نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ تیزی سے برآمدے پر چڑھ گیا۔ اندر جاتے ہوئے میرے قدم جھجک رہے تھے۔ وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ ڈرائنگ روم کی طرز کے ایک کمرے سے گزر کے ہم ایک نہایت کشادہ نشست گاہ میں آ گئے۔ اونچی چھتیں، بے نقش و نگار دیواریں۔ دیواروں پر کہیں کہیں مناظر کی تصویریں آویزاں۔ فرش کے بیچ میں قالین بچھا ہوا، چھت کے وسط میں فانوس لٹک رہا تھا۔ کم سامان کی وجہ سے کشادگی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہر چیز اس ترتیب سے رکھی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہو۔ وہاں سے ہٹائی گئی تو جگہ خالی ہو جائے گی۔ ایک طرف گھومتا ہوا کھلا زینہ اوپر کی منزل تک جاتا تھا۔ زینے کے آس پاس دو ... پودے تھے اور زینے کے ساتھ سنگ مرمر کا ایک قد آدم مجسمہ نصب تھا۔ ساڑی میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ۔ نیم وا آنکھیں، سر جھکا ہوا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ بدن کسی قدر خم کھایا اترایا ہوا سا۔ اسے کسی ماہر بت تراش نے تراشا تھا۔ سچ مچ کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ لگتا تھا مجسمہ ساز جان ڈالنا بھول گیا ہے۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس مجسمے پر نظر پڑتی تھی اور ایک ثانیے کے لیے نظریں ٹھٹک جاتی تھیں۔ اندر آتے ہی ڈاکٹر کیلاش چیخنے لگا۔ "رما! ارے رما! ... سب کدھر گئے؟"

مجھے ایک صوفے پر بٹھا کے وہ سامنے ایک دروازے سے اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ وہ بہت جھلایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ "کوئی بھی وقت نہیں ہے۔ مگر یقین ہے آپ نے ... کچھ بھی نہیں کھایا ہوگا۔ کیا لیجیے گا ... بے تکلف بتایئے اور کیا پیجیے گا۔ کافی، جوس، چائے یا کچھ اور ...... یہ جتنا میرا گھر ہے اتنا ہی آپ کا ......"

اس نے ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ دی تھیں کہ جواب دینا مشکل تھا۔ میں نے مختصراً کہا۔ "چائے پی لوں گا۔"

"نہیں نہیں، سچ بتایئے آپ نے دوپہر کا کھانا کھایا؟"

"نہیں کھایا مگر بھوک بالکل نہیں ہے۔"

یکایک وہ اوپر کی طرف دیکھ کے اچھلنے لگا۔ "ارے رما! رما! ادھر آؤ دیکھو کون آیا ہے۔" وہ انگریزی میں بولا۔ میری نگاہیں بھی زینے کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک نوجوان لڑکی تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ وہ عنابی رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی جس پر گلابی بڑے بڑے پھول کڑھے تھے۔ کھلتی ہوئی رنگت، چمکیلی آنکھیں، مسکراتا چہرہ، مناسب قد، متناسب بدن۔ میں یک لخت صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے گمان ہوا جیسے میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ ... میں اسے پہچان گیا کیونکہ بہت ... ساعتوں کی بات نہیں تھی۔ صرف چند لمحے۔ چند لمحوں میں زینے کے ساتھ نصب مجسمے میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ یقیناً اسی کا پیکر تھا۔ اس نے سر جھکا کے مجھے تعظیم دی۔ "یہ رما ہے میری چھوٹی بہن۔" ڈاکٹر کیلاش پر مسرت لہجے میں بولا۔ "گو یہ بعض عمر میں چھوٹی ہے اور رما، بتاؤ تو یہ کون ہیں؟ دیکھتے ہیں کتنی دیر میں تم انہیں پہچان پاتی ہو؟"

"تمہی بتاؤ نا۔" وہ مچل کے بولی۔

"تم انہیں اچھی طرح جانتی ہو۔"

رما کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ اس نے پلک جھپکنے کا توقف کیا ہوگا کہ اس کی کھنکتی آواز نشست گاہ میں گونجی۔ "ارے کہیں یہ ظہیر صاحب تو نہیں ہیں؟"

"دیکھا! دیکھا آپ نے!" ڈاکٹر کیلاش پر ہیجان سا طاری تھا۔ "اس نے آپ کو کیسے پہچان لیا!"

میں اسے تعجب سے تک رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا، ڈاکٹر کیلاش اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے اسپتال میں اپنا یہی نام ڈاکٹر کو بتایا تھا۔ کرشنا جی بھی مجھے اسی نام سے جانتے تھے اور کلکتہ جیل کے حکام اور قیدی بھی۔ اسی نام سے میں نے امتحانات دیے تھے۔ بابر کی طرح اب یہ نام بھی میری ذات کا جزو بن چکا تھا۔

رما کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایک ذہین لڑکی ہے۔ "ہاں یہ ظہیر صاحب ہیں، ظہیر بھائی۔ رما! اتفاق سے راستے میں مل گئے۔ بس قسمت سمجھو۔" ڈاکٹر کیلاش نے کہا اور تحکمانہ لہجے میں رما کو ہدایت کی کہ وہ جو کچھ گھر میں تیار ہے نکال لائے۔ "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" مجھ سے معذرت کر کے رما فوراً چلی گئی۔ ڈاکٹر کیلاش مجھے اس کے بارے میں بتانے لگا۔ "یہ ... بڑی نٹ کھٹ ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر ہے۔ گزشتہ سال ہی اس نے ڈگری لی ہے۔ اس کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ چیر پھاڑ کا مرحلہ آیا تو بھاگ گئی۔ بمشکل اسے کالج واپس بھیجا گیا۔ اس شرط پر کہ ڈاکٹری کی ڈگری لے لے گی مگر ڈاکٹری نہیں کرے گی۔ امتحان دے کے یہ گھر بیٹھ گئی۔ اس کے شوق مجسمہ سازی، مصوری، موسیقی، رقص، ستار تو یہ کمال کا بجاتی ہے۔ یہ مجسمہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے استاد گھوش جی نے بنایا ہے۔ ویسے اب یہ کام اچھا نہیں بناتی۔ گھوش جی کہتے ہیں کہ اب میں سکون سے مر سکوں گا کہ ایک شاگرد میری موجود ہے جو میرے کام کو آگے بڑھائے گی۔ مگر گھوش جی کو غلط فہمی ہے۔ یہ رما کسی ایک جگہ ٹکتی ہی نہیں۔ وہ تو پارا ہے۔ نہایت ضدی۔ کسی کام کا بیڑا اٹھا لے تو تمام کر کے ہی دم لے۔ چیلنج قبول کرنا اس کی عادت ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے لیکن بے پناہ ڈرپوک ہے۔ اب دیکھیے نا چیر پھاڑ ہی سے گھبرا گئی۔ ڈاکٹری یوں نہیں کرے گی کہ طرح طرح کے دکھی مریض جو آتے ہیں، مریض تو دکھی ہی ہوتے ہیں۔ بلا کی حاضر جواب، ازحد منہ پھٹ ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات اس کے منہ سے نکل جائے تو در گزر کر دیجیے گا۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولتا گیا پھر اسے کچھ خیال آیا۔ سر جھٹک کے بولا۔ "اوہ، میں تو بالکل ہی بے لگام ہو گیا۔ آپ بتائیں، کیا آپ تازہ دم ہونا چاہیں گے۔ میرے خیال میں منہ ہاتھ دھو لیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"رما سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا یہاں کوئی بھی آپ سے ناواقف نہیں ہے۔ ممی اور ڈیڈی بھی آپ کو جانتے ہیں۔ سو آپ کسی قسم کا تکلف مت کیجیے۔" میری جلد سمندر کی نمی سے چپک رہی تھی اور مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ کمرے سے ملحق غسل خانہ بھی تھا۔ میرے بال اور کپڑوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ مجھے نہانا چاہیے تھا لیکن اسے غسل ہی کہنا چاہیے، مجھے سر بھی دھونا پڑا۔ بال کاڑھ کے میں نے آئینے میں چہرہ دیکھا تو کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ باہر نشست گاہ میں کیلاش منتظر تھا۔ وہیں سامنے ایک طرف کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ یہ کھانے کا حصہ تھا۔ یہاں ایک بڑی میز لگی تھی۔ کیلاش مجھے اسی طرف لے آیا۔ ایک ملازم اور ملازمہ میز پر جلدی جلدی پلیٹیں، چھریاں اور کانٹے سجا رہے تھے۔ اسی لمحے رما اندر سے پکوڑوں کی قاب اٹھائے برآمد ہوئی۔ "بس آپ لوگ بیٹھ جائیے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"آپ بھی تو بیٹھیے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"میں بس ابھی آئی۔ پکوڑے اتنی دیر میں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔" وہ بہت مصروف نظر آتی تھی۔ تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"رما بہت کم چیزیں بنانا جانتی ہے لیکن جو بھی بناتی ہے اس کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔" ڈاکٹر کیلاش نے قاب میرے آگے رکھ دی۔ "اب شروع کیجیے۔ اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔"

مجھے واقعی بھوک نہیں تھی مگر گرم پکوڑوں کے دو ایک ٹکڑے میں نے لیے

بھوک جاگ سی اٹھی دیکھتے دیکھتے رُما اور ملازم نے مختلف قابوں سے میز بھر دی۔ چاٹ حلوہ مٹھائی پھل اور مشروبات وغیرہ۔

"ایک آدمی کے لیے اتنا اہتمام۔" میرے منہ پر آتے آتے رہ گیا کہ یہ غذا کی توہین ہے یا آدمی کی۔

"ایک آدمی کے لیے کیوں؟ ہم کیا خالی ہاتھ بیٹھے رہیں گے۔ ایسے موقع ملتے ہی کب ہیں، کیلی کے دوست ہی نہیں ہیں۔" کیلی سے اُس کی مراد کیلاش تھی، کہنے لگی۔ "دو چار شریف آدمی سال میں کبھی کبھار ان کے ساتھ آجاتے ہیں اور دوبارہ اُن کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔" اُس کی آواز میں چوڑیوں کی سی کھنک تھی، چولھے کے پاس کھڑے کھڑے اُس کا چمپئی رنگ کچھ سُرخی مائل ہو گیا تھا۔ چہرہ جل رہا تھا۔ اس اہتمام سے فارغ ہو کے وہ میرے پہلو کی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی اور سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگی۔ "کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے، واقعی بہت مزے دار۔"

"مجھے ہمیشہ شک ہوتا ہے۔"

"پرفیکشنسٹ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔"

"اوہ اوہ۔" وہ کھل کھلا پڑی۔ "میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ ممی مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں۔ آپ ان کے ہاتھ کا کھانا کھائیں تو اندازہ ہو گا کہ پکانا کسے کہتے ہیں۔ میں تو آدھا بھی نہیں جانتی۔ اچھا ہے وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔"

"آپ کی ممی تو پھر کمال ہی کرتی ہوں گی۔"

"آپ کو کون سے کھانے زیادہ پسند ہیں؟"

"مجھے!" مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "کچھ بھی جو اچھا پکا ہو اور اچھا نہ پکا ہو تو بھی جس سے پیٹ بھر جائے۔"

"بالکل۔" وہ اُچھل کے بولی۔ "آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کھانا تو نہایت ضمنی چیز ہے۔ زندگی میں اس سے زیادہ ضروری اور زیادہ خوش ذائقہ چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں صرف زبان کے ذائقے پر توجہ دی جاتی ہے۔ آنکھ کو، ناک کو، کان کو اور دماغ کو بھی غذا کی اور ذائقوں کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہم صرف کھانا جانتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"میں عموماً ٹھیک ہی کہتی ہوں۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "مگر یہ تو اپنے آپ سے۔"

"یہ بڑی کنجوسی نہ ہوئی؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں لیکن کیا کریں۔" اُس کے لہجے میں اور شگفتگی آگئی۔ "لوگ اس زیادتی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا نا، یہ ایسی ہی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر کیلاش بیچ میں بولا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"شکر ہے یہاں کوئی تو میرا ہم زبان ہے۔" وہ آنکھیں میچ کے بولی۔ "میں ان سے کہتی ہوں کہ پیمانوں اور باٹوں کے علاوہ بھی زندگی بہت کچھ ہے۔ پیمانوں اور باٹوں سے زندگی بسر کرنا جزوی طور پر زندہ رہنے کے مترادف ہے۔ یعنی تمام عمر ایک تماشا دیکھنے کے مترادف۔ مجھے لگتا ہے کہ آدمی وقتے کی زندگی زیادہ گزارتا ہے، اپنی کامل اور کھوجی ہوئی زندگی کم۔ وہ مستند اور آزمودہ پیمانوں کے سوا زندگی چھونے سے بھاگتا ہے بلکہ ڈرتا ہے اور یوں زندگی کی مجموعی آشنائی سے نا آسودہ رہتا ہے۔ زندگی تو بے حد حساب ہے۔ اُسے جتنا کریدیے کھودیے شاید اُتنے ہی حیرت ناک شعبے نمودار ہوں۔ میرا مطلب ہے کتنے ہیں جو پوری زندگی حصول کرتے ہیں۔ بر جہت زندگی۔ لوگ تو بس ایک حصے پر قناعت کر لیتے ہیں۔"

"مگر کبھی ایک ہی حصے سے مہلت نہیں ملتی۔" وہ چپ ہوئی تو میں نے سانس لے کے کہا۔ میری آواز بکھری ہوئی تھی۔ "زندگی بہت مختصر بہت تنگ بھی ہوتی ہے۔ آدمی ایک ہی جانب سے نہیں نکل پاتا۔ سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ سب آدمی کی قدرت میں کب ہوتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کیلاش کے ٹوکنے پر رک گئی۔ کیلاش نے چائے دانی کی طرف اشارہ کیا جو مجھے رکھے ٹھنڈی ہو رہی ہو گی۔ کیلاش نے بُرا کیا۔ وہ نہایت اچھی باتیں کر رہی تھی۔ کچے پکے منہ سے پکی پکی باتیں۔ اُس کے لہجے میں ایسا انکسار تھا جس سے مخاطب کو شرمندگی ہونے لگے۔ نہ ایسی نخوت جو سماعت پر بار گزرے۔ کبھی تند تیز کبھی نرم و لطیف رُواں دواں کھنکتی چھلکتی ہوئی باتیں۔ چائے بناتے ہوئے اُس نے مجھ سے شکر کے لیے پوچھا تو میں نے دو چمچے بتائے۔ وہ اپنے بھائی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔

"صحت مند آدمی کو اتنی ہی شکر لینی چاہیے۔" ڈاکٹر کیلاش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر مجھے کیوں منع کرتے ہو؟"

"تم موٹی ہو جاؤ گی۔ خوب صورت لڑکی کا موٹا ہو جانا سمجھو کہ اُس کی ہلاکت ہے۔"

میرے جی میں آیا لطفِ کلام کے لیے سہی یہ کہوں کہ آپ کو شیرینی کی کیا ضرورت ہے لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"کیلی، خدا کے لیے۔" وہ ناراضی سے بولی۔ مصنوعی سی ناراضی سے۔ "میں تو کئی بار آئینہ دیکھتی ہوں۔"

"وہی آئینہ ہو گا۔" کیلاش نے شوخی سے کہا۔

"میں بھی تو ویسی ہوں۔"

"آئینوں کا کیا ہے آئینے اگر سچ بولا کرتے تو آدمی کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوتا۔" کیلاش میری جانب تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ آئینوں کی نہیں، خود آدمی کی کجی ہے۔" رُما نے سنجیدگی سے کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھنے لگی۔ "کیوں ظہیر صاحب؟ آپ بتائیں؟"

"میں میں کیا بتاؤں۔" میری آواز چرانے لگی۔ "شاید کچھ یہی ہے۔ آئینے تو شاید سچ ہی بولتے ہیں مگر ایک بے اثر بے مزہ سچ۔ یہ تو دیکھنے اور سننے والے پر ہے کہ اُس میں سچ قبول کرنے اُس کا سامنا کرنے کا کتنا حوصلہ ہے۔" مجھے اپنی بات میں کچھ ابہام محسوس ہوا تو میں نے کہا۔ "آئینہ تو سچ ہی بولتا ہو گا مگر تشریح غالباً ہم نہیں کر پاتے۔ سچ اثبات میں ہے تو بھی خوش ہوتا ہے اور یقین نہیں آتا۔ نفی میں ہے تو بھی مانتا نہیں جھوٹ کا گمان ہوتا ہے تو بھی یقین نہیں آتا اور آئینے کا یہ ہے کہ وہ تو عکس جلوہ نما ہے۔ اُسے دلیل و حجت نہیں آتی۔ تیر میں کا آمیزہ جو ہے۔ تاہم آئینے کا کوئی اشارہ اثبات میں ہے تو یہ ایک دل خوش کن بات ہے۔ آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "لیکن ظاہری خوب صورتی ہے جو میرے نزدیک ایک سراب ہے۔ ہر ایسا کمال جو اپنا حاصل کیا ہوا نہیں ہے اُس پر افتخار محض دل بہلاوا ہے۔ طویل قامت شخص کو خود کو ممتاز سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آدمی کو اُنھی خوبیوں پر ناز کرنا چاہیے جو اُس نے خود اختیار کی ہوں، خود پیدا کی ہوں اپنے بل بوتے پر۔ جسمانی ریاضتوں کے بعد کوئی اپنے مسٹ بازو ڈھالتا ہے تو یقیناً اُس کے لیے وجہ افتخار ہے۔ میرے نزدیک خوبی صرف اکتسابی ہوتی ہے اور ظاہری خوبیاں تو بہت ناپائدار ہوتی ہیں۔"

"آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اکتسابی خوبیاں کی پائداری کی کیا ضمانت ہے۔"

"ہاں نہیں ہے۔" وہ شائستگی سے بولی۔ "مگر جب تک بھی رہیں، ظاہری خوبیوں سے افضل ہوتی ہیں۔ وہ احساس ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں خوب صورتی ایک طرح کی امیری ہے۔" ڈاکٹر کیلاش تیزی سے بولا۔ "جیسے کچھ لوگ موروثی طور پر امیر ہوتے ہیں۔"

"مگر اُس دولت کی لذت ہی کچھ اور ہو گی جو خود حاصل کی جائے۔"

"لیکن ضائع تو وہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔" وہ اُداس ہو گئی۔ "ہاں اور شاید اُس کے چلے جانے کا دکھ زیادہ ہو، زیادہ ہونا چاہیے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اُس پر اطراد نہ کریں اُس کے لیے کوشش نہ کریں اور ضائع تو آخر سبھی چیزیں ہو جاتی ہیں۔"

"اور آپ نے غور نہیں کیا۔" میں نے اپنا لہجہ استوار رکھنے کی کوشش کی۔ "صرف ظاہری خوبیاں ہی ودیعت کی ہوئی نہیں ہوتیں باطنی بھی ہو سکتی ہیں۔ اچھے ملنسار خوش طبیعی آدمی خلقی طور پر بھی تو نرم و نازک اور سخت و درشت ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق آپ کیا کہیں گی؟"

"وہی جو ظاہری خوبیوں کے متعلق۔" اُس نے ہچکچاتی آواز میں کہا۔ "وہ بھی ہماری اپنی نہیں میراث اور ترکہ ہیں۔"

"لیکن وہ موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "اُن کا ہونا اُن کے نہ ہونے سے بہتر ہے پھر ہم کیا کریں؟"

"انھیں ہم اور پالش کریں۔"

"مگر اُن کا ہونا کیا ہمارے لیے باعث طمانیت نہیں؟ خود اپنا یا اپنے کسی عزیز کی برتری کا میابی ہمیں کیسا سرشار کرتی ہے، ہمارے لیے عزت و افتخار کا باعث ہوتی ہے۔"

"کبھی حسد کا۔" وہ چہک کے بولی۔

"گویا کوئی ردعمل ضرور ہوتا ہے، منفی ہو یا مثبت۔ ہوتا ہے نا؟" میری سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں جہاں ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔

"ہاں ہاں ہوتا ہے مگر آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ اُلجھے لہجے میں بولی۔ "فطری خوبیاں چاہے اپنی ہوں یا دوسروں کی وہ ان کے متعلق ہمارا ردعمل جیسا بھی ہو، طمانیت آمیز یا نفرت زدہ، اُن پر فخر و مباہات یا نفرت بے وقار بے جا ہوتا ہے۔ لیے جا ہے ہماری ذات یا ہمارے کسی عزیز کی ذات کا حصہ ضرور رہیں مگر ہماری وضع کردہ نہیں۔ ہاں، میری مراد تو کچھ اور ہے کہ خوبی صرف اکتسابی ہوتی ہے۔"

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے خود پر حیرت سی ہوئی کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس کیوں نہیں کہ میں پہلی بار اس گھر میں آیا ہوں اور ایک ایسی لڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں جسے آج سے پہلے میں نے نہیں دیکھا۔ جانے میری زبان سے کیا اول فول نکلتا رہا۔ اگرچہ لڑکی کم عمری کے باوجود اُس میں حوصلے کی کمی معلوم نہیں ہوتی تاہم میرا ذرا سا نامحرم وار لہجہ اُسے ملتفت کر سکتا ہے۔ میں اُسے کیا جتانا اور خود کو کیا باور کرانا چاہتا ہوں لیکن میرا قصور نہیں تھا

دلوں اُن سے میرے بھی متعلق باتیں کرتا رہا ہے۔ میرے ہی متعلق نہیں ہو لیں شہزادہ
چھایا بیگم، جمیل اور پریزیمی کے متعلق۔ اُس کی ماں اور چھوٹی بہن کسی عزیز کے ہاں تقریب
میں گئی ہوئی تھیں۔ انھیں اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر میں مجھے اس گھرانے کے
متعلق بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کیلاش کا ایک چھوٹا بھائی شملے میں تعلیم حاصل کر
رہا تھا۔ باپ عرصے سے لندن میں مقیم تھا۔ باپ کے ذکر پر رسما کے لہجے میں ایک حقارت
سی شامل تھی۔ زمینوں اور جاگیروں کی اچھی آمدنی تھی اور ان دونوں بہن بھائی کے
بقول دولت نے انھیں ایسی سہولت نہیں دی تھی۔ دونوں از خود یہ سب کچھ بتاتے رہے۔ مجھے
بھی جواباً کچھ کہنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے اسی لیے پہل کی تھی لیکن میں نے ابھی
زبان بند رکھی اور رات ہو گئی۔ کیلاش کی ایک بار گھڑی پر نظر گئی تو وہ چونک اُٹھا۔
اُسے رات کی ڈیوٹی پر اسپتال جانا تھا۔ "آج چھٹی کر لو۔ بوٹ کلب چلتے ہیں وہیں
جا کے ڈنر کریں گے۔" رسما نے مچلتے انداز میں اپنے بھائی سے کہا
"ظہیر بھائی اگر تیار ہوں۔۔۔۔"
"آج نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا، "پھر کسی دن سہی۔"
"آج ہی کیوں نہیں؟" وہ نازآفریں لہجے میں بولی۔ "کل کا کیا، آپ کو اس قدر
یقین ہے، جو آج مل رہا ہے اُسے آنے والے مبہم کل کی صولت پر کیوں چھوڑا جائے۔
مجھے کل پر ہمیشہ شبہ ہوتا ہے۔ کل محض ایک گمان ہے۔"
"آنے والا ہر لمحہ بھی تو ایک گمان ہے، آنے والے کل کے مانند۔" میں نے کہا۔
وہ چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رک گئی اور اُس کی آنکھوں میں ستارے سے
چمکے اور ماند پڑتے رہے۔ "بے شک۔" کچھ توقف کے بعد وہ تمتماتی آواز میں بولی۔ "ہر آنے
والا لمحہ کل کے مانند ہے لیکن یہ موجود لمحے جو نوازش پر مائل نظر آتے ہیں، سنتے ہیں
کسی خاص صورت حال سے بھی مشروط ہوتے ہیں۔ اگر سب کچھ یہی ہے تو شاید ان کا
تسلسل نہ ٹوٹے۔ کل تک یہ دنیا ہم سے جانے کیا کیا برتاؤ کرے۔ سو ہم اسے اس کل پر تج
ہی کیوں دیں۔ ہم یہ تسلسل ہی کیوں توڑیں۔ کل کی دوری آنے والے لمحے کی نسبت
بڑی ہے اور گویا زیادہ بڑا اندھیرا ہے۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ تیزی سے کہنے
لگی۔ "کیا آپ کبھی بوٹ کلب گئے ہیں؟" میں نے انکار میں سر ہلایا، اُس کی آواز
اور پارا ہو گئی۔ "کیلی سے پوچھیے کیسی خواب ناک جگہ ہے۔ رات کے وقت تو اور فسوں گر۔
سمندر کا کنارہ اور لہروں کا اندھا شور۔ کشتیوں کی مرتعش روشنیوں سے لگتا ہے پانی
میں جگہ جگہ جھینگے سے تڑپ رہے ہوں، جیسے پانی میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔ جھومتے ناچتے
گاتے ہوئے لوگ۔ خوش نظر، خوش لقب، ہنسنے اور کلفتیں بھلانے کے لیے آتے ہیں۔ کشتی
میں بیٹھ کے دور تک نکل جائیے اور لہروں کا جھولا جھولتے رہیے۔"
"میں تصور کر سکتا ہوں۔" میں نے خوش اطواری سے کہا۔
"آپ پیتے ہیں؟"
"جی؟" میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ "جی نہیں، بالکل نہیں۔"
"مجھے یقین تھا۔" وہ بے ساختگی سے بولی۔ "پھر آپ کا نشہ بھی خاص ہوگا۔

شراب ایک نقلی نشہ ہے۔ مصنوعی شراب رنگین عینک ہے۔ مدہوشی میں کسی نظارے کے
حقیقی رنگوں سے کوئی کیا اخذ کر سکتا ہے اور کس درجے تک محسوس کر سکتا ہے۔ شراب
تو جھوٹ ہے، اپنے آپ سے جھوٹ بولنے، اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش۔ مجھے شراب
پیتے ہوئے لوگ کبھی اچھے نہیں لگتے، مجھے اُن پر ترس آتا ہے۔ ہوش زندگی کا سب سے
بڑا جوہر ہے۔ مدہوشی زندگی مختصر کرنے کے مترادف ہے، جزوی خودکشی۔"
"تم کچھ زیادہ انتہا پسند ہوتی جا رہی ہو۔" کیلاش نے کسی قدر تلملاتے
ہوئے کہا۔ "تم نے کبھی شراب پی ہے؟"
"پی ہے ایک بار نہیں، تین چار بار۔"
"تم نے؟" وہ تعجب سے بولا۔ "میرے علم میں نہیں۔"
"تمھارے علم میں آنا ضروری نہیں تھا۔ تم اتنے سراسیمہ کیوں ہو رہے ہو؟ کیا
صرف مردوں کو اس کی اجازت ہے۔ مغرب میں چار سال تک تم کیا شاپنگ کرتے رہے؟"
"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" کیلاش کی آواز کھنچنے لگی۔
"کیا میں نے کچھ نہیں کہا ہے؟" وہ معصومیت سے بولی۔
"ظہیر بھائی کیا سوچیں گے؟"
"نہیں۔" میں نے کسمسا کے کہا۔ "میں بھلا کیا سوچوں گا۔"
"وہ ایک بالغ نظر نوجوان ہیں۔ وہ کیا سوچتے۔ میں نے کچھ نازوا تو نہیں کہا؟"
"قطعاً نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تو آپ نے بھی شراب پی؟"
"ہاں، تین چار بار۔"
"اور کیا محسوس کیا؟"
"میں نے جاننا چاہا تھا کہ یہ چیز کیا ہے۔ دوسری، تیسری، چوتھی بار میں نے
محض اپنے تجربے کی توثیق کے لیے پی حالانکہ تجربہ ہر بار یکساں تھا۔ میں نے یہ امرت
حلق سے اتارا تو جانا کہ میں بے وزن ہو گئی ہوں۔ میرا وجود زمین کی کشش کا ایسا پابند
نہیں رہا اور میری آنکھیں، میں نے دیکھا کہ میری بینائی میری گرفت سے نکل گئی ہے
یا اس کے دائرے میں آنے والی چیزیں اپنی ساخت اور رنگت بدل چکی ہیں۔ مجھے عجیب
سا لگا کہ یہ تو تجربہ ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں سمندر میں کود پڑوں، ناچنا شروع کر دوں، خوب
گاؤں اور خوب روؤں۔ مجھے اپنی کسی کیفیت پر اختیار نہیں رہا۔ میرا فیصلہ ہی مجھ سے
چھن گیا۔ آدمی کی اس سے بڑی بے بسی کیا ہو سکتی ہے۔ میں شراب کو کوئی برائی نہیں
سمجھتی لیکن یہ ایک فضول چیز ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ شراب میں نشہ ہوتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے
تو زندگی میں اس سے کہیں تیز اور پائدار نشے ہیں۔ یہ تو نیند کی گولی کے مانند ہے، ساختہ
نشہ، دوا کے مانند۔"
ڈاکٹر کیلاش اُس کے خاموش ہو جانے کا منتظر تھا۔ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی
گھڑی دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔ "تمھارے بیان میں تمھاری خواہش، تمھارے اندر کا
کوئی استفاع، کوئی اکراہ شامل ہے اور۔۔۔۔"
"میں اپنی ہی بات کر رہی ہوں۔"

"اتنی آسانی سے فیصلے صادر نہیں کیے جاتے۔ ساری خارجی چیزیں تقریباً تمام
کی تمام ساختہ ہوتی ہیں، ساختہ آسودگی والی، غذا، لباس اور بہت سی چیزیں۔ بہر حال
وقت کم ہے۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "تم کلب جانے کو کہہ رہی تھیں؟"
"ہاں ہاں، میں تو بہک ہی گئی۔"
"بن پیے بہک گئیں۔"
"دیکھا تم نے! میں یہی کہہ رہی تھی۔ بن پیے بھی کچھ کم نشے نہیں ہوتے ظہیر صاحب!
اگر آپ ہاں میں جواب دیتے تو مجھے دکھ ہوتا۔ میں نے یوں ہی اپنے اندازے کی تصدیق
کے لیے آپ سے پوچھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔ تاہم کلب میں شراب کے
علاوہ بھی دلکشی شامل ہیں۔ تیراکی، بلیرڈ، برج، رقص اور موسیقی۔۔۔ آپ چلیں
گے ہیں نا۔۔۔۔؟"
"ضرور چلتا مگر ایسا ہے کہ میں کسی سے کہہ کے نہیں آیا تھا۔ سب فکر مند ہوں گے
اور یہ میرا لباس بھی کلب کے لیے شاید موزوں نہ ہو۔" میری ان تاویلات کے باوجود
وہ اصرار کرتی رہی اور کلب کے رنگوں اور روشنیوں کا احوال خوابیدہ لہجے میں بیان
کرتی رہی۔ اب میرے پاس ایک ہی جواز باقی رہ گیا تھا۔ میں نے اُس سے کہا، "یقیناً
یہ ایک دلکش صحبت ہوگی لیکن اس وقت میری طبیعت آمادہ نہیں ہے۔"
"جی کو منانے ہی کے لیے تو چل رہے ہیں۔"
کیلاش نے تنبیہی انداز میں اُسے ٹوکا، "ابھی یہ کس طرح مناسب ہے؟" اُس
نے لہجے میں کاٹنے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ محجوب ہو گئی، خجل خجل سی۔ "مجھے افسوس
ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔ "مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ یہ سب کتنا بے محل ہے۔ اس
سانحے کو گزرے چوتھا دن ہے۔ آپ پر تو بہت بوجھ ہوگا۔ تبھی تو کیلی نے کئی بار آپ سے
ہاں جانے کے لیے کہا۔ میں نے دو بار تو نے بھی لیکن کیلی نے روک دیا، جانے کیوں۔"
وہ تاسف کا اظہار کرتی رہی۔
"آپ بہت گہرے دوست تھے نا؟" اکبر نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا اور
جواب میں لفظ میرے حلق میں اٹک کے رہ گئے تھے۔
"کیلی نے بتایا تھا۔" اُس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ "کیلی نے
بتایا تھا وہ کیسے مضبوط تھے۔ ہو سکتا ہی ہے کہ بڑی آندھی ہوتی ہے، کیسی عجیب بات
ہے، آدمی نے ساری دنیا پر غلبہ پا لیا ہے اپنے آپ پر نہ پا سکا۔ کیسے کیسے زندہ لوگ دیکھتے
دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی سے کچھ بھی کہے، موت کسی کو رعایت نہیں دیتی۔ میں
ہمیشہ موت کے گھر سے بھاگتی ہوں بلکہ موت کے گھر میں رہنے والوں سے، اُن کی صورتیں
نہیں دیکھی جاتیں۔ اُن کے پاس جا کے گونگے پن کا احساس ہوتا ہے۔ لفظوں کی کم مائیگی
کا گلہ بھی ان سے بہت دل گرفتہ ہے۔ صبح ورنگ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا، آج
بھی خود سنبھلا سنبھلا نظر آ رہا ہے۔ کیلی کے سوا ہم میں سے کسی نے جانے والے کو نہیں دیکھا
تھا لیکن مجھے بھی کو بہت رنج ہے۔"
میں سنتا رہا، کیا کہتا۔

کہنے لگی۔ "تمام راستے موت کی طرف جاتے ہیں۔ کبھی کوئی جلدی منزل پر پہنچ جاتا
ہے، کبھی کسی کو دیر لگ جاتی ہے لیکن منزل سب کی ایک ہے۔"
"تمام راستے جب موت کی طرف جاتے ہیں تو لوگ طویل راستے کیوں منتخب کرتے
ہیں؟" میں نے شوخی بھری آواز میں کہا۔
"ہاں!" وہ چونک سی پڑی اور رنجیدہ ہونٹوں سے بولی۔ "آپ نے کیسی نکتہ خیز
بات کہی ہے۔ یقیناً، پھر طویل راستہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"
ڈاکٹر کیلاش کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے لباس کی تبدیلی کے
لیے چند منٹ کی اجازت مانگی۔ اُس کے جانے کے بعد میں اور رسما اکیلے رہ گئے۔ دیر تک
وہ نگاہیں جھکائے جھکائے کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔
"یہاں آ کے اچھا لگا۔ جی کچھ ہلکا ہوا۔" میں نے اُس کے چہرے کی دھند دور کرنے
کی کوشش کی۔ "اتنی دیر میں سب کچھ بھولا سا رہا۔"
"بھلانے کی کوشش کیجیے۔ زندہ آدمیوں کے پاس اس کے سوا کیا چارہ ہے
کہ رخصت ہونے والوں کو بھلا دیں۔ اچھا ہوا آپ یہاں آ گئے۔ اس گھر میں شاید آپ کو کچھ سکون
ملے۔ تبدیلی بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔ یہاں آ جایا کیجیے، اپنا ہی گھر جان کے، کیلی کے
بغیر بھی۔ یہ ایک رسمی سی بات ہے لیکن میں برتنا رسم نہیں کہہ رہی۔ میں اپنے لفظوں
میں گم نہیں کرتی۔ میں سمجھتی ہوں یہ بھی ایک طرح کی منافقت ہے۔ سچ یہی ہے
کہ آپ کو دیکھ کے، آپ سے مل کے ایک طمانیت کا سا احساس ہوا ہے، کچھ حاصل کرنے کی خوشی۔
جب بھی آپ کا جی گھبرائے بے تکلف یہاں چلے آئیے۔ ایسے آئیں گے تو مجھے بہت
خوشی ہوگی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ گھر اور گھروں سے مختلف ہے۔ یہاں کے
مکیں ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے ہیں، ہر دم ایک دوسرے کے کام آنے کے لیے
بے قرار لیکن اپنی ذات، اپنی آزادی کی قیمت پر نہیں۔ میری گزارش ہے کہ آئندہ کیلی
کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے ہی حوالے اچھے لگتے ہیں۔"
"جی۔" میں نے مختصر آواز میں کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔"
"اور ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کی شناخت میں ایک وقت ہی صرف ہو۔
مرحلہ وار شناخت کا وقت کے ربط سے، غیر ضروری فاصلے مٹا کے بھی ایک دوسرے
کے متعلق اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"
"جی، جی ہاں۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کے کہا۔
"میں نہیں جانتی کہ آپ کے کس کام آ سکتی ہوں۔"
"آپ کا اتنا کہنا ہی بہت ہے۔"
"بہت بالکل نہیں ہے۔ میں عمل پر یقین رکھتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے
کسی کام ضرور آ سکتی ہوں، ایک اچھے دوست کے طور پر۔"
"جی ہاں، یہ میرے لیے باعث عزت ہوگا۔"
"میری بات کا شاید آپ کو یقین نہیں آیا؟"
"نہیں، نہیں، آپ نے کیسے سمجھ لیا؟"

"یقین آتا تو آپ کی زبان سے یہ واقعی جملے ادا ہوتے۔"

"مگر سچ بھی تو یہی ہے۔"

"خیر" وہ مسکرانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی مسلسل روشنی۔ اُس کی دُبلی دُبلی آنکھیں لیے بھی ہر لمحے کسی حیرانی سے دوچار رہتی تھیں اب کچھ اور حیران نظر آ رہی تھیں۔ تمام رنگوں کے باوجود اُس کے سراپا میں کوئی اضطراب سا چھپا ہوا تھا کچھ جاننے کی جستجو کچھ کھو جانے کا ہیجان وہ مسلسل انگریزی میں بات کرتی رہی تھی شائستہ اور رواں انگریزی میں۔ اُس کے لہجے میں انگریزوں جیسی فصاحت تھی میری انگریزی میں اُس جیسی روانی تو نہیں تھی لیکن مجھے لفظ ڈھونڈنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کرشنا جی کے ساتھ اتنے دن رہ کے میری جھجک دُور ہو گئی تھی۔ جیل میں بھی سونیا کو پڑھانے کے دوران بیشتر بات انگریزی میں ہوتی تھی۔

کیلاش نے زیادہ دیر نہیں لگائی وہ سرمئی سوٹ میں کچھ اور وجیہ لگ رہا تھا۔ "میری بہن نے آپ کو ستایا تو نہیں؟" وہ شگفتگی سے بولا۔

"یہ ان کی خوبی نہیں معلوم ہوتی۔"

"کبھی یہ بہت بے لگام ہو جاتی ہے۔ میں ممی سے کہتا ہوں کہ اب اس کی شادی کر دو۔"

رما کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "آپ اندازہ کر لیجیے کہ بے لگام کون ہے۔" وہ چیختی آواز میں بولی۔

ڈاکٹر کیلاش کو جلدی تھی رما ہمیں باہر تک چھوڑنے آئی اور آخر تک افسوس کرتی رہی کہ اُس کی ماں اور بہن کو میری آمد کی اطلاع جن کے بہت ملال ہو گا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تھا وہ میرے دروازے پر چلی آئی اور کہنے لگی۔ "دیکھیے اب آپ آتے رہیں گے۔" اُس کے لہجے میں بہت کچھ شامل تھا ؎

کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی حسرت تھی حکم تھا تقاضا تھا

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک خوش گوار تجربے کی خاطر.....۔" وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ کیلاش نے گاڑی چلا دی۔ دروازے تک اُس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ کیلاش کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی کیلاش زور زور سے ہنستا رہا۔

میں پاڑے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن اگر میں کیلاش سے کہتا تو وہ درمیان میں کہیں مجھے اُترنے کے لیے تیار نہ ہوتا اُسے پاڑے کی علامت کہتے جانا ابھی مناسب نہیں تھا چنانچہ ہم جولین کے گھر آ گئے۔ کیلاش کی ڈیوٹی کا وقت ہو رہا تھا لیکن جولین اور شہلا کے اصرار پر وہ اندر چلا آیا اور کوئی آدھ گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ مارتی بھی موجود تھا۔ کسی نے کبھی مجھ سے کہا تھا کہ اصل موت تو زندوں کو بھگتنی پڑتی ہے مرنے والا مر کے تمام ہو جاتا ہے تمام احساس و شعور کے ساتھ اُسے کون جا کے بتائے کہ اُس کے پیچھے کس کس کی آنکھوں میں آگ جلی کس کس کے سینے سے دھواں اُٹھتا ہے۔ یہ تو موت سے بڑی اذیت ہے۔ وہاں سب اُجڑے اُجڑے سے لگ رہے تھے جیسے موت ابھی ابھی گھر میں جھپٹ رہی ہو۔ صبح سے وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ پاڑے سے بھی سائیں ان کوئی نہیں آیا تھا۔ میرا آنا اچھا ہی ہوا۔ اُن کے کھوئے کھوئے اُترے ہوئے رنگ واپس آنے لگے کیلاش کافی پی کے چلا گیا۔ اُن سب کی دل دہی کے لیے میں نے اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ ایک مجھی کو نہیں اُنھیں بھی تو میری کسی پرسش کی ضرورت تھی۔ سب مجھ کے ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے بیٹھے رہے۔ مجھے اُن کے درمیان سے اُٹھنا نہیں چاہیے تھا لیکن اُدھر آبا جان پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اُن کے خیال سے مجھے اُٹھنا پڑا۔ انھی کی بہر سے اُنھوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میں اُنھیں پہلے بتا چکا تھا کہ میں سویرے گھر سے نکل کر آیا ہوا تھا۔ مارتی بھی میرے ساتھ آ گیا۔ پہلی بار وہ آبا جان کے گھر آیا تھا۔ آ کے بہت خوش ہوا۔ جیسے مارتی اکبر اور خادم کو اوٹ پٹانگ قصے سنا کے انھیں ہنساتا رہا۔ چائے کے بعد ہم پاڑے کی طرف نکل گئے۔

وہاں پیر نہیں تھا۔ فضل معلوم ہوا کہ پرسوں شام وہ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ پھر پلٹ کے نہیں لوٹے ہیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ آخر پیر اپنے گھر چلا گیا تھا اپنی بیٹی اور بیوی کے پاس۔ اُسے دیکھ کے اُن کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا ہو گا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ پیر اُن کے لیے دوبارہ زندہ ہو کے آیا ہے۔ پیر کے گھر کا پتہ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آ رہا تھا یہاں پاڑے میں ایک یا دو ایک کے سوا شاید ہی کسی کو اس بابت کچھ معلوم ہو۔ ایسی صورت میں کسی سے پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ پیر نے اپنے گھر کو پاڑے سے بالکل دُور رکھا تھا ہر اعتبار سے دُور۔ دو ایک آدمیوں کو چھوڑ کے شاید ہی کوئی پوری طرح جانتا ہو کہ پیر کا ایک گھر بھی ہے۔ گھروں جیسا ایک گھر۔ اُس کی بیوی اُن سے بنی ایک لڑکی اور ایک باوقار وضع دار بیوی ہے۔ جب میں اُس کے گھر گیا تھا تو لڑکی کالج میں پڑھتی تھی اب تو اور آگے بڑھ گئی ہو گی۔ پیر ہر شب دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے پڑ رہتا تھا ہفتے میں دو ایک راتوں کے لیے یا کسی ایک دن کے لیے وہ گھر کا رُخ کرتا تھا۔ جیل کے دنوں کے سوا اُس کا یہی معمول تھا۔ اپنے علاقے کے علاوہ بمبئی کے کئی اور دولت مند سیٹھوں سے بھی اُس کے خصوصی مراسم تھے۔ پاڑے کے آدمی پاڑے سے اُس کی غیر حاضری کا یہی تاثر لیتے تھے کہ آج کی رات یا آج کے دن وہ کسی سیٹھ کے ہاں عیش و عشرت میں مصروف ہو گا۔ کسی کو اُس کے ان معمولات میں پُر اسراریت کی ضرورت تھی نہ جرأت۔ پیر نے پُر اسراریت ہی کے خیال سے یہ احتیاط کی تھی۔ اُدھر کا بھی پاڑے پر ٹھہرا رہتا تھا۔ پہلی بار جب پیر مجھے اور فضل کو اپنے گھر لے گیا تھا تو پہلے وہ ایک سیٹھ کے ہاں گیا تھا نیچے اُس کی بڑی دکان تھی اُوپر گھر تھا۔ وہیں پیر کی موٹر کھڑی تھی۔ ممکن ہے یہ موٹر اُس کے سیٹھ دوست کی ہو۔ موٹر میں بٹھا کے وہ ہمیں کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقے میں ایک بڑے مکان میں لے گیا تھا جہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا اور ملازموں کے لیے الگ کمرے بھی۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کے بہت تعجب ہوا تھا۔ گھر کی حفاظت کے لیے مسلح ملازم تعینات تھے پیر نے مختلف آدمی ہی رکھے ہوں گے۔ اُس کی بیوی ایک صاحب حیثیت پارسی خاندان کی لڑکی تھی

پیر کے کہنے کے مطابق زندگی میں اُس نے روشنی ہی روشنی دیکھی تھی، روشنی اور پھول۔ پیر کے لیے وہ سب کچھ چھوڑ کے چلی آئی تھی۔ پیر نے بھی اُس کے لیے ایک چھوٹا سا تاج محل بنا دیا تھا۔ کسی گھر میں خوشی ہو تو وہ تاج محل سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

دوپہر تک میں پاڑے میں بیٹھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ پورے دو دن ہو گئے تھے اب اُسے پاڑے آ جانا چاہیے تھا۔ یہاں اور بہت سے لوگ بھی اُس کے منتظر تھے پاڑے کے وہی معمولات تھے۔ وہی لوگ وہی باتیں۔ دوسرے علاقوں کے دادائوں کے پولیس کے اور جیل کے چرچے۔ کہاں کہاں وارداتیں ہوئیں اور کون چاقو بار بیٹھا۔ کلکتے کی کون سی ورائٹی والی نے بمبئی کا رُخ کیا ہے۔ پاڑے کے عقب میں کھلی جگہ اور ٹین کے سائبان میں جسمانی کرتب جاری تھے۔ تم باری، پٹا، لاٹھی، چاقو زنی اور تن سازی کے مشاغل۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب لوگ گھروں سے جیسے رُوٹھ کے آئے تھے یا کہیں کچھ لُٹا کے آئے تھے۔ شامو اور جیرو مجھ سے لپٹ گئے کہنے لگے کہ اُن کا دل اس شہر میں بالکل نہیں لگ رہا ہے اتنا وہ لڑنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ کلکتے کے بغیر انھیں سب کچھ سُونا سُونا لگ رہا ہے۔ وہ آخر کلکتے کے بہت قریب تھے ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا تھا جو اتنے قریب نہیں تھے انھی کو لگ گیا تھا، بھیا، نرود، وغیرہ اُن کے چہروں پر بھی خاک اُڑ رہی تھی۔ انھیں دیکھ کے پاڑے کے دوسرے آدمیوں پر بھی وحشت طاری تھی۔ آدمی کو دیکھ کے آدمی کھلتا ہے یا مرجھا جاتا ہے۔ نرود تو بھرا بیٹھا تھا کلکتے کا نام آیا تو وہ میرے سینے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے اُسے تسلی دینا چاہا لیکن میرے پاس فضل کے چند جملوں کے سوا کیا دھرا تھا۔ وہی جو اُن سے سب ایک دوسرے سے بولتے تھے۔ نرود رو دھو کے خود ہی چپ ہو گیا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب جارجی بھی آ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے پیر کے آنے تک مجھے گھیر کے بیٹھ لیے۔ مجھے اُس کے اِس طرزِ عمل پر حیرت بھی ہوئی، ندامت بھی۔ بھی نے پیر کی جگہ مجھے بٹھا دیا تھا اور جارجی نے مجھے یہی سمجھ لیا تھا کہ پاڑے پر پیر کی نیابت اب میں کر رہا ہوں۔ جارجی بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھ سے وہ کلکتے کی تعریف کرنے لگا اور شکایتی لہجے میں بولا کہ یہاں کسی نے اُسے گھر کا پتہ بتایا ہی نہیں ورنہ کلکتے کو یہ دن کرنے ضرور آتا۔ مجھ سے اُس کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ یہی چند دن پہلے اُسے تھوڑا بہت جانا بوجھا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے درمیان کوئی دوری ہی نہ ہو۔ وہ اس بات کی معذرت کرنے لگا جب پیر، فضل اور میں اُس کے ہوٹل گئے تھے۔ بولا کہ اُسے ہوش ہی نہیں تھا میں اور فضل استاد پہلی بار اُس کے ہاں آئے تھے اور وہ ہماری کوئی خاطر نہ کر سکا۔ "اب سوچتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی دُور جا چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں اپنوں غیروں کی پہچان اندھیرے اجالے کی تمیز کھو چکی تھیں۔" کہنے لگا کہ وہ جو کچھ بھی ہے پیر دادا کی وجہ سے ہے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس کے قدم بہکتے گئے۔ پیر دادا اگر بروقت نہ آ جاتا تو وہ نہ جانے کتنی دُور چلا جاتا۔ پیر نے ہی اُسے یہ بتا رکھا کہ اب ہوٹل میں عورتوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ گو اس حال کا کاروبار آدھا رہ گیا ہے لیکن اُسے کوئی غم نہیں۔ ابھی نے چپکے سے اس کی تصدیق کی کہ پاڑے کے آدمی جا کے گن گن لیتے ہیں۔ اب ان کے بعد سے کوئی عورت ہوٹل میں نہیں آئی ہے یہاں تک کہ جارجی نے اپنی بیوی ماری کو بھی کاؤنٹر سے ہٹا دیا ہے حالانکہ اب جارجی ایک ہی صورت میں ہوٹل چلا سکتا ہے کہ وہ شراب اور جوئے کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں گاہکوں کو فراہم کرے۔

میں نے ہرچند کوئی رائے زنی نہیں کی تھی مگر معلوم نہیں جارجی میرے سامنے یہ صفائیاں کیوں پیش کر رہا تھا۔ شاید خجالت کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ میں چپ رہا تو وہ عاجزی سے بولا "اُس کی بیوی ماری کی آرزو ہے کہ فضل اور میں کسی دن پیر دادا کے ساتھ اُس کے گھر آئیں اور ماری کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھائیں۔" میں نے کہا "ہاں کیوں نہیں ضرور آئیں گے۔" میرے بارے میں اُسے بہت سی معلومات تھیں کہ میں نے پیچھے پرانے استاد کا پاڑا کس طرح حاصل کیا تھا۔ بمبئی کے ایک بڑے دادا تیواڑی کے خاتمے کا سبب بھی وہ مجھی کو ٹھہرا رہا تھا۔ میں نے تردید کی کہ اُس میں تو سبھی کا ہاتھ تھا۔ کہنے لگا "لیکن بنیاد تو میں ہی تھا۔" میں اس بات سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ "اپن کا سن کر آپ نے کبھی اپنے راجا کے چاقو کا بل آنکھ سے دیکھے۔ لوگ بانگ بولتا ہے، بجلی ہے کہ جادو ہے۔" ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو لیکن وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اُس کے لہجے میں اشتیاق بھرا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے پیش کش کی کہ بمبئی میں کسی قسم کا بھی کام ہو میں اُسے بے تکلف بتا دوں۔ میں مُسکرا کے اور ایک بار اُسے آزما کے تو دیکھوں۔ کہنے لگا کہ بمبئی تو ایک تہہ خانہ ہے ایک بھول بھلیاں۔ ذرا تو کچھ نہیں ہوتا آدمی ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی اُس کے ساتھ تو بمبئی کے ان تہہ خانوں میں چلوں شاید میرے لیے اس انکشاف میں بہت کچھ نیا اور انوکھا ہو۔ ابھی اُسے ہوٹل کھولے کتنے مہینے ہوئے ہیں لیکن اتنے عرصے میں جو کچھ اُس نے دیکھا ہے وہ عمر بھر نہیں دیکھ پایا تھا۔ باہر سے جو اُجلے مکان نظر آتے ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ ان کے اندر کتنا اندھیرا بھرا ہوا ہے اور یہی حال مکینوں کا ہے۔ وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کیسے کیسے تابندہ چہرے جن کی لوگ پوجا کریں اتنے ارزاں بکتے ہیں۔

اُسے ہر طرف بازار ہی بازار نظر آتا تھا۔ اُس کا اعتبار ہی ختم ہو گیا تھا۔ مجھے قدموں کے آدمی کا تو گھوم جانے۔ جارجی میری خاموشی کو میرا تجسس سمجھ رہا تھا مجھے طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ آدمی مروت میں بھی تو خوشامد قبول کر لیتا ہے۔ اُسے کچھ یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں پیر دادا کے یہاں اُس کی موثر سفارش ثابت ہو سکتا ہوں۔ میں نے اشارۃً اُسے باور کرانا چاہا کہ پاڑے پر آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ اُس کی حد سے زیادہ خجالت سے مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی بلکہ گھٹن بھی۔

ڈھائی بجے دسترخوان بچھایا گیا تب کہیں وہ میرے پاس سے ہٹا۔ کھانے میں آتی دیر پیر کے انتظار میں کی گئی تھی۔ کھانے کے بعد بھی وہ نہیں آیا۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی۔ فضل تو خیریت سے ہے؟ کہیں پیر کے گھر جا کے وہ کچھ رُک گیا ہو۔ پاڑے کا نہیں تو اُن دونوں کو آبا جان اور جولین وغیرہ کا تو خیال ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں اُدھی کی طرف نہ نکل گئے ہوں۔ سوا تین بجے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مارتی، شامو اور جیرو بھی میرے ساتھ اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ پیر کے گھر جانے کا تھا۔ مگر انھیں میں کیسے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ یوں روکنا بھی مناسب نہیں تھا لیکن اِدھر اُدھر کا کوئی عذر کرنے کے بجائے میں نے صاف صاف اُن سے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔ ابھی پاڑے سے پیر ہی شام کو کسی وقت میں ہی واپس

آجاؤں گا۔ رات بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے احتیاطاً اُن سے کہہ دیا۔ وہ سب بھی اتنے بھولے نادان ہوتے تھے کہ کسی نے مجھ سے حجت نہیں کی۔

دھوپ اترتی جا رہی تھی۔ میں اندازے سے فاصلہ طے کرتا رہا۔ کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج تھا۔ مجھے کام بھی کون سا تھا۔ رات کو گھر ہی پہنچنا تھا۔ اُس وقت تک میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ پیسے میری جیب میں تھے۔ بس تھوڑی بہت نشانیاں مجھے یاد رہ گئی تھیں۔ وہی ذہن میں لیے کہ میں ایک سڑک سے دوسری سڑک تک پیدل فاصلہ طے کرتا رہا۔ آگے میں نے ٹرم روک لی لیکن مجھے الجھن ہونے لگی۔ ہر جگہ پر راستے کی نشان دہی کرنے میں مجھے دیر لگتی تھی۔ ٹرم ٹرم والا جلد ہی گھبرا گیا۔ جہاں تھوڑی ہی دور چلا کہ میں اُتر گیا اور اُتر کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو بے سمت پا ہو گیا تھا۔ میری لگام بھی جیسے کوچوان کے ہاتھ میں تھی۔ پیدل آدمی راستوں میں شامل ہو کے چلتا ہے اور یہی بات تھی کہ پیدل آدمی اپنے ساتھ چل رہا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا۔ طرح طرح کے خیال طرح طرح کے وہم و گمان میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا تجمل کی حالت اگر ذرا بھی خراب ہوئی تو میں اُسے فیض آباد جانے کا مشورہ دوں گا۔ وہ یہاں ہاتو کا تذکرہ کرتے ستا رہے گا۔ سنائے گا تو وہاں بھی۔ اُس کا نقش تو تجمل سے مٹائے نہ مٹے گا۔ کاتنے تو اُس کی عادت تھا۔ اُس کا سایہ۔ کاتنے کو وہ ایسے کس طرح بھول سکتا تھا مگر فیض آباد میں زرین ہو تو شاید۔ زرین اُسے اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتی۔ اُس کے سامنے تجمل بے بس سا ہو جاتا ہے۔ زرین کے علاوہ وہاں جہاں گیر ہے۔ نیاں ہے۔ استاد جا مو کلکتے سے آسکتا ہے۔ فیض آباد کے اور بہت لوگ ہیں۔ موت پر عزیز شاید اس لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو گمان دیتے رہیں کہ ابھی اور بھی باقی ہیں۔ ایک کے چلے جانے سے سب نہیں مر گئے۔ جگہ کی تبدیلی بھی دوا کا کام کرتی ہے۔ یہاں بمبئی میں بھی کئی گھر ہیں لیکن سفر کا احساس بھی کچھ کم بوجھ نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے ٹھکانے ہی پر ٹھیک طرح جسم کھولتا اور پھیلاتا ہے۔

میں خود سے سوال کرتا، خود کو جواب دیتا رہا۔ لیکن ابھی وہ فیض آباد بھی تو نہیں جا سکتا۔ کوئی بھی اُسے یوں نہیں جانے دے گا۔ نہ آبا جان، نہ جولین، نہ پیرزادہ اور ابھی تو خانم کا معاملہ بیچ میں ہے۔ کیا ضروری ہے کہ خانم نواب خانم تاک کے چالیسویں کے بعد ہی یہاں سے آئے۔ پہلے بھی تو آ سکتی ہے اور پہلے بھی تو اُس کا دل گھبرا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ہمیں درمیان میں بھی اس کی خیر خبر رکھنی چاہیے۔ جانے وہ کس حال میں ہو۔ نواب لوگوں کا کیا بھروسا۔ ہمارے جانے کے بعد معلوم نہیں اُن کا رویہ کیسا ہو۔ خانم نے وہاں ٹھہر جانے کا فیصلہ کر کے شاید غلطی ہی کی ہے۔ تیچروں کے دیوانے راجا نواب خانم کو بھی تو اپنا ہدف بنا سکتے ہیں۔ خانم کی شکل میں ہمارا ایک آدمی تو ابھی وہاں موجود ہی ہے۔ ہمارا سراغ لگانے اور ہمارے بارے میں حقائق جاننے کے لیے وہ اُسے مجبور کر سکتے ہیں۔ خانم بہت تجربہ کار اور ہوشمند عورت ہے لیکن ایک اکیلی عورت کب تک مزاحمت کرتی رہے گی۔ تجمل، پیرزادہ اور آبا جان نے اس بات پر ضرور سوچا ہو گا۔ گو اندر زنان خانے تک باہر کے کسی آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔ بڑے نواب کو بیرون وغیرہ سے ایسی رغبت معلوم نہیں ہوتی۔ ابھی بھائی کا زخم بھی تازہ ہے۔ اُس کی طبیعت ویسے بھی اس طرح کی طرف پر مائل نہ ہو گی۔ خانم کے سلسلے میں اتنی مروت تو اُس کے دل میں ہو گی ہی کہ وہ اُس کے گزشتہ سوتیلے بھائی کی مسیحائی کے لیے اپنا گھر منتشر کر کے آئی ہے۔ اُس کا بھائی زندہ نہ رہ سکا مگر اُسے ایک آسودہ موت تو نصیب ہوئی۔ اُس کی روح تو اب ایسی بے چین نہ ہو گی۔ خانم کسی افتاد کی صورت میں گھِرتی تو ادھر سب بھی اُس کی پشت پناہ ہوں گی۔ اُن کی موجودگی میں خانم کو محفوظ سمجھنا چاہیے۔ نواب زادی ہونے کے باوجود اُن میں وہ نخوت نہیں ہے۔ وہ تو خود شیشے کے مانند ہیں۔ خانم کو تماشا بنتے نہیں دیکھتی رہیں گی۔

ہاجی نے مجھے بتایا تھا کہ حیدرآباد سے ہمارے تعاقب میں سفر کرنے والے دونوں آدمیوں کو اُس نے بالاخانے پر بند کر رکھا ہے۔ وہ بالاخانے کی اوپری منزل میں قید ہیں۔ انھیں چھوڑ دیا جاتا لیکن کاتنے کی موت کے بعد ہاجی نے فیصلہ بدل دیا۔ ہاجی نے کاتنے کی لاش پر عزم کیا تھا کہ اب وہ اُن دونوں کو اُس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک حیدرآباد میں آبا جان کی حویلی پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک ایک کو چن کے ختم نہیں کر دے گا جن کی غضب ناکی کا کاتنے نشانہ بن گیا تھا۔ ہاجی ارادے کا اتنا ہی پکا تھا لیکن ریاست حیدرآباد شہر جیسلمیر کے راجا مہتاب کی حویلی نہیں ہے جس میں ایک اندھیری رات میں پھلانگ کے وہ اور پیرزادہ داخل ہو گئے تھے اور تجمل کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے راجا مہتاب کی آنکھیں نکال لائے تھے۔ حیدرآباد میں قدم قدم پر ایک سے ایک راجا مہتاب ہے اور جیسلمیر سے آٹھ گنی دس گنی بڑی سیکڑوں حویلیاں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔ ہاجی کو کیا اندازہ تھا کہ حیدرآباد سے ہمارا لوٹ آنا کسی زنداں سے نجات کے برابر ہی نہیں دوبارہ جنم لینے کے مترادف بھی ہے۔ بالاخانے میں مقید اُن دو آدمیوں نے حجت تمام کرنے کے بعد نواب حشمت جنگ کی طرف اشارہ کیا تھا مگر ابھی تک یہ لازم نہیں ہے کہ آبا جان کی حویلی میں آنے والے وہ مسلح آدمی بھی اُسی کی طرف سے بھیجے گئے ہوں جیسا کہ وہ کہہ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اُن کا مقصد ہمارے تعاقب کے سوا واقعی کچھ اور نہ ہو۔ انھیں بہ سرعت یہی حکم دیا گیا ہو گا کہ وہ ہمارے بارے میں پورا اطمینان کر کے آجائیں کہ ہم کون ہیں اور کہاں کے رہنے والے رئیس ہیں جو ایک نادر مسیحا کسی جان پہچان کسی رشتے حوالے کے بغیر ایک نواب کو پیش کرتے ہیں۔ اس جود و سخا کے پیچھے ہمارا کوئی اور مقصد تو نہیں۔ نواب کے معتمدین نے اُسے مشورہ دیا ہو گا کہ از روئے احتیاط ہمارے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جائیں تو کسی نازک وقت کام ہی آئیں گی۔ بالاخانے میں ہمارے قبضے میں موجود وہ دو آدمی اور ریل میں نقاب پوش اور اُس کے "خاوند" کا کوئی باہمی ربط ضبط معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دونوں نے اپنے آقاؤں کے مختلف نام بتائے تھے۔ اُن برقعیوں نے نواب قطب الدین کا نام لیا تھا۔ گویا وہ کوئی اور نواب بھی ہو سکتا ہے جس نے آبا جان کی حویلی میں نقب زنی کرائی تھی لیکن اگر وہ نواب حشمت جنگ ہی ہے تو بڑے نواب کی حویلی کا زنان خانہ اُس کی دسترس سے دور نہیں۔ پھر تو خانم کا اُس کی زد پر آنا طے ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خانم ہمارے بارے میں زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دے گی۔

میں نے تمام تنکے کانٹے اپنے سر سے جھٹک دینے چاہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر بھی کیا کر سکتے ہیں۔ کاتنے کو رخصت ہوئے ابھی پانچواں دن ہے۔ حیدرآباد سے ہمیں چلے ہوئے دس دن کے قریب ہو رہے ہیں۔ اِن دس دنوں میں فراغت کا کتنا وقت ہمیں ملا ہے!

شاید وہ خانم کو زر خرید کنیز یا ایک عورت سمجھ کے اُسے معاف کر دیں۔ پہلے نواب حشمت جنگ کو اپنے آدمیوں کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے جو ابھی تک ہماری تحویل میں ہیں۔ اب بہت سوچ سمجھ کے ہی انھیں حیدرآباد کا رخ کرنا پڑے گا۔ خانم کے لیے وہاں جانا تو بہ صورت پڑے گا۔ چلتی ریل میں ہم نے جن آدمیوں کو زمین پر اتار دیا تھا، وہ بھی اب اپنے آقا کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ اُن کے آقا کو اب پہلے سے زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے۔ ہماری طرف سے کسی جوابی اقدام کا خطرہ بھی اپنے سر پر منڈلاتا محسوس کرنا چاہیے۔ گو امکان یہی ہے کہ اُس کے واپس جانے والے نمک خوار اُس نے اپنی جان کی امان کے لیے اُس پر حقیقت آشکار کرنے سے گریز کیا ہو گا کہ وہ ہمیں اپنے بھیجنے والے کا نام پتہ بتا کے آئے ہیں لیکن اگر انھوں نے ریل میں اپنے ساتھ بیتی ہوئی داستان کا ایک حصہ بھی گوش گزار کیا ہے تو باقی سب کچھ جہاں دیدہ نواب قطب الدین کو خود اخذ کر لینا چاہیے کہ ہاتھ میں آجانے کے بعد ہم نے اُن کے رئیس نواب کا پورا نام پتہ سارا شجرہ جانے بغیر انھیں نہیں چھوڑا ہو گا۔ سب تحقیق کر لینے کے بعد انھیں یوں چھوڑ دینے کی فیاضی سے مراد نواب کے لیے ہماری جانب سے ایک تنبیہ ہی ہونی چاہیے۔ کسی حساس طبع اور نکتہ بیں شخص کے لیے ایک جارحانہ تنبیہ۔ سو اگر وہ کوئی قطب الدین علی تھا تو اپنے آدمیوں کی ناکام واپسی اور اُن سے سفر کا احوال سُن کے اُس کی نیندیں ضرور اچاٹ ہو گئی ہوں گی۔

میں بہت دور آ چکا تھا۔ نہ وقت کا احساس ہوا نہ فاصلے کا اور نہ تھکن کا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ کئی بار یہ جی میں آئی کہ لوٹ چلوں۔ اندھیرا ہو جانے پر نشانیاں بھی اندھی ہو جائیں گی مگر اتنی دور آ جانے کے بعد واپس جانے کو بھی دل نہیں مانتا تھا۔ شام کے وقت سڑکوں پر بھیڑ بھی بڑھ گئی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گھوم پھر کے مجھے پھر اُسی جگہ آنا پڑا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی اور اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا لیکن میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا کوٹھیوں اور بنگلوں کے ایک علاقے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر گلیوں میں چلتے میری رفتار تیز ہو گئی اور میرا شبہ ہر اگلے قدم پر بڑھتا گیا کہ اب پیرو کا مکان دور نہیں ہے۔ پندرہ منٹ ادھر کی گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد آخر میں اُس کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ جانے کیوں مجھے کوئی بڑی منزل سر کر لینے کا سا سکون ملا۔ میں اگر پیرو کا پڑوسی سے پتہ پوچھ لیتا تو یہ دشواری پیش نہ آتی۔ دروازے پر ایک مستعد دربان موجود تھا۔ بالوں سے پیچھے تک گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی۔ وہ سر سے پیر تک متجسس نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے دھڑکتی آواز میں اُسے بتایا کہ مجھے پیرزادے سے ملنا ہے۔

"ابھی کیدے سے آیا ہے صاحب؟" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

"اندر جا کے بولو کہ راجا آیا ہے۔" میں نے اُس کی ترش نگاہی نظر انداز کر دی۔ نوکری کے لیے اُس کا رویہ یہی ہونا چاہیے تھا۔

مجھے چھوڑ کے وہ اندر چلا گیا لیکن دروازہ جیسے ہی کھلا کابڈر کے ساتھ بنے ہوئے چبوترے پر کھڑی ہوئی لڑکی نے مجھے دیکھ لیا۔ "کون ہے؟ کون ہے؟" اُس نے لپکتا ہوا اپنی طرف بڑھتے ہوئے دربان سے پوچھا۔ دربان نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پہلے تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی رہیں پھر ایک دم وہ جوش سے کود پڑی۔ "ارے آپ!" اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "آپ کب آئے؟"

وہ گیتا تھی۔ اُسے پہچاننے میں مجھے چند لمحوں کا تامل ہوا۔ وہ خاصی بدلی ہوئی تھی۔ پہلے سے بڑی معلوم ہو رہی تھی۔ لمبی اور تیکھی۔ اتنا عرصہ درمیان میں نہیں گزرا تھا جتنا اُس کے سراپے سے لگ رہا تھا۔ رنگت بھی بدل گئی تھی۔ بادامی رنگ اور گہرا ہو گیا تھا جیسے اُس میں سونا مل گیا ہو۔ نہایت متجسس شربتی آنکھیں، ترشے ہوئے رسیلے ہونٹ۔ لمبی سی چٹیا کمر پہ لٹک رہی تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑی اور ساڑی پر عنابی واسکٹ پہنے وہ سراپا ایک اور لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ ایک مضطرب اور اپنے آپ سے بے خبر سی لڑکی۔ تیور میں اضطراب آمیز شائستگی، نفاست آمیز اضطراب۔ مجھے دیکھ کے اُس کا وہی حال ہوا جو کسی بہت قریبی عزیز کی اچانک آمد پر ہوتا ہے۔ میرے آنے کا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو اور میرے آنے کی خوشی کے اظہار کا انداز بھی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ لگ رہا تھا کہ پیرو اُسے مسلسل میرے بارے میں بتاتا رہا ہے۔ وہ اچانک سے چلانے لگی "پاپا! پاپا! دیکھیے کون آیا ہے۔" اور مجھے یہیں چھوڑ کے وہ سرپٹ اندر کی طرف لپکی۔ پھر اُسے کچھ خیال آیا۔ فوراً پلٹ پڑی۔ "آئیے آئیے! اندر آئیے۔"

میں نے اندر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ اُس نے بے چینی سے پوچھا۔ "اکیلے آئے ہیں؟"

مجھے ایک لمحے کو تعجب ہوا لیکن پھر میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ پیرزادے نے فرخ فرلال کے بارے میں اُسے بتایا ہو گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو صرف میں ہی..."

اُس نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ "سویرے سے میں سوچ رہی تھی شاید آج آپ آجائیں۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "آپ ٹھیک سے ہیں؟"

"ہاں ہاں بالکل ٹھیک۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیا میں کچھ بدلا ہوا لگ رہا ہوں؟"

"نہیں، بالکل ہی آپ میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

"تم کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اور ممی کیسی ہیں؟"

"اُن کی طبیعت اچھی نہیں تھی لیکن اب پہلے سے بہت اچھی ہیں۔" اُس کی آواز چہک رہی تھی۔

"پیرو بھائی کے آنے سے تو تم بہت خوش ہو گی۔"

اُس کی آنکھیں چمک گئیں۔ "ہاں!" وہ سرشاری سے بولی۔ "پاپا جب سے آئے ہیں لگتا ہے یہ گھر زندہ ہو گیا ہے۔ ایسے اُکھڑے دن بھی تو بہت گزار دیے تھے۔"

جیل میں پیرو کو کبھی اتنے دن نہیں لگے ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ کیوں کہ اس سے پہلے پیرو کو تب اور حیدرآباد میں بڑی جیلوں سے واسطہ کب پڑا تھا۔

گیتا کی آواز اندر پہنچ گئی تھی اور تیز قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ دوسرے ہی لمحے پیرو میرے سامنے تھا۔ "ہاں راجا؟" وہ اچھل کے بولا۔ "تم کیسا! ابھی کیدے سے آ گیا؟" اُس نے پوری طاقت سے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زمین سے اُٹھا کے گھومنے لگا۔ گیتا کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ "کیسا ہے بھائی اب ٹھیک تو ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو چلو اندر چلو۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا اور زور سے آوازیں لگانے لگا: "اے تجمل بھائی! تجمل بھائی! دیکھ تو کون آیا ہے۔ ایدر اپنا راجا آیا ہے۔"

میری کمر میں ہاتھ ڈال کے تقریباً دھکیلتا ہوا وہ ایک کشادہ اور روشن کمرے میں لے آیا۔ سامنے چوکی پر تجمل گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی لیکن روشنی میں تو خال و خط اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ صاف لگتا تھا کہ یہ کچی روشنی ہے۔ اندر جسم میں بہت اندھیرا بھرا ہوا ہے۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت کمرے میں اس کے یوں پڑے رہنے سے سب ظاہر تھا۔ میں اس کے پاس جا کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "کیسے آ گیا رے؟" اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس آ گیا، راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

"دادا وہ پھر جانے کو بولتے تھے پر سوچا اب سویرے ہی نکلیں گے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ میں جو سوچ کے آیا تھا ارادہ کرتے کرتے رہ گیا۔ یہ گھر بھی زندگی کی حویلی سے کیا کم تھا۔ میری طرح گیتا تجمل کے بائیں جانب اس کے پہلو سے لگ کے بیٹھ گئی تھی کسی بچی کے مانند جو ٹکر ٹکر دیکھتی بڑوں کی باتیں سنتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر میں پیرو کی بیوی رانی بھی آ گئی۔ اپنے گھر میں آدمی کو اس سے زیادہ کون سی کشادگی اور طمانیت مل سکتی ہے جو یہاں تھی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا تجمل یہاں عرصے سے مقیم ہے۔ مجھ سے پھر یہی کہا گیا کہ فرخ، فریال نے صبح چلتے وقت اصرار کیا تھا کہ میں تجمل کو گھر ہی لے آؤں۔ ابا جان نے بھی یہی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہاں گیتا اور اس کی ماں کسی طور فرخ، فریال اور جولین سے کم اس کی نگہدار نہیں تھیں۔ پیرو کی بیوی رانی کی نگاہوں میں تجمل کے لیے وہی عزت اور پذیرائی تھی جو کسی آنکھ میں ممکن ہے۔ پیرو کو ان دو دنوں میں کتنا وقت ملا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ وابستگی صرف دو دنوں کی تاکید و تلقین کا حاصل نہیں تھی۔ جنت کے سفر کے لیے تجمل کی طلبی پر کلکتے آنے سے پہلے ہی پیرو نے ہمارے بارے میں ان سے بہت کچھ کہا ہو گا، کہتا رہا ہو گا۔

پیرو کی بیوی رانی جسے تجمل کو بھائی جی کے لقب سے مخاطب کرتے سن کر میں نے بھی یہی کہنا شروع کیا تھا، مجھ سے فرخ، فریال کے متعلق پوچھنے لگی اور وہی سوال کیا جو جولین نے مجھ سے کیا تھا کہ اتنے زمانے بعد ان سے مل کے مجھے کیسا لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی میں ان سے پوری طرح ملا ہی کہاں ہوں۔ کلکتے نے مہلت ہی نہیں دی۔ موت آ تو وہ ساتھ لے کے آیا تھا۔ اس پہلی رات کے سوا ان سے ٹھکانے سے بات ہی کتنی ہو پائی ہے۔ کلکتے کے نام پر وہ افسردہ ہو گئی اور خاموش بھی۔ پیرو اور اس کی بیوی کے درمیان دوستوں کا سا تعلق تھا۔ لگتا تھا پیرو اس سے کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ سبھی کچھ شاید اسے معلوم تھا لیکن گیتا کے چہرے کی سادگی بتا رہی تھی کہ وہ بہت سی باتوں سے بے خبر ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا باپ بمبئی کے کتنے باڑوں کا دادا ہے اور باڑا کیا، باڑے کا دادا کون ہوتا ہے۔ اسے کوئی بتاتا تو پھر وہ ضرور پوچھتی کہ آخر اس کے باپ کو باڑے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ یہ حویلی تو نہیں تھی لیکن اس گھر میں سبھی کچھ تھا۔ کشادہ اور ہوادار کمرے، باغیچہ، طرح طرح کا ساز و سامان، آرائش کی چیزیں، کھڑکیوں اور دروازوں پر رنگ برنگے پردے، خوش نشست کا ایک کمرہ، ایک کمرے میں صوفے، کرسیاں اور کھانے کی میز لگی ہوئی۔ جگہ جگہ گلدان، بے داغ دیواریں، خدمت گار، ایک باوقار معاملہ فہم اور پڑھی لکھی بیوی، ٹھہر ٹھہر کے بات کرنے والی، آواز میں گونج، لہجے میں گداز، تیکھے نقش و نگار، شہابی رنگ، اجلی اجلی سی، اپنے نام کی نسبت سے وہ کسی رانی ہی کی طرح تھی۔ اور ایک بیٹی جیسی کسی بڑی گڑیا سے مشابہ، جوانی کے بغیر تھرکتی پھرکتی ہوئی گڑیا، پھولوں کی طرح نازک، شیشے کی طرح صاف شفاف جیسے ریشم سے اور روشنی سے بنی ہو۔ کسی گھر میں اس سے زیادہ اور کیا ہونا چاہیے۔ ان سب کے ہوتے پیرو کو باڑے کی کیا ضرورت ہے۔ باڑے اور اس گھر میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ پیرو کو یہاں آ کے تو بہت مشکل پیش آتی ہو گی، باہر باڑے میں جا کے۔ یہاں تو ریشم ہی ریشم ہے۔ باڑے میں ہر طرف خنجر تنے رہتے ہیں، لاٹھیاں، بلم۔ کسی راوی کی زندگی اور موت کے درمیان بس ایک چاقو کا فاصلہ ہوتا ہے۔ میں نے سوچا، کبھی پیرو سے بات کروں گا، وہ باڑے کیوں جاتا ہے۔ اگر باڑے سے مراد گھر چلانے کے لیے کسی معقول آمدنی کا حصول ہے تو پیرو تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے بازوؤں میں طاقت ہے، اس کی آنکھیں بینائی سے بھری ہوئی ہیں اور اس کے کان دور افتادہ آوازیں اپنی طرف کھینچ لینے پر قادر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میرے پاس کرشنا جی کی چھوڑی ہوئی بہت بڑی رقم پڑی ہے۔ آٹھ لاکھ روپے کے برابر۔ اب تک تو بینک میں رکھے رکھے اور بڑھ گئی ہو گی۔ وہ میری رقم ہے۔ اگر پیرو مجھ پر اپنا حق سمجھتا ہے تو اسے انکار نہیں کرنا چاہیے مگر شاید یہ بات نہیں تھی۔ ایک بار کوئی باڑے سے وابستہ ہو جاتا ہے تو باڑا اسے مشکل سے چھوڑتا ہے۔ باڑا آدمی میں رچ بس جاتا ہے۔ پیرو کی وابستگی تو ابتدا سے ہے اور یہ بات تو کتنی ہی بار اس کی بیوی رانی نے بھی کہی ہو گی۔ معلوم نہیں پیرو اسے کیا جواب دیتا رہا ہے۔ ایک بار میں بھی اس سے پوچھوں گا ضرور۔ ممکن ہے پیرو کے پاس کوئی بہت بڑا جواز ہو جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

گیتا مجھے اپنی مختصر سی مطالعہ گاہ میں لے گئی۔ جہاں نصاب کی کتابوں کے علاوہ سو ڈیڑھ سو کے قریب انگریزی ناول الماری میں سجے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں طبلہ رکھا تھا اور ہارمونیم بھی اور میز پر طرح طرح کی بانسریاں۔ میرے پوچھنے پر اس نے شرمیلی آنکھوں سے بتایا کہ اسے رقص اور موسیقی کا شوق ہوا تھا۔ باقاعدہ ایک استاد سکھانے آتے تھے۔ کتنی ماہ کی تربیت کے بعد استاد کا کہیں تبادلہ ہو گیا۔ دوبارہ اسے ڈھنگ کا استاد نہ مل سکا۔ پھر اس کا شوق ماند پڑ گیا۔ کبھی کبھی اس کے بقول وہ خود ہی الٹا سیدھا بجا لیتی ہے۔ ان تینوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرے لیے کیا کریں۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سب نے مل کے ہی کھانا کھایا اور پیرو مجھے بتاتا رہا کہ گیتا کی ماں نے کیا پکایا ہے اور گیتا نے کیا۔ پیرو کی بیوی مجھ سے پوچھنے لگی کہ مجھے کون سے کھانے زیادہ پسند ہیں۔ بے اختیار میں نے تجمل کی طرف دیکھ کے کہا: "پتلی دال اور خشکا۔" جیل کے سات سالوں میں یہ شیریں غذا

ملتی رہی تھی۔ میرے جواب پر وہ بھی تیزی سے مسکرائی۔ وہ سمجھ گئی ہو گی کہ میری مراد کیا ہے۔ البتہ گیتا پلکیں پٹ پٹاتی رہی۔ دس بجے کے قریب میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو وہ دونوں مجھے روکنے لگیں۔ میرا خود بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تجمل کی حالت پہلے سے کچھ بہتر معلوم ہوتی تھی۔ یقیناً میرے آنے کا بھی کچھ اثر ہو گا مگر پیرو نے تاکیداً مجھے اٹھا دیا کہ میرے نہ جانے سے ابا جان پریشان ہوں گے۔

وہ تینوں مجھے چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئے۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ درختوں کی وجہ سے کھمبوں کی روشنی چھنتی ہوئی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ کچھ آگے جا کے کہیں اور بھی لوگ ٹہلتے نظر آئے۔ خوش پوش لوگ۔ وہ رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہے تھے۔ اس علاقے میں ہر سو سکون ہی سکون تھا۔ سارے کا سارا علاقہ کسی جنگل کے مانند تھا۔ جیسے جنگل کے بیچ میں مکانات بنا لیے گئے ہوں اور آنے جانے کے راستے۔ ہم مختلف گلیوں سے گزر کے خاص سڑک پر آ گئے۔ راستے میں فرخ، فریال کے بارے میں گیتا اشتیاق آمیز لہجے میں بولی: "ان سب کو بھی یہاں لائیے گا۔"

"کیوں نہیں، ضرور، وہ آتی رہیں گی۔"

"ابھی تھی اس کے پاس کیوں نہ چلا جائے۔"

"مگر جب آپ لے جائیں گے تبھی......"

"تم راجا کے ساتھ جا سکتا ہے۔" پیرو نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا: "راجا! ابھی اس کو اودر لے جا۔"

"اس وقت؟" گیتا نے تذبذب سے کہا۔

"اس وقت میں کیا جاتا ہے۔ ابھی دو تین روز بیٹا لوگ کے ساتھ ہی رہنا۔ وہ سب تیرا دوست، امیں بھائی ہے۔ تم اکیلا ہونے کا بہت بولتا تھا۔ ایدر ابھی تم کبھی بھی اکیلا نہیں ہونے گا۔ اپن بار بار تیرے لیے کیا کانچ کا، پھول کا، مانک لوگ لایا ہے کر دیکھے گا تو بولے گا پاپا! اپن کو اودر ہی ان لوگ کے پاس رہنے کا ہے۔ دیکھے گا تو دیکھتا رہ جائے گا۔ راجا سیدھا اودر ہی جا رہا ہے۔ جانا ہے تو ابھی چلے جانے کا ہے۔ کیوں رے راجا؟"

"ہاں دادا!" میں نے اس کی ہم نوائی کی کوشش کی۔ "چلو ضرور چلو۔ یہ تو بہت اچھی بات ہو گی۔ سب خوش ہو جائیں گی۔"

"مگر رات بہت ہو گئی ہے۔" پیرو کی بیوی نرمی سے بولی۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔" پیرو کی بیوی نرمی سے بولی۔

"رات بہت ہو گیا ہے۔ ابھی راجا جو ساتھ ہے۔ راجا اکھا شیر ہے۔" پیرو نے مجھی سے کہا۔ "پتہ ہے راجا کون ہے؟"

"وہ لوگ اب سو گئے ہوں گے۔"

"او در اپنا گھر ہے رانی!" پیرو ٹھنک کے بولا۔ "دیکھنا ایدر راجا کا چاپ سنے گا، لوگ جاگ پڑے گا۔" مگر پیرو کچھ توقف کے بعد خود ہی ہنس کے کہنے لگا: "ٹھیک ہے۔ ابھی ایسے اپن کے ساتھ چلنا۔ اپن سمجھ گیا۔ ابھی پہلی بار جا رہا ہے ایسا تھوڑا چلا جائے گا۔" پیرو کے پاس شاید موٹر نہیں تھی۔ میں نے بھی نہیں پوچھا۔ ہوتی تو وہ اسی میں مجھے پہنچا کے آتا۔ ہمیں گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ سواری مل گئی۔ میں پیچھے مڑ کے دیکھتا رہا جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی، تینوں وہیں کھڑے رہے۔ میں باڑے پہنچا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ برو شاموا ورلی کو ساتھ لے کے میں گھر آ گیا۔

دوسرے دن اول وقت میں تجمل اور پیرو کے ساتھ گیتا اور اس کی ماں گھر آ گئی تھیں۔ وہ آئیں تو مارتی، جولین، شہر یارہ اور جاوید کو بھی بلا کے لے آیا۔

* * *

کلکتے کے دسویں پر ابا جان نے مارتی اور نگو کے توسط سے بہت سی دیگیں پکوا کر غریبوں میں تقسیم کرائیں۔ اس کے ایک دن بعد ابا جان نے ایک بڑی سی سیاہ موٹر خریدی تھی، تقریباً نئی موٹر۔ انھوں نے کہیں سے ایک کہنہ مشق ڈرائیور بھی ڈھونڈ لیا تھا۔

اس روز کلکتے کو گزرے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ تجمل اور پیرو ابا جان کے کمرے میں تھے۔ تجمل تو پہلے ہی سے تھا، پیرو کو بطور خاص ابا جان نے بلایا تھا۔ کمرے میں اس وقت میر علی تھے نہ مولوی اکرم۔ ابا جان نے بوجھل آواز میں تجمل اور پیرو کو مخاطب کر کے کہا: "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی کہ ابا جان آخر ایسی کون سی بات کہنا چاہتے ہیں جو ان کے لب و لہجے میں اتنی سنجیدگی طاری ہے۔ "دیکھیے، میری بات تحمل سے سنیے۔" ابا جان نے کہا۔ "ممکن ہے ابھی یہ سب قبل از وقت معلوم ہو اور آپ کو گراں گزرے لیکن زندگی تو رواں دواں رہتی ہے۔ بے شک کلکتے کے جانے سے سب کچھ اجڑا اجڑا لگتا ہے۔ دل کا وہ عالم نہیں رہا۔ زندگی بہت بے اعتبار ہے اور اب اور بھی بے اعتبار معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہی ٹھیک ہے۔ ہر شخص کے دن طے کر دیے گئے ہیں اور ہمارے پاس صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" ابا جان نے چند لمحوں کے لیے تامل کیا اور سر جھکائے دھیمی آواز میں بولے: "پھر وقت طے نہ کیا، کب طے اور کتنا طے۔ میں جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں، نئی نہیں ہے۔ فیض آباد میں بھی میں نے آپ سے درخواست کی تھی اور آپ نے صاف جواب دے دیا تھا۔ میری التجا ہے کہ آپ اس پر نظر ثانی کریں۔"

"اپن سمجھ گیا بڑے صاحب! اچھا ہے ابھی آگے نہ بولو۔" پیرو نے بے تابی سے کہا۔ "اپن سے ایسا......"

ابا جان نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ "دیکھیے، یہ سب بہت ہے، بے اندازہ ہے، آپ کے تصور سے زیادہ۔ یہ میری ضروریات اور خواہشوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔ اس سے زیادہ آدمی اور کیا ہوس کر سکتا ہے۔ آپ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہیں اور میری خوشی کو ہر حال مقدم سمجھتے ہیں۔ سمجھ لیجیے میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔"

پیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ابا جان نے کہا: "میری بات پہلے پوری طرح سن لیجیے، تسلی سے۔"

"ہاں سُن رہے ہیں بابا!" تجمل بدبداتے ہوئے بولا۔

"لیکن غور بھی کیجیے گا اور فوراً جواب دیجیے گا۔" ابا جان نے تجمل کے لہجے پر توجہ نہیں دی اور نرمی سے کہا۔ "میں اکیلا اسے صرف نہیں کر سکتا۔ روپیہ پیسہ ہوتا کس لیے ہے۔ آدمی کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے اور اچھی زندگی گزارنے کی تمنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ میرے پاس ظاہر ہے زندگی زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ یہ باقی وقت میں سکون اور آرام سے گزارنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں اتنی لمبی مسافت کے بعد میری یہ خواہش بے جا نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں ہے۔" پیرو نے کہا۔ "اپن تو آپ کو خود ایسا بولنے کا تھا کیوں تجمل بھائی؟"

"لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے، اُس حیثیت سے جو آپ نے مجھے دی ہے، میرا فرض ہے کہ میرے متعلقین میرے پوچھنے والے بھی اپنی زندگیاں عزت مندانہ طور پر بسر کریں۔ اپنی مرضی کی زندگی۔ یقین کیجیے ایسی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے۔ ایسا کوئی بل کریا آپ کا کوئی اجر ہے۔ اس کے حصول میں چونکہ آپ برابر کے شریک رہے ہیں، پیرو پہچھے تو اس کا اجر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بے جگری اور جذبے کے اجر کے لیے یہ سب بھی بہت تھوڑا ہے۔ اسے کوئی بدگمانی مت سمجھیے۔ آپ تو منع ہی کر چکے ہیں اور فرض کیجیے کہ یہ واقعی میرے دماغ کے کسی گوشے میں یہ وہم چھپا ہے کہ دولت جتنی اچھی چیز ہے اتنی بری بھی ہے۔ آدمی کو آدمی سے جدا کر دیتی ہے۔ سو عقل و فہم کا تقاضا یہی ہے کہ حساب صاف رکھا جائے۔ خدا گواہ ہے ایسی کوئی کھٹک دل میں نہیں ہے لیکن اگر ہے تو کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اسے نیک نیتی بھی سمجھا جاتا ہے، تیز اندیشی اور میں دلیل کے طور پر بھی کر سکتا ہوں کہ سب آپ کے سامنے پیش کر دوں کہ آپ جو چاہیں اٹھا لیں اور جو چاہیں مجھے دے دیں۔ اللہ جانتا ہے کہ مجھے کوئی ملال نہ ہو گا اگر میرے لیے کچھ بھی باقی نہ بچے۔" ابا جان کی آواز بھرانے لگی تھی۔ "سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"اپن کا سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔" پیرو تمتماتے لہجے میں بولا۔ "اپن کو اس کا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپن اُدھر پہاڑ کا طرف اس لیے نہیں گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"اپن آپ کے لیے گیا تھا۔ اپن کا راجا کے لیے۔"

"یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"پھر اپن ابھی کیدر کا سا جیسے وار بن گیا۔ اپن نے تو سپنے میں بھی ایسا کبھی نہیں سوچا۔"

"میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا تھا۔"

"آپ کو مل گیا تو سمجھو اپن کو مل گیا۔ اپن کا مارا ماری تھوڑا کام آگیا۔ آپ کا پاس ہے تو اپن کے پاس ہے بابا! اپن کیا پھر ایدر آپ کے ساتھ نہیں رہنے کا؟"

"ہمیشہ کے لیے۔" ابا جان نے جلدی سے کہا۔ "لیکن میری بات پر شاید آپ نے توجہ نہیں دی۔"

"ہم لوگ کیا اٹھ کے چلے جائیں بڑے صاحب!" بہت دیر بعد تجمل نے زبان کھولی۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں نہیں آپ کوئی غلط غلط ۔۔۔"

"خدا کے لیے اب آپ کچھ نہ بولیے۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "میں نے بہت ضبط کیا لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔"

ابا جان کی بے چین نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں پھر انھوں نے اپنے ہونٹ بند ہی رکھے۔ دیر تک کمرے میں وحشت انگیز خاموشی طاری رہی مگر اچھا ہوا کہ ابا جان نے پھر کچھ نہیں کہا اور شاید یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ ابا جان اٹھ کے نہیں گئے، وہیں بیٹھے رہے۔

◆

دوپہر کے کھانے کے بعد پیرو واپس جانا چاہتا تھا کہ ابا جان نے اسے روک لیا۔ "آپ کو کہیں لے جانا ہے۔" انھوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کوئی ضروری کام نہ ہو تو ابھی ٹھہر جائیے۔"

"حکم کرو بابا! کیدر کو جانا ہے۔" پیرو مستعدی سے بولا۔

"باندرے میں، میں نے ایک مکان دیکھا ہے۔ آپ لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔ کیسا مکان ہے؟"

"شاید پسند آئے۔"

پیرو نے فرج سے پانی کی فرمائش کی تھی۔ اس وجہ سے کچھ دیر لگی۔ ابا جان کی موٹر باہر موجود تھی۔ ڈرائیور ایک آواز پر کہیں سے نمودار ہو گیا۔ ان چار دنوں میں جب سے موٹر آئی تھی، میں پہلی بار اس میں بیٹھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے بیس منٹ میں ہمیں اس مکان کے سامنے پہنچا دیا جو ابا جان کے بہ قول انھوں نے پسند کیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی کائی زدہ چار دیواری کی وجہ سے اندر کسی خاص عمارت کے آثار نظر نہیں آتے تھے لیکن جیسے ہی موٹر باوردی چوکی دار نے کالے رنگ کا آہنی دروازہ کھولا اور موٹر اندر داخل ہوئی، سبھی دیکھتے رہ گئے۔ اندر چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار میں جدید طرز کی ایک کوٹھی کھڑی تھی۔ ایک سہ منزلہ پرت در پرت عمارت۔ نئے رنگ و روغن سے آراستہ ویسے بھی پرانی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کسی ماہر عمارت ساز نے جس نے خاکے بنانے لگائے ہوں گے تو یہ نقشہ بنا ہوگا۔ قریب جانے پر اندازہ ہوا کہ عمارت کے ایک دوسرے سے پیوست کئی حصے ہیں۔ اندر آنے جانے کے کئی راستے، اندر باہر الگ الگ زینے۔ ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ اور کمروں کا ایک سلسلہ۔ ہال، مردانہ اور زنانہ حصے۔ عقبی باغیچہ۔ ایک جانب چھوٹا سا باغ اور ایک مختصر حوض میں سنگ مرمر کا فوارہ۔ ایک طرف کھنچی ہوئی دیوار کے پیچھے ملازموں کے کوارٹر، کاٹھ کباڑ کے لیے گودام، گیراج اور موٹر کھڑی ہونے کی جگہ۔ ساری عمارت خالی پڑی تھی لیکن بھاری قسم کا فرنیچر موجود تھا۔ کئی کمروں میں بچھے ہوئے قالین بھی نہیں سمیٹے گئے تھے۔ ہال میں ایک بڑا فانوس بھی چھت سے لٹک رہا تھا۔ یہ ابا جان کی حویلی جتنی بڑی عمارت تو نہیں تھی نہ اس کا رقبہ اتنا لمبا چوڑا تھا لیکن بمبئی کے مکانات کے اعتبار سے

بہت بڑی تھی۔ بمبئی میں ایسے مکانات کی تعداد کم ہی ہوگی۔

"یہ تو کسی نواب راجا لوگ کا ہی ہو سکتا ہے۔" پیرو نے ساری عمارت دیکھنے کے بعد ابا جان سے کہا۔

"سارے نواب راجا پیسے کے نواب راجا ہوتے ہیں، آسمان سے نہیں اترتے۔" ابا جان کے لہجے میں ترشی موجود تھی۔ انھوں نے تجمل سے پوچھا۔ "کیوں، کیسی ہے؟"

"اچھی جگہ ہے بڑے صاحب!" تجمل نے سر ہلا کے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں۔"

کسی نے ان سے قیمت نہیں پوچھی۔ معلوم ہوتا تھا ابا جان یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکے ہیں۔ عمارت میں موجود ملازم انھیں تعظیم دے رہے تھے اور ان کی ہدایت پر دروازے کھولتے جاتے تھے۔ "یہاں اچھی خاصی گنجائش ہے۔" ابا جان نے کہا۔ "گو یہ پوری طرح میرے تصور کے مطابق نہیں ہے لیکن فی الحال گزارا کیا جا سکتا ہے۔ پھر اور دیکھ لیں گے۔"

"ابھی اور کیا دیکھیے گا بابا!" پیرو تذبذب سے بولا۔

"جی چاہتا ہے ایک ایسا گھر ہو جس میں سب آرام و سکون سے سما سکیں۔" ابا جان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "خاندان بھی تو چھوٹا نہیں ہے۔ سب مجھے ایک بڑے کا رتبہ دیتے ہیں تو میرا بھی کچھ فرض ہے۔"

"جی جی۔" پیرو ان کی طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔

"اس مکان کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف خاندان ایک چھت کے نیچے ایک ساتھ رہنے کے باوجود اپنی اپنی پردہ داریاں بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ سب ایک دوسرے کے قریب آنے کے آرزومند ہیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے۔ فیض آباد میں زرینہ بیٹی کے ہاں جا کے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ممکن ہے۔ یہی کچھ دیکھ کے میں نے ایک ایسے مکان کی تلاش شروع کی تھی جو سب کا گھر ہو۔ گیا اور اس کی ماں سے مل کے میرے ارادے کو اور تقویت ملی۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں ہیں، دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔"

"گیا تو گھر لوٹنے کو نہیں بولتا تھا۔" پیرو نے ہنس کے کہا۔ "اس کا ماں بھی اپن کو رونے کو بولتا ہے۔ بولتا ہے، ابھی اپن کو کیسا پالا پوسا بیٹا مل گیا ہے۔ ابھی سب مل گیا ہے۔ اپن بولا، ابھی تم دیکھا کیا ہے، ابھی تم فیض آباد کیدر کیسا ہے۔"

"آپ کہیں تو پھر سودا کر لوں؟"

پیرو ان کی تائید ہی کر سکتا تھا۔ تردید کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ نہ تجمل کے پاس، نہ میرے پاس۔ جہاں روپے پیسے کی رکاوٹ نہ ہو وہاں پھر اور سوچنے سمجھنے کا مشورہ بھی کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ابا جان کے ہاں ویسے بھی حتمی ہی بات تھا۔ کسی کو اس میں کیا کلام ہو سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے انھوں نے ان دنوں سے ہال کا ذکر کیوں کیا تھا۔ عندیہ لینا مقصود تھا یا جواز پیدا کرنا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اتنے عرصے میں انھوں نے بہت کچھ دیکھا اور جانا بوجھا ہے مگر حیثیت سے یہاں تک آنے ان ساٹھ برسوں کے انھوں نے کتنا دیکھا اور جانا بوجھا تھا جو دوبارہ انھوں نے یہ ذکر کرنا ضروری سمجھا۔ بہرحال یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ وہ فیض آباد جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ یہیں بمبئی میں قیام کا ارادہ ہے۔ میں ان سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور کسی اچھے موقع کا منتظر تھا لیکن اب شاید یہ بعد از وقت تھا۔ ٹھیک ہی ہوا جو میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ اپنی کوئی رائے ان پر نہیں تھوپی۔ زرینہ کا خیال مجھے خود رکھنا تھا اور تجمل کی موجودگی میں میری بھی کیا ضرورت تھی۔

تجمل کو انھوں نے نہیں جانے دیا۔ میں شام کو پیرو کے ساتھ باڑے آ گیا۔ باڑے میں خلاف معمول بڑا مجمع لگا ہوا تھا اور پیرو کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اندھیری کے دادا راجن کے باڑے پر پولیس نے چھاپا مار کے راجن کو گرفتار کر لیا تھا۔ پیرو نے فوراً ضمانت کا انتظام کرنے کو کہا تھا لیکن جارجی نے پیرو کو بتایا کہ راجن پر علاقے کی ایک عورت کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ جارجی کہہ رہا تھا، اتفاق سے وہ اس عورت کو جانتا ہے۔ وہ فارس روڈ کی ایک مشہور طوائف کاشی ہے۔ راجن نے اسے مستقلاً اپنے لیے وقف کر لیا تھا اور اس کا سارا خرچ وہی چلاتا تھا۔ اسے ایک گھر بھی لے کے دیا تھا۔ جارجی نے بتایا اسے معلوم ہے کاشی صرف اس کی ہو کے نہیں رہی۔ راجن کو اس کی خبر نہیں تھی۔ جب خبر ہوئی تو اس سے برداشت نہیں ہوا۔

"پر راجن ایک عورت کو نہیں مار سکتا۔" پیرو نے اسے جھڑک کے کہا۔ "وہ تیرے ماکف نہیں ہے۔ اکھا دولوا ہے۔ اپن کو ضرور کوئی گھپلا دکھتا ہے۔"

پیرو کسی تاخیر کے بغیر لنچ بھی اور زورا کو لے کے باڑے سے نکل گیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ جانا چاہا تھا لیکن مجھے اس نے منع کر دیا۔ میں نے رات کو دیر تک اس کا انتظار کیا۔ وہ نہیں لوٹا۔ تجمل کی وجہ سے مجھے گھر آنا پڑا۔

دوسری صبح ناشتے کے دوران ابا جان نے تجمل کو بتایا کہ کل رات انھوں نے مکان کا سودا کر لیا ہے لیکن ضروری ساز و سامان کے بعد ہی وہاں منتقل ہوا جا سکتا ہے اور اس اہتمام میں ہفتہ عشرہ تو لگ ہی جائے گا۔ تجمل نے یہ کسی فرض ہی کے طور پر سنا اور انھیں مبارک باد دینا نہیں بھولا۔

ناشتے کے بعد تجمل سے کہہ کے میں پھر باڑے آ گیا تھا لیکن پیرو دن بھر غائب رہا۔ لنچ بھی اور زورا بھی وہاں نہیں تھے۔ باڑے میں آنے والے آدمی طرح طرح کی باتیں سنا رہے تھے کہ پولیس نے اندھیری کے علاوہ دوسرے باڑوں کے داداؤں کو بھی تھانے طلب کیا ہے اور علاقے کے دو بڑے تاجروں کے ہاں بھی چھاپے پڑے ہیں۔ جارجی یہ خبریں سننے اور انھیں آگے بڑھانے میں پیش پیش تھا۔ وہ تقریباً یہیں رہتا تھا۔ پیرو نہ ہوتا تو اس کے انتظار میں پڑا رہتا تو جب تک وہ باڑے میں رہتا، جارجی دم سادھے بیٹھا رہتا۔ مجھے اس سے نفرت ہونے لگی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ میرے ہی پاس آ جاتا اور میرے پہلو سے چپکا رہتا۔ کبھی کچھ کہتا کبھی کچھ۔ اس دن بھی میں

دیر تک پاٹے میں بیٹھا رہا لیکن پیڑ اور ماچھی میں سے کوئی پلٹ کے نہیں آیا۔ راجن کے چلے جانے سے اندھیری کے پاٹے پر اُن کی موجودگی ضروری تھی۔ آنے والے لوگوں کی اطلاع کے مطابق عدالت نے راجن کو ضمانت پر چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہر چند کہ مزید لوگوں کے گرفتار ہو جانے کے بعد اب پولیس کا شبہ محض راجن پر نہیں رہا تھا۔ خالہ پیرو کا اندازہ درست تھا کہ وہ راجن نہیں ہو سکتا۔ غلام کو کلیا اندھیری سے ہو کے آیا تو اُس نے بتایا، پیڑ علاقے میں شہادتیں سمیٹ رہا ہے۔ ظاہر ہے اِن دو دنوں میں وہ گھر بھی نہ جا سکا ہوگا۔ کلیا اور اُس کی ماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ جا کے انھیں تسلی دے آؤں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ میرے جانے سے وہ کھٹک سکتی تھیں اور یوں بھی یہ تو اُن کے لیے معمول کی بات ہوگی۔

اگلے دن صبح میں پاٹے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ وہ ابا جان تھے۔ دوسرے لمحے وہ اندر چلے آئے۔ پہلی بار اُن کے اس طرح آنے سے میں گھبرا گیا۔ کمرے میں میں اکیلا ہی تھا۔ ضرور کوئی اہم بات ہوگی۔ انھوں نے کسی تمہید کے بغیر سرسری انداز میں مجھ سے کہا کہ نئے مکان میں اگر مجھے کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو انھیں بتا دوں۔ مجھ سے جواب نہیں دیا جا سکا۔ "کچھ بھی نہیں۔" میں نے بہ دقت چڑچڑاتی آواز میں کہا۔

میری بات انھوں نے نہیں سُنی۔ یکایک وہ ٹھٹک سے گئے اور جھپٹتے قدموں سے میری طرف بڑھے اور انھوں نے میز پر رکھی ہوئی میری مالا اُٹھا لی۔

زرینہ نے فیض آباد میں اس کے موتی از سر نو پروئے تھے اور مٹیالے رنگ کا غلاف چڑھا دیا تھا۔ اس سے دانے چھپ جاتے تھے اور محفوظ بھی رہتے تھے۔ باہر سے دیکھنے میں وہ گنڈے قسم کی کوئی چیز نظر آتی تھی لیکن باہر سے کسی کا دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ہمیشہ اُسے بنیان کے نیچے پہنتا تھا۔ غلافی شکل میلی ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے دھونے کے لیے مالا باہر نکالی تھی کہ ابا جان کی نظر پڑ گئی۔ وہ اضطراری انگلیوں سے اُس کے دانے ٹٹولنے لگے۔ "یہ تمھارے پاس...." وہ اضطراب سے بولے۔

میں نے سر جھکا لیا۔ اُن سے کیا کہتا۔

"یہ تو وہی ہیں۔" اُن کی آواز سنسنا رہی تھی۔ "یہ دنیا کے نادر ترین موتی ہیں۔" اُن کی حیرت بجا تھی۔ ان جیسے موتی اُن کے پاس بھی تھے۔ کورا کی لائی ہوئی پوٹلی کے دوسرے نوادر میں اس قسم کے موتی بھی شامل تھے۔ ابا جان نے یہ دانے بمبئی کے ایک بیوپاری کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے۔ جوہری سے مسز روپ پٹیل نامی ایک امیر بیوہ نے انھیں خرید لیا تھا۔ کرشنا جی جب مجھے کلب لے گئے تھے تو مسز روپ پٹیل کے گلے کے ہار میں وہ موتی دیکھ کے میرا بھی یہی حال ہوا تھا جو ابا جان کا اس وقت تھا۔

"یہ تمھارے تمھارے پاس کیسے آئے؟" میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں گھٹ گئی۔ اُن کی بے چین نگاہیں میرے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔

اچھا ہوا انھوں نے دوسرا کوئی سوال نہیں کیا ورنہ میرے مُنہ سے کچھ بھی نکل جاتا۔ شاید میرا جواب میرے چہرے پر لکھا تھا۔ "تو یہ تمھارے پاس بھی تھے۔" وہ جذباتی انداز میں بولے۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ بھی لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا لیکن اُن کی آنکھیں مجھے اپنے سارے جسم پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ انھوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ "حوصلہ رکھو۔" انھوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ذرا حالات قابو میں آ جائیں پھر دیکھیں گے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

مالا میز پر رکھ کے وہ فوراً چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد بھی اُن کی لرزتی آواز کی بازگشت میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ میرا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ پھر آدمی اپنا سر دیوار سے کیوں نہ پھوڑ لے۔ جانے کیوں میرے سینے میں ایسی گرہ سی اٹھی کہ مجھے کچھ اختیار نہ رہا۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون کمرے میں آیا تھا جس نے نجمل کو خبر کی تھی یا نجمل از خود آ گیا تھا۔ اُس نے مجھے سینے سے لگایا تو میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "کیا ہوا ہے؟" وہ جتنا مجھ سے پوچھتا تھا میری آنکھیں اور اُمڈنے لگتی تھیں۔ "بول رے مجھ کو بھی نہیں بولے گا؟" وہ میرے بال کھینچنے اور مجھے جھنجھوڑنے لگا۔

"کچھ نہیں ہے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"کچھ دھیان کر۔ اُدھر وہ تیری سگی بھی ہیں کیا بولیں گی کہ بڑا بھائی......"

وہ چلپلاتی آواز میں بولا۔ "کیا ہوا رے....؟"

"کچھ نہیں ہوا، تم کیوں کیوں....؟"

"اُدھر ٹھیک سے بیٹھ جا۔" اُس نے مجھے بستر پر دھکیل دیا اور میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ "اپنے پاس بھی کتنی نہیں ہیں لاڈلے!"

"تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ کوئی بھی بات نہیں ہے، بس یوں ہی، مجھے ایسے ہی ہو جاتا ہے۔"

"بول رے اب کس نے نوچ لیا ہے۔"

"کسی نے نہیں، تم سے کہہ دیا نا۔"

"بابا اِدھر سے ہو کے گئے تھے۔"

میں سسکیاں بھرتا رہا۔

"وہ کچھ بول کے گئے تھے؟ پر وہ تو کچھ بھی بول سکتے ہیں۔ وہ تو بابا ہیں۔"

"وہ کتنی آسانی سے کہہ کے چلے گئے۔" میں نے آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں کہا اور اُسے بتانے کی کوشش کی۔ "تمھیں معلوم ہے وہ کیا کہہ کے گئے ہیں۔ اب اتنی دور آ کے......"

"ٹھیک ہے رے۔" وہ مجھے تھپکنے لگا۔ "ایسا ہی آگے پیچھے ہو جاتا ہے۔"

"اگر وہ پہلے یہ سب۔"

"آدمی گھڑی دیکھ کے چلتا ہے۔ آدمی خود گھڑی نہیں ہوتا۔ پہلے بھی اُن نے ٹھیک ہی بولا تھا۔ اب بھی غلط بول کے نہیں گئے ہیں۔ جیتا تو تو ہی رے۔"

"یہ جیت ہے؟ یہ کیسی جیت ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"کبھی لگتا ہے، تیرا دودھ بھی ابھی نہیں چھوٹا۔ اب سنبھال لے اپنے کو۔" وہ بھی تھکی آواز میں بولا۔ "یہ تجھ کو ایک دم کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اُبلنے لگتا ہے۔"

"یہ ذرا سی بات ہے۔ امی چلی گئیں، فمی چلی گئی۔ سب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ تم کہتے ہو، یہ ذرا سی بات ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "تم نے وہ گھر نہیں دیکھا تھا۔"

"پھر بات تو اُس سے پہلے سے بھی کرتا!"

"کہاں سے کہاں پہلے سے؟"

"گھر میں اس کو بابا لائے تھے ڈولی میں بٹھلا کے؟"

"نہیں مگر مگر..." میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے پھڑپھڑاتے ہونٹ جم کے رہ گئے۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ "ہر بات اپنی طرف ہی مت دیکھا کر۔ یاد ہے اپنے نصیب میاں کیا بولتے تھے کہ اُستاد ہر آدمی کے ساتھ کوئی چکر لگا ہوتا ہے۔ کبھی اُلٹا گھومنے لگتا ہے کبھی سیدھا۔ میں بولتا تھا بڑھن یہ چکرا وکرا کوئی نہیں، یہ سالی کھوپڑی ہی چکرا ہے۔ گھومنے پہ آتی ہے تو دن کو رات رات کو دن کر دیتی ہے۔ پر لگتا ہے نصیب میاں سچے ہی بولتے تھے۔ اپنے کو بھی ابھی ایسا ہی جان پڑتا ہے کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا تو کیا بولیں۔ پر اب تو چکرا سیدھا گھومنے لگتا ہے۔ نہیں رے کیا؟"

میں اُس سے کیا بحث کرتا کہ چکرا سیدھا گھومنے لگا ہے تو پھر کاٹنے کیوں چلا گیا؟ "بس رے۔" وہ کہنے لگا۔ "ابھی پرسوں دادا بول رہے تھے، سب کو اُن کے گھر آیا تھا۔ بولتے تھے ابھی تھوڑے دن بعد نکلنے کا ہے نجمل بھائی! اپنے سے ابا کو دیکھا نہیں جاتا۔ تھوڑے دن اور، پھر جا پھر چلیں گے۔ بچے اوپر سے نیچے تک سارے کوٹے بچالے ٹملوں کے آئیں گے۔ دادا تو بولتا ہے اب کے اُنھیں گھمو ایک ہی بات پر...."

"نہیں اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ دادا نے پہلے بھی کچھ وقت برباد کیا ہے۔ کچھ کم سکھ اُٹھایا ہے جواب اور کی حسرت ہے اور تم بھی کب تک مارے مارے پھرتے رہو گے۔ اڈے پر تمھیں واپس نہیں جانا تو اُدھر زرینہ تمھارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"دیکھیں گے رے ایک بار اور۔"

"میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔ کسی کو بھی نہیں۔ اب کون سا تماشا دیکھنا رہ گیا ہے۔ جب بھی کہیں جاؤ، کوئی نہ کوئی دیوار، کوئی نہ کوئی زنجیر منتظر ہوتی ہے۔ دادا کا پورا گھر ہے اور کیسا گھر۔ انھیں اِس میں رہنا چاہیے اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ۔ میں تو دادا سے کہوں گا، وہ بارہ بھی چھوڑ دیں۔ وہ سوال کچھ کہتے تمھیں آیا محسوس بھی نہیں کرتے۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اب یہی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب اور کتنے گھر اُجاڑنے، کس کس کے حوصلے آزمانے رہ گئے ہیں۔ سلطان وزیر، مٹھن میاں، کبن خاں، کالے۔ اب اور کون دشمن رہ گیا ہے۔ تم بھول گئے؟"

"یاد ہے رے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "پر تیرا اور زرینہ کا ایک بگولہ بننے پہ دُور رہتی ہے کیا، رات نہیں بدلتی، رات نہیں آتی اور سب ایسے رہ گیا ہے کیا۔ اگر پاؤں نہ نکالتے تو یہ سب دکھائی دیتا؟"

"بس اتنا بہت ہے۔"

"اُدھر شیشے میں تھوڑا اُکھڑا تو چل کے دیکھا اتنا کڑوا بہت ہے۔ بابا نے ذرا ٹھکا چھوڑ دیا تو ناچنے لگا، پھیل گیا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے جھنجھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ بھی کہو، تم ٹھیک کہتے ہو یہ بھی کیوں۔ یہی سب تو ہے جو سب کو اجاڑتا ہے۔ مگر میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں چھپانے کی بہت کوشش لیکن بس اچانک..... میں تمھیں کیا بتاؤں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں، اپنے آپ کو چاقو مار لوں، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں رے، چاقو تو تیرے پاس بڑا ہی ہے اور چلانا بھی بُرا نہیں آتا۔ مار لے پھر۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "اپنی ہی گُدی اوچی کھا۔"

میں نے بے اختیار اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "پھر میں کیا کروں، بتاؤ میں کیا کروں؟"

"مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔" اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ "اتنی دور آنے کے بعد پوچھتا ہے کہ کیا کروں۔ اتنے دنوں کی دھوپ میں تو تیری کھال سخت ہو جانی چاہیے۔ تُو نے اسے اور چھوئی موئی کر لیا۔" اُس نے کسی چھپی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی سے کیوں ہانپنے لگا۔ آگے تو دن پڑے ہیں رے۔"

"لیکن یہ دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"جتنی بڑی ہے اتنی چھوٹی بھی ہے۔ بھلی عمر بیت جاتی ہے، کبھی ایک پل میں لپٹ جاتی ہے۔ کسی اور کا نہیں تو تجھے اُس کا بھی دھیان نہیں آیا۔ اُدھر اُس کا بھی تو یہی حال ہوگا۔ اُدھر کیا وہ کل سے بیٹھی ہوگی؟"

"کون جانے، اُس کا کیا حال ہے!"

"رے، بھول گئی ہوگی کیا؟"

"وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"پھر ڈوری توڑ دی ہوگی اُس نے؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ وہ زندگی بھر میری راہ دیکھتی رہے گی اپنی آخری سانس تک۔"

"اور تو اِدھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا؟"

"مگر میں کون سی کھوہ میں اُسے ڈھونڈوں؟ کسی طرف تو منہ اُٹھانا پڑے گا نے۔"

"تمھیں معلوم ہے داوا نے تم سے ضرور کہا ہو گا حیدرآباد میں نواب رت نے ہمیں کیا بتایا تھا۔ اُس نے کہا کہ جیسے ہی اُس نے مولوی صاحب سے ہمارا ذکر کیا مولوی صاحب گم صم سے ہو گئے اور دوسرے دن اُس کی عدم موجودگی میں گھر سے چلے گئے، کوئی رقعہ، کوئی اطلاع دیے بغیر۔ اِس سے کیا ظاہر ہوتا ہے، یہی نا کہ وہ اُسے مجھ سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک قاتل، ایک سزا یافتہ کو اُس کے قریب نہیں پھٹکنے دینا چاہتے۔"

وہ سر ہلانے لگا۔ "ہاں سنا تھا۔"

"مولوی صاحب اگر چاہتے تو کیا مجھے ڈھونڈ نہیں سکتے تھے؟"

"پر مولوی سے اپنے کو کیا لینا۔"

"لیکن وہ اُنھی کی تحویل میں ہے۔ وہ میرے بارے میں اُس سے جانے کیا کہتے رہے ہوں، کون کون سے عذر پیش کرتے رہے ہوں۔ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اُسے مجھ سے چھپائے چھپائے پھر رہے ہیں۔"

"ابھی ایسا بول نہ ڈال، کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"اور کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"ابھی کیا بولیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "مولوی نے اُسے سنبھال کے بھی تو رکھا ہے ہر طرف سے بچا کے۔ بڑے صاحب (امیر علی) کیا بولتے تھے، مولوی مراد آبا اپنے گھر کو بھی تو نہیں لوٹا۔ وہ حویلی کے چودھری رانا مہتاب بڑے صاحب کے کاٹنے پر تلے بیٹھے ارشد اور دکن کے نواب ثروت جیسے رشتے کیوں منع بول دیتا ہے۔"

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ معاً اُس نے مجھے ٹہوکا دیا۔ باہر سے فرخ قربال کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "اُٹھ جا رے، ایسے دیکھیں گی تو ٹوٹ جائیں گی۔" اُس نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھا دیا۔

میں نے کوشش کی کہ وہ میرا چہرہ نہ دیکھ پائیں یا اُنھوں نے ہی نگاہیں چرالیں۔ وہ جولین اور شہ پارہ کی آمد کی اطلاع دینے آئی تھیں۔ میں تجمل سے پوچھنا چاہتا تھا کہ پھر کیا بات ہے۔ آخر مولوی صاحب کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے، کب تک؟.... مگر وہ فرخ قربال کے کندھوں کی بیساکھیوں پر کمرے سے چلا گیا۔ پھر کو ابا جان اُسے ساتھ لے گئے۔ اتنے دنوں بعد کہیں اُس نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ اس دوران کوئی بات کرتے ہوئے کیا، اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگتا تھا۔

جولین اور شہ پارہ کل کے لیے سب کو اپنے گھر بلانے آئی تھیں۔ کل کا تے کا میلاں تھا اور چھپا بیگم کی خواہش تھی کہ کل سب اُسی جگہ جمع ہو جائیں، جہاں سے کاتے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ سب ہی کو رانی اور گیتا بھی آ گئیں۔ صرف جولین کی ماں اور چھپا بیگم کی کسر رہ گئی تھی۔ جمرو، شاہو، مارٹی اور ٹنگو بھی موجود تھے۔ اُس دن کہیں جانے کو میرا جی ہی نہیں چاہا حالانکہ مجھے خیال تھا کہ پاٹے پر جا کے پیری کی خبر لینی چاہیے۔ یقیناً وہ ابھی تک اندھیری میں پھنسا ہوا ہے ورنہ تجمل کو دیکھنے ضرور آتا۔ دوپہر کھانے کے بعد جمرو اور

شاہو نے مجھ سے کہا بھی۔ میں نے صاف انکار نہیں کیا تھا لیکن مجھے آمادہ نہ دیکھ کر وہ بھی چُپ ہو گئے۔ مجھے گھر میں بھی کسی جگہ قرار نہیں تھا۔ کبھی کمرے میں آ کے لیٹ جاتا، کبھی جولین اور شہ پارہ کے کمرے میں چلا جاتا جہاں سبھی موجود تھیں۔ میرا جسم اندر ہی اندر سن سنا رہا تھا۔ رگ رگ میں خون جیسے حرکت کر رہا ہو۔ تجمل کی شام کو واپسی ہوئی تو میں اُس سے بات کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ میرے ذہن میں جانے کتنی باتیں منڈلا رہی تھیں۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ ہو سکے تو کسی اچھے وقت وہ فیض آباد میں مستقل قیام کے لیے ابا جان سے بات کرے۔ فیض آباد میں بہت سکون ہے۔ جہاں گیر بھی وہیں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہاں نہیال ہے، امیر علی کا پورا خاندان ہے۔ خانم بھی کسی دن واپس آ جائے گی۔ یہاں بمبئی میں تو بہت شور ہے، بہت بھیڑ۔ تجمل کی بھی یقیناً یہی خواہش ہو گی۔ میں اُس سے خانم کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ اب حیدرآباد جانا کس طرح ممکن ہے۔ کون خانم کو لینے جائے گا۔ میلاں زیادہ دیر خانم کی موجودگی مناسب نہیں ہے لیکن تنہائی میں تجمل مجھے نہ مل سکا۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا، کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے مجھ سے کچھ اوجھل ہو جائے گا۔ کوئی چیز گم ہو جائے گی۔ صبح کسی وقت میری آنکھ لگی لیکن کچھ دیر بعد لاری کی آہٹ پر ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا اور ناشتے کے بعد جمرو اور شاہو کو لے کے پاٹے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ہمارے پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد پیری بھی پاٹے آ گیا۔ چہرے پر غبار چھایا ہوا تھا لیکن مجھے دیکھ کے وہ اُچھل گیا اور صدقے جانے لگا۔ "بارا جا! اپن کا جانی بھی ادھر ہی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو دادا! آخر کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

اُس نے زور سے اپنا سر میرے سر سے ٹکرایا اور بھپاتی آواز میں بولا۔ "ابھی سب ٹھیک ہے جانی! اپن نہیں جاتا تو راجن کو تو سالا پھندا الپیٹ ہی دیا ہوتا۔"

"راجن نے قتل نہیں کیا نا دادا؟"

"نہیں شہزادے! اپن راجن کو جانتا ہے۔"

"اب تو سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں! ایک دم اکھا فٹ فاٹ ہے سالا۔"

"تو اب گھر جاؤ۔"

"ابھی نہیں اجا! اپن کو ابھی اندھیری لوٹنا ہے۔"

"اب بھی وہیں جانا ہے تمھیں؟ ابھی کو بھیج دو، میں چلا جاتا ہوں۔"

"او رے نہیں نہیں، نہیں رے اجا! ابھی کل تک کا بات اور ہے، ابو رکا بول۔ تجمل بھائی کیسا ہے؟"

"بالکل ٹھیک دادا!"

"بولنا کہ اپن ابھی کیدھر چلا گیا تھا، کل آئے گا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ رات کو جولین کے گھر کاتے کا میلاں ہے۔ کہنے لگا کہ آنے کی کوشش کرے گا مگر اندھیری سے فاصلہ زیادہ ہے۔ اُسے واپس بھی جانا پڑے

واپس کا انتظار نہ کیا جائے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اندھیری کے پاٹے پر اُس کا رکے رہنا بہت ہی ضروری ہو گا۔

وہ کچھ دیر بعد ہی چلا گیا۔ گیا بھی اور جارج کے کہنے پر دوپہر کے کھانے کے لیے ٹھہر گیا۔ جارج اپنے علاقے کے کسی خاص باورچی سے بریانی اور قتلمے کی کھیر پکوا کے لایا تھا۔ دونوں چیزیں نہایت لذیذ تھیں۔ سبھی نے سیر ہو کے کھائیں۔ جارج بار بار افسوس کرتا رہا کہ کاش پیرو بھی موجود ہوتا۔

شام کو جولین کے گھر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کیلاش بھی اپنی بہن رما کے ساتھ آیا تھا۔ رما سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی شکایت کرنے لگی کہ وہ میرا انتظار کرتی رہی۔ روز ہی کیلاش سے پوچھتی تھی۔ میں نے ندامت سے کہا کیلاش نے کئی بار بتایا اور کئی بار میں نے ارادہ بھی کیا لیکن بس آتے آتے رہ گیا۔ کہنے لگی۔ "بہرحال کرو مگار رضا ہے اور میں اپنے گھر سے اپنے دُکھ کا اظہار کرنے آئی ہوں لیکن مجھے ایک خوشی بھی ہے کہ اس بہانے اتنے لطیف، اتنے خوب صورت لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔"

چھپا بیگم نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ شام ہی سے غریبوں میں کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کاتے کو جولین کے ہاتھ کے کباب بہت پسند تھے۔ جولین نے خاص طور پر بنائے تھے۔ ساڑھے نو بجے کھانا لگ گیا۔ سب پیری کی آمد سے مایوس ہو چکے تھے مگر بعد وہ آ گئے۔ "پیرا اور راجن!" دونوں عجلت میں تھے۔ کھانا بھی اُنھوں نے سرسری طور پر کھایا۔ کھانے کے بعد پیرو کچھ دیر تجمل اور ابا جان کے ساتھ بیٹھا، کانا پھوسی کر رہا پھر اُٹھ گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ گیتا اور اُس کی ماں بھی آئی ہوئی ہیں۔ کہنے لگا کہ گیتا بچل جائے گی۔ اب کل تو گھر جانا ہی ہے، گر جاتے جاتے دروازے سے پلٹ آیا اور مجھ سے بولا۔ "ٹھیک ہے، تھوڑا گھوانے اُن کو۔" میں نے کہا۔ "تم خود اندر چلے جاؤ۔ یہاں کس کا پردہ ہے۔" کہنے لگا کہ نہیں، وہاں سبھی ہوں گے اور کچھ دیر تو بیٹھنا پڑے گا۔ میں اندر جا کے اُن دونوں کو دروازے پر لے آیا اور دانستہ وہاں سے ہٹ گیا۔ پیری نے اُن سے چند ہی لمحے بات کی ہو گی کہ پلٹ پڑا اور گھر سے نکل گیا۔ ابا جان کی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے کہا اُسے لے جا۔ کہنے لگا۔ "اس ہی گیتا اور اُس کی ماں کو میں گھر واپس پہنچا دوں۔" میں نے کہا یہ تو میرا پہلے سے ارادہ تھا۔

میں نے کچھ دُور تک اُس کے ساتھ جانا چاہا لیکن دونوں نے بہ اصرار مجھے لوٹا دیا۔

موٹر ایک تھی اور سب کو گھر واپس جانا تھا۔ میں نے سوچا مارٹی سے کہہ کے گیتا اور اُس کی ماں کے لیے کوئی دوسری سواری منگوا لیتا ہوں لیکن ابا جان نے مجھے روک دیا اور کہا کہ میں خود اُنھیں موٹر میں گھر چھوڑ کے آؤں۔ ڈاکٹر کیلاش اور رما پیری کے آنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اکبر بھی موٹر میں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ مارٹی کی بھی خواہش تھی لیکن میں اُسے پیرو کا گھر دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اُسے منع کر دیا کہ ابا جان اور تجمل کو یہاں شاید اُس کی ضرورت پڑے۔

ابا جان کے گھر جانے کے خیال سے میں گیتا اور اُس کی ماں کو پہنچا کے فوراً ہی سے لوٹ آیا۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ بس اِکا دُکا دکانیں کھلی تھیں۔ ڈرائیور نے مجھ سے اجازت لے کے ایک جگہ کھڑے کھڑے چائے پی۔ میں بھی اکبر کے ساتھ اُتر گیا۔ جتنی دیر میں ڈرائیور نے چائے پی، ہم نے ہوٹل سے ملحق پان کی دکان سے پان کھایا اور موٹر میں آ کے بیٹھ گئے۔ جس وقت ہم ناگپاڑے کے علاقے میں داخل ہوئے گیارہ بج رہے تھے۔ ایسی تو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی آمد و رفت میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔

ڈرائیور موٹر کاٹ کے اندر گلی میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے موٹر روک دینے کی ہدایت کی۔ موٹر کی تیز روشنی میں مجھے موٹر پر جمرو اور ٹنگو کھڑے نظر آئے تھے۔ وہ موٹر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر ایک جھٹکے سے موٹر ٹھہری، اُدھر وہ جھپٹتے قدموں سے میری طرف آئے۔ "لاڈلے!" جمرو نے لرزتی آواز میں مجھے پکارا۔ "پیرو دادا اور راجن کو آگے گلی میں کسی نے گولی ماری ہے۔ اُدھر مت جاؤ لاڈلے! پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ "کیا بک رہے ہو تم؟"

"ہاں لاڈلے! زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ پولیس نے اُدھر ساری گلیوں پہ گھیرا ڈال دیا ہے۔" جمرو کی آواز سٹ پٹا رہی تھی "تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو اُن کے سامنے نہیں جانا ہے۔"

"مگر ہوا کیا؟ کیا ہوا؟"

"کیا بولے کیا ہو گیا راجا بھائی!" ڈنگو بلکتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑا دیری میں کچل کے آجانے کا پھر اُودر جانے کا ہے۔"

اُن کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں دروازہ کھول کے فوراً موٹر سے اُتر گیا اور میں نے جمرو کا بازو پکڑ لیا۔ "کیا بات ہے؟ دادا کیسے ہیں؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

"اپنے کو کچھ نہیں معلوم لاڈلے! کچھ بھی نہیں..." جمرو لرزتے ہونٹوں سے بولا۔ اُس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

"اپن کچھ بھی نہیں بول سکتا راجا بھائی! ابھی یہ کیا اور کیسا ہو گیا" ڈنگو کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا کہ وہ جمل کی ہدایت پر اُس کے لیے بیڑیاں لینے نکلا تھا۔ گھر جانے کے لیے چونکہ سب لوگ موٹر میں نہیں آسکتے تھے اس لیے جمل نے ایک ٹرم لانے کو بھی کہا تھا۔ ٹرم نہیں ملی تو وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے راستہ بند تھا اردگرد گلیوں میں خلافِ معمول پولیس اور لوگوں کی تعداد سے اُسے بے چینی ہوئی۔ وہیں کسی جگہ بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی وہ اندر گھس گیا اور دیکھا کہ گلی کے فرش پر پیر دادا اور ماچھی خون میں ڈوبے ہوئے بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کے اُس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اُس کے دماغ میں یہی آیا کہ وہ جا کے جمل کو خبر کرے۔ وہ جتنا تیز بھاگ سکتا تھا بھاگ کر جولین کے گھر پہنچا۔ جمل، مارٹی اور شاہو کو لے کر اُسی وقت گھر سے نکل پڑا۔ ڈنگو نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے بتایا۔ "دادا استاد جاتے جاتے جمرو بھائی اور اپن کو بولا آگے تم کو جا کے روک دے۔"

میں لمحوں تک گُنگ کھڑا رہا۔

"جلدی کرو لاڈلے!" جمرو مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا کہ وہ اور ڈنگو اباجان کو گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں اکبر کو ساتھ لے کے فوراً اس علاقے سے نکل جاؤں۔

"مگر کیوں! کیوں؟"

"استاد نے کچھ جان کے ہی بولا ہوگا" جمرو نے درشتی سے کہا: "زیادہ سوال جواب مت کر۔ ابھی جیسا استاد نے بولا ہے ویسا ہی کرنا ہے۔"

"وہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟" میں نے ڈنگو سے پوچھا۔

"اتنا دور نہیں ہے۔" ڈنگو نے بتایا۔

"مگر دادا تو میرے گھر سے نکلنے سے پہلے چلے گئے تھے۔"

"پر ابھی آدھا پونا میل آگے گیا تھا کہ گولی..." ڈنگو نے ہونٹ بھینچ لیے۔ "ایسا ہی کچھ لگتا ہے اپن کو..."

میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ کیا مجھے جمل کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے؟ ایک لمحے کے لیے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا لیکن یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ میرے جسم و جاں نے اسے رَد کر دیا۔ دو ایک ہی لمحے میں نے اُن دونوں کو موٹر میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ عجلت موٹر میں بیٹھ گئے تھے کہ میں نے ڈنگو سے راستہ بتانے کے لیے کہا۔ وہ چیختے چلاتے رہے پھر اُن کا لہجہ عاجزانہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے ابھی دُور ہی رہنا بہتر ہے اور اگر نہیں تو موٹر جولین کے گھر بھیج دینی چاہیے۔ موٹر، میر علی، مولوی اکرم، اباجان، زرتاج، زلال وغیرہ کو لے کے گھر چلی جائے گی۔ اکبر ہمارے ساتھ ہے کم ازکم اسے وہاں نہیں لے جانا چاہیے۔ آگے جانے کی کیا صورت ہو۔

میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے جتنا میں اُنہیں یکجا کرنے کی کوشش کرتا وہ اتنے ہی منتشر ہوتے۔ لگتا تھا یہ کوئی بھیانک خواب ہے خواب پر آدمی کو قدرت کہاں ہوتی ہے کچھ دیر میں آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ ابھی ایک گھنٹہ ہی تو ہوا ہے میں دادا اور ماچھی کو گلی کے آخری سِرے تک چھوڑ کے آیا تھا۔ بار بار میری نگاہیں جمرو اور ڈنگو کی طرف اُٹھتیں کہ وہ کہیں مجھ سے صبر آزما مذاق تو نہیں کر رہے؟ میرے صبر و ضبط کا امتحان لے رہے ہوں لیکن دونوں کی پھٹی ہوئی آنکھیں اُن کے جلتے چہرے دیکھ کے میرا سارا وجود ڈوبنے لگتا۔ موٹر آگے بڑھنے پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ مجھے بھی اُن سے مزید کچھ پوچھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ موٹر کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اور تیز چلانے کی ہدایت کی۔ ابھی ہم نے گلیوں کے دو ہی موڑ کاٹے تھے کہ ایک چوراہے پر جمرو نے موٹر رکوا دی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اکبر کو لے کے جولین کے گھر چلا جائے۔ شاید یہی مناسب تھا۔ یہاں سے جولین کے گھر سیدھا راستہ جاتا تھا۔ موٹر نہ پہنچنے کی وجہ سے اباجان پریشان ہو رہے ہوں

گے اور اچھا ہے کہ اس وقت وہ یہاں سے چلے ہی جائیں۔ یہ اطلاع انھیں بعد میں بھی مل سکتی ہے۔ اگر نے ہمارے ساتھ چلنے کی ضد کی لیکن جمرو نے ڈپٹ کر اسے منع کر دیا اور تاکید کی کہ وہ گھر جا کے کسی سے کچھ نہ کہے۔ یہی تاکید اس نے ڈرائیور کو بھی کی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس نے ان سے اور کیا کچھ کہا۔ موڑ مڑتے ہی ٹنگو کے اشارے پر میں نے دائیں جانب کی گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹنگو میرا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن چھوٹی ٹانگوں کے سبب وہ اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ مجھے اپنی رفتار بار بار کم کرنا پڑتی۔ اتنے میں جمرو بھی پیچھے سے بھاگتا ہوا ہمارے ساتھ آگیا۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی اور کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے لیکن جیسے جیسے ہم فاصلہ طے کرتے گئے، بھیڑ بڑھتی گئی۔ بیشتر مکانات کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، لوگ ٹکڑیوں میں ادھر ادھر کھڑے تھے۔ آگے رت جگے کا سا منظر تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، ہجوم نظر آتا۔ آگے پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ لوگ تو واپس آ رہے ہیں۔ میں نے رک کے کسی سے پوچھنا چاہا لیکن جمرو اور ٹنگو بڑھتے رہے۔ راستے میں سامنے [illegible] نے والے لوگوں کی وجہ سے ہمیں ایک طرف ہو جانا پڑتا۔ کبھی کوئی خود ایک طرف ہو جاتا یا اپنی جگہ ٹھیر جاتا۔ تین آدمیوں کو دور سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے دیکھ کے لوگوں کی توجہ ان کی طرف منعطف ہونی ہی چاہیے تھی لیکن ہم ان کے تجسس اور تردد کی فکر کیے بغیر بھاگتے رہے۔ غنیمت تھی تو پولیس کی، راستے میں کوئی بھی سپاہی رکاوٹ بن سکتا تھا مگر کسی ایسی رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا۔

سامنے چند قدم کی دوری پر ایک بڑا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ راستہ بند تھا اور ہر طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک منتشر مجمع ہے۔ چند سپاہی بھی چیخ چیخ کر لوگوں کو بکھر جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جمرو نے میرا بازو پکڑ کے مجھے وہیں روک لیا۔ ان دونوں کی سانسیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ جمرو نے سانس استوار کرنے کی بھی مہلت نہیں لی اور ہانپتی آواز میں سامنے کھڑے ہوئے ایک رن رسیدہ شخص سے بھیڑ کا سبب پوچھا۔ وہ شخص بھی ابھی ابھی آیا تھا تاہم اس نے بتایا کہ دو آدمیوں پر گولی چلی ہے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر ہم آگے بڑھ گئے۔ وہاں لوگوں کی ایک دیوار سی کھڑی تھی۔ باہر آتے، اندر جاتے، ایک دوسرے کو دھکیلتے شور مچاتے لوگوں کی دیوار کے پار کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے عبور کر کے اندر جانے کے خیال سے میرے پیروں میں بیڑیاں سی پڑ گئیں۔ دوسروں کی بے قراری، ان کی دیوانہ وار صداؤں سے ظاہر تھا کہ اندر کیا کچھ ممکن ہے۔ میں ان سے پیچھے رہ گیا۔ جمرو اور ٹنگو لوگوں کو ہٹاتے ہوئے اندر پہنچ گئے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ لوٹ جاؤں لیکن جمرو نے پلٹ کے مجھے اپنے پاس کھینچ لیا۔

اندر قدم رکھتے ہی میرا جسم سن ہو کے رہ گیا۔ وہاں ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ درمیان کی خالی جگہ فرش پر ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ جمے ہوئے خون کے لوتھڑے۔ ایک پولیس افسر اور سپاہی ٹارچوں اور گیس کی لالٹین کی روشنی میں جگہیں ناپ رہے تھے اور نشان زدہ دائرے سے لوگوں کو دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے چکر سا آنے لگا اور پھر میری آنکھوں میں بینائی نہیں رہی۔ جانے کتنے لمحے گزر گئے۔ مجھے اپنی کوئی سدھ بدھ نہیں تھی۔ جمرو نے مجھے ٹہوکا دیا تو میں اچھل پڑا۔ میں نے بہت نظریں چرانا چاہا لیکن نگاہیں زمین پر پڑے ہوئے خون پر منڈلاتی رہیں۔ خون جیسے میری آنکھوں میں بھی بھر آیا تھا۔ مجھے ہر طرف سرخی ہی سرخی دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ لوگ کدھر گئے؟" جمرو کی متوحش آواز پر میں نے گھوم کے دیکھا۔ اس نے کسی سپاہی کو روک لیا تھا۔

"کون لوگ؟" سپاہی نے برگشتگی سے کہا اور وہ سر سے پیر تک جمرو کو گھورتا رہا۔

"یہی لوگ جن کو گولی لگی ہے۔"

"تم ان کا کون لگتا ہے؟" سپاہی نے تلخی سے پوچھا۔

"ہم کیا لگتا؟" جمرو نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"ان کو ابھی اسپتال میں لے گیا ہے۔" سپاہی کے بجائے جمرو کے پہلو میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

میں نے بھی سن لیا تھا۔ "کون سے اسپتال میں؟" میں نے جھپٹتی آواز میں پوچھا "کیسے ہیں وہ؟..."

"تھوڑا جان باقی تھا۔" وہ بے رحمی سے بولا۔ "دادا لوگ تھا سالا! ایک دم جان دار، حرام کا اولاد۔"

مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ ڈکرانے اور ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ جمرو، ٹنگو اور سپاہی نے مجھے ہر طرف سے جکڑ لیا۔ سپاہی نے میرے منہ پر مکا بھی رسید کیا۔ ایک جانب کاغذ قلم ہاتھ میں دبائے ایک پولیس افسر کسی آدمی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ سپاہی نے اسے بھی آوازیں دیں۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ جمرو

کچھ ہوش میں تھا، اس نے تیزی سے مجھے اندر مجمع کی طرف کھینچ لیا۔ ادھر ٹنگو یقیناً سپاہی کے آڑے آگیا ہوگا جبھی میں اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اس اثنا میں جمرو اردگرد کے لوگوں کو دھکیلتا ہوا پوری طاقت سے مجھے کھینچتا گھسیٹتا باہر لے آیا۔ مجھ پر رعشہ طاری تھا۔ خاصی دور آجانے کے بعد جمرو نے مجھے ایک دکان کے چبوترے پر بٹھا دیا اور ہانپنے لگا۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس میری کمر تھپکتا رہا۔ اس کے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب کچھ زبان ہی سے تو نہیں کہا جاتا۔ اب مجھے خود احساس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ ہمیں جلد سے جلد اسپتال جانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ ٹنگو ہم سے بچھڑ گیا تھا لیکن ہمیں چبوترے پر کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی کہ وہ ہمیں ڈھونڈتا ہوا آنکلا۔ اسے دیکھتے ہی جمرو اٹھ گیا۔ ٹنگو کسی سے معلوم کر کے آیا تھا کہ انھیں ڈاکٹر شیورام کے اسپتال لے جایا گیا ہے اور یہ اسپتال یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جمرو دکانوں کے پچھواڑے کے ایک گلیارے میں داخل ہو گیا۔ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی مگر باہر نکلنے کے لیے یہی قریبی راستہ تھا۔ اب جمرو کی احتیاط میری سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی۔ سر دست یہاں سے دور ہو جانا ہی بہتر تھا۔ بھری گلی میں سپاہیوں کے تعاقب کا اندیشہ تھا۔ اس وقت تو وہ اپنے سائے پر بھی شک کر رہے ہوں گے۔ مجمع میں افراتفری ہو جانے سے ہمیں رل مل جانے کا موقع مل گیا تھا مگر ذرا سکون ہونے پر انھیں ہماری جستجو لازماً ہونی چاہیے۔ سیدھے راستے میں ہمیں دیکھنے والا کوئی شخص بھی پہچان سکتا تھا اور راستے کا پتھر بن سکتا تھا۔

گلیارے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند ہی قدم بعد ہمارے جوتے کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ ہر طرف گلی سڑی چیزوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کوڑا کرکٹ کی وجہ سے زمین بھی ناہموار تھی۔ ہم اندھوں کی طرح راہ ٹٹولتے ہوئے چلتے رہے۔ مجھ میں انھیں مشورہ دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ میری وجہ سے انھیں اس راستے پر آنا پڑا تھا۔ ہمیں راستے کا افسوس نہیں تھا جتنی دیر ہو رہی تھی لیکن دیر تو اور بھی لگ سکتی تھی۔ اگر جمرو مجھے وہاں بروقت تھام نہ لیتا تو کیا ہوتا؟ پھر وہاں سے اتنی آسانی سے نجات نہ ملتی۔ آگے چل کے جمرو کو بھی اندازہ ہو گیا کہ اس طرح دور تک چلتے رہنا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ہی عمارتوں کے درمیان ایک تنگ گزرگاہ نظر آئی، جمرو اسی طرف مڑ گیا۔ وہاں سے چلنے پر پختہ سڑک دکھائی دے رہی تھی لیکن جب تک ٹنگو نے آگے جا کے سڑک کا جائزہ نہیں لے لیا، ہم وہیں چھپے ٹھیرے رہے۔ یہ وہ گلی نہیں تھی جہاں سے ہم گزر کے آئے تھے مگر یہاں روشنی بھی تھی اور سڑک بھی صاف تھی۔ ابھی تک بہت سے لوگ موجود تھے۔ سب کا رخ اپنے گھروں کی طرف تھا۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ جمرو نے شاید عجلت میں فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم اسی متوازن رفتار سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے سیدھے راستے پر چلتے رہتے تو شاید کسی کو گمان بھی نہ ہوتا مگر یہ سب اکیلے جمرو ہی پر موقوف نہیں تھا۔ کیا وہی پتھر کا بنا ہوا تھا؟ ٹنگو کو اس علاقے کے راستے یاد تھے، مجھے بھی تھوڑے بہت معلوم تھے لیکن اس وقت سمت نہ وہ پہچان پا رہا تھا نہ میں۔ ہم چلتے رہے، کہیں نہ کہیں تو یہ گلی ختم ہوگی ہی۔ ہمیں زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی گلی ایک کشادہ سڑک پر پہنچ کے ختم ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر چوک کی تیز روشنیاں جل رہی تھیں اور گھنٹہ گھر کی گھڑی میں ایک بج رہا تھا۔ ٹنگو راستہ پہچان گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اسپتال تک پیدل کا فاصلہ تھا۔ لیکن چوک پر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کے کوچوان نے آوازیں لگا کے ہمیں روک لیا۔ اس سے کچھ کہے سنے بغیر ہم ٹم ٹم میں بیٹھ گئے۔ تینوں کے جوتے اور پائنچے کیچڑ میں سیاہ ہو گئے تھے اور بو اٹھ رہی تھی۔ ہم پہلے صفائی کر لیتے تو ٹھیک تھا، اب وقت نہیں رہا تھا۔ کوچوان نے ہمارے کہنے پر رفتار تیز رکھی۔ وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میری طرح ان کے جسم بھی ریت کے، راکھ کے ڈھیر ہو رہے ہوں گے، ان کی رگوں میں بھی آگ دہک رہی ہوگی۔ پیچھے سے موٹر کا ہارن گونجنے پر وہ دفعتہ سیدھے ہو گئے۔ کوچوان نے بھی ٹم ٹم ایک طرف کر لی، پولیس کی ایک جیپ تیزی سے گزر گئی۔ اس میں سپاہی بھرے ہوئے تھے۔ انھیں ہماری طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ جمرو اور ٹنگو اچک اچک کے انھیں دیکھتے رہے۔ مگر جیپ آناً فاناً نگاہوں سے مفقود ہو گئی تھی۔ کوچوان گھوڑے کو چابک مارتا ٹم ٹم پھر سڑک پر لے آیا۔ جتنی دیر ٹم ٹم چلتی رہی، میں اپنے آپ کو نوچتا کھسوٹتا رہا کہ مجھے ہر حال میں خود کو سمیٹ کے رکھنا چاہیے، اپنا سب کچھ سمیٹ کے، میری طرح دوسروں کی بینائی بھی کسی لمحے ان سے چھن سکتی ہے۔ اپنے اوسان کی جتنی مجھے ضرورت ہے، اتنی ہی دوسروں کو بھی ہے۔ اس وقت مجھے بس ایک ہی دعا کرنی چاہیے، خدا کرے دادا اور رمّا بھی خیریت سے ہوں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ راستے بھر میں خود کو یہی تاکید میں کرتا رہا مگر مجھے اس خود فریبی کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ دس منٹ سے بھی کم عرصے میں ٹم ٹم ڈاکٹر شیورام کے اسپتال پہ جا کے ٹھیر گئی۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ بنگلے کے طرز کی ایک دو منزلہ عمارت تھی

پتھروں سے بنی ہوئی ایک قدیم عمارت۔ گیٹ پر دربان پہرا دے رہا تھا۔ اُس نے ہمیں روکنا چاہا لیکن جمرو نے اندر پولیس کے پاس جانے کا عذر کیا۔ دربان نے زیادہ پس و پیش نہیں کی۔ جمرو کو وہاں پولیس کی موجودگی کا پختہ یقین تھا۔ اسپتال کے احاطے میں قدم رکھتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا جیسے کوئی مجھے دھکیلتا گھسیٹتا لیے جا رہا ہو۔ میں اُن دونوں کے ساتھ قدم بڑھاتا رہا۔ پھلواری اور عمارت کے درمیان گھومتے ہوئے پکّے راستے سے گزر کے ہم خاص دروازے تک پہنچ گئے۔ کاریڈور کے آس پاس کھلی جگہ پر پولیس کی کئی موٹریں کھڑی تھیں اور سامنے کے کشادہ اور روشن دالان میں کئی بندوق بردار سپاہی موجود تھے۔ ہم پوچھیا ملے کیا ہی چاہتے تھے کہ انھوں نے ہمیں ٹھیر جانے کا حکم دیا اور ایک سپاہی نے قریب آ کے دھتکارتے لہجے میں ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں۔ جمرو نے اُن سے تصدیق چاہی کہ کیا پیرو اور راچھی دادا کو یہیں لایا گیا ہے؛ وہ اُن سے ہمارا تعلق پوچھنے لگا۔ جمرو نے جھجکتے ہوئے خود کو اُن کا عزیز بتایا۔ ہمیں دیکھ کے سپاہی کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی تھی، اُس کی نظریں مسلسل ہمارے پیروں پر بھٹک رہی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتا، میں نے اُس سے دادا کا حال پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے وہ لپکتا ہوا عمارت کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ چند لمحوں میں وہ نمودار ہوا تو اُس کے ساتھ ایک پولیس افسر بھی تھا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آئے۔ پولیس افسر وہی سوال دہرانے لگا جو سپاہی پہلے کر چکا تھا، پھر اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ ابھی اندر ڈاکٹر کے ساتھ ہے۔"

"کیسے ہیں وہ لوگ....؟" میں نے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں بول سکتا۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا، کیا ہم اندر نہیں جا سکتے؟"

"کیا کرے گا تم جا کے؟...." اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، پھر اُسے کچھ خیال آیا، ناگواری سے کہنے لگا: "ٹھیک ہے، تم ابھی بیٹھ کے تھوڑا انتظار کرو۔" اُس نے سپاہی سے کہا کہ وہ ہمیں اندر لے جا کے بٹھا دے۔ یہ کہتے ہی وہ چلا گیا تھا مگر جاتے جاتے لوٹ آیا اور تحکمانہ لہجے میں ہم سے بولا کہ اُسے ہم سے ضروری بات کرنا ہے، اطلاع دیے بغیر ہم واپس نہ جائیں۔

سپاہی نے ہمیں دالان سے ملحق ایک کشادہ اور روشن کمرے میں پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، وہ تینوں وہاں موجود نہیں تھے، تجھل، شامو اور مارٹی۔ ہم ایک طرف کونے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سپاہی واپس چلا گیا۔ کئی منٹ گزر گئے، کسی نے ہماری خبر نہیں لی۔ کمرے کے ساتھ ہی شاید کوئی راہداری تھی جہاں سے ہلکی ہلکی چاپیں اور مضطربانہ سرگوشیاں سی سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے سے راہداری میں کھلنے والا دروازہ بھی وا تھا۔ میں اُس طرف جا کے راہداری میں دیکھنے کے بجائے اپنے آپ کو جکڑے بیٹھا رہا، مگر میرا دم گھٹ رہا تھا۔ گیتا اور پیرو کی بیوی رانی کی صورتیں بار بار آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھیں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو میں اُنھیں اُن کے گھر چھوڑ کے آیا تھا۔ گیتا دادا سے ضد کر رہی تھی کہ وہ اُن کے ساتھ گھر کیوں نہیں چل رہا۔ دونوں کیسی مطمئن اور خوش گھر لوٹی تھیں۔ اُن کے خیال سے میرا دل ہولنے لگا۔ خدا دادا کو سلامت رکھے، میری زندگی ویسے بھی کسی کام کی نہیں، کاش یہ دادا کو لگ جائے۔ میں وہاں بیٹھا بس دعائیں کرتا رہا۔ اِس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ جمرو اور ڈنگو کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ دروازے پر ذرا سی آہٹ ہوتی تو دونوں چونک پڑتے۔ کوئی بھی اندر نہیں آیا۔ لگتا تھا پولیس افسر اور سپاہی ہمیں یہاں بٹھا کے بھول گئے ہیں۔ دیواری گھڑی میں ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ویسے ہمیں یہاں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا لیکن وقت تو گھڑی پر نہیں، آدمی پر موقوف ہے، آدمی پر کیسا گزر رہا ہے۔ یہ چند منٹ ہم پر پہاڑ کے مانند گزرے تھے۔

پھر مجھ سے ایسے بے دست و پا کسی معذور و مفلوج کی طرح نہ بیٹھا گیا۔ میں اُٹھ کے سیدھا راہداری میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایک راہداری ہی تھی، گلی جیسی، اِس سرے سے اُس سرے تک دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ سفید گاؤن میں اسپتال کے متوسل عملے کے علاوہ پولیس افسر اور سپاہی۔ پہلے میں نے سر نکال کے باہر کا جائزہ لیا۔ تجھل، شامو اور مارٹی کے چہرے دور تک دکھائی نہیں دیے۔ یہاں اُنھیں ضرور ہونا چاہیے تھا۔ یقیناً وہ کسی کونے یا کسی اور کمرے میں ہوں گے۔ میں دروازے سے باہر آ گیا، پھر جیسے ہی پہلو کے کمرے سے مجھے ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر نکلتا نظر آیا، میں جھپٹ کے اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جلدی میں تھا تاہم اُس نے رک کر کبیدگی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے دبی دبی آواز میں اُس سے دادا اور راچھی کے بارے میں معلوم کیا۔

"ہم کوشش کر رہے ہیں لیکن اب دعا کی ضرورت ہے۔ دعا کرو میرے بیٹے۔" وہ مجھ سے معذرت کرتا ہوا راہداری میں چلا گیا۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ میری سانس سینے میں اٹک گئی تھی۔ درمیان میں کسی سپاہی نے آوازیں دے کے مجھے ٹھیرنے کا حکم دیا تھا مگر میرے ڈگمگاتے قدم تیزی سے اُس طرف بڑھتے رہے جدھر ڈاکٹر گیا تھا۔

چند گز کے فاصلے پر مجھے ٹھٹک کے رک جانا پڑا۔

راہداری کے بیچ میں بنے ہوئے بیضوی دائرے کے دائیں حصے میں جمگھٹا سا لگا تھا۔ ریس اسپتال کے عملے کے لوگ ایک بند کمرے کے گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ پولیس افسر بھی وہاں تھا جس نے مجھے، جمرو اور ڈنگو کو کاریڈور میں روکا تھا۔ کمرے کی چوکھٹ پر سُرخ بتی جل رہی تھی۔ اسی کمرے میں وہ دونوں ہوں گے۔ اُس پر آپریشن تھیٹر کی تختی بھی نصب تھی۔ میرے دل میں بس یہی آئی کہ دروازے کے پہرے دار کو ہٹا کے سیدھا اندر داخل ہو جاؤں۔ بعد میں چاہے مجھے دھکے دے کے باہر نکال دیا جائے۔ دادا کیسا بھی ناراض ہو، کتنے ہی غصّے میں ہو، میری آواز سن کے اُس کا چہرہ ہمیشہ کھل اُٹھتا ہے، وہ مجھے اپنی گیتا کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ میں جا کے اُسے گیتا اور رانی کا واسطہ دوں گا۔ شاید میری آواز اُس کا حوصلہ بحال کر سکے، میری صوت اُس کے وجود کے اندھیرے میں کوئی کرن ثابت ہو۔ آدمی بھی تو آدمی کی دوا ہوتا ہے۔ میری صدا پر وہ ایسا غافل نہیں رہ سکے گا۔ وہ کتنی بار میری خاطر اپنی جان داؤ پر لگا چکا ہے، اِس بار میں اُس سے زندگی مانگوں گا۔ مجھے کسی تاخیر کے بغیر اندر جانا چاہیے۔ میں ڈاکٹروں سے عاجزی کر لوں گا کہ صرف چند لمحوں کے لیے اُس کے پاس جانے کی مہلت دے دیں اور روپے پیسے کی کوئی فکر نہ کریں، میرے پاس دھن دولت کی کمی نہیں ہے۔ ابّا جان کے پاس بے شمار نادر و نایاب ہیروں کا خزانہ ہے۔ ڈاکٹر جو چاہیں اُس میں سے لے لیں، بس کسی طرح دادا کا ہوش واپس لے آئیں۔ تجھل بھی نظر نہیں آ رہا، وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں وہ اندر تو نہیں ہے؟ اُسے تو دادا کے سرہانے ہی ہونا چاہیے۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں اندر داخل ہو جاتا مگر دوسرے ہی لمحے وہ تینوں مجھے نظر آ گئے۔ ایک کونے میں کمرے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کرسیوں پر تجھل، شامو اور مارٹی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر بھی اُن کے قریب بیٹھا کاغذوں پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اتنی سی دیر میں وہ تینوں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ بکھرے ہوئے بال، سوجے سوجے چہرے، کپڑوں پر خون کے دھبے۔ اُنھیں اِس حال میں دیکھ کے میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ میں اُنھیں آوازیں دیتے دیتے اُن کی طرف جاتے جاتے رہ گیا۔ اُسی وقت مارٹی اور شامو نے مجھے دیکھ لیا، جیسے اُنھیں بس میرا انتظار تھا۔ وہ اُمڈتے ہوئے میری طرف بڑھے اور آ کے مجھ سے چمٹ گئے۔ مارٹی پھڑکنے لگا۔ اُس کی سسکیوں سے میرا سینہ کٹ رہا تھا۔ میں اُسے کیا دلاسا دوں؟ اُس کی کمر تھپک کے چپ کراؤں؟ کیا کروں؟ زبان کی طرح میرے ہاتھ بھی اینٹھ گئے تھے۔ ایک نادار دوسرے نادار کے آگے، ایک تہی دست دوسرے تہی دست کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو دوسرا کیا کرے۔ شامو کو جانے کیا ہوا۔ وہ مارٹی کو اُسی وقت میرے پاس سے لے گیا اور اُنھی کرسیوں پر جا کے بیٹھ گیا۔ میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ میں اکیلا ہی کھڑا رہا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چوکھٹ کی سُرخ بتی بجھ گئی اور دروازہ کھلنے پر کئی ڈاکٹر ایک دوسرے کے آگے پیچھے برآمد ہوئے۔ اُن کی پیشانیوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اُنھیں دیکھتے ہی سب اُن کی طرف لپک پڑے۔ تجھل کو بھی میں نے کرسی سے اُٹھتے دیکھا، پھر وہ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے بھی اُن کی جانب بڑھنا چاہا تھا لیکن مجھ سے ایک قدم بھی نہ چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے شور سا اُٹھا، پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اِس سنّاٹے کا مطلب میری سمجھ میں بعد میں آیا کہ وہ دادا اور راچھی کے بارے میں فیصلہ سنا رہے ہیں۔ میرا سارا جسم دھڑکنے لگا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں، یا تو یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں یا سب میری آنکھوں کا جھوٹ، میرے دماغ کا فتور ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے کے جیتے جاگتے آدمی اِس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟ میرے جی میں آئی کہ میں زور زور سے چیخوں، اپنا سر دیواروں سے پھوڑ لوں یا پولیس افسر سے تمنچا چھین کے سب کو گولی مار دوں، اِس جگہ ہی کو آگ لگا دوں مگر مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اُنھوں نے ڈاکٹروں کے لیے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ میں بُت کے مانند کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے سامنے سے گزر گئے۔

آدمی عناصر کا مرکب ہے تو حواس سے بھی عبارت ہے۔ بے حواسی بھی ایک قسم کی موت ہے۔ میں بھی کچھ دیر کے لیے مر گیا تھا، اندھا ہو گیا تھا کیونکہ میری استطاعت یہی تھی۔ کاش ایسا ہی رہتا، میرے حواس کبھی نہ جاگتے، میری آنکھیں بند ہی رہتیں۔ یہ عارضی موتیں تو آدمی کے لیے اور عذاب ہیں۔

مارٹی میرے سینے سے لپٹ کر رونے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کون ہوں، یہ جگہ کون سی ہے اور سامنے کے کمرے میں کون بے حس و حرکت.... مارٹی مجھ سے چمٹ چمٹ کے رو رہا تھا اور وہی سوئیاں میرے تن بدن میں پھر چبھنے لگی تھیں۔ کیا وہ دونوں اتنے اکیلے، اتنے بے وقعت ہیں کہ اُن کے لیے یوں آسانی سے حکم صادر کر دیا جائے؟ پہلے بھی کئی بار میرے سینے میں گرج اُٹھی تھی کہ مجھے سیدھے باڑے جانا چاہیے۔ اُس کتے کے لیے چاہے مجھے اِس سرے سے اُس سرے

تک بمبئی کے ایک ایک باڑے جانا پڑے۔ وہ کوئی بھی ہو اور کتنے بھی ہوں، میں انھیں مہلت نہیں دوں گا۔ دادا کا خون ایسا ارزاں نہیں کہ اتنی دیر لگے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دادا اور ماچھی کے صرف اپنے ہاتھ پیر ہی نہیں ہیں، اُن کے اَن گنت ہاتھ پیر ہیں۔ دادا اور ماچھی ہی کے خیال نے اب تک مجھے روکے رکھا تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اب کس بات کا انتظار ہے؛ مجھے تو اُسی وقت نکل جانا چاہیے تھا۔ میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ تجمل اور سب ہنگامے سے چل پڑیں اور مجھے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑے۔ مجھے نکل جانا چاہیے ورنہ وہ مجھے نہیں جانے دیں گے اور میرا جسم اسی طرح جلتا رہے گا۔ اُن کمینوں تک کسی اور کے پہنچنے سے پہلے مجھی کو پہنچ جانا چاہیے۔

مَیں نے سارنگی کو اپنے بازوؤں سے الگ کر دیا۔

وہ سب منتشر ہو چکے تھے۔ میری نظریں بے اختیار تجمل کی طرف گئیں۔ وہ پولیس افسر اور سپاہیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ جمرو اور شنکو بھی مجھے اُن کے قریب کھڑے دکھائی دیے۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ میں وہیں ٹھیرا رہا۔ کسی طرف کا رُخ کرنے سے پہلے مجھے اپنے آپ کو طمانچے مارنے کی ضرورت تھی۔ اپنی بینائی کی درستی اور دل و دماغ کی یک جائی کے بغیر میں اُن تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر عین اُس وقت جب میں وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا شامو میرے پاس آ گیا اور اُدھڑی اُدھڑی آواز میں کہنے لگا کہ مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیے۔

"کیوں؟" مَیں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"وہ ہم کو تھانے لے جا رہے ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

"تھانے! مگر کس لیے؟"

"تھوڑی پوچھ تاچھ کے لیے۔"

"اب کیا پوچھا رہ گیا ہے؟"

"بول رہے ہیں تو جانا پڑے گا۔ تو گھر جا کے پہلے بابا کو بول دے اور باڑے میں بھی بول آ۔ اور ذرا اور سمجھے تو اُدھر دادا کے گھر...." اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"بولنا تو ہو گا لاڈلے!" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں، مگر تجمل بھائی ہی کو بھیجنا۔"

"ہم کو اُدھر دیری بھی لگ سکتی ہے۔"

"کیوں؟"

"سمجھا کر، پولیس کو تو تُو سارا جانتا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"اپنے کو بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا لاڈلے کہ یہ کیا ہو گیا، یہ سب کیا ہو گیا۔" وہ سسکتے ہونٹوں سے بولا۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے شامو!"

"ہم جلدی آنے کا کریں گے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے، ایسا کر، تُو ابھی باڑے کی طرف مت جا۔"

پولیس افسر کی آواز پر وہ کوئی توقف کیے بغیر میرے پاس سے چلا گیا۔ میں بھی اُسی لمحے راہ داری میں مڑ گیا۔ مَیں نے راہ داری عبور کر لی اور کاریڈور کی سیڑھیاں طے کر کے دروازے کی جانب دُور تک چلا آیا۔ معاً کسی نے پیچھے سے اونچی آواز میں ٹھیر جانے کا حکم دیا۔ میرے قدم رکھ گئے تھے لیکن میں دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔ پھر پیچھے سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ مَیں نے سوچا، باقی فاصلہ دوڑ کے طے کر لوں اور جلد از جلد دروازے سے گزر جاؤں، مگر وہ بالکل میرے سر پر آ گیا اور مجھے ٹھیرنا پڑا۔ "کدھر کو جاتا ہے؟" اُس نے تیز تیز سانسوں میں مجھ سے پوچھا۔ وہ ایک سپاہی تھا۔

مَیں نے اُسے بتانا چاہا کہ میں گھر جا رہا ہوں۔

"تم کو ابھی کچھ بولا تھا صاحب نے؟" میں چپ رہا تو وہ بھری ہوئی آواز میں بولا: "چلو، ابھی ساتھ چلنے کا ہے۔"

"کیوں؟" مَیں نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ اُدھر افسر لوگ سے پتہ کرنا۔"

وہ ایک ہی آدمی تھا۔ اُس کے شانے پہ بندوق لٹکی تھی۔ میرے دل میں اُس کی گردن دبوچ لینے اور اُسے قریب کی باڑھ کے پیچھے لُوٹ دینے کا خیال آیا۔ اُس طرف اتنی روشنی نہیں تھی اور میرے لیے دروازہ بھی دُور نہیں رہا تھا، لیکن مَیں نے خود کو روک لیا۔ اُس نے میرے بازو پر ہاتھ مار کے مجھے کاریڈور کی جانب دھکیل دیا۔ کاریڈور تک وہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ تجمل، جمرو اور شامو بھی موٹروں کے پاس آ چکے تھے۔ پولیس افسر میرا منتظر تھا۔ دُور سے مجھے دیکھ کے ناراض ہونے لگا کہ کیا مجھے ٹھیک سنائی نہیں دیتا۔ میں اُسے اطلاع دیے بغیر کہاں جا رہا تھا؟ میرے خاموش رہنے پر وہ اور جز بز ہونے لگا۔ تو ایک دوسرے پولیس افسر نے آ کے اُسے ٹوکا اور عجلت کا مشورہ دیا، تب اُس کی زبان قابو میں آئی۔ تجمل اور جمرو پہلے ہی سوار ہو چکے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی جیپ چل پڑی۔ راستے بھر خاموشی رہی۔

تھانے کے ایک وسیع اور روشن کمرے میں انھوں نے ہمیں بینچوں پر بٹھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں تیز تیز قدموں سے تین پولیس افسر اندر داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں کاغذات تھے۔ ایک عمر رسیدہ افسر کی بغل میں ڈنڈا بھی دبا تھا۔ ڈنڈا میز پر رکھ کے اُس نے ہم سے کچھ فاصلے پر درمیان کی کرسی سنبھال لی۔ باقی دونوں افسر اُس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اُن میں سے دو کو مَیں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے پیچھے دیوار کے ساتھ دو سپاہی بندوقیں لٹکائے مستعد کھڑے تھے۔ دروازے پر بھی دو مسلح سپاہی تعینات تھے۔ ایک سپاہی میز کے قریب ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ افسر کاغذات الٹ پلٹ رہے تھے کہ برابر بیٹھے ہوئے جمرو نے آہستگی سے میرا ہاتھ دبایا: "تھوڑا سنبھل کے۔" اُس کے کہنے پر مَیں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "اپنے کو سارا دھیان رکھنا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ مَیں نے اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی، کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے جو یہ وقفے وقفے سے مجھے ٹھوکے دے رہا ہے؟ یہی کچھ شامو نے کمرے میں داخل ہوتے وقت مجھ سے کہا تھا: "تھوڑی سی بے دھیانی سے دیر لگ سکتی ہے۔" جمرو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ کیسا دھیان؟ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ ہمیں کس قسم کا دھیان رکھنا ہے اور ہم یہاں ایسے بے زبانوں کی طرح کیوں بیٹھے ہیں؟ میں جمرو سے پوچھنا چاہتا تھا، مگر اُس نے کہنی مار کے مجھے میز کی طرف متوجہ کیا۔ درمیان والے عمر رسیدہ پولیس افسر کی نگاہیں ہم پر منڈلا رہی تھیں۔ اُس نے عینک اُتار کے میز پر رکھ دی اور بھاری آواز میں تجمل کو مخاطب کیا: "جیسا تم نے بولا ہے، یہ لوگ تھوڑی دیر پہلے گھر سے نکلا تھا، کوئی دس بجے کے قریب؟"

"ہاں صاحب!" تجمل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور اندھیری جانے کا بول کے گیا تھا؟"

تجمل نے سر ہلا کے ہاں میں جواب دیا۔

"پھر تم کو کبھی اور کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم سب پہلے بول چکے ہیں۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔

پولیس افسر نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ اور کاغذات ٹٹولنے لگا: "تم کتنی دیری بعد وہاں پہنچا تھا؟"

"یہ بھی ہم نے بول دیا ہے۔"

بائیں طرف والے ادھیڑ عمر افسر کی پھیلی پھیلی آنکھیں تجمل پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے نسبتہً نرم آواز میں کہا: "کوئی بات رہ گئی ہو تو یاد کر کے ہم کو بولو۔"

"یاد آنے پر ضرور بول دیں گے۔" تجمل بھن بھناتی آواز میں بولا۔

"کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے پولیس کو تمھاری مدد کی ضرورت پڑے گا۔ ہم کو کھل کے بتاؤ، ابھی تمھارے خیال میں کون اِن لوگوں کا دشمن ہو سکتا ہے؟"

"اپنے کو پتہ ہوتا تو پہلے اُدھری جاتے۔"

"وہ قانون کا کام ہے، ہمارا کام۔ اور ہم انھیں کھوج لے گا۔ انھوں نے کن لوگوں پر ہاتھ ڈالا ہے، ہم بھی جانتا ہے۔ اِدھر سپاہی لوگ نے اُس کو پہچان لیا ہے۔ وہ پیرو دادا ہے۔"

"صرف دادا ہی نہیں بولو۔"

"ہاں۔" ادھیڑ افسر جلدی سے بولا: "بڑا دادا، ہم کو معلوم ہے، ایک نمبر کا دادا۔"

تجمل سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"تم نے بولا کہ تم لوگ اِدھر بمبئی کا نہیں ہے اور پیرو دادا تمھارے کسی آدمی کے بیسیوں پر اندھیری سے ماچھی دادا کے ساتھ آیا تھا، کچھ دیر ٹھیرا اور چلا گیا۔ ایسا ہی بولا تھا تم نے؟"

"ایسا ہی۔" تجمل نے ہنکاری بھر دی۔

"تم ابھی کدھر سے بمبئی آیا تھا؟"

"اپنی بات چھوڑو، ابھی اُس کی بات کرو۔"

"اُسی کے لیے پوچھتا ہے۔" دائیں طرف کی کرسی والے نوجوان پولیس افسر نے ترشی سے کہا۔

"اُلٹی طرف سے مت چلو۔"

"پھر سیدھی طرف کا تم بولو۔"

"کیا بولیں، اپنے پاس ابھی کیا رہ گیا ہے۔" تجمل نے گہری سانس بھر کے کہا: "دادا کو ابھی تم نے کدھر بھیجا ہے؟"

"دونوں کا پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال میں۔"

"اپنے کو کب تک مل جائے گا؟"

"زیادہ دیری نہیں لگے گا۔" درمیان میں بیٹھے ہوئے افسر نے کہا: "پر اُن کو ابھی تمھارے حوالے کیوں کرے؟"

"پھر کس کو کرو گے صاحب؟"

"تم اُس کا وارث نہیں ہو۔"

"ہم انھی کے پاس لے جائیں گے۔"

"تم ماں انھیں جانتے ہو؟" نوجوان افسر نے تیزی سے پوچھا۔

"نہ جانتے تو ٹھیک تھا۔" تجمل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے، ماہم کے باڑے میں؟"

"وہ اپنے گھر رہتا ہے۔"

"گھر! گھر کدھر ہے؟"

"اِدھر شہر میں ہی ہے۔"

"تم بتانا نہیں چاہتا؟"

"بتا دیں گے پر پہلے ہم کو اُدھر جانا ہوگا۔"

"تم کو کیوں؟"

"اُس کو دیکھ کے وہ مر جائیں گے، ہم کو پہلے جا کے اُن کو سنبھالنا ہوگا۔" مچھل کی آواز بھرّا رہی تھی۔

"کون کون لوگ ہے اُدھر؟"

"بیوی اور بیٹی۔"

"بیوی اور بیٹی!" نوجوان افسر نے دُہرایا۔

"کیوں! نہیں ہو سکتا صاحب؟"

"ہو سکتا ہے۔" پولیس افسر پہلو بدل کے بولا۔

"وہ اُن لوگ کو سب سے دُور رکھتا تھا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ بیوی اور بیٹی نہیں جانتا تھا کہ وہ باڑا چلاتا ہے، پاکٹ میں ہر وقت چاقو رکھتا ہے، کتنی بار جیل جا چکا ہے، سارا بمبئی کے دادا لوگ کا وہ راجا ہے؟"

مچھل نے کچھ نہیں کہا۔

"بولو! چپ کیوں ہو گئے؟"

"آپ کرسی پر بیٹھے ہو۔"

"لگتا ہے، بہت قریب تھا تم اُس کے؟"

"آپ کو بُرا لگتا ہے صاحب؟"

"نہیں۔" پولیس افسر نے سر جھٹکا۔ "لیکن...." وہ کچھ سوچ کے رک گیا اور مضطرب آواز میں بولا۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟"

"کاغذ پر لکھا ہے۔"

تینوں افسر کاغذ لوٹنے پلٹنے لگے۔ "مچھل!" نوجوان افسر نے تندی سے کہا۔ "صرف اتنا ہی نام ہے تمھارا؟"

مچھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"دادا کا جان کار کیا کر سکتا ہے۔"

"دادا گیری! یا تم بھی دادا ہے، کدھر؟"

"ابھی تو اُدھر ہی ہے، کام کی بات کرو صاحب!"

"دیکھو مچھل دادا!" اُدھیڑ افسر نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اچھا ہوگا کہ تم سے جو پوچھا جائے سوچ سمجھ کر ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

"یہ آپ کے ٹھیک ٹھیک بولنے پر ہے۔" مچھل نے کہا۔ "آپ کی ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔"

"تم اپنے ہوش میں نہیں ہے۔" نوجوان افسر برہمی سے بولا۔ بیچ میں بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ افسر نے میز پر جھک کے اُسے تحمل کی تلقین کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں مچھل سے کہا۔ "یہ پولیس اسٹیشن ہے دادا! اور تم پولیس کے سامنے بیٹھا ہے۔"

"نہیں بیٹھے ہیں۔"

"ایسا ہی لگتا ہے پر تم اِدھر ضرور نُوا نُوا ہے۔ یہ بمبئی کا پولیس ہے۔ اس کے بارے میں تم نے تھوڑا بہت سنا ہوگا۔"

"اُوپر سے اُترکے نہیں آیا ہے۔" مچھل کی آواز تڑخنے لگی تھی۔ "ہم بولتے ہیں، اپنے آپ کو زیادہ مت اُلجھاؤ۔ دُور چلے جاؤ گے، اِدھر اُدھر کی منہ ماری سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ آپ لوگ کیسا آدمی ہے۔ اِدھر اپنا دو بھائی چلا گیا ہے اور آپ مخول کر رہے ہو۔"

"یہ مخول ہے؟" نوجوان افسر بھڑک کے بولا۔

"ہم اِدھر پاکٹ مار کے نہیں آئے ہیں یا آپ کے گھر ڈاکا ڈال کے۔"

"تم ایک خون بلکہ دو خون کے گواہ ہو۔" دائیں طرف والے افسر نے کہا۔ "یہ پاکٹ مارنے اور ڈاکا ڈالنے سے بڑا...."

"اپنے دو آدمیوں کا خون ہو گیا ہے۔" مچھل اُس کی بات کاٹ کے اونچی آواز میں بولا۔ "ایسا بولو صاحب۔"

"ایسا ہی ٹھیک ہے اور تم وہ پہلا آدمی ہے جو اُس کو پوچھتا ہوا آیا تھا۔"

"ہم کو دو کے تیسرے نمبر پر آنا چاہیے تھا کیا؟"

"اپنا آواز تھوڑا نیچا رکھو۔ ضرورت سے اُوپر اونچا ہے، سمجھا۔"

"اپنے کو بھی آپ سے یہی شکایت ہے۔"

میں نے بے چینی سے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیوں گونگے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔ اُن سے کہتے کیوں نہیں کہ وہ ہم سے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں جن کا کچھ حاصل نہیں۔ یہ لوگ پولیس سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو مچھل ہی کو روک لیں۔ کم از کم وہی اپنا لہجہ بدل سکتا ہے۔ جمرو اور شامو جو ہدایتیں مجھے دے رہے تھے، وہ مچھل کو دینی چاہیے تھیں۔ مچھل حواس میں نہیں معلوم ہوتا، ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں جانتا ہوں اُس کے سینے میں کیسا تلاطم برپا ہوگا۔ میں نے طے کیا کہ میں دخل دوں اور اُن سے کہوں کہ کچھ تو ہمارا خیال کریں۔ اُنھیں کوئی اندازہ نہیں کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم کس طرح جبر کیے یہاں بیٹھے ہیں۔ اس کارروائی کے لیے وہ کوئی اور وقت نہیں رکھ سکتے؟ میں یک لخت

اُٹھ گیا لیکن فی الفور اِدھر سے جمرو نے اُدھر سے شامو نے میرے بازو کھینچ کے مجھے بٹھا دیا۔

"کیا ہے؟ کیا ہے؟" کمرے میں ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔

"کچھ نہیں صاحب! کوئی بات نہیں۔" شامو نے جلدی سے کہا۔

"یہ کون ہے؟" نوجوان افسر نے درشتی سے پوچھا۔

"اپنا بھائی ہے صاحب!"

"ابھی کیا ہو گیا اس کو؟ کیا بولتا ہے؟"

"کچھ نہیں صاحب آپ اپنا کام کرو۔" شامو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور کترائی ہوئی آواز میں مجھے سمجھانے لگا۔ "ابھی اُستاد کو رہنے دے۔"

پیچھے کھڑے ہوئے دونوں سپاہیوں نے بندوقیں سیدھی کر لی تھیں، دروازے پر تعینات سپاہی بھی آگے آ گئے تھے۔ تینوں افسروں کی نگاہیں دیر تک مجھ پر مرکوز رہیں، پھر نوجوان افسر نے ناگواری سے کہا۔ "کوئی اور کچھ بولنا مانگتا ہے؟"

سب خاموش رہے۔ مچھل نے بھی کچھ نہیں کہا۔

"سنو دادا! ذرا غور کر کے سنو۔" بیچ والے افسر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم کو تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"اپنے کو آپ سے زیادہ ہے۔" مچھل کی آواز بھی کسی قدر سنبھلی ہوئی تھی۔

"ہم کریں گے اگر جیسا تم بولتے ہو۔ ہم کو بھی دُکھ ہے کہ تمھارے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ اِدھر قریب میں بڑے دادا اور ماہمی دادا سے کسی کا دنگا فساد تو نہیں ہوا تھا؟ اپنا مطلب ہے، تمھیں کسی پر شک ہو تو صاف صاف بولو۔ پولیس اپنا کام کرے گی۔ وہ جدھر بھی ہے، پولیس سے دُور نہیں ہے۔"

"آپ کو سارا بول دیا ہے، ہم دادا کی صورت دیکھنے پیچھے آئے۔ دادا سے پہلے اُس حرام کے تخم کا کریا کرم کرتے۔"

"تم کو اس کا اجازت نہیں ہے۔ تم سے ابھی کیا بولا کہ اس کے لیے ہم موجود ہے۔ ہم کس لیے اِدھر بیٹھا ہے۔"

"آپ کو دیر لگے گی صاحب اور ہم کو یہ راس نہیں آتی۔"

"اِس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ تم خود وہاں پہنچنا چاہتے ہو اور اسی لیے ہم کو کچھ بتانا نہیں چاہتے؟"

"آپ ٹھیک سمجھے ہو، یہ اپنا حساب ہے۔ پتہ ہونے پر بھی ہم آپ کو تکلیف نہیں دیں گے۔"

"ہم تمھیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔"

"آپ کا کام بعد میں شروع ہوتا ہے۔ بولو تو سگے، بعد میں آپ کے پاس آ جائیں گے۔"

"تم غلطی پر ہے، ہمارا کام پہلے بھی شروع ہوتا ہے۔ ہم تمھیں ابھی کو اِدھر روک سکتے ہیں۔"

"آپ کس کس کو روکو گے؟"

"تم سب کو، ہم تم سب کو روک سکتے ہیں۔"

"اور اُدھر جو بے گنتی کے بیٹھے ہیں؟ اُدھر اُس کی بولی لگانے والے تھوڑے نہیں ہیں۔ آپ سمجھتے ہو دادا ایسا اکیلا آتا جاتا تھا؟" مچھل نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور اِدھر کون سی دیوار پر لکھا ہے کہ آپ ہم کو ایسے روک سکتے ہو۔"

"روک سکتے ہیں۔" اُدھیڑ افسر کرختگی سے بولا۔ "اپنے پاس بہت اُدھیکار ہے۔ ایک نہیں کئی چارج لگا کے۔ تم جو ابھی بولے، کام بول رہا ہے، یہی چارج لگا کے ہونے والے خون خرابے کی روک تھام کے لیے، پولیس تم کو شک میں بھی روک سکتی ہے۔"

"کتنے دنوں تک؟"

"جب تک تمھارا دماغ ٹھکانے پر نہ آ جائے اور ہم کسی ٹھیک جگہ نہ پہنچ جائیں۔ جب تک ٹھیک آدمی کا گریبان پہ اپنا ہاتھ نہ پہنچ جائے اور جب تک تم پہ اپنا شک دُور نہ ہو جائے۔ تم نہیں جانتا، ابھی تم پہ شک کرنے کو کتنا کتنا پوائنٹ بنتا ہے۔ تم اِدھر بمبئی کا رہنے والا نہیں ہے، بمبئی پولیس تمھارا آگا پیچھا بھی ایک دم نہیں جانتا۔ دادا تمھارے گھر سے لوٹ رہا تھا اور رستے کا نام کام کو اچھی طرح پتہ تھا۔ دادا کا جان پہچان والے میں تم سب سے پہلے پہنچا تھا، تم کو سب سے پہلے خبر لگا جب کہ تم اُدھر دُور دری پر گھر میں بیٹھا تھا۔ اُدھر گولی کا آواز بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سمجھا! ہم کو ابھی سارا چھان بین کرنا پڑے گا کہ تم.... تم...."

مچھل چپ بیٹھا رہا۔ نوجوان افسر غصے سے بولا۔ "ایسا نہیں ہے؟"

"آپ بادشاہ ہو صاحب! شک کرنے کو اپنے آپ پر بھی کر سکتے ہو۔ اُدھر ہمارے جانے سے پہلے وردی والے لوگ پہلے گئے تھے، بندوق بھی اُن کے پاس تھی اور دادا سے رشتا کا بھی مال کے...." مچھل کے منہ سے کچھ نکل جاتا، اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "پتہ چلنے پر ہم گھر میں بیٹھے انگلی چوستے رہتے؟ ایسا نہیں ہوتا صاحب! آپ اُوپر سے افسر نہیں ہو اور آپ کے اپنی باپ دادا کی دشمنی کا اُدھار نہیں ہے۔ آپ ایسا نہیں کرو گے۔ تھوڑی بہت اپنے کو بھی اونچ نیچ کی جان کاری ہے۔

آپ چار دن میں تسلی کرلوگے، دس دن میں، سال بھر میں۔ سوال کرنا آپ کو ہی نہیں آتا۔ اپنے کو بھی آتا ہے اور جو اپنے کو نہیں آتا، وہ اُدھر کرانے کے آدمیوں کو آتا ہے، ہر جے خرچے کا پورا حساب۔ مُنھ سے سیر مل جاتے ہیں۔ اُلٹا پڑ جائے گا۔"

"تم ہم کو دھمکی دیتا ہے؟" نوجوان افسر چیختے ہوئے بولا۔

"آپ ٹھیک بولتے تھے صاحب! یہ بمبئی کی پولیس ہے۔" تجمل نے زہرخند سے کہا: "ہم لوگ بالکل نہیں جانتے تھے۔"

"آگے ابھی اور جان لے گا۔"

"آپ بھی کچھ جان لوگے۔"

میرے کپڑے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ اب میری سمجھ میں خوب آرہا تھا کہ جمرو اور شامو بار بار مجھے کیوں ٹوک رہے تھے اور تجمل نے جمرو اور منگو کو گلی کے سرے پر مجھے روک دینے کے لیے کیوں بھیجا تھا اور شامو مجھے اسپتال سے نکل جانے کو کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ یہی کچھ کہنا، یہی سب باور کرانا چاہتے تھے جس کا مجھے کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ ہم اُس شخص سے نسبت کے مدعی ہیں جو پاڑے کا آدمی ہے۔ پاڑے کا آدمی تو پاڑے کا آدمی ہوتا ہے، زندہ رہنے پر بھی، مرجانے پر بھی۔ دادا کا سب سے بڑا حوالہ پاڑا ہے۔ اُس کے پرسانِ حال کو بھی اسی حوالے سے برتنا چاہیے۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ ہم یہاں دادرسی کے لیے نہیں، جواب طلبی کے لیے لائے گئے ہیں اور ہماری آنکھیں، ہمارے چہرے، ہمارے حال کی شہادت نہیں ہوں گے۔ وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اُن کے گھروں میں شاید کبھی موت نہیں آتی۔

اُدھیڑ افسر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ درمیان والے افسر نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے منع کردیا۔ وہ تینوں سر جوڑے ایک دوسرے سے آدھی انگریزی، آدھی ہندوستانی میں باتیں کرتے رہے۔ اُن کی سرگوشیوں کا کوئی کوئی لفظ مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ تینوں بہت مضطرب اور مشتعل نظر آتے تھے۔ جب تک وہ آپس میں گفتگو کرتے رہے، تجمل بھی ساکت بیٹھا رہا۔ خاصی دیر بعد عمر رسیدہ افسر نے سر اُٹھایا اور جھجکتے ہوئے بولا: "دادا! اب تک ہم نے تم لوگ کے ساتھ بہت نرمی کیا ہے۔ لگتا ہے تم یہ زبان نہیں سمجھتا۔ تم مجبور کررہا ہے کہ ہم ابھی دوسری زبان میں بات کرے۔ ہم ایسا نہیں چاہتا پر ادھر تم اپنی مدد کررہا ہے نہ ہماری۔ ہم صاف بولے، ایسا کرکے تم ہمارے شک کو گھٹانے کے بدلے اور بڑھا رہا ہے اور اپنے لیے بالکل اچھا نہیں کررہا۔"

تجمل نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میرے پاس بیٹھا ہوا جمرو یکایک کھڑا ہوگیا اور جلتی ہوئی آواز میں بولا: "مائی باپ! کسی کے گھر میں آگ لگے، آپ اُلٹا تیل چھڑکتے ہو۔ شک کا مطلب ہے، ہم نے اُس کو مارا ہے۔ وہ ہماری جان تھا، ہم اپنے کو ماریں گے کیا؟ پھر ہم آپ کے سامنے بیٹھے ہوتے؟ بمبئی سے سو میل آگے نکل گئے ہوتے۔ ہوا بھی نہ لگتی آپ کو اور آپ کیسی مدد کو بولتے ہو؟ چاہتے کیا ہو آپ؟ ہم آدمی کا نام چھپاتے ہیں کہ اپنے کو چھپاتے ہیں۔ ہم اُلٹا سیدھا کسی طرف انگلی اُٹھا دے یا آپ کو بول دے کہ ہم خونی ہے، ہم کو لگتا ہے، ہم نے اپنا خون کیا ہے۔ آپ کیسے پولیس والے ہو جو آدمی کو نہیں پہچانتے۔ لگتا ہے بس چور اُچکوں سے پالا پڑا ہے۔ اڈے پاڑے کا آدمی کبھی نہیں دیکھا آپ نے۔ آپ ادھر روک کے کیا کرلوگے ہمارا؟ سولی پر چڑھا دوگے؟ ماں قسم! ابھی آپ دادا کا نام لیو، سولی تو دیر کی بات ہے، اپنے پاس چاقو ہے، ہم ابھی اُسے سینے میں نہ اُتارے تو اپنی ماں کا جنا نہیں۔ ایک بار بول کے دیکھو۔ دو گئے ہیں، ابھی تیسرا چلا جائے گا۔ پھر تسلی ہوجائے گا آپ کا کہ دادا اپنے لیے کون تھا۔ مرنے سے ہم نہیں بھاگتے۔ روز مرتے ہیں، روز زندہ ہوتے ہیں۔ موت تو سالی اپنی جیب میں پڑی رہتی ہے۔ اپنے کو معلوم ہے کسی دن ایسی بیچ رستے میں ہی آئے گی۔ آپ زیادہ سے زیادہ موت کی سزا دوگے۔ موت کی سزا اس سے بڑی نہیں ہے جو آپ ابھی دے رہے ہو۔ وہ ہمارا باپ تھا، اپنا بھائی تھا وہ۔ آپ اپنے پہ کسی بھائی، کسی باپ کو مارنے کا شک کرتے ہو۔ آپ کا کوئی رشتہ ناتا کسی سے نہیں ہے کیا؟ اپنی ایسی خواری کبھی نہیں ہوئی۔" جمرو کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ تینوں افسر اُسے گھورتے رہے، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جمرو کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ وہ حلق میں گھٹی ہوئی آواز سے بولا: "ہم کو بولو صاحب! ابھی آپ خود کون سی زبان سمجھتے ہو؟ آپ کیسے جانوگے کہ......"

"تھوڑا ٹھیر کے۔" درمیان والے افسر کے ہونٹ پھڑک رہے تھے تاہم اُس کی آواز تھمی ہوئی تھی: "تھوڑا ٹھیر کے۔ ایسا جوش دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تھانہ ہے، اِدھر ایسا نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے تمھاری یہ بات ہم ایک بار کو مانے لیتا ہے کہ وہ تم نہیں تھا، پھر وہ کون تھا؟ تم پیرو دادا کے لیے ایسا بڑھ چڑھ کے بولتا ہے، خود کو اُس کا دوست بتاتا ہے۔ تم کیسا دوست ہے کہ دادا کے ایک دشمن کا نام بھی نہیں جانتا؟"

"آپ پھر وہی رٹ لگا رہے ہو۔" جمرو بیزاری سے بولا۔

"یہ بہت ضروری ہے دادا۔"

"اپنے لیے آپ سے زیادہ ضروری ہے۔ آپ کے ساتھ تو ادھر پوری فوج لگی پڑی ہے۔ اِدھر آپ اپنا جتن کرو، اُدھر ہم اُس......" جمرو کے منھ سے گالی نکل گئی۔ اُس نے حتمی لہجے میں کہا: "ہم ایسے بمبئی سے نہیں لوٹیں گے۔"

"دادا پانچ چھ مہینے سے اُدھر اپنے ساتھ تھا، بمبئی سے باہر۔" جمرو کے خاموش ہوتے ہی شامو ہچکچاتے ہوئے بولا اور انھیں بتانے لگا کہ ہم کوئی پچیس دن پہلے ایک بیمار ساتھی کے ساتھ یہاں آئے تھے، پانچ چھ دن اُس کی تیمارداری میں کسی کو اپنی خبر ہی نہیں تھی۔ اُس کا بہت علاج کیا۔ آپریشن کامیاب ہوگیا تھا لیکن اُسے جلدی تھی۔ ٹھیک بیس دن ہوئے، اچانک وہ بھی دادا کی طرح کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر چلا گیا۔ اس تمام عرصے میں ہم اُنھی پریشانیوں میں گھرے رہے۔ ہمیں اپنا ہی ہوش نہیں تھا، کسی اور طرف نگاہ کیا جاتی۔ اُس کے روٹھ جانے کے بعد کہیں نکلنے بلکہ بمبئی میں ٹھیرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن دادا کا خیال روکے رہا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دادا کے پیچھے بمبئی میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کسی نے پاڑے پر دادا کی دو بازو یہی اور شہر کے پاڑوں پر اُس کا ہاتھ پسند نہیں کیا، وہ کوئی ایک نہیں، بہت سے ہوسکتے ہیں۔ شامو کی آواز رفتہ رفتہ سُندھ گئی تھی لیکن شاید تجمل نے اس کی طرف منھ اُٹھا کے دیکھا تھا یا اُسے خود کچھ خیال آگیا تھا، وہ ہکلانے لگا اور آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیا ہوا؟" وہ تینوں چونک پڑے تھے جیسے شامو کوئی انکشاف کرتے کرتے رُک گیا ہو۔ "دادا بمبئی سے کدھر گیا تھا؟"

"وہ اپنے ساتھ تھا۔" شامو کے بجائے تجمل نے جواب دیا۔

"کہاں، کیوں؟"

"ایسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے، مستی کے لیے۔"

"مستی کے لیے۔" اُدھیڑ افسر بے تابی سے بولا: "دادا! تم ابھی چپ بیٹھو، اس کو بولنے دو۔" اُس نے براہِ راست شامو کو مخاطب کیا: "ہاں، کیا بول رہا تھا تم؟"

شامو نے تجمل کی طرف نظر کیے بغیر آہستگی سے کہا: "ہاں صاحب! گھومنے پھرنے کے لیے۔ اُس کے لیے کوئی نہیں نکل سکتا۔"

"ایسا ہی بے وجہ؟"

"بولا نا آپ کو۔" شامو نے تیز لہجے میں کہا: "سیر سپاٹے کے لیے آپ کبھی باہر نہیں نکلتے ہو؟ اِدھر اُدھر مت بھٹکو صاحب! اپنا مطلب تھا کہ دادا بمبئی آنے کے بعد پورا انجانے میں تھا۔ یہی بولنا تھا آپ سے۔ اُسے کچھ پتہ ہوتا تو ہم کو بھی ضرور ہوتا۔"

"اور ہم کو ہوتا بھی تو بتانا اپنی مرضی پر ہے۔" تجمل نے پھر چٹختی آواز میں دخل دیا: "اور ہم آپ کو بولیں صاحب! بمبئی شہر اپنے لیے ایسا اڈا ابھی نہیں ہے۔ پہلے بھی ہم اِدھر آچکے ہیں۔ دادا کے ساتھ اچھا دیکھا بھالا ہے۔ اِدھر کا بہت سا دادا لوگ ہم کو جانتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی کہ جب اُن کی برف کسی قدر پگھلتی ہوئی نظر آرہی ہے تو تجمل کا لہجہ ایسا تُند کیوں ہے۔ وہ انھیں کیا جتانا چاہ رہا ہے؟ تجمل کی حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔

نوجوان افسر کا جسم اُس کے قابو میں نہیں تھا: "ہی لکس دی مین کلپرٹ۔" اُس نے تجمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا: "ہمیں کچھ دیر کے لیے اسے باہر کرکے باقی سے بات کرنی چاہیے۔"

میں نے سُن لیا تھا۔ وہ ہم سب کو باسٹرڈ اور تجمل کی کٹھ پتلیاں کہہ رہا تھا اور بھی بہت کچھ۔ میں سنتا رہا لیکن میرے لیے خاموش بیٹھے رہنا دشوار ہوگیا۔ مجھے اُٹھ کے اُن سے کہنا چاہیے تھا کہ وہ زبان سنبھال کے بات کریں۔ اس سے پہلے کہ وہ تجمل کو باہر نکل جانے کا حکم صادر کریں، مجھے صاف صاف انھیں بتا دینا چاہیے تھا کہ پھر ہم میں سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ میں نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر بیٹھے تھے۔ تجمل، مارتی اور منگو بھی۔ میں انگریزی نہ سمجھتا تو میری بھی یہی کیفیت ہوتی۔ ہر آدمی اتنا بہرا ہوتا ہے جتنا وہ نہیں جانتا اور مارتی کو تو اتنی انگریزی ضرور آتی ہے، اُس نے سُن لیا ہوگا کہ وہ کیسی بدزبانی، دریدہ دہنی کررہے ہیں۔ اُسے چُپ دیکھ کے میں بھی اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔

درمیان میں بیٹھا ہوا افسر کچھ سوچتا رہا، پھر اُس نے اپنے نوجوان ساتھی کی تجویز یہ کہہ کے مسترد کردی کہ ہم سب ایک جیسے ہیں، تجمل کے جانے کے بعد ہم اور بے لگام بھی ہوسکتے ہیں یا زیادہ محتاط بھی۔ اُس نے مذبذب لہجے میں تجمل سے کہا: "تم اِدھر بمبئی میں کب تک رہنے کا ہے؟"

تجمل نے جواب دیا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

"ابھی کوئی ضمانت کراسکتا ہے؟"

"کاہے کی ضمانت؟"

"کہ تم لوگ اِدھر شہر میں رکے گا۔"

"ہم ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ آپ زیادہ بات مت کرو، سیدھا پرچی بناؤ۔"

"پرچی بننے میں ابھی کوئی دیر نہیں لگے گا۔"

تجمل کے لبوں پر جنبش نہیں ہوئی۔

"ایک بار ابھی تم کو سوچنے کا موقع ہے۔" قجھل نے کچھ نہیں کہا تو عمر رسیدہ افسر کرختگی سے کہنے لگا: "زبان بند کرنے سے تمھارے لیے اچھا نہیں ہے دادا!"

"کھلا رہنے سے ابھی اپنے کو کیا ملا ہے؟" قجھل نے جھنجلا کے کہا: "آپ اپنے لیے وکیل کا انتظام کرو۔"

"وکیل؟ کیسا وکیل؟" وہ متوحش انداز میں بولا۔

"ابھی ہم اُس سے بات کر کے ہی کچھ بولیں گے۔"

"تم بہت آگے کا بول رہا ہے۔"

"اپنا سر بہت گھوم رہا ہے صاحب! ابھی آپ کے ساتھ کھپا کے اوراُلٹا ہو جائے گا۔"

"تم پولیس کا پوزیشن نہیں سمجھ رہا ہے دادا!" ادھیڑ پولیس افسر نے کسی قدر مفاہمت کے لہجے میں کہا۔

"پر آپ تو اپنے کو خوب سمجھ رہے ہو۔"

"نہیں۔" وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم کوشش کر رہا ہے۔ ہم بولا کہ اپنے کو تم سے کوئی بیر نہیں ہے۔" ادھیڑ افسر وہی کچھ دہرانے لگا جو کم و بیش وہ تینوں پہلے کہہ چکے تھے کہ یہ ایک نہایت سنگین واقعہ ہے، آج دو دادا گئے ہیں، کل دوسرے جا سکتے ہیں، پاڑوں سے متعلق لوگ آپس میں خون خرابہ کر سکتے ہیں، اس امکان کی پیش بندی کے لیے پولیس کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے، اُسے کسی بے گناہ آدمی پر ہاتھ ڈال کے خوشی نہیں ہوتی۔ پولیس بھی کسی کے سامنے جواب دہ ہے لیکن چونکہ پیرو اور ماہجی دادا کے لیے سب سے پہلے ہی اُن کے سامنے آئے ہیں اس لیے ہم سے اتنا کچھ کہا جا رہا ہے۔ جہاں تک پولیس کے اختیار کا تعلق ہے، وہ یقیناً بے حد و حساب نہیں ہے لیکن ایسا کم بھی نہیں ہے۔ پولیس روکنے پہ آئے تو ہمیں کسی بھی الزام، کسی بھی شبے میں روک سکتی ہے۔ بعد میں ہم ثابت کرتے پھریں گے۔ یہی ہوگا نا۔ وہ بھی کچھ ثابت کریں گے لیکن پس منظر میں اگر کچھ نہیں ہے تو یہ ایک غیر ضروری غیر نتیجہ خیز بات ہوگی۔ پولیس بھی پر کیا، ایسی صورت میں کسی پر بھی شک کر سکتی ہے۔

وہ کہنے لگا کہ پولیس کو ایسے معاملات کا خوب تجربہ ہے۔ دادا لوگ عموماً نام نہیں بتاتے، خود جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پولیس ایسے خود سر اور منتقم مزاج لوگوں کو کیسے چھوڑ دے جو اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ انھیں معلوم ہوتا تو پہلے وہ اسی طرف کا رُخ کرتے اور انھیں مجرم کا نشان مل جائے گا تو پولیس کو اطلاع نہیں دیں گے۔ ہماری خواہش پر وکیل بلایا جا سکتا ہے مگر وکیل کیا کرے گا۔ وہ یہیں بیٹھے ہی پر نہ آگئے تو وکیل بھی دیکھتا رہ جائے گا۔ عدالت بھی اتنا جانتی ہے کہ چالاک مجرم کبھی کبھی علی الاعلان سامنے آکے بھی جرم پوشی کی کوشش کرتے ہیں۔ جائے واردات پر ہمارا موجود ہونا دونوں باتیں ثابت کرتا ہے۔ خبر ملنے کے بعد ہمیں فطری طور پر وہاں آنا چاہیے تھا یا پھر ہم نے اس طرح اپنی دانست میں خود پر عائد ہونے والا ہر شک مٹا دینے کی کوشش کی ہے۔ پولیس افسر نے بے تکلفی سے کہا: "کچہری عدالت ابھی دُور کا بات ہے۔ پہلے اپنے کو تسلی دو کہ یہ سب ایسا نہیں ہے۔"

"تسلی تو آپ اپنے کو دو! آپ کا کون چلا گیا ہے جو ایسا بولتا ہے۔" قجھل نے تپیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "جو آپ آگے پیچھے کا بول رہے ہو اُس کا اپنے کو پورا پتہ ہے۔ پتہ ہے کہ آپ کتنی دُور تک ساتھ چلو گے، آگے کون ...."

پولیس افسر اُس کی بات کاٹ کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا کہ عدالت بھی پولیس کے شبے کی تائید اُس وقت تک کرتی رہے گی جب تک پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتی، عدالت پولیس کا دوسرا رُخ ہے۔

"ہم نے ساری مٹی نہیں کی ہے۔" قجھل نے کھردری آواز میں کہا: "اتنا چوپٹ نہیں ہے اُدھر۔"

"اِدھر بھی نہیں ہے۔" پولیس افسر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "اِدھر کوئی تمھارا دشمن نہیں بیٹھا ہے۔ اپنے پہ بھروسا کرو اور کھل کے بولو۔"

"آپ کا رنگ کالا ہو جاتا ہے۔" قجھل نے بے اعتنائی سے کہا: "ہم کو بیان بدلنا نہیں آتا۔ اُدھر گلی میں جو بول دیا تھا اور آپ کے منشی نے لکھ لیا تھا اُس کے بعد نیا کچھ نہیں ہے۔ لگتا ہے آپ کے پلّے بھی نہیں ہے جبھی آپ پھرکی گھما رہے ہو۔ جب تک اُڑیے کام لیتے رہو گے، ایسا ہی رہے گا۔ تھوڑا نیچے کو بھی آؤ اور چھاتی پر ہاتھ دھر کے دیکھو۔"

ادھیڑ افسر اضطراری انداز میں سر ہلا کے بولا: "پولیس بھی تم لوگ میں سے ہے دادا!"

قجھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمر رسیدہ افسر نے تیکھی آواز میں پوچھا: "ابھی تم کو چھوڑ دے تو کدھر جائے گا؟"

"آپ بولو، کدھر جانا چاہیے؟"

"ہم تم سے پوچھ رہا ہے۔"

"کدھر جاتا صاحب!"

"پاڑے جائے گا؟"

"پاڑے بھی جائیں گے پر پہلے اُن کو پھونکنا ہے۔" قجھل کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔ "پاڑے بھی جائیں گے صاحب!"

"اُدھر دادا کی گدی پر بیٹھنے کا ہے؟"

"پاڑا کوئی راجا کی گدی نہیں ہے۔"

قجھل کا مفہوم عمر رسیدہ افسر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کسی قدر بوکھلا کے بولا: "پاڑے کی گدی پر کون بیٹھنے کا ہے؟"

"پاڑا مال جائداد نہیں ہوتا، راج پاٹ کی طرح، باپ آنکھ بند کرے تو بیٹے کے متھے پر تاج جما دیا جائے۔ پاڑا بل سے ملتا ہے اور بل تک ہی رہتا ہے۔ دادا اُسی ٹائم ختم ہو جاتا ہے جب اُس کے ہاتھ پیر اپنے نہیں رہتے۔"

"تم .... تمھارا مطلب ہے کہ ماہم کے پاڑے کے لیے جو بھی جاتی بل والا آئے گا وہی گدی پر بیٹھنے کا ہے؟"

"یہ آپ بھی جانتے ہو۔"

"پر ہم نے دیکھا، اُدھر بہت بوڑھا بوڑھا لوگ بھی پاڑے پر ہے۔ اب اُس کا بل نہیں ہے پھر بھی وہ پاڑا چلاتا ہے اور سب اُس کا آگے پیچھے گھومتا ہے۔"

"پر پاڑا دادا کے جینے کو نہیں ملتا۔ آپ کی طرح آپ کی کرسی بھی ...."

"ہاں ہاں، ہم سمجھتا ہے۔" درمیان والے افسر نے مضطربانہ کہا۔

"پاڑے کا راجا، دادا جیتا نہیں، پالتا ہے اور بل کھو کے گدی پر بھی لکار رہتا ہے۔ جب اُس کے بنائے ہوئے پاڑے کے دادا لوگ ایسا چاہتے ہوں۔ پرانے دادا کی جان کاری، پرکھ کی اُن کو ضرورت پڑے تب ...." قجھل نے انھیں بتانا چاہا، "لیکن ایسا کم ہوتا ہے اور دیر تک نہیں چلتا۔ وہی گدی سنبھالتا ہے جس کے بازو زیادہ پھڑکتے ہوں اور جس کی انگلیاں چاقو کے کھیل سے خوب واقف ہوں اور اندر پاڑے میں ایسا کوئی نہیں ہوتا تو باہر سے کوئی آجاتا ہے۔"

"پیرو دادا کا بھی یہی تھا؟" نوجوان افسر بے چینی سے بولا۔

"ابھی تو اُس کا بل شروع ہوا تھا۔"

"پر وہ تو اُدھر بیس پچیس سال سے پاڑے کا مالک تھا؟"

"شہر کا راجا بننے کو بڑا ٹائم بھی تھوڑا ہے۔ ٹھنڈے گرم کی پہچان میں پوری عمر ڈھلک جاتی ہے! ابھی اُس کو نزدیک کا پڑے کا دیکھنا کیا تھا۔ بل اکیلا بازو کا نہیں ہوتا۔ اِدھر اُس جیسا کوئی نہیں تھا۔"

"تم بھی نہیں ....؟"

قجھل نے جواب نہیں دیا۔ نوجوان افسر نے ایک لمحے کی مہلت دیے بغیر اُسے ٹوکا۔

"جھکو مت صاحب!" قجھل نے جھلّائی آواز میں کہا۔ "بولیں گے تو آپ کو مرچ لگ جائے گی۔ آپس میں کا بٹّا نہیں رکھا جاتا۔"

نوجوان افسر کے کچھ کہنے سے پہلے ادھیڑ افسر نے بے دلی سے کہا: "دادا! جس لوگ نے چاقو کے بدلے گولی سے دادا کو ختم کیا ہے، اُس نے گدی کا لالچ میں ایسا کیا! کیوں؟ پھر وہ ضرور سامنے آئے گا، ابھی نہیں تو تھوڑا دیر میں ...."

"ایسا نہیں آئیں گے، وہ حرام کے .... اتنے ڈھنی نہیں ہیں جو پاڑے پر سینہ پُھلا کے ابھی آجائیں۔ اِدھر آپ ان روٹھا لگائیں اُدھر اپنے کو خوار کریں۔ وہ ایسے آگ کی طرف نہیں بڑھیں گے۔ گولی نہ چلاتے پھر، وہ بھی پیچھے کی طرف سے ...."

"پھر اُن کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"دادا جی کے سارے پاڑوں کا دادا تھا۔"

"ہاں۔" ادھیڑ افسر جھجکتی آواز میں بولا: "تم سمجھتا ہے کہ وہ پیرو دادا کے دباؤ سے سارے شہر کے پاڑوں کو نکالنے کے لیے بھی ایسا کر سکتا ہے؟"

قجھل سر ہلا کے رہ گیا۔

"پر اگر کوئی نیا دادا پھر سے ماہم کے پاڑے کے نیچے آنا لوبے تو اُدھر بہت سا لوگ سامنے آسکتا ہے۔"

"آپ غلطی پر ہو، نیا دادا آنے پر کون ایسے ماہم کے پاڑے کے حکم کو مانے گا۔ پاڑے کی چوکی ٹکڑی کی ہے دادا لوگ کا نہیں ہوتا۔ حکم کے لیے زور چاہیے۔"

"تم ابھی ماہم کے پاڑے پر بیٹھنا مانگتا ہے؟"

"اپنے پاس اڈّے پاڑے کی کمتائی نہیں ہے۔ اپنے کو ابھی بس ایک بات سے مطلب ہے کہ دادا پر ہاتھ اُٹھانے والے کا گردن کب اُتار لیں۔"

"ایسا کیسے اُتارے گا؟" ادھیڑ افسر طنزیہ انداز میں بولا۔

"اُس کا نہیں تو اپنا اُتار دے گا۔"

"ہم پوچھتا ہے، کدھر ڈھونڈے گا اُسے؟"

"ڈھونڈے گا صاحب!"

"کیسے؟"

"ابھی نکل کے دیکھیں گے۔"

ادھیڑ افسر نے مزید حجت نہیں کی۔ چند لمحوں تک سناٹا رہا پھر اُسی نے کسمسائی آواز میں تجمل سے پوچھا: "دادا کے پاس مال تو بہت ہوگا؟"

"دادا کے پاس مال ہو تو اُس کا زور آدھا ہو جاتا ہے۔"

"ایسا کیسا؟"

"مال زور کا گھُن ہے۔"

"یعنی دادا کے پاس کوئی مال نہیں تھا؟"

"کسی دادا کے پاس اتنا نہیں ہوتا۔ مال کے لیے کوئی پاڑا نہیں چلاتا ہے۔"

"پھر کس لیے چلاتا ہے؟"

"اپنے ساتھ تھوڑے دن پاڑے پر بیٹھو تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

"دادا کا بیٹی کتنا بڑا ہے؟" یکایک عمر رسیدہ افسر نے تیور بگاڑ کر پوچھا۔ اُس کا لہجہ صاف چھچھلے پن کا تھا۔

تجمل پھیلی ہوئی آنکھوں سے اُنھیں دیکھا کیا۔

عمر رسیدہ افسر نے اُس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ تیزی سے بولا: "جوان ہے؟"

"ہاں" تجمل نے آہستگی سے کہا۔

"شادی کا لائق؟"

تجمل چپ بیٹھا رہا۔

"بس ایک بیٹی!"

"ابھی دو چار ہوتی تو آپ کیا کر لیتا؟"

"جو پوچھتا ہے اُس کا جواب دو" نوجوان افسر نے خشونت سے کہا۔ "اب اُن لوگ کو کون دیکھے گا؟"

"وہ اپنی بٹیا ہے۔"

"ہوں" عمر رسیدہ افسر ہونٹ سکوڑ کے بولا: "تم دیکھے گا؟"

"آپ دیکھو گے کیا؟" تجمل کی آواز تمتما رہی تھی۔

"تھوڑا کھینچ کے بولو تو اچھا ہے دادا!" نوجوان افسر نے برانگیختگی سے کہا: "ہم پوچھتا ہے ادھر اور کوئی نہیں ہے اُس کا؟"

"ہوگا" تجمل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم نہیں جانتا۔"

"تم نہیں جانتا؟"

"یہی بولا ہے۔"

"گھر نہیں بتائے گا؟"

"بتائیں گے پر ابھی نہیں۔"

"ابھی بولنے میں کیا جاتا ہے؟"

دونوں افسروں نے آنکھیں میچ کے اُسے صبر و ضبط کی تلقین کی اور سرگوشیوں میں دیر تک اُس سے باتیں کرتے، کاغذات اُلٹتے پلٹتے رہے مگر بار بار اُن کی نظریں ہم پر بھٹکنے لگتیں جیسے ہم بیٹھے بیٹھے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں ایک دراز قد سپاہی تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اُس نے اُن کے قریب آکے سیلوٹ کیا اور کونے والے نوجوان افسر کے سامنے میز پر ایک پرچی رکھ دی۔ تینوں افسروں نے باری باری پرچی دیکھی۔ اُسے پڑھ کے اُن کے شانے سیدھے ہو گئے۔ اُنھوں نے رقعہ لانے والے سپاہی سے دھیمے لہجے میں مختصراً کچھ کہا، سپاہی فوراً واپس چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی عمر رسیدہ افسر نے تجمل سے کہا: "تو تم ہم کے پاڑے پہ نہیں جائے گا؟"

"ضرور جائیں گے۔"

"پر تم ابھی کیا بولا؟"

"ضرورت ہونے پہ ہر جگہ جائیں گے۔"

"کیسا ضرورت؟"

"یہ آپ جانتے ہو۔"

"دادا!" ادھیڑ افسر نے دخل دیا: "تم نے اب تک ہمارا کوئی مدد نہیں کیا ہے۔" اُس کی آواز میں غصہ بھی شامل تھا، رنج بھی۔

"آپ خود ایسا کرنا نہیں چاہتے۔"

"کیا؟ کیا بولا تم؟"

"ادھر بمبئی میں ایک ہی آپ کو دکھائی دیا ہے، سارا شہر دلالا کو جانتا ہے، سارا دادا لوگ۔"

"تم کیا سمجھتا ہے، پولیس آنکھ بند کیے بیٹھی ہے؟"

"پھر ہمی کو کیوں پکڑ لیے ہو؟"

"کیونکہ تم خود کو اُس کا بھائی، دوست بولتا ہے۔"

"تو ہم اُلٹ بولیں، آپ چین سے بیٹھ جاؤ گے؟"

"ایسا نہیں، ایسا نہیں دادا! اپنے کو کس چیز سے چین آنے کا ہے، تم جانتا ہے، سچ جانتے سے۔"

"جھٹکے سے نہیں ملتا، تھوڑی دیر لگتی ہے۔"

"اتنی دیر ہم تم کو ادھر رکھ سکتا ہے۔" نوجوان افسر نے مشتعل لہجے میں کہا: "کیوں؟"

"اپنی چھٹی کرو صاحب!" تجمل نے برہمی سے کہا۔

"چھٹی کرنے؟" نوجوان افسر بھڑک گیا اور دیوانہ وار انداز میں اپنے ساتھی افسروں سے پوچھنے لگا: "یہ کیسا بولتا ہے، حکم چلاتا ہے؟"

"آپ کی مرضی ہے، پر شاید پھر اور دیر لگ جائے۔"

"اور ابھی ہم تم کو جانے دے تو....."

"تو آپ اپنے لیے بھلا کرو گے۔"

جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، نوجوان افسر اپنی نشست سے اچھل سا گیا۔ دونوں افسروں کے منع کرنے پر وہ ہذیانی انداز میں جھنکنے لگا۔

"ایک شرط پر ہم تم کو چھوڑنے کا سوچ سکتا ہے کہ تم اپنے آپ کچھ نہیں کرے گا، پہلے ہم کو بولے گا۔" ادھیڑ افسر نے آشتی آواز میں کہا۔

"آپ کیسی بات کرتے ہو؟"

"کیوں، تم ہم کو نہیں بولے گا؟"

"ہم کہاں کہاں تحصیل لگائیں گے۔ دادا نے پوری ادھوری کھوتی ادھری کاٹی ہے۔ جو آج پاڑوں پر سینگ لگانے راج کرتے ہیں، اُن میں کتنوں کو دادا نے جا تو نچانا سکھایا ہے، یہ آپ جانتے ہو نہ ہم۔ کس نے دادا کا نمک زیادہ کھایا ہے، کون خون کا اصلی ہے، ہم سارے شہر کا ٹھیکہ لیتے کا آپ کو بول دیویں؟ ادھر اپنے کو بہت سے جانتے ہیں، اُن کو پتہ ہے، دادا سے اپنا کیا ناتا ہے۔ وہ اپنے پاس سر پیٹتے، چھاتی کوٹتے آئیں گے۔ اُن کو بولنا چاہیے کہ ابھی کدھر اُن کا دھیان جاتا ہے، پر اُنھوں نے نہیں بولا، اپنے تک سینت کے رکھا کہ دادا کا ایک بدلہ چکانے کے لیے....."

"اپنا بات کرو، صرف اپنا بات۔"

"اپنی کیا بات کرے۔" جمرو بہت دیر سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اچانک پھر کھڑا ہو گیا اور بھیچی ہوئی آواز میں ڈکرانے لگا: "بہت ہو گیا، بہت ہو گیا صاحب بہادر! اب یہ تماشا ختم کرو، جو فیصلہ کرنا ہے اپنے کو بول دیو۔" اِس وقت جمرو کو چپ ہی رہنا چاہیے تھا۔ میں نے اور شامو نے اُسے بٹھانا اور خاموش کرانا چاہا مگر جتنا ہم نے اُسے روکنے کی کوشش کی وہ اتنا بے قابو ہوتا گیا اور جو منہ میں آیا بکتا رہا، کہنے لگا کہ کیا وہ اونچا سنتے ہیں۔ کوئی دوسرا جو ٹھیک طرح دیکھتا اور سنتا ہو کوئی آدمی کا بچہ یہاں نہیں ہے؟ نوجوان افسر نے بھی چیخ کر اُسے سیدھی طرح بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور تجمل سے کہا: "اِس کے گلے میں پٹا ڈالو دادا!" تجمل نے جیسے سُنا ہی نہیں۔ جمرو شور مچاتا رہا۔ "کیا کرو گے ہمارا؟ کیا کرو گے؟ قسم سے ہم کو نہیں جانتے۔ آگے بہت دیکھا دو گے۔ بہت ستایا ہے اپنے کو....." نوجوان افسر نے سپاہیوں کو اشارہ کر دیا۔ میں نے تجمل کی طرف دیکھا تاکہ وہی اُٹھ کے جمرو کو سنبھالے مگر وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سپاہی ہماری طرف بڑھ گئے تھے۔ شامو نے اُنھیں روکا اور جمرو سے منت کی کہ بس وہ کچھ دیر اور تحمل کرے۔ ٹنگو اور باری بھی اُٹھ کے ہمارے پاس آگئے تھے۔ سپاہیوں کی دست درازی سے پہلے ہی ہم نے جمرو کو بٹھا دیا، اِس میں خود جمرو کی انفعالیت بھی شامل تھی۔ شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ آہ و فریاد سے کچھ حاصل نہیں۔ اتنی دیر میں اُسے یہ اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔

"یہ، یہ پاگل ہو گیا ہے؟" نوجوان افسر نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔

"پاگل تو آپ بنا دو گے صاحب!" تجمل کی آواز جمی ہوئی سی تھی: "ایسے وقت میں اپنے سے آنکھ مچولی کرتے ہو۔ پہلی بار کوئی ملا ہے آپ کو؟"

عمر رسیدہ افسر نے جلدی جلدی کاغذات سمیٹنے شروع کر دیے۔ اُس کا چہرہ سوج سا گیا تھا۔ دونوں افسروں نے اُس کی پیروی کی۔ وہ اٹھا ہی چاہتے تھے کہ ادھیڑ افسر تاسف آمیز ناراضی سے بولا: "لگتا ہے تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

"پتا کر کے نہیں جائیں گے۔" تجمل نے کہا: "بولنے کو ہم کچھ بھی بول کے اِدھر سے جا سکتے ہیں۔ آپ ایک کیا دس شرط رکھ لو پر آگے سارا اندھیرا ہے، ایسے میں آپ کو کیا بولے۔ ادھر سے نکل کے اپنے کو کچھ معلوم نہیں کدھر جانا پڑے۔ اِس ٹائم اپنے کو کچھ دکھائی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ آپ سمجھتے ہو، یہاں سے نکل کے آگے راستے میں سب ہرا ہی ہرا ہے۔ ادھر آپ کی بندی میں اپنے لیے بہت سکھ ہے۔ اپنے کو کہیں کسی کو دیکھنا، سننا نہیں پڑتا۔ اُس کے گھر میں وہ دونوں روتے روتے مر جائیں گی۔ دادا نے پھولوں میں رکھا تھا اُن کو۔ اپنے کو اُن کو بھی سنبھالنا ہے۔ اُن سے بولنا ہے کہ دادا اب لوٹ کے کبھی نہیں آنے کا، اب وہ اُس کو ایک دم بھول جائیں۔ اُدھر پاڑے پر سب بکھرا ہوا ہوگا۔ گھر میں اُس کے صرف دو جنے تھے لیکن دادا کا دوسرا گھر پاڑا ہی ہے۔ اُدھر بھی سب اُس کی اولاد کے مانند ہیں۔ اپنے کو اُن کو بھی تھامنا ہے اور وہ، آپ سمجھتے ہیں، وہ خنزیر کے جنے اپنی طرف سے آنکھ بند کیے پڑے ہوں گے۔ اُن کو پتہ ہے کہ ہم کون ہیں۔ دادا کا کانٹا اُنھوں نے نکال دیا ہے۔ جب تک ہم سامنے ہیں، اپنی ہڈی بھی اُن کے گلے میں پھنسی رہے گی۔ خود آگے نہیں آئیں گے تو ادھر بمبئی کے سارے دادا لوگ کو پتھر ماریں گے کہ دیکھو باہر کا کون پیر دادا کے پاڑے پہ چپک کے بیٹھ گیا ہے، ایک دن میں دادا کا سب کچھ بن بیٹھا۔ ادھر وہ آپ کو تیلی دکھائیں گے۔ اپنے کو اُن کے پاس بھی جلدی پہنچنا ہے، نہیں پہنچے تو ہم اپنے آپ کو منہ دکھانے کے نہیں رہیں گے جیتی

دیر وہ زندہ رہیں گے، ہم کو نیند نہیں آئے گی۔ سارا جلتا رہے گا۔ ہم کو ایک طرف نہیں دیکھنا، ہم نے دادا پر بہت بوجھ ڈالے تھے، پر اتنے نہیں جتنے وہ ڈال کے چلتا بنا ہے۔ آپ آپ یہ سب نہیں جانو گے۔"

"ہم جانتا ہے۔" وہ تینوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ تجھل جیسے ہی خاموش ہوا، ادھیڑ افسر نے کہا۔ "پر تم پولیس پر بھروسا کرے گا، ہمارا ساتھ دے گا، ہم سے دُور نہیں رہے گا تو اتنا سب نہیں ہوگا۔" اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔

تجھل نے کچھ نہیں کہا تو پولیس افسر مضطرب ہو کے کہنے لگا۔ "ہم کیا بولتا ہے، ابھی سمجھتا ہے؟"

"سمجھ رہا ہے صاحب! اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔" تجھل نے سر ہلا کے کہا۔

"اپنے تمھارے دونوں کے اچھے کے لیے بولتا ہے بابا! تم کو صرف اتنا کرنا ہے کہ جاننے پہ ہم کو اشارہ کر دو، بعد میں تم کو کوئی شکایت نہیں ہوے گا۔"

"دیکھیے گا صاحب! پر ابھی اپنی بھی ایک بات دھیان سے سُن لو۔ اگر آپ پہلے پہنچ گئے تو ہم سے بات کیے بنا آگے نہیں بڑھو گے؟ پہلے ہم کو دکھاؤ گے؟"

"کیا؟" ادھیڑ افسر حیرت سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی لکیریں دُور ہو گئیں۔ "ٹھیک ہے۔" اُس نے نخوت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ "ہم اس پر سوچ سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ فائلیں سمیٹ کے کرسی سے اٹھ گیا، اُس کے دونوں ساتھی بھی۔ "باہر ممبئی کا سارا بڑا افسر موجود ہے، ہم کو ابھی تھوڑا اُن سے بات کرنے کا ہے۔" ادھیڑ افسر نے چلتے چلتے کہا۔

"آپ سے بڑا نہیں ہوگا صاحب!"

یہ سُن کے وہ تینوں پلٹ گئے لیکن ایک لمحے کے تامل کے بعد تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

اُن کے جانے کے بعد کمرے پر سکوت چھا گیا۔ سپاہی ابھی بھی وہیں کھڑے تھے، بُتوں کے مانند، ہم پر نظریں جمائے۔ تجھل نے بیڑی سلگا لی۔ مارٹی اور ڈنگو کے ہمارے پاس آ جانے کی وجہ سے وہ سب سے الگ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، اُس کے پاس چلا جاؤں لیکن میں جا کے کیا کرتا، اُسے اور پریشان ہی کرتا۔ چارہ گری کا حوصلہ نہ سہی آدمی یہ تو کر سکتا ہے کہ خاموش بیٹھا رہے۔ وہ بھی سر جھکائے چپ بیٹھے تھے، میری طرح سب کا دم گھٹ رہا ہوگا مگر غم کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے، آدمی کو خود پر یہ جبر بھی کرنا پڑتا ہے، چاہے اُسے اپنے وجود سے گھن آ رہی ہو۔ دیدوں میں روشنی نہ ہو تو آدمی بہت کچھ دیکھنے سے محفوظ رہتا ہے۔ ہوش گم کر دینا تو بہت آسان ہے، میری طرح اتنا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا جتنا تجھل کی اور اُن سب کی رگوں میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے اُن کے سامنے بہت کم مائیگی، کم تری کا احساس ہو رہا تھا۔ انھیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا جبھی وہ مجھے یہاں لانے سے اجتناب کر رہے تھے۔ میرا سینہ اتنے بوجھ کا حوصلہ نہیں رکھتا، یہ مجھے، مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

دیر تک کوئی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ارادہ بدل دیا ہو یا دوسرے افسروں کو قائل نہ کر پائے ہوں، وہ خود بھی متذبذب تھے ورنہ فیصلہ کر کے جاتے۔ اگر انھوں نے افسروں تک تجھل کا رویہ، اُس کا لہجہ بھی منتقل کر دیا تو وہ بھی برہم ہو سکتے ہیں۔ تجھل کا رویہ ابتدا ہی سے معتدل ہوتا، جیسا وہ کہہ رہے تھے، وہ پہلے ہی ہاں کر دیتا تو اتنی دیر نہ لگتی۔ جمرو اور شامو نے بھی دخل دے کے انھیں اور متوحش کیا تھا۔ اتنی باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جلد یا بدیر انھیں ہمارے حق میں فیصلہ کرنا تھا لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ وہ بہرحال اپنا فیصلہ ملتوی کر سکتے ہیں، ہمارے لیے ایک پہر کی تاخیر بھی پہاڑ جیسی ہے۔ تجھل نے شاید اسی خیال سے اتنی حجت کی تھی۔ ہماری نرم روی سے اُن کے وسوسے اور تقویت پا سکتے تھے۔ ممکن ہے تجھل کے ذہن میں یہی کچھ ہو۔ اتنی ردّ و قدح کا سبب صرف ذہنی انتشار نہیں ہو سکتا۔ بہرحال افسروں کے انتظار میں کوئی بے قرار نہیں تھا، جتنا اُن کے امکان میں تھا، وہ کر چکے تھے۔

بہت دیر بعد دروازے پر اُن کی آہٹیں گونجیں۔ سپاہیوں کے جسم اکڑ گئے۔ آنے والے صرف دو تھے۔ ایک نیا افسر بھی ادھیڑ افسر کے ساتھ تھا۔ "تم جا سکتے ہو دادا!" اُس نے اندر آ کے بلند آواز میں کہا۔

سب کی نگاہیں تجھل پر مرکوز ہو گئیں۔ تجھل بنچ پر بیٹھا رہا۔

"سُنا تم نے! ہم کو تمھارے لیے بہت بات کرنا پڑا۔" ادھیڑ افسر نے کہا۔ "پر یاد رکھنا، ہم نے تم پر بھروسا کیا ہے۔"

تجھل نے اپنا جسم سمیٹا اور کھڑا ہو گیا۔

"کچھ رہ گیا ہو تو ابھی اپنے کو بول دیو؟"

"نہیں صاحب!" تجھل نے زیرِ لبی سے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ ہم بھی اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے تھے۔ دروازے کے باہر سائبان میں افسروں اور سپاہیوں کا ہجوم موجود تھا۔ ہم دروازے سے نکلے تو سب کا رُخ ہماری جانب ہو گیا۔ چند ہی قدم بعد سیڑھیاں تھیں مگر وہیں تجھل کی وجہ سے ٹھہر جانا پڑا۔ تجھل ہمارے نزدیک ہی ادھیڑ افسر سے جانے کیا باتیں کرنے لگا۔ ایک دو منٹ لگ گئے۔

ہم اُس کے انتظار میں کھڑے تھے کہ سامنے کھڑے ہوئے پولیس افسروں کے جھنڈ میں انتشار سا ہوا، ایک افسر اپنے قریب کے افسروں کو ہٹاتا ہوا تیزی سے آگے آیا۔ ابھی اُس نے بے تابانہ چند ہی قدم طے کیے ہوں گے کہ میری آنکھیں دھندلا سی گئیں۔ وہ ایس پی شکلا تھا، کرشنا جی کا معتمد۔ میں نے دوسری نگاہ میں پہچان لیا تھا اور میرا جسم ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گیا تھا۔ میں اُس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ رک گیا۔ میرے قریب آ کے اُس کے پاؤں بھی ٹھٹک گئے تھے۔ "تم؟ ظہیر؟" اُس نے ہیجانی آواز میں کہا۔

میں نے سر جھکا لیا۔

اُس نے میرے شانے پکڑ لیے۔ "یہ تمھی ہو؟" وہ منتشر لہجے میں بولا۔ "تم یہاں کیسے؟ کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔" میں نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"بہت دن ہو گئے اور مجھے نہیں معلوم؟ کسی نے مجھے نہیں بتایا۔" وہ حیرانی سے بولا۔ "مگر یہ سب، یہ سب کیا ہے؟"

مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

"کیا؟ کیا ہوا ظہیر میاں؟ تم بھی؟" میری خاموشی پر وہ اور پریشان ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ سراسیمگی سے شامو اور مارٹی کی طرف دیکھ کے بولا۔ "تمھارا ان سے کیا تعلق ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟"

"کیا بتاؤں؟" میں نے سسکتے ہونٹوں سے کہا۔ "پیر دادا...."

"پیر دادا؟" وہ دہشت سے بولا۔ "تم بھی اسی سلسلے میں آئے ہو؟ اوہ مائی گاڈ! پیر دادا سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

میں اُسے کون سا رشتہ بتاتا۔

دوسرے پولیس افسر بھی ہمارے نزدیک آ گئے۔ شکلا کی نظریں سر سے پیر تک اس طرح مجھ پر منڈلا رہی تھیں جیسے اُس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہوں۔ میرے گندے پیر، سیاہ پائنچے، شکستہ کپڑے، بے ترتیب بال۔ میری یہ حالت دیکھ کے اُسے بے قرار ہو ہی جانا چاہیے تھا۔ اُس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے بتاؤ ظہیر میاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"انھی سے پوچھ لیجیے۔" میں نے قریب کھڑے ہوئے نوجوان افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں سب معلوم ہے۔"

"کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" نوجوان افسر نے انگریزی میں شکلا سے پوچھا۔

"انھیں یہاں کون نہیں جانتا۔" شکلا نے میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "کرشنا جی کو تم بھول گئے؟ یہ انھی کے ساتھ رہتے تھے۔ مستانہ کیس انھی کی وجہ سے.... اور" شکلا رک گیا۔ "کیا ظہیر میاں بھی ان لوگوں میں شامل ہیں؟"

"جی ہاں۔" نوجوان افسر نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"نہیں نہیں، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ان لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ پاڑے کے دادا ہیں۔ پیر دادا اور ماچھی دادا سے ان کے گہرے مراسم رہے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" شکلا بے یقینی کے عالم میں بولا۔ "کیوں ظہیر! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ شکلا کی متردد نگاہیں مجھ پر رکی ہوئی تھیں۔ "یہ کوئی بالکل مختلف معاملہ ہے۔" وہ بے چینی سے انگریزی میں بولا۔ "کیا بات ہے ظہیر؟ مجھے بتاؤ۔"

"مجھ سے اس وقت کچھ مت پوچھیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ اُس کے چہرے پر لکیریں پڑ گئیں۔ "مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟ ٹھیک ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں دیکھتا ہوں۔ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟ جولی کے ہاں؟"

"جی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اور اب اب کہاں جا رہے ہو؟"

میری نظریں تجمل کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایس پی شکلا ٹ ثباتی پلکوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ "آپ ہی کچھ بتائیے؟" اُس نے تند لہجے میں تجمل سے پوچھا۔

"اب کوئی بات نہیں صاحب!" تجمل نے لجاجت سے کہا۔

میں نے تجمل کو بتانا چاہا کہ یہ وہی ایس پی شکلا ہے جس نے فیض آباد میں مجھے تار دیا تھا کہ ابا جان جیسے حلیے کا ایک شخص آسام میں دیکھا گیا ہے۔ اسی اطلاع پر تجمل نے تبت جانے کا ارادہ کیا تھا اور ابا جان مل گئے تھے۔ یہ زیادہ مدت کی بات نہیں۔ کرشنا جی کے بعد یہی تھا جو ابا جان کی ٹوہ میں لگا رہا۔ اِس نے ہندوستان کے تمام تھانوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا مگر شاید تجمل کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود اُسے پہچان چکا تھا۔ اس نے شکلا کو سلام کیا۔ شکلا نے تپاک سے جواب دیا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ وہ پہلے مل چکے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے جولین کے گھر کبھی اُن دونوں کی ملاقات ہوئی ہو۔ اُن کے انداز سے شناسائی ظاہر ہوتی تھی۔ شکلا کے چہرے پر اضطراب چھایا ہوا تھا۔ "ابھی سب ٹھیک ہے صاحب!" تجمل نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اپنے کو جلدی جانا ہے۔"

شکلا کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ تجمل کی آواز پر بڑبڑا سا گیا۔ "ہاں ہاں ٹھیک ہے، آپ لوگ جائیں۔" اُس نے بے خیالی میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم بھی جا رہے ہو مگر مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"مجھے جانے دیجیے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "میں آپ سے پھر مل لوں گا۔"

"صرف چند منٹ کے لیے نہیں ٹھہر سکتے؟" وہ تکدر سے بولا۔ مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ "ابھی اِس کو جانے دو شکلا جی!" تجمل نے اُس کا نام لے کے کہا۔ "اِس کا باپ مر گیا ہے۔"

"باپ؟" شکلا حیرت سے بولا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ اُس کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔"

"پیر دادا کو؟"

"ہاں صاحب! وہ اِس کے لیے باوا سے بھی زیادہ تھا۔"

"پیر دادا!" شکلا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ "کیوں ظہیر؟" اُس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔ میری خاموشی پر وہ مجھے جھنجھوڑنے لگا پھر اُس نے میرے شانوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اُسے اپنی حیثیت کا خیال آ گیا تھا یا اطراف میں کھڑے ہوئے افسروں کا۔ اُسی نے لمحوں میں خود پر قابو پا لیا اور ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

چبوترے کی سیڑھیاں طے کر کے ابھی ہم تھانے کا احاطہ عبور کر رہے تھے کہ شکلا پھر لپکتا جھپکتا ہمارے پاس آیا اور تجمل سے پوچھنے لگا کہ اُسے کسی مدد کی ضرورت تو نہیں؟

"ہو سکے تو اپنے لیے سواری کا بول دو صاحب! اتنی رات کو نہیں ملے گی۔" تجمل نے اُس سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" اُس نے پیچھے مڑ کے کسی کو اشارہ کیا۔ نوجوان افسر بھاگا ہوا آیا۔ شکلا کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ تھانے کے باہر موٹریں کھڑی ہیں، وہ ہمیں اسپتال تک لے جائیں گی جہاں دادا اور ماچھی موجود ہیں۔ وہاں ہمیں اُن کے وارث کے طور پر دستخط کرنے ہیں۔ شکلا نے اُسے ہدایت کی کہ اسپتال سے گھر تک پہنچنے کے لیے بھی سواری ہماری تحویل میں رہنی چاہیے۔

"نہیں صاحب!" تجمل بوجھل آواز میں بولا۔ "اپنے کو ابھی ماہم کے پاڑے تک جانا ہے، گھر نہیں۔"

"لیکن یہ لوگ بتاتے تھے کہ دادا کا تو اپنا گھر ہے۔" شکلا نے تجسس سے کہا۔

"ایک دم اُن کے سامنے کیسے لے جائیں؟"

"ہاں۔" شکلا نے تاسف سے تجمل کو شہ دی۔ "اگر ایسا ہی ہے تو پیر دادا کو ابھی اسپتال ہی میں رہنے دیا جائے اور بہتر ہے کہ پہلے تم گھر ہو آئیں۔"

"پاڑے بھی تو اُس کو جانا ہے، وہ بھی اُس کا گھر ہے۔"

"لیکن پاڑے کے لوگ بھڑک سکتے ہیں۔"

"نہیں لے جائیں گے تو اور غل مچائیں گے صاحب!"

شکلا نے سر ہلا کے تائید کی اور مجھ سے کہنے لگا۔ "اُس کی موٹر موجود ہے، ضرورت ہو تو میں لے سکتا ہوں، ڈرائیور بھی ساتھ رہے۔" میں سوچتا رہا کہ کیا جواب دوں۔ میں نے تجمل کی طرف دیکھا۔ اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ضرورت ہو گی تو ضرور اُسے زحمت دی جائے گی۔ شکلا اور نوجوان افسر ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ تھانے کی چار دیواری کے باہر تجمل کچھ فاصلے پر ہو گیا تھا۔ شکلا نے پہلو سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بھن بھناتے لہجے میں بولا۔ "ظہیر! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے پہلے سے بتا دو۔"

"کیسی بات؟" میں نے بھر کے کہا۔ "کوئی ایسی بات نہیں۔"

"مجھ پر اعتبار کرتے ہو نا؟"

"آپ بھی انھی جیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"پھر یہ سب کیا ہے ظہیر! میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا، یہ کیا ہو گیا۔"

"پیر دادا سے تمھارا کیسا تعلق تھا؟"

"وہ میرا...." میری زبان لکنت کرنے لگی۔ "کیا بتاؤں۔ بہت لمبی داستان ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں۔"

"تم کہہ رہے ہو تو یقیناً نہیں ہو گی مگر کسی وقت کسی طرف سے بھی کوئی اندیشہ محسوس کرو تو دیر نہ کرنا۔" اُس نے مجھے متنبہ کیا کہ پیر دادا بمبئی کا بہت بڑا دادا تھا، پولیس نے اِس واقعے کی سنگینی کا شدت سے نوٹس لیا ہے، ہیڈ کوارٹر کے حکم پر سارے شہر کی پولیس حرکت میں آ گئی ہے اور جگہ جگہ چھاپے مارنے کا ارادہ کر رہی ہے، پیر دادا سے قربت کی وجہ سے میں بھی زد پہ آ سکتا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ پولیس کی کارروائیاں اپنے انداز کی ہوتی ہیں، یہ تو میں جانتا ہی ہوں گا۔ پولیس کی رائے میں یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوگا۔

میں سنتا رہا، میں نے کچھ نہیں کہا۔

"اتنے دنوں تک تم آئے کیوں نہیں؟ کیا کرتے رہے؟"

"فرصت ہی نہیں ملی۔ خیال تھا کہ کسی دن شاید آپ ہی آ جائیں۔"

"پچھلے دو مہینے میں کئی بار بمبئی سے باہر جانا ہوا۔" موٹریں قریب آ جانے پر اُس کی سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ تجمل ابھی باہر کھڑا تھا۔ شکلا نے اپنے ہاتھوں میں اُس کے ہاتھ جکڑ لیے اور معذرتی انداز میں بولا "مجھے علم نہیں تھا کہ ظہیر میاں بھی یہاں ہیں ویسے بھی مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی ورنہ اتنا وقت نہ لگتا۔"

"اچھا ہوا جو آپ دیر سے آئے۔"

"کیوں؟" شکلا چونک پڑا۔ "یہ کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"

"آپ ادھر اکیلے تو نہیں ہو صاحب!" تجمل نے چبھتی آواز میں کہا۔ "اپنے کو جان کاری میں اتنی دیر تو لگتی۔"

شکلا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ میری طرح وہ بھی تجمل کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا تاہم اُس نے تشریح نہیں چاہی۔ خوش اطواری سے بولا "پولیس کو کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی ضد کرنی پڑتی ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف چلنا پڑتا ہے۔ پولیس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو شاید مجھے بھی وقت لگتا۔ ہاں ظہیر کا سامنا ہونے پر صورت یقیناً مختلف ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ظہیر کم از کم پیچھے سے وار نہیں کر سکتا اور نہ اس کے ساتھی ایسے ہو سکتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان میں کسی نے ظہیر کو نہیں پہچانا۔ یہ ایسا بدل بھی نہیں گئے۔ کرشنا جی کو گزرے بھی اتنا زمانہ نہیں ہوا کہ کوئی انھیں بھول جائے اور اُن کے محبوب ظہیر کو بھول جائے۔ یہ اشارہ بھی کر دیتے تو اُن سب کی مشکل بھی حل ہو جاتی آپ کی بھی بہرحال......"

"ہم پاڑے کے آدمی ہیں شکلا جی! اپنا بوجھ ساتھ لے کے چلتے ہیں۔ آپ اس کی وجہ سے ہم کو تھوڑا چھوٹ دیتے تو ہم منع بول دیتے۔ یہ کسی کا نام لیتا تو ہم اس کو باہر کر دیتے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" میری توقع کے خلاف شکلا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اپنی ہتک ہے آگے بھی آپ کوئی چمکی مت لگانا۔ کندھے کا اُدھار ہم کو راس نہیں آتا۔"

"اوہ او میری گڈ۔" شکلا اچھل کے بولا۔

یہ کچھ کہنے کا کیا محل تھا۔ شکلا تو ہمارے لیے کہہ رہا تھا اس سے پہلے کہ تجمل کی زبان سے کچھ اور نکلتا۔ میں نے اُسے کہنی مار کے اندر بیٹھ جانے کی التجا کی۔ اندر نشست پر بیٹھتے ہوئے تجمل شکلا کو سلام کرنا نہیں بھولا۔ وہ سب اندر چلے گئے تو میں نے بھی جانا چاہا۔ شکلا نے میری کلائی پکڑ لی۔ "اپنا خیال رکھنا۔" اُس نے مرتعش آواز میں کہا۔ "میں اسی شہر میں ہوں۔"

میری رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ میں جلدی سے اندر چلا آیا۔

اسپتال کے دروازے پر زورا، گلیا، الچھی اور چھیدا ہمیں بُجھ کے دھاڑیں مارنے لگے۔ اسپتال سے پاڑے تک سارے راستے وہ منہ نوچتے، سینہ پیٹتے رہے۔ پاڑے کے علاقے میں جگہ جگہ سپاہی گشت کر رہے تھے اور ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے جیسے ہر گھر میں کوئی مر گیا ہو۔ موٹریں پاڑے کی عمارت کے قریب پہنچیں تو ہر سُو شور مچنے لگا۔ جب تک موٹریں پاڑے کے دروازے پر ٹھہر نہیں گئیں، لوگ ساتھ ساتھ بھاگتے رہے۔ موٹر سے اُتار کے وہ انھیں اپنے کندھوں پر عمارت میں لائے۔ دیکھتے دیکھتے عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ سپاہی بھی اندر گھس آئے تھے۔ دونوں کو اُسی تخت پر لٹا دیا گیا تھا جہاں ایک پہر پہلے وہ دندنایا کرتے تھے۔ زورا، چھیدا اور نہ جانے کون کون لوگوں سے بار بار خاموش ہو جانے کی منتیں کر رہے تھے۔ پل بھر کے لیے سناٹا چھاتا پھر وہی شور اُمڈنے لگتا۔ میں نے بس ایک نظر انھیں ایک دوسرے کے قریب پڑے دیکھا۔ جب وہ اُن کے چہروں سے چادر ہٹانے لگے تو میں وہاں سے ہٹ آیا اور ایک کونے میں آ کے بیٹھ گیا۔ اُن کی سسکتی بلکتی آوازیں سُن سُن کے میرا جسم شل ہو گیا تھا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ شامو میرے پاس آ گیا اور بھنّاتے ہوئے بولا کہ میں یوں چھپ کے کہاں بیٹھ گیا ہوں۔ لوگ سارے میں مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے چڑ کے کہا۔ "میں کدھر جاتا، میری فکر مت کرو۔"

"استاد بلاتے ہیں لاڈلے!" وہ تلخی سے بولا۔

"مجھے یہیں رہنے دو، کہہ دو کہ نہیں ملا۔"

"کیا بولتا ہے؟" اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔

"میں یہاں ٹھیک ہوں شامو بھائی!"

"میں بولتا ہوں استاد نے پوچھا ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"اُسی سے جا کے پتہ کرنا، چل اُٹھ۔" اُس نے جھٹکے سے مجھے کھینچ کے اُٹھا لیا۔ چوکی کے اطراف لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہم اُن کے درمیان سے گزرتے ہوئے اندر کمرے میں چلے آئے۔ تجمل پیرو

دادا کے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ "کیا ہے رے، کدھر کھو گیا تھا؟" وہ تنک کے بولا۔

"کہاں جاتا، یہیں تھا۔"

"چلنا ہے ابھی......"

"کہاں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"چلنا ہے رے۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں جانے کو کہہ رہا ہے۔ "میں نہیں جاؤں گا، خدا کے لیے مجھے مت لے جاؤ۔" میں نے بہت التجا کی۔

اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ "چل رے! وہ اپنا نہیں تو تیرا ہی تھوڑا خیال کریں گی۔"

"وہ کسی کا خیال نہیں کریں گی۔"

"کوئی نہ جانے پھر؟" وہ غصے سے بولا اور اُٹھ کے میری کمر تھپکتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ وہاں جانے کے خیال سے میری ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ شامو نے مجھے آگے کی جانب دھکیلا۔ میں چوکھٹ سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ گلیا نے عقبی دروازہ کھول دیا تھا۔ ہمیں دوبارہ ہجوم کی طرف نہیں جانا پڑا۔ پچھواڑے ٹم ٹم کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا۔ اس طرف بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ دُور جا کے ٹم ٹم کی رفتار تیز ہو گئی۔ سڑکیں بھی سنسان ہو گئی تھیں۔ تجمل گم سم بیٹھا رہا۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اندھیرا ٹوٹنے لگا لیکن روشنی اُجالا تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ جیسے جیسے دادا کا گھر قریب آ رہا تھا، مجھے ہر شے گھومتی سی نظر آ رہی تھی، جیسے کوئی مسلسل میری جان کھینچ رہا ہو۔

مکان پر سکوت طاری تھا۔ میں رات ہی کوئی دس گیارہ بجے کے درمیان یہاں آیا تھا۔ اس وقت پانچ بج رہے ہوں گے۔ چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ رات اُن کے چہروں پر کیسی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ بات بات پر کھِل جاتی تھیں۔ کیا معلوم تھا کہ چند گھنٹوں بعد مجھے یہاں پھر آنا پڑے گا اور صبح کے ساتھ میں اُن کے لیے اندھیرا لے کے آؤں گا۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ٹم ٹم ٹھیرتے ہی تجمل اُتر گیا۔ اُس کی دستکوں پر دیر سے دروازہ کھلا اور بندوق بردار گورکھا چوکیدار اندر سے برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا جسم بل کھانے لگا۔ "اندر جا کے بول، ہم آئے ہیں۔" تجمل نے اُسے پوری طرح آنکھیں کھولنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

وہ بوکھلا گیا۔ "کیا ہے مالک! سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں رے، اب دیری مت کر۔" تجمل نے اُلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

چوکیدار گُنگ کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ اُس کی پیشانی ایک پل کے لیے سمٹ گئی، وہ فوراً دروازے سے ہٹ گیا۔ "ابھی سب سوتا ہے۔" وہ اضطراب سے بولا۔

"اٹھا دے رے اُن کو۔" تجمل نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"مالک کو پوچھتا ہے آپ؟" اندر جاتے جاتے اُس نے رُک کے پوچھا۔

"نہیں رے!" تجمل نے درشتی سے کہا۔ "گھر میں جا کے بول۔"

سامنے کے مختصر سبزہ زار سے ملحق ساری کوٹھی لوہے کی جالیوں میں محصور تھی۔ چوکیدار نے عمارت کے ستون میں نصب گھنٹی بجائی۔ اندر سے پیرو دادا کے خاص آدمی شبّی چاچا کی دھمکتی آواز سنائی دی۔ "کون ہے گورے! کیا ہے؟"

چوکیدار ابھی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ شبّی چاچا ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ بنڈی اور لنگی پہنے ہوئے تھا۔ کہنے کو وہ ملازم تھا لیکن اُسے گھر کے نگران کی حیثیت حاصل تھی۔ عمر میں بھی وہ پیرو سے بڑا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، گندمی رنگت، درمیانہ قد۔ اپنی وضع قطع سے بھی وہ گھر ہی کا کوئی فرد لگتا تھا۔ پیرو سے اُس کی شناسائی بہت پرانی تھی لیکن گھر میں آمد و رفت گیتا کے ہوش سنبھالنے پر ہوئی۔ گیتا کو سب سے پہلے اسی نے پڑھانا شروع کیا تھا۔ پیرو کی رائے میں کسی جھگڑے کے سبب اُس نے اپنے شہر سے بھاگ کے بمبئی کے جنگل میں پناہ لی تھی، اپنے بارے میں اُس نے نہ کبھی کچھ بتایا تھا، نہ پیرو نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ پیرو کو شبہ تھا کہ اُس کا اصل نام شبیر خاں ہے بھی کہ نہیں۔ بہت دنوں بعد پیرو کو معلوم ہو سکا کہ اُس کا تعلق ریاست رام پور سے ہے۔ پیرو کے اصرار پر وہ یہیں رہنے لگا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ گھر کی دیکھ بھال کے سوا اُس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گھر سے بھی وہ صرف ضرورت کے وقت نکلتا تھا۔ سارا حساب اُس کے ذمے تھا اور گھر کے دوسرے ملازم اُس کے سامنے جواب دہ تھے۔ پیرو اُسے بڑے بھائی کا درجہ دیتا تھا۔ رانی اور گیتا بھی اُسے بھائی اور چاچا کہتی تھیں لیکن شبّی چاچا ہر جگہ خود کو پیرو کا ملازم کہتا اور ایک مالک کی طرح پیرو کا احترام کرتا۔ گھر میں اتنا شامل ہونے کے باوجود سب سے الگ تھلگ رہتا، ضرورت پر سامنے آتا۔ وہ کوٹھی کے ایک کونے میں ملازموں کے لیے بنے ہوئے حصے میں رہتا تھا، البتہ

پیرو کی عدم موجودی میں اندر آجاتا۔ پیرو کے بارے میں اُسے سب کچھ معلوم تھا۔ پیرو کے بہ قول شجی چاچا پاڑے اور اُس کے گھر کے درمیان ایک پردے اور دیوار کے مانند تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ "کون؟ کون؟ تجمل بھائی آئے ہیں۔ اتنے سویرے سویرے، خیر تو ہے؟" اُس نے جالیوں کے درمیان بنے ہوئے دروازے کا تالا بہ عجلت کھول دیا۔ تجمل وہیں پڑی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"خدا نخواستہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟" شجی چاچا نے ٹھٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آنا بھی بس کا نہیں ہوتا شجی میاں!" تجمل نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ "اُن دونوں کو اٹھا دیجے۔"

"کنھیں؟" شجی چاچا سٹ پٹا کے بولا۔ "پیرو رانی اور بٹیا کو؟"

"انھی کو بولتے ہیں۔"

"کیا بات ہے تجمل بھائی! خدا خیر کرے، سب خیریت ہے نا؟" شجی کے چہرے پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ اتنی عمر میں آواز اور چہرے پہچاننا اُسے خوب آ گیا ہوگا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں پیرو کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ کہاں ہے؟

"اُن کے سامنے ہی جان لینا، کدھر ہے وہ۔ اُن کو ابھی اٹھا دو شجی میاں!"

"کیا ہوا، ایسی کیا بات ہے؟" وہ بدحواسی سے بولا۔ "مجھے کیوں نہیں بتاتے آپ؟"

"بتانے کے لیے آئے ہیں۔" تجمل نے اُسے جھڑک دیا۔ شجی چاچا دم بخود ہو کے تجمل کی صورت تکتا رہا، پھر مزید استفسار کیے بغیر اندر کی طرف مڑ پڑا۔ چند لمحوں بعد اندر سے دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز آئی۔ دروازہ جلد ہی کھل گیا تھا۔ شجی چاچا کی چیخ پکار بند ہو گئی۔ پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اُس نے اُن دونوں کو جانے کیا بتایا تھا مگر شاید کچھ زیادہ نہیں کیونکہ وہ فوراً واپس آ گیا۔ آتے آتے اُس نے بیرونی کمرے کا دروازہ کھول دیا، کمرہ روشن کر دیا اور پردے ہٹا کے کھڑکیاں کھول دیں۔ کانتے کے چلے جانے کے بعد تجمل نے اس کمرے میں کئی دن گزارے تھے۔

ہمیں وہاں پہنچے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ رانی اور گیتا جھپٹتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ گیتا نے آتے ہی دہشت زدہ آواز میں اپنے باپ کے بارے میں پوچھا۔ تجمل نے ہاتھ پھیلا کے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ تجمل نے رانی کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا رہا۔ جانے کتنے لمحے گزر گئے۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ گیتا نے اُسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کچھ دیر اپنی سانسیں استوار کر سکے اور الفاظ ڈھونڈ سکے جو کبھی بہت حقیر ہو جاتے ہیں، بالکل بے جان پتھر جیسے۔ گیتا نے اضطراری لہجے میں تجمل سے دوبارہ پوچھا: "پاپا کدھر ہیں؟"

"اِدھر ہی ہے بٹیا، اِدھری۔" تجمل کی زبان اکڑ گئی تھی۔

گیتا کو یقین نہیں آیا۔ ایسی بچی نہیں تھی وہ۔ تجمل کے بازوؤں سے نکل کے وہ اُس کا چہرہ دیکھنے لگی، پھر اُس نے پلٹ کے بے تابانہ مجھے دیکھا۔ تجمل کی طرح میری نظریں بھی جھک گئیں۔ میرا تو سارا جسم اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ "پھر آپ......" وہ اٹکتی بہکتی آواز میں بولی۔ "یہ شجی چاچا......؟"

"یہ بھی ٹھیک بولتے ہیں۔" تجمل نے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے کہا۔

"کیا! کیا ہوا اُن کو....؟" رانی کی چیخ نکل گئی۔ تجمل پتھر ہو گیا تھا۔ گیتا دیوانہ وار اُسے جھنجھوڑنے لگی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن مجھ سے وہاں نہ ٹھہرا جا سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا گریبان پکڑ لیتیں، میں کمرے سے بھاگ آیا۔ میرے قدم مجھے مکان کے دروازے تک لے آئے تھے اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا چاہیے، کون سی کھوہ میں۔ دروازہ بند تھا اور چوکی دار موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا تھا لیکن مجھ سے آگے بھی جایا جا سکا۔ پیچھے سے شجی چاچا بھاگتا ہوا میرے پاس آ گیا اور مجھے اپنے پہلو میں دبوچے اندر لے آیا۔ میرا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں رہا تھا مگر دوبارہ اندر جانے کے خیال سے میرا دم پھر نکلنے لگا۔ شجی چاچا کی آنکھیں اُمڈ رہی تھیں۔ وہ اُلٹا مجھے تھپکیاں دینے لگا۔ میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ وہ بھی نہیں رکا، مجھے وہاں چھوڑ کے سامنے کے بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ وہ بین کر رہی تھیں، اُن کی چیخوں اور کراہوں کی صدائیں برآمدے تک آ رہی تھیں۔ تجمل کی گھٹی گھٹی آوازیں بھی اُن میں شامل تھیں۔ اُسے میں نے اکیلا چھوڑ دیا ہے، یہ احساس مجھے اور ہلکان اور ناتواں کر رہا تھا۔ میں اندر نہیں گیا۔ اتنی دیر میں باہر سے موٹر کا ہارن بجا۔ چوکی دار نے دروازہ کھولا تو منیر علی اور ابا جان اندر داخل ہوئے۔ فرخ اور فریال بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ سب ہانپتے کانپتے سیدھے میری طرف آئے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے تھے۔ میں کیا جواب دیتا۔ برآمدے میں گونجتی ہوئی رانی اور گیتا کی سسکیاں اُنھوں نے بھی سن لی ہوں گی۔ پھر وہ میرے پاس نہیں ٹھیرے۔ اچھا ہوا جو وہ آ گئے، مجھے ایک دم چھاؤں کا سا احساس ہوا۔ تجمل اب اکیلا نہیں رہا تھا۔ ابا جان اور منیر علی کی آمد پر اُن کی آہ و بکا کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اُنھوں نے ایسا گریہ کیا کہ آدمی تو آدمی در و دیوار دہل جائیں۔

دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی مگر اندھیرا ختم ہو گیا تھا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ شجی چاچا اور گھر کے ملازم سسکتے بلکتے کئی بار میرے سامنے سے گزرے، کوئی بھی میرے پاس نہیں آیا۔ پھر بیرونی کمرے سے یکایک تجمل نمودار ہوا۔ اُسے دیکھ کے میں ہڑبڑا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے مقابل آ کے ٹھیر گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا: "چلا آیا رے!" میرے ہونٹ سسک کے رہ گئے۔

"ابھی پاڑے جا کے اُن کو لانا ہے۔" اُس نے بکھری بکھری آواز میں کہا: "اِدھر کا دھیان رکھنا۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔ یہاں ابا جان ہیں۔"

"ابھی اِدھری رہ۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا: "اِدھر تیری ضرورت ہے۔ تجھ پہ مان کرتی ہیں وہ۔"

"مگر مجھ سے یہ سب......"

"پہلی بار تھوڑی دیکھ رہا ہے۔"

"مگر کوئی کتنی بار دیکھ سکتا ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا: "تمھاری بات اور ہے۔"

"ہاں رے! ٹھیک بولتا ہے۔"

"تم کہو تو میں پاڑے چلا جاتا ہوں۔"

"اُدھر کوئی اور ہیں کیا؟......"

"مگر یہاں مجھ سے اُن کے سامنے نہیں جایا جاتا۔"

اُس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے تن بدن میں ایسا شور اُٹھا کہ پھر کچھ بھی خیال نہ رہا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں: "نا نا، نہیں رے نہیں، ایسا کیسے چلے گا۔ تو بھی ڈھیر ہو جائے گا تو......" باہر سے ہارن کی آواز آنے پر وہ سیدھا ہو گیا: "موٹر آ گئی ہے۔ میں چلتا ہوں۔ ابھی اندر جا کے بیٹھ تو ٹھیک ہے۔" میرے شانے دباتا وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ موٹر جولین، اُس کی ماں، چمپا بیگم اور شہ پارہ کو لے کے آئی تھی۔ اُنھوں نے سیڑھیوں پر تجمل کو روک لیا لیکن وہ اُن کے پاس نہیں ٹھیرا، آگے بڑھ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی مجھ تک پہنچ گئیں۔ میرا سارا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے کچھ پوچھنا، کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ میں نے بیرونی کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایکا ایکی میرے سینے میں وہی آگ بھڑکی۔ تجمل دروازے تک چلا گیا تھا۔ اُن چاروں کو وہیں چھوڑ کے میں نے تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں۔ میری آواز پر تجمل ٹھیر گیا۔ میں نے اُس کے پاس جا کے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ اُس کا دھیان کس طرف جاتا ہے؟

"کاہے کا دھیان؟" وہ چونک کے بولا۔

"یہی کہ وہ کون، کون ہو سکتا ہے؟"

"تو بھی وردی والوں کی طرح بولتا ہے۔"

"تم نے کچھ سوچا تو ہوگا، کسی طرف ضرور تمھارا......"

"بیٹھ جا اندر جا کے۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"تم کو کچھ شبہ ہو تو مجھے بتاؤ؟ دادا کی ارتھی اُس سے پہلے نہیں اُٹھنی چاہیے؟"

"پھر دادا لوٹ آئے گا؟"

"دادا تو کبھی نہیں لوٹے گا۔" میں نے تلخی سے کہا: "تمھارا کیا مطلب ہے؟ کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے؟ پھر تو کبھی کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں، تمھیں اس طرح چین آ جائے گا!"

"ایک وقت میں ایک ہی طرف کا پورا دکھائی دیتا ہے رے، دیکھیں گے اس کو بھی۔"

"تم اس طرف دیکھو، میں جاتا ہوں، میں ایسے نہیں لوٹوں گا۔"

"پتہ ہے اپنے کو۔" وہ غصے سے بولا: "اِدھر کوئی تیرا جوڑی دار نہیں ہے۔ بڑا رُستم ہے تو۔ کانٹے کا پکا، تھوڑی دیر کا بھی اُدھار نہیں رکھتا۔"

"تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کرتے؟"

"چا تو ہی سیکھا ہے تو نے بس۔" وہ تمتمائی آواز میں بولا اور منہ پھیر کے سیدھا موٹر میں جا بیٹھا۔ میں دروازے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس کے بیٹھتے ہی موٹر روانہ ہو گئی۔ گو میں اندر لوٹ آیا تھا، اِس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ تجمل میری آنکھیں اور دھندلا گیا۔ میں اُسی وقت نکل جاتا مگر میں کون سی گلی کون سے کوچے کا رُخ کرتا۔ میں نے تجمل کی تائید یا اُس کی اجازت کے لیے اُس سے بات نہیں کی تھی۔ مجھے اپنے سر میں گونجنے والے مبہم اور مجہول شکوک کی تصدیق مطلوب تھی۔ یوں شاید مجھے کوئی اشارہ مل جاتا۔ ظاہر ہے تجمل بھی کسی سمت کا تعین نہیں کر پایا تھا، اسی لیے مجھے تحمل کا درس دے رہا تھا اور خود اُسے اتنا وقت گوارا نہ ہوتا یا کوئی اور بات ہے؟ وہ محض مجھے روکنے کے لیے تو ابھی سب کچھ خود تک محدود رکھنا نہیں چاہتا؟ نہیں، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس پر تو ایک ایک لمحہ عذاب کے مانند گزر رہا ہوگا۔

دھوپ پھیلنے کے ساتھ ساتھ گھر میں پڑوسیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ شجی چاچا نے سبزے پر شامیانہ لگوا دیا تھا۔ عمارت کے

اندر اور باہر دریاں اور سفید چادریں بچھا دی گئی تھیں۔ ابا جان اور منیر علی بھی شتی چاچا کے ساتھ مصروف تھے۔ میں ایک کونے میں سبزے پر بچھی ہوئی دری پہ آ بیٹھا۔ ابا جان اور منیر علی کئی بار میرے پاس آئے اور گپ چپ بیٹھے رہے۔ نہ کچھ وہ کہہ پاتے تھے، نہ مجھ سے کچھ کہا جاتا تھا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کسی کمرے میں جا کے کمر ٹکانے کو کہنے لگے۔ میرے جلیے کی طرف بھی اُنھوں نے اشارہ کیا۔ پھر جولین مجھے برآمدے کی جالیوں میں دکھائی دی۔ وہ مجھی کو بلا رہی تھی۔ میں اُٹھ کے اُس کے پاس پہنچا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر ایک کمرے میں لے گئی۔ یہ گیتا کا کمرہ تھا۔ یہاں فرخ بھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ جولین نے بھیگی ہوئی تولیا میرے سامنے رکھ دی۔ میرا کچھ جی نہیں چاہتا تھا لیکن نہ انکار کی ہمت تھی، نہ اس کا کوئی جواز تھا۔ مجھے یاد ہے، کانتے کے وقت پیرو دادا نے کہا تھا کہ زندوں سے بھی تیرا کچھ واسطہ ہے۔ جولین کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں اگر کوئی تماشا بنا ہوا تھا تو یہ اچھا نہیں تھا۔ جولین اور فرخ کو میری فکر سے زیادہ گیتا اور رانی کی نگہداشت کرنی چاہیے تھی۔ تولیا ایک طرف رکھ کے میں غسل خانے چلا گیا۔ پاجامے کے پائنچوں پر پانی انڈیلنے سے کیچڑ کے دھبے بڑی حد تک مٹ گئے۔

میں باہر آیا تو فرخ چائے کی پیالی لے آئی۔ میں نے کوئی پس و پیش نہیں کی اور چند گھونٹوں میں چائے حلق میں لوٹ لی۔ غم کی تازگی کے لیے توانائی بھی ضروری ہے۔ وہ دونوں میرے ساتھ باہر نکلیں۔ میں برآمدے کی طرف جانے کے بجائے اُن کے ساتھ بیرونی کمرے میں داخل ہوا۔ شہ پارہ، چمپا بیگم، جولین کی ماں، فریال اور پڑوس کی عورتوں کے درمیان رانی اور گیتا بتوں کی طرح بے سُدھ بیٹھی تھیں۔ بکھرے ہوئے بال، ویران آنکھیں۔ آدمی ایسے شیشے کے بنے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر میں وہ ایسی اُجڑ گئیں کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ کسی لمحے گیتا نے بھی دروازے کے قریب مجھے کھڑے دیکھ لیا۔ اُس کے بدن میں کوئی تلاطم سا اٹھا۔ جس بات کے تصور سے میرا دل ڈوبنے لگتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے، جیسے کسی بچے سے کوئی چیز چھین لی جائے اور وہ حسرت سے بے بسی سے منہ بسورنے لگے۔ یہی اُس کا حال ہوا۔ وہ میرے پاس آنا چاہتی تھی یا مجھے بلانا، دوسرے ہی لمحے وہ وہیں ڈھیر ہو گئی اور گھٹنوں میں سر دیے بلکنے لگی، چمپا بیگم نے اُس کا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ پھر میں ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں ٹھہرا لیکن باہر آ کے میری نگاہیں اُسی کو دیکھتی رہیں، اُسی کے گرد منڈلاتی رہیں۔

گیارہ بج رہے تھے جب موٹروں اور ٹمٹموں کا شور بلند ہوا۔ پھر چند منٹوں میں اندر باہر ہر جگہ سارا مکان باڑے کے آدمیوں سے بھر گیا۔ دادا کی چارپائی بیرونی کمرے میں رکھی گئی۔ تو وہ پاگلوں کی طرح واویلا کرنے لگیں۔ کوئی انھیں خاموش بھی کیا کرتا۔ اُن کا حال دیکھ کے سب کے ہوش گم ہوئے جاتے تھے۔ کسی کو ہنستا دیکھ کے آدمی کو اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا روتا دیکھ کے دل کٹتا ہے۔ سبھی بے حال تھے۔ زورا، چھیدا، انگلیا، پچھی، جمرو، شامو، مارٹی، ٹھنگو، دینا دادا اور باڑے کے آدمیوں میں جانے کون کون مجھے ڈھونڈتے ہوئے میری طرف آنکلے تھے اور میرے ہی گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ گلے مل مل کے روتے، اپنے آپ کو طمانچے مارتے، سر پیٹنے لگتے، کوئی کسی کو سنبھالتا اور خود بکھر جاتا۔ تجمل کے ساتھ آنے والوں کے بعد بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ مکان کے باہر ساری گلی اُن سے گھر گئی تھی۔ اُن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ لگتا تھا، ماہم کا سارا علاقہ اُٹھ کے آ گیا ہے۔ چند ہی لوگ میرے صورت آشنا تھے۔ پھر یکایک جارجی میرے سامنے آ گیا۔ اُسے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا مگر وہ خود بہت کھنڈر معلوم ہو رہا تھا۔ سارا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا، لال لال آنکھیں، ڈھلکے ہوئے شانے، مرا تُڑا جسم۔ وہ میرے سینے سے آ کے لگ گیا اور بُری طرح بلکنے لگا۔ مارٹی نے اُسے ہٹایا اور تشفی دلا سے دے کے ایک طرف بٹھا دیا۔ اُس کی بیوی ماری بھی چند لمحوں کے لیے مجھے نظر آئی، سڑک پر بیٹھی ہوئی کسی باؤلی بھکارن کی طرح، کوئی ذرا چھیڑے تو کاٹ کھائے۔ نہ اپنی خبر، نہ دوسروں کی۔ جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی، معلوم ہوتا تھا، ویسے ہی اُٹھ کے چلی آئی ہے۔

مکان کے اندرونی حصے کے ایک گوشے میں مسکراتا ایس پی شکلا بھی مجھے دکھائی دیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اُس کے ساتھ یقیناً اور پولیس والے بھی ہوں گے۔ شکلا میرے پاس نہیں آیا، دُور دُور کھڑا رہا لیکن اُس کی نظریں مسلسل مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

گیارہ بجے وہ دادا کو لائے تھے، تین بجے تک اُنھوں نے بنا سنوار کے اُسے پھولوں میں چھپا دیا۔ اُس کی ارتھی اُٹھی تو

گیتا اور رانی دیوانوں کی طرح چیختی بلبلاتی باہر نکل آئیں۔ جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم نے انھیں جکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ دیوانگی کی طاقت ہی اور ہوتی ہے، گیتا ارتھی سے چمٹ گئی۔ تجمل، منیر علی اور شتی چاچا نے جا کے اُسے پکڑا اور بے بس کر دیا۔ تجمل اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے جانے کیا کیا کہتا رہا۔ گیتا زار و قطار رو رہی تھی جیسے بس آنسوؤں میں تحلیل ہو جائے گی۔ تجمل کے اشارے پر وہ جلد ہی دادا کو گھر سے باہر لے گئے۔ گلی کے بیچ میں ایک چوکی پر ارتھی رکھ دی گئی اور لوگوں سے منت کی گئی کہ جسے دادا کا درشن کرنا ہو قطار میں آ جائے اور آگے بڑھتا رہے۔ کوئی زور زور سے بار بار اس قسم کے اعلانات کر رہا تھا مگر سب بہرے ہو گئے تھے۔ کوئی سامنے سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا، کوئی دادا کے لیے پھول لایا تھا، کوئی گلاب پاش سے گلاب چھڑکتا، کوئی پھول بکھیرتا، کوئی بس ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس کچھ عورتیں گھر کے اندر نہیں گئی تھیں، وہ فارس روڈ کی عورتیں ہوں گی۔ وہ رنگ برنگی چُنریاں دوپٹے لے کے آئی تھیں۔ دادا کی ارتھی پر وہ انھیں پھیلاتی سجاتی رہیں۔ میں نے اب تک اُس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے اس نظارے کی حسرت تھی۔ ایک ہی رات کی تو بات تھی، میرے سینے میں اُس کا مسکراتا چہرہ نقش تھا، آدمی زندہ چہرے ہی سینے میں کیوں محفوظ نہ رکھے۔ میں اُس کے قریب نہیں گیا لیکن جمرو، شامو اور مارٹی مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں لے گئے۔ وہ پھولوں کے درمیان جیسے پلکیں موندے کسی سوچ میں گم تھا۔ جیسے ابھی کسی آہٹ پر آنکھیں کھول دے گا مگر اتنی صداؤں اور دستکوں کے باوجود اُس کی پلکوں میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ زندگی بھر دادا لوگوں سے اپنا گھر چھپاتا رہا۔ کچھ خبر نہیں تھی، ایک دن ایسا راز فاش ہو گا، اتنے لوگ یوں شور مچاتے ہوئے آ جائیں گے۔

دھوپ اُترنے لگی تھی اور ارتھی کے گرد لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہو رہا تھا مگر پھر باڑے کے داداؤں نے زبردستی دادا کی ڈولی کندھوں پر اُٹھا لی۔ ابا جان اور منیر علی کو تجمل نے رانی اور گیتا کے خیال سے گھر روک دیا تھا حالانکہ وہ اس کے لیے آمادہ

نہیں تھے۔

گھاٹ تک کوئی دو میل کا فاصلہ تھا۔ آگے پولیس نے موٹروں اور دوسری گاڑیوں کے لیے سڑک بند کر دی تھی اسی لیے لوگ کسی رکاوٹ کے بغیر آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ دادا کی ارتھی کے آگے آگے پولیس کی موٹریں بھی چل رہی تھیں۔ بہت سے باوردی پولیس والے بھی ہجوم میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہم ابھی اقامتی علاقے سے نکل کے بڑی سڑک پر آئے تھے کہ ڈاکٹر کیلاش اکھڑی ہوئی سانسوں اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آگیا اور مجھ سے وہی پوچھنے لگا جس کا مجھے خود علم نہیں تھا۔ وہ مجھ سے معذرت کرنے لگا کہ اُسے دیر سے خبر پہنچی۔ اپنی ماں اور بہنوں کو وہ گھر چھوڑ آیا ہے۔ گھر کے آس پاس موٹر کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ملی تھی، اُسے دُور اُترنا پڑا۔ اس طرح کچھ اور دیر ہو گئی۔ وہ میرے پہلو سے لگا لگا چلتا رہا۔ خاصی دُور بعد کسی بوڑھے کی آہ و بکا پر میں نے پلٹ کے دیکھا، ایس پی شکلا بھی میرے پیچھے چل رہا تھا، میرے سائے کی طرح جانے کب سے۔ میں اگر مڑ کے نہ دیکھتا تو گمان بھی نہ ہوتا۔

"آپ بھی؟" میں نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کیسے؟"

اُس نے بڑھ کے میرا ہاتھ تھام لیا اور آہستگی سے بولا۔ "میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کہنے لگا۔ "پولیس اسٹیشن سے کچھ دیر کے لیے گھر گیا تھا، دل نہیں مانا۔ بے کلی سی رہی۔ تم سویرے وہاں بالکل ٹھیک نہیں تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب معلوم ہو سکا کہ دادا کا گھر کہاں ہے۔ اب کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے سانس لے کے کہا۔

"کہاں ٹھیک ہو۔" وہ افسردگی سے بولا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چپ ہو گیا اور میرے قدموں سے قدم ملا کے بڑھتا رہا۔ کچھ دُور کے سکوت کے بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"مجھے افسوس ہے ظہیر! میں اتنا نہیں جانتا تھا۔"

"کیا نہیں جانتے تھے؟"

"یہی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب بہت عجیب ہے۔ میں یہاں نہ آتا تو ایک نئے تجربے سے محروم رہتا۔ یہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ بلکہ مختلف ہے۔" میں صرف سُنا کیا۔ "مجھے بتاؤ ظہیر!" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "یہ کون آدمی تھا؟"

"آپ نے اُسے کبھی نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہے کئی بار مگر اس طرح نہیں۔ ماہم کا سارا علاقہ بند ہے۔ کہیں کوئی کاروبار نہیں۔ اِدھر فارس روڈ کی عورتوں نے تین دن کے لیے اپنا کاروبار بند کرنے کا اعلان کیا ہے۔ صرف میں نہیں، پولیس کے کسی سپاہی کسی افسر کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آدمی کی کمائی صرف آدمی ہوتے ہیں۔ کوئی کتنے اپنے رونے والے سمیٹتا ہے۔ پیرو دادا نے اتنے آدمی اکٹھے کیے تھے، وہ اتنا مال دار تھا! یہ پاڑے کے دادا سے سوا بات ہے۔"

"وہ پاڑے ہی کا دادا تھا۔"

"مگر ایسا نہیں ہوتا۔"

"اور آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ تذبذب سے بولا۔ "مگر یہ کیسے ہے؟"

میں سوچتا رہا، کیا جواب دوں۔ چوک آگیا تھا، یہیں سے گھاٹ کو راستہ جاتا تھا مگر کچھ دیر کے لیے سب کو ٹھیرنا پڑا۔ کسی نے ارتھی پر بے شمار سکے نچھاور کیے تھے۔ اُدھر پاڑے کی جانب سے بہت لوگ ماچھی کی ارتھی اُٹھائے آ رہے تھے۔ جب تک وہ شامل نہیں ہو گئے، سب اُن کے انتظار میں کھڑے رہے۔ آگے راستہ کچھ کشادہ ہو گیا تھا لیکن شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ماچھی کو لانے والوں کی شمولیت سے ہم کچھ پیچھے ہو گئے تھے۔ شکلا اور ڈاکٹر کیلاش، دونوں میرے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ ابھی گھاٹ کچھ فاصلے پر تھا کہ شکلا کسمساتے لہجے میں بولا۔

"جولین بھی مجھے وہاں نظر آئی، کیا وہ دادا کو جانتی تھی؟"

"پھر وہ کیسے آتی۔"

"مگر اُس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"ضروری تھا کیا۔"

"نہیں۔" وہ خفیف سا ہو گیا۔ "میں نے وہاں دادا کی بیوی اور بیٹی کو بھی دیکھا، دادا کے گھر کو۔ بہت دُکھ ہوا۔ میرے لیے تو یہ سب کچھ کسی کہانی کے مانند ہے۔ دادا ایسے گھر میں رہتا تھا! اتنی اچھی بیوی اور بیٹی، اتنا اچھا گھر ہوتے ہوئے وہ پاڑا کیوں چلاتا تھا؟"

"شاید اس لیے کہ اتنے لوگ اُسے پاڑے پر دیکھنا چاہتے تھے۔"

"مگر وہ کون تھا؟" اُس کے پنجے کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔ "وہ کون تھا جو پیرو دادا کو پاڑے پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا، جسے اُس سے ایسا بَیر ہو۔ تمھیں کچھ پتہ چلا؟"

"اس کی مہلت ہی کب ملی۔"

"پولیس بھی بہت ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ چند آدمی گرفتار کیے گئے ہیں مگر شاید خانہ پُری کے لیے۔ کوئی مطمئن نہیں ہے۔ سارے شہر میں بھی چرچا ہے اور خوف پھیلا ہوا ہے۔ پولیس نے کئی جگہ چھاپے مارے ہیں۔ بمبئی سے باہر جانے والے راستوں کی ناکا

بندی کر دی گئی ہے۔ ہتھیار رکھنے والوں کی چھان بین کی جا رہی ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ وہ بمبئی کے پاڑوں میں سے کوئی ایک باغی آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ دادا کے خاص پاڑے ہی میں سے کوئی ہو اور یہاں موجود ہو۔" شور کی وجہ سے اُس کی آواز صاف سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بول بھی ایسے رہا تھا جیسے خود سے مخاطب ہو۔ گھاٹ قریب آنے پر وہ خاموش ہو گیا اور مجھ سے دور بھی ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کیلاش بھی مجھ سے بچھڑ گیا۔ گھاٹ کی تنگ گزرگاہ میں داخل ہوتے وقت پیچھے سے ہجوم کا ایک ریلا آیا، سبھی منتشر ہو گئے۔ شکلا کی باتوں سے مجھے اُس وقت بہت وحشت ہو رہی تھی۔ میں اُس سے کہتے کہتے رہ گیا کہ کیا وہ یہ سب مجھ سے کسی اور وقت کے لیے اُٹھا نہیں رکھ سکتا مگر اُس کے جُدا ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ اُس کا ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ وہ تو میری اشک شوئی، میری دل جوئی کی خاطر میرے ساتھ تھا، میرا دھیان بٹانے، مجھے سہارا دینے کے لیے۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ نہ جبرو، نہ شامو، نہ مارتی۔ ڈاکٹر کیلاش بھی ہجوم میں کہیں کھو گیا تھا۔ جانے کیوں ہر طرف بھگدڑ مچ گئی تھی لیکن سب کا رخ گھاٹ ہی کی جانب تھا۔ وہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے یا پیچھے کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ اِس افراتفری میں، میں بہت پیچھے رہ گیا اور آخری آدمیوں کے ساتھ گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوا۔ آگے جانے کے لیے جگہ ہی نہیں تھی اور میں آگے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

دونوں کو لکڑیوں کے درمیان چبوترے پر رکھ دیا گیا تھا۔

میں گھاٹ کے سرے پر اُن سب سے پیچھے ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ کبھی سناٹا چھا جاتا، کبھی پنڈتوں کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ پھر ایک دم ایسی چیخ پکار مچی جیسے سب اُن کے ساتھ جل رہے ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، اُنھوں نے کب دونوں کو آگ لگائی اور کب آگ نے اُنھیں خاک کیا اور کس نے گھاٹ کے چبوترے پر اپنا سر پھوڑا، کون دیوانہ ہوا۔ جب سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھانے لگا اور لوگ بہت کم رہ گئے اور گھاٹ کے چبوترے پر رکھی ہوئی چتاؤں کے شعلے تھک چکے تب کہیں کسی گوشے سے ڈاکٹر کیلاش میرے پاس آگیا۔ اُس نے میرا شانہ جھنجھوڑ کے مجھے اُٹھایا۔ میرے جسم میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے بازو کی بیساکھی کے سہارے مجھے چتا کے قریب لے گیا۔ وہاں تجمل، شامو، جبرو، مارتی سبھی موجود تھے اور چتا کے بجھتے شعلے دیکھ رہے تھے۔ آخر آگ نے سب کچھ راکھ کر دیا۔ دادا اور ماچھی دونوں راکھ ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے آگ نے سب کچھ خواب کر دیا۔ آگ نے مٹے ہوؤں کو مٹا دیا مگر وہ آگ جو زندوں کا نصیب ہے؟ جو جلاتی بھی ہے اور راکھ بھی نہیں کرتی۔ وہ آگ جو نظر نہیں آتی، وہ اِس سے کہیں تیز، کہیں زیادہ کاری ہے۔ وہ آگ جانے کب بجھے۔ آگ سے آگ جلتی ہے۔ رات ہو گئی تھی۔ وہ چبوترے کے سامنے دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ شاید اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ آگ منتقل کر لیں۔ یہ آگ جتنی آزار تھی، اتنی قرار بھی تو تھی، یہ اضطراب کہ کوئی خالی سینہ لے کر گھر نہیں لوٹ رہا ہے۔

وہ سب ہمارے ساتھ گھر لوٹے لیکن ہم سے پہلے تیجی چاچا کے علاوہ بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ سہ پہر کی طرح کم و بیش اُن کی تعداد اتنی ہی تھی۔ ساری گلی میں شامیانے تنے تھے اور بجلی کے قمقموں کے ساتھ گیس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ ایک طرف بہت سی دیگیں چڑھی تھیں۔ اتنی جلدی یہ اہتمام ابا جان ہی نے کیا ہو گا۔ وہ یہی کر سکتے تھے۔ جس کی جتنی استطاعت ہو، اتنا ہی کر سکتا ہے۔ مال ہر چیز کا بدل ہے، کبھی یہ وقت بھی ضرور لیتا ہے مگر آدمی کا بدل نہیں ہے۔ ابا جان اپنے لعل و جواہر سے آدمی ایک نہیں لا سکتے تھے۔ انھیں شاید احساس ہوا ہو کہ آدمی ایسے چٹکیوں میں چلا جاتا ہے۔ کاٹنے کو کچھ دیر بھی لگی تھی۔ دادا اور ماچھی جیسے گراں ڈیل ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہ سکے۔ دونوں طرح کے کھانوں کا انتظام تھا۔ ہندو مسلم کھانے الگ الگ۔ ہمارے پہنچتے ہی کھانا شروع کر دیا گیا۔ میں تجمل کے ساتھ سیدھا اندر چلا آیا۔ برآمدے میں جولین، کیلاش کی بہن رما اور چند عورتیں بیٹھی تھیں، گیتا اور رانی کی ملنے والیاں ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کے جولین ہماری طرف لپک پڑی۔ تجمل نے اپنے بازو کھول دیے۔ جولین کے چہرے پر گھٹا سی اُمڈ آئی، لمحوں کے لیے اُس کا سراپا متزلزل ہوا جیسے بہت دُور کے کسی تھکے ہارے کو کوئی دیوار نظر آ جائے۔ دیوار سایہ بھی دیتی ہے، سہارا بھی مگر وہ فوراً سنبھل گئی۔ جولین کو خود پر اتنا اختیار تھا۔ تجمل نے بھی اُسے وقت نہیں دیا، وہ گیتا اور رانی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جولین کے کہنے کے مطابق گیتا کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دونوں نے ہزار منتوں کے باوجود نہ کچھ کھایا، نہ پیا۔ شور و غل کے سبب اُنھیں بیرونی کمرے سے اندر کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جولین نے رندھی ہوئی آواز میں تجمل کو بتایا کہ جس وقت سے دادا کی ارتھی گئی ہے، گیتا بیگانہ سی ہو گئی ہے۔ کسی

سے بولتی ہے، نہ کسی کی سُنتی ہے۔ ابّا جان، منیر علی بار بار آ کے اُسے دلاسے دیتے ہیں۔ سبھی اُس کی دل جوئی میں لگے ہوئے ہیں۔ تجمّل نے ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی، وہ جولین کے کندھے پر ہاتھ ٹکائے اندر چلا گیا۔ میں اور ڈاکٹر کیلاش برآمدے میں کھڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھا کیے۔ پھر مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ میں تجمّل کی پیروی میں اندر کی جانب بڑھ گیا لیکن چند قدموں کے بعد مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر کیلاش رہ گیا ہے، اُسے بتا کے آنا چاہیے بلکہ اُسے بھی ساتھ لے چلوں۔ گیتا اُس کے لیے اجنبی ہے۔ کل ہی رات کانتے کے بلیوین پر اُس نے رانی اور گیتا کو دیکھا تھا۔ گیتا کو بھی احساس ہوگا کہ کون کون کتنی دُور سے یہاں آیا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں، میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ بس غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اُٹھ گیا۔ اب اُسے روک دینا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ وہ مستعد کھڑا تھا۔ فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔

میں جانتا تھا، وہ اس وقت کس کیفیت سے دوچار ہوگا۔ وہ ایک عجلت پسند، ہڑکل مزاج نوجوان تھا، جیسے نوجوان ہوتے ہیں۔ اُس نے مجھ سے کچھ جاننے بوجھنے کی عجلت نہیں کی تھی تو بہت ضبط کیا ہوگا۔ ویسے اُسے اس کا موقع بھی کہاں ملا تھا۔ اُس کے بہ قول وہ سُنتے ہی چلا آیا تھا لیکن کیسی کیسی حیرانیاں اُس کا گرم خون جھلسا رہی ہوں گی۔ یہ تو اُسے معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ پیرو کون تھا اور پیرو داگر بمبئی کے پاڑوں کا دادا ٹھہرا جاتا تھا تو ہم کون ہیں، میں کون ہوں۔ اُس نے پہلی مرتبہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا، کیا وہی درست تھا جب ہم پہلی بار اسپتال گئے تھے اور ہم نے رات گئے کانتے کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اُس نے اُس وقت فون پر اپنے ساتھی ڈاکٹر سے ہمارے لیے کیسے وہم و گمان کا اظہار کیا تھا اور کون کون سے خطاب و لقب سے نوازا تھا۔ گھاٹ پر جاتے وقت وہ میرے بائیں جانب تھا اور شکلا دائیں جانب۔ شکلا کی باتوں پر اُس کے کان لگے ہوئے ہوں گے حالانکہ شور کی وجہ سے یہ آسان نہیں تھا تاہم اُس کی متجسس سماعت سے بھی کچھ اوجھل نہیں رہا ہوگا اور یہاں ہجوم کے درمیان ہونے والی چہ میگوئیاں، دادا کا چھپا ہوا محل دیکھ کے حیرت زا تبصرے، پاڑے کے اتنے آدمیوں کا ہجوم دیکھ کے پڑوسیوں کے تعجب خیز بیانات، یہ سرگوشیاں اچٹتی اچٹتی میرے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اِن کی بازگشت ڈاکٹر کیلاش نے بھی سُنی ہوگی۔ ویسے اصل کے سوا صورت بھی کون سی تھی۔ تجمّل کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ دادا کو پاڑے تک محدود رکھتا یا گھر تک۔ پاڑے کے لوگ دادا کا دیدار کرنے کے بعد اُسے تجمّل کے حوالے کر دیتے اور تجمّل گھر کے دس آدمیوں کے سامنے چُپ چُپاتے اُسے آگ دکھا دیتا۔ ہر پردہ فسانہ ساز ہوتا ہے، ہر بند دروازہ باہر کے لوگوں کی بینائی چھین لیتا ہے۔ بعد میں جو طرح طرح کی داستانیں تراشی جاتیں، وہ ان حیرتوں سے کہیں زیادہ بے رحم ہوتیں۔ اب کسی سے شاید کچھ بھی چھپا ہوا نہیں رہا تھا۔ نہ منیر علی سے، نہ مولوی اکرم سے، نہ ایس پی شکلا سے، نہ ڈاکٹر کیلاش سے۔ اور ابّا جان کو تو جنت سے اب تک اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد بہت کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ مولوی اکرم پہلے ہی مجید کے ہوٹل میں پیرو کی خوں باری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ منیر علی جیسلمیر میں میری اور تجمّل کی مشقِ ستم کے شاہد تھے۔ کوئی کسر رہ گئی تھی تو اب دادا نے پوری کر دی تھی۔ ڈاکٹر کیلاش کو اب تصدیق و توثیق کے لیے اتنا اضطراب نہیں ہوگا جتنا اپنی آگہی کے انکشاف پر ہوگا۔ جاننے کا آزار اکثر نہ جاننے سے زیادہ ہوتا ہے۔ پردے کے اندر کبھی توقع سے بہت مختلف اور سوا بھی نمودار ہوتا ہے۔ سبھی کچھ اُس کا حال ہونا چاہیے لیکن مجھے کوئی صفائی نہیں پیش کرنی تھی۔ پاڑے کے آدمی کو یہ مجبوریت نہیں آتی۔

ہم کمرے میں داخل ہونے والے تھے کہ جولین دروازے پر آگئی، کہنے لگی، ہم اگر ابھی اندر نہ جائیں تو بہتر ہے۔ شام کے بعد سے اب کہیں تجمّل کو دیکھ کر گیتا کا جمود ٹوٹا ہے۔ اتنے لوگ گئے، اُس نے کسی کی بات نہیں سُنی۔ تجمّل نے جاتے ہی اُسے چوکی سے اُٹھا کے فرش پر کھڑا کر دیا اور جانے کیا جادو کیا کہ وہ بکھر سی گئی اور اب تجمّل کے سینے میں چھپی، بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی ہے۔ رونا ہی اُس کے لیے مفید تھا۔ آنسو بھی کبھی علاج ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کیلاش نے جولین کی تائید کی اور کہا کہ اُس کی موٹر میں ایسی دوائیں موجود ہیں جو رات کو اُسے گہری نیند سلا سکیں۔ نیند بھی اُس کے لیے ضروری ہے۔ میں نے سوچا، اُس سے کہوں کہ وہ تجمّل کو بھی ایسی کوئی دوا دے دے، کسی چیز میں ملا کے سہی۔ کل رات سے اُس کے منہ میں ایک کھیل تک نہیں گئی ہے، نہ اُسے کُھل کے ایک گھڑی بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ بس بیڑیوں کا دھواں نگلتا اُگلتا رہا ہے۔ کسی کو اُس کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ چارہ گر بھی آدمی ہوتے ہیں۔ ہم دروازے کے قریب کھڑے رہے۔ گو اب اندر جانے کی ایسی ضرورت نہیں تھی لیکن میں تجمّل کے خیال سے وہاں جانا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد جولین پہلے اندر جھانک کے آئی تب ہم نے کمرے

کا رُخ کیا۔ سامنے تجمّل چوکی کے کنارے اُس کا سر زانوؤں پر رکھے بیٹھا چُپکے چُپکے اُسے جانے کیا تلقین کر رہا تھا، کیا کچھ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گیتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ فرخ، فریال، چمپا بیگم، جولین کی ماں، شہ پارہ اور مولوی اکرم کی بیٹی ریحانہ چند اجنبی عورتوں کے ساتھ ایک طرف گٹھری بنی رانی کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ "دیکھ ری! کون آیا ہے۔" میرے پہنچتے ہی تجمّل نے بلند آواز میں کہا جیسے روٹھے ہوئے کسی بچے کو کوئی کھلونا دکھا دیا جائے۔ "جانتی ہے اِس کو، یہ کون ہے۔" تجمّل اُس کے بال سنوارتے ہوئے بولا۔ گیتا کی بھیگی پلکوں پر ارتعاش سا طاری ہوا اور وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر کیلاش پر بھی اُس کی نظر گئی ہو گی۔ "تیرا بابا اِس کو بیٹا بولتا تھا۔ اِس کو ابھی کون پوچھے۔" تجمّل نے کہا۔ گیتا نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔ خنجر اور کیا ہوتا ہے، اُس کی جھکتی نظروں میں ایسی ہی کاٹ تھی۔

تجمّل کے اشارے پر میں بھاری قدموں سے چلتا کسی مجرم کی طرح اُن دونوں کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ تجمّل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اُس کے پہلو میں بٹھا دیا۔ "سنبھال لے اِس کو۔" وہ تھکی آواز میں بولا۔ "میرا جسم سُن ہو گیا۔ اِس کو بول کہ ابھی ایک گیا ہے، سارے نہیں۔" میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ کہوں، کہوں کہ وہ خود کو اتنا بے آسرا، بے سایہ نہ جانے مگر میری زبان بیٹھ کے رہ گئی۔ مجھے ہر لفظ ہیچ معلوم ہونے لگا۔ تجمّل ہی کچھ نہ کچھ کہتا رہا۔ چند لفظوں پر مشتمل موت کا آموختہ۔ آدمی کو طوطے کی طرح یہ لفظ رٹے ہوتے ہیں لیکن دُہرانا بھی حوصلے کا کام ہے۔ سامنے آنے پر سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ آدمی کو اپنے الفاظ کی بے مائگی کا احساس ہو تو اُس کی زبان لکنت کرنے لگتی ہے۔ تجمّل کی زبان بھی اٹک رہی تھی، کہنے لگا۔ "میں اِس کو بولتا ہوں کہ تو تو شیر کی بیٹی ہے۔ شیر بھی ایک دن ڈھے جاتا ہے۔ گولی سے نہیں تو اپنے زور سے۔ اِدھر کوئی بھی نہیں رُکنے کا۔ تُو بھی نہیں، میں بھی نہیں۔ بولتے ہیں، پڑھ لکھ کے آدمی کو اونچا نیچا دکھائی پڑتا ہے۔ تُو کیسی پڑھی لکھی ہے۔" پھر کہنے لگا۔ "ابھی برس پورا نہیں ہوا، وہ اِدھر سے کیا بول کے گیا تھا کہ ابھی لوٹنے کا بھروسا نہیں۔ وہ لوٹ کے آ گیا۔ پر زندگی اُس کو دوبارہ مل جاتی، بس تھوڑے دن کے لیے، نہ پلٹتا تو کیا کر لیتی ری۔ اُدھر ہم لوگ ساتھ تھے۔ سب تڑپتے پڑتے رہے، اپنی جگہ پہ رو کے چلے گئے۔ ماں سے پوچھ، اُس نے کتنی بار اُس کو کھویا ہے۔ پہلے دن سے یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے۔ اُس سے وہ ایسا ہی ہتھیلی پہ دھرے پھرتا تھا، پر جو سینت کے رکھتے ہیں، دھوکا اُن کو بھی ہو جاتا ہے۔ بچّا کسی کا نہیں لکھا ہے۔ اپنی ماں کو دیکھ ری۔ اُس کا بھی کوئی گیا ہے۔ وہ کیسے باندھے بیٹھی ہے اپنے کو۔" یہ سُن کے رانی پھٹ پڑی۔ گیتا پھر سسکنے لگی جیسے کوئی زخم اندر کچوکے لگاتا ہو۔ اُس کے سینے میں یک بیک ہُوک سی اُٹھی۔ وہ میرے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ میں اُس کی سانسیں سُن سکتا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی اُس کی اُکھڑی اُکھڑی سانسیں۔ میرے سینے میں کوئی سمندر سا شور کرتا تھا کہ اُسے کسی طرح اپنے اندر جذب کر لوں۔ اُس کے سارے آنسو، سارے کرب اپنے اندر سمیٹ لوں۔ میں لمحے لمحے خود کو مجتمع کرتا تھا۔ میں نے بہ مشکل اپنا لرزتا ہاتھ اُس کے سر پر رکھنے کی کوشش کی۔ وہ تو ابھی تک بھری بیٹھی تھی اور بلکنے لگی۔ آدمی اتنے آنسو چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی سوتا ابھی باقی رہ گیا تھا جو اُس کی آنکھوں سے سوال تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، یہاں سے بھاگ جاؤں، میں یہاں کیوں آگیا ہوں۔ یکایک مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوئی۔ میں نے اُسے کھینچ کے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ میں نے بے تحاشا اُس کے ہاتھ چومے، اپنے دامن سے اُس کے رخسار خشک کیے۔ "نہیں نہیں، مت رو، خدا کے لیے مت رو۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں اُس سے منّت کی۔ "تم اکیلی نہیں ہو۔ دادا چلا گیا ہے اور کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا مگر یہاں سب... یہاں تمھارا بھائی میں موجود ہوں۔ میں اور یہ سب... تجمّل بھائی... ابھی تمھارے بہت سے گھر...." میرے سینے نے میری آواز کا ساتھ نہیں دیا۔ میں اُسے تھامنے چلا تھا اور خود مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ دیر تک وہ میری جزوِ جاں بنی رہی۔ مجھ میں سمٹی، مجھ میں چھپی، سہمی سہمی سی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اطراف میں کون کون ہماری جانب نگراں ہے اور یوں تو میں اُسے اور ہلکان کر رہا ہوں۔ کوئی ہمارے قریب نہیں آیا۔ تجمّل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر جانے کب کسی لمحے جولین نے میرے پاس آ کے مجھے ٹہوکا دیا اور اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ جولین، شہ پارہ، فرخ اور چمپا بیگم نے اُسے مجھ سے جُدا کر دیا اور ڈاکٹر کیلاش نے مجھے چوکی سے اُٹھا دیا۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کیلاش میری کمر جکڑے مجھے برآمدے میں لے آیا۔

رات گئے ہر سو سناٹا چھا گیا اور ڈیرے کا سارا ہجوم رخصت ہو گیا تو جولین نے ایک ایک کو بیرونی کمرے میں اکٹھا کر لیا۔ اُن

کی طرح اُسے بھی حکم دینا آ گیا تھا۔ بیرونی کمرے کے فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ ابا جان، منیر علی، مولوی اکرم، مارتی، شامو، جمرو سبھی موجود تھے۔ ڈاکٹر کیلاش بھی تھا۔ رما بھی تھی۔ سب دسترخوان کے اطراف گم سم بیٹھ گئے۔ کسی نے کچھ نہیں لیا۔ رنگیتا نے نہ رانی نے۔ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کھانے کو ہاتھ لگائے مگر سب کو وہ زہر اپنے حلق سے اُتارنا پڑا۔ موت کے کھانے اور زہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

صبح دس بجے کے قریب پاڑے کی اوپری منزل کے بڑے کمرے میں شہر کے سارے پاڑوں کے دادا موجود تھے۔ نچلی منزل پردادا کے سوگ میں آنے والوں کی کثرت کے سبب کوئی جگہ نہیں رہی تھی اس لیے تجمل نے اُن سب کو اوپر جمع ہو جانے کو کہا۔ رات ہی انھیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ کل صبح دس بجے تک دادا کے پاڑے پہنچ جائیں۔ اُن سے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ چاہیں تو اپنے اپنے پاڑے کے منتخب آدمی بھی ساتھ لا سکتے ہیں۔ دینا، سُندر، شوا، بالے، جارجی، نادرے، جگت، لال خان، سورت والا بنارسی اور دوسرے جنھیں وہ ناموں کے بجائے شکل سے پہچانتا تھا اور وہ جنھیں وہ بالکل نہیں جانتا تھا، بارش کے باوجود وہ سبھی وقت پر پاڑے آ گئے۔ سب کے چہرے کھنچے ہوئے تھے اور پیشانیوں پر بل پڑے تھے۔ سارا کمرہ اُن کی قیاس آرائیوں سے گونج رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے طور پر تاسف کا، غضب کا اظہار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تجمل کے آنے پر خاموشی چھا گئی۔ اُس نے چوکی پر بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر اُن سے کہا۔ ”اپنے کو زیادہ نہیں بولنا۔ بولنا ہے کہ تم پاڑے پر ابھی کس کو بٹھانا مانگتا ہے؟“

کسی نے جواب نہیں دیا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔

”چپ رہنے سے کچھ نہیں بنے گا۔“ تجمل نے اونچی آواز میں کہا۔ ”تم نے کچھ سوچا ہے تو اپنے کو بولو۔“

”کیا! کیا بولے دادا؟“ خاصی دیر بعد بالے نے زبان کھولی۔

”ایسا تو نہیں رہے گا۔ اپنا مطلب ہے، تم میں کوئی ماہم کے پاڑے کی گدی پر بیٹھنے کا ہے تو اُٹھ کے بولے۔ ایک دو تین چار جتنا بھی ہے۔ تم اُن کو اچھی طرح دیکھ لو اور جس پر سب کا جی ٹھکتا ہو اُس کو اِدھر بٹھا دو۔“

”ایسا کیسے دادا! تم کیا بولتا ہے؟“ کسی نے پیچھے سے کہا۔

”یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی تو اس کا دوسرا رستہ بھی ہے۔ کاغذ پر سب کا نام رکھ کے الگ کر لو جیسا اپنے یہاں پردادا اِدھر بیٹھا ہوا تھا۔“

”تم بولو، تم نے کیا سوچا ہے؟“

”اپنے کو کیا سوچنے کا ہے؟“ تجمل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ابھی اِس کو مت چھیڑو دادا!“ بالے نے التجا کی۔ ”اتنی جلدی مت کرو۔ ابھی کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ماہم کے پاڑے پر پیر دادا کی جگہ بیٹھنا مانگتا ہے۔ کیوں! اپن ٹھیک بولتا ہوں نا؟“ اُس نے اُن سب سے پوچھا۔

سب نے متذبذب انداز میں بالے کی تائید کی۔

”پھر اِدھر کون رہے گا؟“

”ابھی پہلے دادا کی بات کرو اُستاد!“ بنارسی دادا نے سر اُٹھا کے کہا۔ ”دادا کی گدی پر تب تک کوئی ٹھیک نہیں لگے گا جب تک اُس کا حساب صاف نہیں کر لیا جاتا۔ اس سے پہلے کوئی اِدھر نہیں بیٹھنے کا۔“

”حساب کون صاف کرے گا؟“ تجمل نے اُس سے پوچھا۔

”اپن کرے گا۔ حساب ضرور ہوئے گا۔ نہیں ہوئے گا تو اپن ماں کا جنا نہیں۔“ لال خان نے غضب آلود لہجے میں کہا۔

”اُس ٹائم تک اِدھر پاڑے پہ کون بیٹھے گا؟ پاڑے کی گدی ایسے خالی نہیں رہتی لالے! ایک جاتا ہے، دوسرا آ جاتا ہے اِدھر کا بولو۔“

”اِدھر ایسا کس کو بیٹھتے اچھا لگے گا۔ کوئی اور پاڑا ہوتا تو ابھی چلتا۔ یہ پیر دادا کا پاڑا ہے۔“ باندرے کے دادا دینا نے کہا۔

مارتی تجمل کے لیے حقہ لے آیا تھا۔ تجمل چند لمحے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ چلم ابھی پوری طرح دہکی نہیں تھی۔ تجمل نے منال منہ سے ہٹا کے اُن سے کہا۔ ”پاڑے پہ اُس ٹائم تک تالا ماردیں پھر؟“

”تم جو اِدھر ہو تمھی اِدھر بیٹھو۔“ بالے تیزی سے بولا۔

”نہیں رے! ہم کو اِدھر نہیں بیٹھنا۔“

”کیوں؟“ بالے کی آواز بھرا رہی تھی۔ ”اپن اکیلا نہیں، اِدھر سب لوگ تم سے ایسا بولتا ہے۔ ابھی کچھ دن کے لیے تم اِدھر رہو۔ پیر دادا کی خاطر، اُس کے پاڑے کی خاطر۔ زیادہ دیری نہیں لگے گا۔ اپن کو پتہ ہے، ماں قسم زیادہ دیری نہیں لگے گا۔“

”ہم کو یہاں سے جانا ہے۔“

”تم ابھی تو نہیں جاؤ گے۔ کل دادا گیا ہے، آج تم چلے جاؤ

گے۔“ بنارسی دادا نے تلخی سے کہا۔

”دادا کے بعد اب کون اِدھر ٹکے گا رے!“

”ٹھیک ہے، اپن لوگ تمھارا کوئی نہیں، تمھارا نہیں تو دادا کا تو کوئی ہے۔ اُسی کے لیے.....“ بالے جنونی انداز میں بولا۔

”اپن کو دوسرا کام ہے۔ ابھی اُس کو کھوجنا ہے۔“

”کس کو؟“ لال خان اچک کے برہمی سے کہنے لگا۔ ”تم اپن کو گالی دیتا ہے۔ ہم اِدھر اکھا بمبئی کا دادا لوگ چوڑی ڈال کے بیٹھا ہے جو اکیلا تم اُس کو ڈھونڈنے نکلے گا۔ وہ صرف تمھارا ہی نہیں، اپنا بھی بھائی تھا، باپ تھا وہ۔“

”اور اُس کے کسی بیٹے بھائی نے اُس پہ پیچھے سے گولی داغ دی۔“ تجمل نے زہر خند سے کہا۔

”کیا بولتا ہے تم؟“ لال خان کا چہرہ بگڑ گیا۔

”دادا کیا اُلٹا بولتا ہے جو ابھی مرچ لگتا ہے۔“ بالے بکھری ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”وہ اپن میں سے ہی کوئی حرام کا..... ہے، دوسرا نہیں۔ وہ گیدڑ کا اولاد ابھی ہمارے بیچ بھی بیٹھا ہو سکتا ہے۔“

”اپن بھی ابھی یہی سمجھتا ہے۔“ شوا اور سُندر نے یک زبان کہا۔

”اِدھر ہی کوئی کالا بھیڑیا ہے دادا!“ سُندر تمتماتے لہجے میں بولا۔ ”وہ ابھی تم بھی ہو سکتا ہے، اپن بھی۔ اپن اُس کو اِدھر ہی ڈھونڈ کے بھگتا دے تو ٹھیک ہے۔“

”نہیں ڈھونڈے گا تو کل دوسرے کا باری آئے گا۔“ بالے نے کہا۔ ”اب چاقو، بازو کا کام نہیں رہا۔ بندوق تمنچے کا بات ہے۔ اُجالے کا نہیں اندھیرے کا ہے۔ سامنے کا نہیں پیٹھ پیچھے کا ہے۔ وہ کوئی دادا نہیں ہے سالا، بھڑولیا ہے۔ ایک بار اُس کے منہ کو خون لگا ہے تو ابھی بار بار ایسا ہوتا رہے گا۔“

سب مختلف بولیاں بولنے لگے۔ تجمل نے انھیں روکا۔ ”پہلے اِدھر پاڑے کی بات کرو۔“

کوئی نہیں بولا۔ سب مضطرب انداز میں ایک دوسرے کی لب کشائی کا انتظار کرتے رہے پھر بالے نے خاموشی توڑی اور جھجکتے ہوئے بولا۔ ”اِدھر کسی کو بھی بٹھا دو دادا! ابھی اپن میں سے کوئی لوٹ کے نہیں پوچھے گا۔“

”اپنے کو پتہ ہے پر اِدھر پھر تم کو بُلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اِدھر سبھی بیٹھا ہے۔ ایک ایک سے پوچھ لو۔ سوچنے کا ہے تو تھوڑا ٹائم لے لو۔ ایک بات کا دھیان رکھنا۔ اِدھر جو بھی گدی سنبھالے گا، پہلے کی طرح ہر کوئی اُس کو اپنے اپنے پاڑے کا بھتا پہنچائے گا۔“

”ابھی اس کا بات مت کرو دادا!“ دینا نے کسی قدر جھنجلاہٹ سے کہا۔

”ہاں دادا! ابھی اس کو مت چھیڑو۔“ بنارسی نے بھی دینا کی حمایت کی، اوروں کی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔

”پھر کا ہے کا ٹنٹا ہے، اُس کا کام پورا ہو گیا۔“ تجمل دہکتی آواز میں بولا۔ ”ہٹانے والے کا کام پورا ہو گیا۔“

”دادا کا بات سمجھا ابھی۔“ شوا نے منتشر لہجے میں کہا۔ ”ہم کو اس وقت کچھ ایک دم ایسا ہی بنائے رکھنے کا ہے جیسا کل دادا کے وقت تھا۔“

”اور گولی ایک بار پھر چلے گی۔“ تجمل نے زیر لبی سے کہا۔ لیکن سب نے سن لیا اور سب چونک پڑے۔

”کیا دادا! ابھی کیسا بولتا ہے تم؟“

تجمل نے بجھتے ہوئے لہجے میں انھیں بتایا کہ دادا کے چلے جانے پر ماہم کے پاڑے سے شہر کے تمام پاڑوں کا واسطہ جوں کا توں رہے گا تو بندوق بردار پھر اس طرف کا رُخ کرے گا اور اندھیرے کا منتظر رہے گا کہ کب نیا دادا اس طرف آتا ہے۔

”ہاں ہاں! اسی واسطے ہم بولتا ہے کہ اس کو ابھی مت چھیڑو۔“ بنارسی نے اضطراری انداز میں کہا۔

”نہیں چھیڑتا، آج سے سارے پاڑے کھلے ہیں، پھر اپنے اپنے گھر کو جاؤ۔“ تجمل ترشی سے بولا۔ ”اب گولی پر سارا دی بات ہے تو سب ٹھیک ہے۔“

”ہم، ہم سمجھ رہا ہے، تمھارا کیا مطلب ہے؟“

”دادا ہو گا تو ضرور سمجھ لے گا۔“

”پر اپن سمجھے کہ تم بھی اسی واسطے اِدھر بیٹھنے کو نہیں مانگتا۔“ دینا نے اشتعال میں کہا۔

”یہی بات ہم تمھارے لیے بھی بول سکتے ہیں، اِدھر سب کے لیے۔“ تجمل نے گونجتی آواز میں کہا۔

”ایسا؟“ دینا پھنکارنے لگا۔ ”ایسا ہے تو اپن ہی اِدھر بیٹھے گا۔ اپن دیکھے گا کہ کون شیر کا جنا ہے اور کتنا گولی پٹا خا ہے ابھی اُس کے پاس۔“

”سُن لیا تم نے؟“ تجمل نے بلند آواز میں کہا۔ ”آج سے دینا دادا اِدھر کا دادا ہے۔ تم سب لوگ مانتے ہو؟“

کمرے میں بھن بھناہٹ ہونے لگی۔ لال خان اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بلند کر کے اُس نے سب کو خاموشی کے لیے کہا۔ ”دادا!“

وہ ٹھیر ٹھیر کے بولا: "باہر کے پاڑے سے کوئی آدمی نہیں چلے گا۔ اِدھر ماہم کے پاڑے پر کوئی کمی نہیں ہے۔ اِدھر ہی کا کوئی آدمی ہوئے تو ٹھیک ہے۔ ماچھی دادا ہوتا تو بات ہی نہیں تھا، دُور دُور اُس کے بل کا کوئی نہیں تھا پر اِدھر اور بھی ہے۔ اپن سے پوچھو تو ابھی اِدھر کے پاڑے پہ اِدھر کے آدمی کا حق نکلتا ہے۔"

"حق کی بات مت کرلا رے! پاڑے پہ حق صرف بَل کا بنتا ہے۔"

یکایک دینا اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی کھردری آواز میں کہنے لگا کہ سردست تجھل سب سے موزوں آدمی ہے۔ دادا سے اپنے خصوصی تعلق کے ناتے تجھل پر لازم ہے کہ وہ اُس کے پاڑے کا بھرم قائم رکھے، تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ تجھل کو صرف اُس وقت تک بیٹھنا ہے جب تک دادا کو ختم کرنے والے سامنے نہیں آجاتے۔ تجھل کی مرضی ہے کہ پھر جیسا چاہے اکرے۔ اُس کے بعد ہم پھر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ یہ ریت نئی بھی ہے اور اچھی بھی کہ اِس طرح بھی ہم اپنے بارے میں کچھ فیصلے کر سکتے ہیں۔

دینا بیٹھا ہی تھا کہ چوکی کے دائیں جانب بھاری تن و توش کالی رنگت کا ایک عمر رسیدہ دادا کھڑا ہو گیا اور دبے لہجے میں بولا: "مائی باپ! حکم ہوئے تو اپن بھی کچھ بولے؟"

سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ آنکھیں اُبلی اُبلی، ٹھوڑی کا گوشت لٹکا ہوا، انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی اور کان میں دُریا پڑی ہوئی۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔ تجھل نے اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا لیکن شاید اُس نے دیکھا نہیں، کھڑا رہا اور کہنے لگا: "تم اپن کو نہیں جانتا، اپن پانڈے ہے، سورت شہر سے آیا ہے۔"

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بنارسی دادا نے اُٹھ کے اُس کا بازو تھام لیا اور تجھل سے مخاطب ہو کے بولا: "اپن بولتا ہے، یہ پورا نہیں بولے گا کہ پانڈے دادا کون ہے۔ اِدھر بمبئی میں کسی پاڑے کا کوئی آدمی ایسا نہیں جس نے اگر پانڈے دادا کو دیکھا نہیں تو اِس کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ یہ اِدھری پاڑا چلاتا تھا۔ پانڈے دادا مانگتا تو ایک وقت میں بمبئی کا اکھا پاڑا اِس کا گود میں ہوتا پر یہ اپنے پاڑے سے کبھی باہر نہیں نکلا اور نہ اِس کا طرف کبھی کسی نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا۔ ابھی بمبئی میں کتنا دادا لوگ کو چاقو کا بولی پانڈے دادا نے سکھایا ہے۔ جیسا کوئی اپنا ہے ایک دم ایسا مانک تھا۔ پانڈے دادا کے علاقے میں پنچھی بھی پوچھ کے اُڑتا تھا۔ چیتے کے مانک جھپٹ تھا اس میں۔ جدھر بولتا تھا، چاقو اُسی طرف کو جاتا تھا۔ ایک دن منگو پھر بلا تھا کہ بمبئی کا پاڑا اخلاص کیا اور سُورت چلا گیا۔ اُدھر شہر میں جو ایک پاڑا ہے، وہ پانڈے دادا کا ہے۔ اِس کے ہوتے دوسرا ابھی کوئی ہوئے گا بھی کیسے۔ اور اِدھر جو سورت والا دادا بیٹھا ہے، اِسی کا بنایا ہوا ہے۔ پانڈے دادا اِس کو بمبئی کا پاڑا دے کے گیا تھا۔ برس ہو گیا پر ابھی تک لوگ پانڈے کا پاڑا ہی بولتا ہے۔ کبھی جب بمبئی کا یاد آتا ہے تو پلٹ کے آتا ہے۔ اپن کو پتہ نہیں کبھی پیرو دادا کو دیکھے بنا لوٹ کے گیا ہو۔ پیرو دادا سے اِس کا پرانا یارانہ ہے۔ اچھا ہے کہ پانڈے دادا بھی اِدھر ہے۔ کوئی دوسرا نہیں تو ابھی اِس....."

"بیٹھ جا،" پانڈے دادا نے بنارسی کے شانے پر ہاتھ مار کے اُسے بٹھا دیا۔ پہلے بھی وہ کئی بار اُسے ٹوک چکا تھا۔ بنارسی خاموش ہوا تو وہ تجھل کی طرف ہاتھ جوڑ کے بولا: "اپن غلام تھا اُس کا۔ عمر میں وہ اپن سے چھوٹا تھا پر اپن کا باپ تھا۔ کیا بولے اپن کا کیا تھا وہ۔" اُس نے دل گیر لہجے میں تجھل کو بتایا کہ وہ کل ہی رات بمبئی آیا تھا، یہ سُن کے کہ پیرو لمبے سفر سے واپس آگیا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہاں یہ دیکھنے کو ملے گا۔ کل رات سے ایک پل کے لیے اُس کی آنکھ نہیں لگی ہے۔ رات سے وہ اِسی پاڑے پر ہے۔ اُسے بھی اُن لوگوں میں شامل سمجھا جائے جو پیرو اور ماچھی کے قاتلوں تک پہنچنے اور اُنھیں کتوں کے آگے زندہ ڈال دینے کے لیے بے چین ہیں۔ پیرو تو کسی چٹان کی طرح تھا، لوہے کا بنا ہوا۔

پانڈے دادا کی پاٹ دار آواز میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں: "اپن آج پہلی بار سب کے سامنے زبان کھولتا ہے، اپن ایک دم بمبئی سے کیوں چلا گیا تھا۔ ایک دن پیرو پاڑے پہ آ کے بولا، پانڈے دادا! اپن صاف بولے، جب تک تم سے دو ہاتھ نہیں کرے گا، اپن کو ابھی چین نہیں پڑے گا۔ اپن تمھارے بارے میں سُن سُن کے تھک چکا ہے اور تمھارا چاقو، تمھارا زور دیکھنے کو اِدھر آیا ہے اور بول دے کہ پاڑا لینے کو نہیں۔ ہاں اگر اپن کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا تو اپن ماہم کا پاڑا چھوڑ کے چلا جائے گا۔" پانڈے کہنے لگا کہ اُس نے پیرو کو ٹالنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ اگر سے پاڑے سے تمھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو مجھے بھی تمھارے پاڑے سے دلچسپی نہیں۔ پھر کیوں ہم کسی ناگوار صورتِ حال سے دوچار ہوں مگر پیرو نہ مانا، وہ اصرار کرتا رہا اور چاقو نکال کے کھڑا ہو گیا اور دھمکی دینے لگا کہ اب یا تم پاڑے

پر ہو گے یا میں۔ ناچار پانڈے دادا کو بھی چاقو نکالنا پڑا۔ پیرو کی خواہش پر وہ پاڑے کی ایک کوٹھری میں آگئے، اُن دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پیرو آیا بھی اکیلا تھا۔ دونوں چاقو آزمائی کرتے رہے اور پانڈے کے کہنے کے مطابق وہ تفصیل کیا بیان کرے۔ بہت دیر لگی۔ دونوں پسینے پسینے ہو گئے اور وہی ہوا جو پیرو دادا طے کر کے آیا تھا اور جس کا پانڈے کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو چکا تھا۔ پانڈے کا چاقو اُس کے ہاتھ میں برقرار نہ رہ سکا۔ پیرو اُسے سینے سے لگا کے چلا گیا۔ پھر پانڈے بھی اپنے پاڑے پر نہیں ٹھیرا۔ دو ایک دن ضرور اُس نے تذبذب میں لگائے لیکن آخر اُس نے اپنے دل کے فیصلے پر عمل کیا۔ پیرو کو پیغام پہنچایا کہ وہ آ کے اُس کے پاڑے پر بیٹھ جائے یا اپنا کوئی آدمی بھیج دے۔ پیرو نے انکار کر دیا تو پانڈے اپنے عزیز شاگرد سورت والے دادا کو پاڑے پر چھوڑ کے خود سورت چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ سورت والے کو تاکید کر گیا تھا کہ کبھی پیرو دادا اِس طرف آنکلے تو وہ پاڑے کی چوکی سے ہٹ جائے مگر پیرو نے اُس کے بعد کبھی پانڈے کے پاڑے کا رُخ نہیں کیا اور ایک دن اچانک سورت پہنچ گیا اور پانڈے سے منت کرنے لگا کہ بمبئی واپس چلے۔ اُس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اُسے پانڈے کے پاڑے سے کوئی سروکار نہیں ہے مگر پانڈے پھر نہیں لوٹا لیکن وہ بمبئی برابر آتا رہا، صرف پیرو سے ملنے کے لیے۔ پیرو اُسے اتنی عزت دیتا تھا، اُس کا ایسے خیال کرتا تھا جیسے پانڈے اُس کا باپ، اُس کا اُستاد ہو۔ اُس نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا کہ پانڈے سے اُس کا کبھی کوئی تصادم ہوا تھا۔ پانڈے کو اگر کبھی بمبئی آنے میں وقت لگ جاتا تو پیرو اُس سے ملنے خود سورت چلا جاتا۔

پانڈے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس کی آواز بھی بھرّا رہی تھی۔ کمرے میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ چند لمحے وہ چپ کھڑا رہا، پھر کہنے لگا کہ میرا دماغ کام نہیں کر رہا، وہ کون اندھے عقل سے عاری لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے ایک اتنے زندہ آدمی کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کون تھا۔ وہ پیرو اور ماچھی دادا کے دشمن نہیں تھے، اپنے دشمن ہیں۔ ایک آدمی کی طاقت، اُس کے سارے دوستوں کی طاقت ہوتی ہے۔ ایک آدمی کے ختم کر دینے سے اُس کے دوست ختم نہیں ہو جاتے۔ اُنھیں دکھائی نہیں دیا کہ پیرو کے کتنے اور کیسے دوست ہیں۔ پہلے اُن سب کو ختم کرنا چاہیے تھا۔

پانڈے نے نسبتاً ٹھیری ہوئی آواز میں تجھل سے کہا کہ کوئی ایک دن میں کیسے ماہم کے پاڑے پر نئے دادا کا خیال کر سکتا تھا۔ یہ تو پیرو دادا کا پاڑا ہے۔ اُس کی عدم موجودی میں ماچھی بیٹھتا تھا تو بھی یہ پیرو کا پاڑا تھا۔ یہ عمارت اُسی نے بنوائی تھی۔ اِس کے در و دیوار پر اُس کے نقش ہیں۔

بنارسی نے اُٹھ کر پھر کچھ کہنا چاہا مگر پانڈے نے ڈپٹ کے اُسے بٹھا دیا اور کہنے لگا کہ یہاں لوگوں کے درمیان بیٹھ کے اُس نے بہت کچھ سُنا اور دیکھا ہے اور اِس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تجھل ہی کو پاڑے پر رہنا چاہیے۔ حالانکہ وہ تجھل سے اتنا واقف نہیں لیکن اُسے یاد ہے، زیادہ عرصہ نہیں گزرا، پیرو نے اُس سے تجھل کا ذکر بہت اشتیاق اور احترام سے کیا تھا اور کہا تھا، پانڈے! دیکھنا، اب کے بمبئی آیا تو اُس سے ملاؤں گا۔ پانڈے نے کہا کہ پیرو اگر تجھل کا ذکر نہ کرتا تو بھی تجھل کو دیکھ کے اُس کے بارے میں وہ یہی رائے قائم کرتا۔ پیرو ہاتھ کا صاف، دل کا صاف تھا۔ اُس کا کوئی دوست بھی اُسی جیسا ہو سکتا ہے۔ یہاں سب ماہم کے پاڑے پر بدستور بھتّا پہنچانے کے لیے آمادہ ہیں تو اِس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک تجربہ کار شخص دادا کی گدی سنبھالے۔ کوئی متنازعہ شخص پاڑے پر بیٹھا تو اِس سے دادا کے نادیدہ دشمنوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ آج کی بات اور ہے، آج شہر کے جو دادا یہاں گم سم بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں، کل اِنھی کے درمیان اِس معاملے پر اختلافات جنم لے سکتے ہیں اور پولیس اِس خلفشار سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ جیسا کہ تجھل کا خیال ہے، مناسب یہی ہو گا کہ ہم ہر طرف کا دھیان رکھ کے کچھ طے کر لیں۔ کوئی ایسا فیصلہ جو ہم نے اِس طرح کبھی نہیں کیا، مگر جو کیا جا سکتا ہے جس پر سب متفق ہوں اور قائم بھی رہ سکیں۔ بمبئی کے پاڑوں میں سے کوئی دادا لیا گیا تو شاید زیادہ دیر تک ہم اُس کے ساتھ نہ چل سکیں۔ باہر کا آدمی ہونا چاہیے یا اِسی پاڑے کا۔ کسی کو حق تلفی کی شکایت نہیں ہو گی۔ وہ کہنے لگا کہ اُسے اِس اندیشے سے اتفاق نہیں ہے کہ پیرو دادا کے زمانے کی طرح سب جوں کا توں رہا تو دادا کے قاتل پھر اِس طرف کا رُخ کریں گے۔ اِس کا موقع ہی شاید نہ آئے۔ اگر ہم میں سے کوئی ایسی کسی احتیاط کے سبب پاڑے پر بیٹھنے سے کتراتا ہے تو اُسے پاڑے کا کام چھوڑ کے کوئی دوسرا دھندا کرنا چاہیے۔ بار بار ایسا نہیں ہو گا لیکن ہاں، اُن کی بازیابی میں بہت دیر

ہو گئی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ کہہ کے پانڈے بیٹھ گیا۔ کئی دادا کچھ کہنے کے لیے مضطرب تھے لیکن شوا کی آواز اُن پر غالب آئی۔ "ابھی تم بھی تو باہر کا آدمی ہے۔"

بیک وقت کئی اطراف سے شوا کی تائید میں آوازیں اُٹھیں۔ پانڈے سر جھٹکتا ہوا دوبارہ کھڑا ہوا اور ہذیانی سے انداز میں بولا۔ "کیا بولتا ہے تم؟ پاگل ہو گیا ہے ابھی سب۔ تمھارا مطلب ہے، اپن کو باہر کا آدمی سمجھ کے ایسا بولا تم؟" وہ آتش برانگیختہ ہو گیا تھا جیسے کسی نے اُسے گالی دی ہو۔ کہنے لگا کہ کیا وہ پھر سے دُہرائے جو یہاں بیٹھے لوگوں نے توجہ سے نہیں سُنا۔ اُس نے یہ سب اس لیے نہیں کہا تھا کہ اُس کے منہ پر یوں طمانچہ مارا جائے۔ یہ ماہم کا پاڑا ہے، پیرو دادا کا پاڑا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا اور دریدہ لہجے میں بولا کہ اُس کے دل میں تو اب ایک ہی حسرت ہے کہ کسی طرح پیرو اور ماچھی دادا کے قاتلوں کے سر اُتار لائے۔ اُسے معلوم ہے کہ اِس طرح پیرو اور ماچھی واپس نہیں آجائیں گے مگر تب تک اُسے قرار بھی نہیں آئے گا۔ اِس وقت تو نہ اُس کا دل قابو میں ہے نہ دماغ۔ ایسی حالت میں وہ پاڑے پر کیا بیٹھے گا اور پاڑے کے لیے کیا کر سکے گا۔ یہاں تو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ساری ڈوریاں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو۔ یہاں دادا کا محترم دوست تجمل موجود ہے۔ اُس کے ہوتے کسی دوسرے کا خیال، پانڈے کے مفہوم کے مطابق، عاقبت نا اندیشانہ ہی نہیں مجرمانہ بھی ہے۔

کسی طرف سے پھر آواز اٹھی تھی۔ پانڈے دادا نے اُسے جھڑک دیا اور بولا کہ آگے کسی نے ایک لفظ کہا تو وہ اُٹھ کے چلا جائے گا۔ ہر طرف تکدر آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ تجمل بھی چُپ رہا۔ پھر سب سے پیچھے دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا ہوا اندھیری کا نوجوان دادا سکندر ہچکچاتے ہوئے اُٹھا۔ راجن کے جیل جانے کی وجہ سے چند روز پہلے پیرو نے اُسے اندھیری کے پاڑے پر تعینات کیا تھا۔ سکندر کچھ بولنے سے پہلے جیسے لفظ ڈھونڈتا رہا۔ اُس کے چہرے پر متانت تھی۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں پولیس کے طرزِ عمل پر اچھی طرح نظر رکھنی چاہیے۔ پولیس جانتی ہو گی کہ دادا پر کسی ایک پاڑے ہی کے لوگوں نے حملہ کیا ہو گا لیکن پولیس کو اِس بہانے شہر کے تمام پاڑوں سے چھیڑ خانی کا موقع مل گیا ہے۔ آئندہ وہ اور تلخ رویہ اختیار کر سکتی ہے اور جیسا کہ پانڈے دادا نے اشارہ کیا ہے، پاڑے کے داداؤں کے درمیان نفاق کا بیج بو سکتی ہے۔

سکندر وہی کچھ دُہرانے لگا جو کل شام شکلا نے بتایا تھا کہ کل سارے دن پولیس مختلف پاڑوں پر چھاپے مارتی رہی اور ہر پاڑے سے متعدد آدمی گرفتار کر کے لے گئی۔ پولیس کا رویہ نہایت درشت اور دہشت انگیز تھا۔ سکندر کو حیرت تھی کہ پولیس اب تک ماہم کے پاڑے پر کیوں نہیں آئی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس پیرو دادا کے خاص پاڑے کو مشتبہ نہیں سمجھتی، اُس کا شبہ دوسرے پاڑوں پر ہے اور بے سبب نہیں ہو گا۔ یہ خاص بات سامنے رکھتے ہوئے ماہم کے پاڑے پر شہر کے کسی اور پاڑے کے دادا کا گدی سنبھالنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ پولیس کی جا و بے جا دخل اندازی سے نجات پانے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم جلد از جلد دادا کے قاتلوں کو پکڑ کے زندہ یا مردہ اُس کے حوالے کر دیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے تمام شکوے شکایتیں بر دست یک سر فراموش کر دیں اور ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قاتل پولیس کو ورغلانے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچنے دینے کی پوری کوشش کریں گے۔ پولیس کی اُفتاد پڑنے پر ایک پاڑا دوسرے پاڑے کی مدد تبھی کر سکتا ہے جب سب کسی ایک مرکزی پاڑے سے بندھے ہوں اور اُن کے درمیان گہرا رابطہ ہو۔ ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت برقرار رہے گی تو کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا، پولیس کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع نہیں مل سکے گا اور یہ تبھی ممکن ہے جب ماہم کے پاڑے پر کوئی ایسا دادا چوکی پر بیٹھا ہو جس کی سوجھ بوجھ، زور اور غیر جانب داری پر تمام پاڑوں کے دادا یقین رکھتے ہوں جیسا کہ پیرو دادا نے ثابت کیا تھا۔

سکندر کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ وہ کسی پختہ کار دادا کی طرح بردباری اور تحمل سے ایک ایک کر کے مختلف پہلو کریدتا رہا۔ اُس کی زبان ذرا صاف ہوتی تو کوئی بھی اُسے پاڑے کا دادا نہ کہتا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ گزشتہ تین روز سے پیرو دادا کا بیشتر وقت اندھیری کے پاڑے پر گزرا ہے۔ پرسوں رات جب گولی چلی تو وہ باندرے سے اندھیری ہی کی طرف آرہا تھا۔ اِس دوران سکندر کو اُس کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔ پیرو بار بار تجمل کو یاد کرتا اور کہتا، راجن کا معاملہ جلدی طے ہو تو وہ اپنے دوست تجمل کے پاس جائے۔ وہ کہتا تھا، اگر کسی دادا

کو دیکھنا ہے تو اپنے تجمل بھائی کو دیکھو۔

سکندر کی باتیں سب توجہ سے سُنتے رہے تھے۔ وہ بیٹھ گیا تو کمرے میں بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ شنکرا، شندر، لال خان، سوت والا، دینا، بنارسی، مدنا، وہ سبھی شد و مد سے تجمل سے اصرار کرنے لگے کہ اُسے اب انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کے لہجوں میں بظاہر کوئی کھوٹ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اُن میں دل سوزی بھی تھی اور تشویش و تردد بھی۔

تجمل خفا خفا گڑگڑاتا رہا۔ جب سب چُپ ہو گئے تو اُس نے منال ہونٹوں سے ہٹائی اور بھاری آواز میں کہا۔ "ہم ایسے پاڑے پر نہیں بیٹھتے۔"

"پھر کیسے بیٹھتا ہے؟" دینا غصے میں بولا۔

"بل پر بیٹھتے ہیں۔"

"پر ادھر بل کھانے کو کون بولتا ہے۔ جب سب چُپ ہے تو کاہے کو نا بولتا ہے۔" لال خان نے ناراضی سے کہا۔

"اپنے کو ادھر ٹکنا نہیں ہے، پھر ادھر دادا کے گھر کی طرف دیکھنا ہے۔ دونوں باڈلی ہو گئی ہیں۔"

"تو پھر ادھر راجا دادا کو بٹھا دو۔" بالے جھنجھلاتی آواز میں بولا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے جبرو نے مجھے کہنی ماری۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجمل انھیں منع کر دے گا اور کسی توقف کے بغیر تجمل نے یہی کیا۔

"پھر تم جس کو بول دو، کوئی تو بیٹھے گا ادھر۔ کوئی آدمی تم کو پورا نہیں ملتا تو ابھی دادا کی جوتی چوکی پر رکھ دو۔" بالے کے لہجے میں بھی تندی آگئی۔

"بھتی بیٹھو دادا! اپن کی بنتی ہے۔" قلابے کے دادا جارجی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اُس کی آواز دھڑک رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"تو بھی یہی بولتا ہے رے!" تجمل نے سر اُٹھا کے کہا۔

"ابھی یہی ٹھیک ہے۔" جارجی اٹکتی زبان سے بولا۔

تجمل نے ہنکاری بھری اور چُپ بیٹھا رہا۔ طرح طرح کی آوازیں آتی رہیں پھر پانڈے نے جھٹ اُٹھ کے تجمل کے پیروں پر اپنا چاقو ڈال دیا۔ بالے نے بھی اُس کی تقلید کی، جارجی نے بھی، سوت والے نے بھی اور دینا نے بھی۔ دیکھتے دیکھتے تجمل کے پیروں پر چاقوؤں کا ڈھیر لگ گیا۔ تجمل نے ہاتھ بلند کر کے اُن سے کچھ کہنا چاہا لیکن شور میں اُس کی آواز سنائی نہیں دی۔

✽ تجمل نے سر جھکا لیا۔ شاید اب حجت پوری ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تو ابتدا ہی میں چاقو نکال کے اُن کے سامنے کھڑا ہو جاتا یا مجھے اشارہ کر دیتا۔ اوّل تو اُن میں سے کوئی سامنے ہی نہ آتا۔ آتا بھی تو فیصلے میں زیادہ دیر نہیں لگتی، لیکن یہ چاقو کے زور پر پاڑا حاصل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ انھیں اِس کے سوا بھی کچھ بتانا اور جتانا مقصود تھا جو انھوں نے یقیناً اچھی طرح جان لیا ہو گا۔ دوسری صورت میں انھیں اِس سفید و سیاہ سے آگہی کا موقع نہ ملتا اور وہ کوئی بھی اُلٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے تجمل کی مرضی کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بعد میں اُن کی باتیں سُن سُن کے میری سمجھ میں آتا گیا کہ تجمل نے اُن لوگوں کو کیوں جمع کیا ہے اور اِس تکرار و حجت کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تجمل کو نہ اڈے پاڑوں سے اب کوئی سروکار ہے اور نہ بمبئی میں اُس کا مستقل رہنے کا ارادہ ہے۔ اُس کا بس چلتا تو وہ ہمیشہ فیض آباد میں اپنی زمین کے پاس بیٹھا رہتا۔ پیرو دادا کے پاڑے پر بیٹھنے کا خیال تک اُس کے ذہن میں نہیں ہو گا۔ اِس کا تصور ہی اذیت ناک تھا لیکن دادا کا پاڑا کسی ایرے غیرے کے حوالے بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمارت دادا کی ذاتی ملکیت تھی اور عمارت ہی کیا، پاڑے کے جن آدمیوں نے زندگی بھر قدم قدم پر اُس کا ساتھ دیا جو گیتا کی طرح اُس کی اولاد کے مانند تھے، تجمل کو اُن کا بھی خیال رکھنا تھا۔ پاڑے کو لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لیے ہماری موجودی اور فعالیت ضروری تھی، کسی اور طرح نہیں، باقاعدہ پاڑے کے نگراں کی حیثیت سے۔ اس میں ہماری عافیت کا پہلو بھی مضمر تھا۔ پولیس نے پرسوں رات ہمیں تھانے سے آجانے دیا تھا لیکن وہ دوبارہ بھی ہماری طرف متوجہ ہو سکتی تھی۔ چند دنوں کے لیے ہمیں بھی کسی پاڑے کی مضبوط چھت درکار تھی۔ بے پاڑے کا دادا پولیس کی نظروں میں کسی یتیم کے مانند ہوتا ہے۔

پولیس کو اب اِس خبر سے اتنی حیرت نہیں ہو گی کہ وہی تجمل پیرو دادا کی گدی پر موجود ہے جس نے تھانے میں افسروں کے استفسار پر پاڑے کی منصب داری سنبھالنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پولیس سے قربت رکھنے والے اور اُسے خبریں فراہم کرنے والے بعض دادا یہاں ضرور ہوں گے۔ اُن کے ذریعے پولیس کے علم میں یہ حقیقت بھی آنی چاہیے کہ تجمل نے کسی

قدرِ تامل و تکدر کے بعد یہ پیش کش قبول کی ہے۔ وہ چاقو نکال کے سب کے سامنے کھڑا نہیں ہو گیا تھا۔

پاڑے پر بیٹھنے کی یہی بہترین صورت تھی کہ پیش کش اُن سب کی جانب سے ہو۔ کسی کو پچھتاوا نہیں ہو گا کہ صرف ایک اُس نے اس گراں بار فیصلے کی تائید میں آواز اُٹھائی تھی۔ اتنی جلد کسی کا دماغ نہیں لوٹے گا کہ کل کوئی یوں بے سوچے سمجھے منہ اُٹھائے اپنا حق جتانے چلا آئے۔ اتنے آدمیوں کے بیچ میں کیے گئے عہد سے لوگ اتنی جلدی نہیں پھرا کرتے۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے جو پاڑے کے آدمیوں میں بھی دوسروں سے کم نہیں ہوتی۔ چاقو کے زور پر پاڑا حاصل کرنے سے مراد تھی، اُن سب کی پسپائی جو ما ہم کے پاڑے پر کب سے نگاہیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ اُسی اقتدار و ثروت کی جگہ پر اچانک ایک 'ادا' وہ بھی باہر کے دادا کے قبضہ جمانے کا تازیانہ وہ کبھی دل سے قبول نہ کرتے۔ وہ کھسے نوچتے اور شہر کے داداؤں کو شکے بھجواتے تو دوسری طرف پولیس کو یہ باور کرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے کہ ہم تو اِس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب پیر دادا کا کانٹا نکلے، اور کیا عجب کہ وہ ہی ہوں جنھوں نے دادا کو اِس طرح راستے سے ہٹا دیا ہے۔ جانے کب سے ہم دادا پہ گھات لگائے ہوئے تھے کہ اُس رات وہ نشانے پر آ گیا۔ اِس صورتِ حال میں اُن کی شوشے بازی کیسی مضحکہ خیز اور مبالغہ آمیز لگتی! ہمیں دیکھ کے پولیس نے کچھ کم خیال آفرینی اور ہرزہ سرائی کی تھی، میرے بس سے جانے چھُٹ رہے تھے۔ جھل نے تھانے میں دیر کیوں لگائی تھی اور وہ اُن تین افسروں سے کیوں اُلجھتا رہا تھا۔ اگر ہم اُس وقت تھانے جانے سے پہلو بچاتے اور دانستہ وہاں اتنی دیر نہ لگاتے تو شاید یہ فراغت کبھی نہ ملتی۔ دادا کے گھر کے راستے میں، دادا کے گھر پر، پاڑے میں کسی بھی وقت وہ ناگہاں ہمارے سروں پر پہنچ جاتے۔ بمبئی میں ہماری موجودگی اور دادا سے تعلق کا ایک ذرا سا اشارہ ہی انھیں مضطرب کر دیتا اور ہمیں اپنے رُو بہ رُو کیے بغیر انھیں چین نہیں آتا۔ ہم نے انھیں اپنی تلاش کی زحمت نہیں دی تھی۔ یہ کام ہم نے خود انجام دے دیا تھا۔ اب انھیں کوئی شکوہ نہیں ہو گا کہ اُس رات انھوں نے ہمیں اچھی طرح دیکھا بھالا نہیں تھا۔ ہم دیر تک اُن کے سامنے رہے تھے۔ شاید کوئی کسر رہ گئی تھی۔ جھل کو دادا کی آخری رسم گیتا اور رانی کی دل جوئی پاڑے کا نظم، سبھی کچھ ذہن میں رکھنا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ پھر دادا اور ماچھی کی لاشیں کب تک اسپتال کے سرد خانے

میں اینٹھتی رہتیں۔ سب کچھ اتنے تسلسل اور تواتر سے پیش نہ آتا۔ دادا کا پہلے پاڑے پر آنا، پھر گھر لے جانا، دادا کی سواری کبھی اِس اہتمام اور دھوم دھام سے نہ اُٹھتی جیسے کوئی دولھا بیاہا جا رہا ہو۔ جانے پھر یہ سب کچھ کس طرح رونما ہوتا۔ جھل نے تھانے سے جانے کے بجائے از خود پولیس افسروں کو شہ دی تھی۔ سکندر کو حیرت تھی کہ پولیس ما ہم کے پاڑے پر اب تک کیوں نہیں آئی۔ اُسے کون بتاتا کہ ہم یہ مرحلہ پہلے ہی سَر کر آئے ہیں۔ حمرو اور شامو تھا نے میں بار بار مجھے خاموش ہو جانے کی تلقین اسی لیے کر رہے تھے کہ کہیں اپنی دیوانگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو جائے۔ اندھیرے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی اذیت ستم بالائے ستم ہے۔ انھیں دُہری اذیت سہنی پڑتی تھی، مصائب و ابتلا کے اندھیروں سے اپنے سر محفوظ رکھنے کی اذیت، صبر و ضبط تو بجائے خود ایک آزار ہے۔ آدمی گزرنے والے وقت سے نبرد آزما ہو یا آنے والے وقت پر پشتے باندھے۔ آدمی سے اپنا آپا ہی نہیں سنبھلتا کہ وہ دوسروں کی بیساکھی بنے۔ جسم میں آگ لگی ہو مگر آدمی اپنی صدائیں بھی گھونٹے رکھے۔ انھیں یہ ہنر آتا تھا۔ میں نے اُن سے زور آزمائی، چاقو بازی کے تمام حربے سیکھ لیے تھے مگر مجھ سے یہ مشقت نہیں ہو پاتی تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود مجھے اِس جبر کے طریقے نہیں آتے تھے۔

وہاں نہ شیرینی بٹی، نہ دودھ کا شربت تقسیم ہوا، نہ ہار، نہ پھول۔ نئے دادا کی مسند نشینی پر کسی جانب سے تحسین و آفریں کا غلغلہ بلند نہیں ہوا۔ کچھ ہی دیر میں جھل نیچے بیٹھے ہوئے ہجوم کے درمیان چلا آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے وہ سبھی آ گئے۔ اُن کے چہروں سے کسی ناروا اقدام کی ناگواری مترشح نہیں تھی۔ اطمینان ہی چھلک رہا تھا کہ انھوں نے عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ صمیمِ قلب سے کیا ہے۔ دل تو ممکن ہے، بعضوں کا اِس قدر شامل نہ ہو جتنا انھوں نے دماغ سے کام لیا تھا۔ دماغ کے فیصلے کسی قدر پائدار ہوتے ہیں۔ جھل کو اسی قدر مہلت چاہیے تھی، وقت کی ایک ذرا سی امان۔ جن کے دل نے اُن کے دماغ کا ساتھ نہیں دیا تھا، اُن معدودے چند داداؤں کو یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ایک آدمی کے راکھ ہو جانے سے، پانڈے کے بقول، اُس کے نقش مٹ نہیں جاتے۔ اُس کا زور اور اثر، اُس کی رُوح کتنے اُس کے ہم نشینوں، ہم نفسوں میں حلول کر جاتی ہے، کتنے دلوں میں دھڑکتی رہتی ہے، کتنے لوگوں میں وہ خاکستر زندہ رہتا ہے۔ اقبال اسی کو کہتے ہیں جو آدمی کے جانے کے بعد بھی قائم رہے۔

اور اگر، جیسا کہ اُن کا قیاس تھا، قاتل بھی وہاں موجود تھے تو یہ سب جان کے اُن پر کیا گزری ہو گی۔ انھیں تو ایسے ہی ہلاک ہو جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے یہ مجمع لگانے سے جھل کا مقصد اُن کے چہرے ٹٹولنا بھی ہو اور انھیں یہ جتانا بھی کہ دادا کے نام لیوا پُشت سے اُن پر وار نہیں کریں گے۔ نیچے آ کے جھل نے اُن سے کہا کہ وہ جب تک پاڑے پر نہیں رہے گا، پانڈے دادا پاڑے کی دیکھ بھال کرے گا۔ یہ سُن کے پانڈے دادا ہاتھ جوڑ کے انکار کرنے لگا مگر جھل نے اُسے زیادہ واویلا نہیں کرنے دیا۔ اُس نے اپنا چاقو نکال لیا اور وہ غالباً پانڈے کے پیروں پر ڈالنا چاہتا تھا مگر پانڈے نے ایک دم بڑھ کے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور دیوانہ وار اُس کے سینے سے لگ کے بُڑبُڑانے لگا۔

علاقے کے کسی سیٹھ کی جانب سے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا لیکن جھل کھانا کھائے بغیر اُٹھ گیا۔ پانڈے اور دوسرے کئی داداؤں نے اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن جھل نے دادا کے گھر جانے کا عذر کیا تو سب چُپ ہو گئے۔ پاڑے کے باہر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی اور چبوترے پر رکھی ہوئی دیگچوں سے مسلسل کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ پانڈے، اشوت والا، دینا، سکندر، لال خان، زورا، چھید اور جارجی وغیرہ ہمیں موٹر تک پہنچانے آئے۔ سڑک کے کنارے ابا جان کی موٹر کھڑی تھی۔ حمرو، شامو اور رانی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ پاڑے کے علاقے میں دُور دُور تک مسلح سپاہی گشت کر رہے تھے اور دادا کے گھر کے اطراف گلیوں میں بھی وہ ہمیں دکھائی دیے۔ گزشتہ رات کی طرح گھر کے باہر محتاجوں اور ناداروں کی قطاریں لگی تھیں۔ شبّی چاچا ہمیں باہر ہی مل گیا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا جان کی ہدایت پر غریبوں میں کپڑا تقسیم کیا جا رہا ہے۔ بازار سے کپڑے کے گٹھے آتے تھے لیکن اِدھر آئے اُدھر ختم ہو گئے۔ اب ابا جان نے اُن کے لیے اور کپڑا منگوایا تھا اور محلے کے چند بزرگوں سے درخواست کی تھی کہ وہ اِس کارِ خیر کی نگرانی کرتے رہیں، کوئی سائل خالی ہاتھ نہ جائے۔ شبّی چاچا کی روداد ادھوری چھوڑ کے جھل تیز قدموں سے سیدھا اندر چلا گیا۔ کوئی بھی وہاں سے نہیں گیا تھا اور کسی نے ہمارے انتظار میں دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ برآمدے میں پڑوس کی عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی جولین جھل کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی کہ صبح سے کئی بار گیتا اُسے پوچھ چکی ہے۔ اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔ وہی ہمیں اندرونی کمرے میں

لے گئی۔ وہاں فرخ، فریال، شہ پارہ اور مولوی اکرم کی بیٹی ریحانہ کے ساتھ گیتا ایک کونے میں خوف زدہ، خوف شدہ بیٹھی تھی۔ ہرنوں کی طرح پھیلی ہوئی آنکھیں، جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آدمی بھی گلستانوں کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں میں بہار آتی ہے اور ایک تُند جھونکے میں سب کچھ اُجڑ جاتا ہے۔ اُس کی نظر پیچ دروازے ہی پر لگی تھیں، جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، وہ بے کل ہو گئی مگر اِس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کے ہمارے پاس آتی، جھل لپکتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ تو دریا بنی بیٹھی تھی، سر پر جھل کا ہاتھ آتے ہی اُمڈ پڑی۔ جھل نے اُسے وہاں سے اُٹھا لیا اور اُس کا بکھرا بکھرا سا اپنے پہلو میں سمیٹے بیرونی کمرے میں چلا گیا، میں وہاں نہیں گیا۔

جولین کے بلاوے پر کھانے کے لیے جب میں بڑے کمرے میں پہنچا تو توقع کے خلاف گیتا بہت سنبھلی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں جھل جانے اُس سے کیا کیا کہتا رہا ہو گا۔ فرش پر لمبا دستر خوان بچھا تھا اور گھر کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ رانی، حمرو اور شامو بھی۔ غذا کی ضرورت ایک رسم بھی تو ہے، صبح و شام کی رسم۔ سب لِس کوئی رسم ادا کر رہے تھے۔ سفید ساڑی میں ملبوس رانی بالکل میرے سامنے بیٹھی تھی۔ صبح کی نسبت اب اُس کے چہرے پر عزم و اعتماد سا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے مجھے یک گونہ سکون ہوا لیکن پھر ایسا لگا جیسے یہ استقامت صبر و شکر کی نہیں، غصّے اور خود آزاری کی کوئی کیفیت ہے، جیسے رانی نے کچھ طے کر رکھا ہو اور جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔ آدمی غم بھی تو چھپاتا ہے، غم، غصّہ، خوف، نفرت۔ غم زدہ کو دوسروں کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ زخم خوردہ کو اپنے مسیحا کی نزاکتِ احساس کا خیال بھی رہے۔ ہر غم شاید یوں ہی زہر بن جاتا ہے۔ ممکن ہے، رانی کے بارے میں یہ میرا گمان ہو۔ بہت سے وہم و گمان آدمی کی اپنی نظر کا فتور ہوتے ہیں۔ آنکھیں اپنے اندر کے حبس، اپنے اندر کے فشار سے مشروط ہوتی ہیں۔ ایک عینک آدمی کے اندر بھی تو ہوتی ہے جس کے شیشے آدمی کے اپنے موسم سے بدلتے رہتے ہیں، گھڑی گھڑی یہ پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔

جولین نے میرے، حمرو، شامو اور رانی کے لیے ایک الگ کمرے کا انتظام کر دیا تھا تاکہ ہم آرام کر سکیں مگر جولین اِس خلوت کی منتظر تھی۔ کھانے کے بعد ہم چاروں وہیں آ گئے اور ابھی ہم نے بستر پر کمر ٹکائی ہی تھی کہ جولین کے واپس آ جانے پر ہمیں اُٹھ جانا پڑا۔

وہ تنہا آئی تھی۔ اُس نے معذرت بھی نہیں کی جو بات بات پر اُس کا خاصہ تھا۔ کہنے لگی "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ صبح ایک پولیس انسپکٹر تین سپاہیوں کے ساتھ گھر آیا تھا۔" یہ سُن کے ہم چاروں چونک پڑے لیکن چُپ رہے۔ جولین نے بتایا کہ وہ گیتا اور رانی کے بیانات لینے کے ارادے سے آئے تھے۔ جولین ہی نے اُن سے بات کی اور کہا کہ اس وقت تو یہ ممکن نہیں ہے۔ دونوں کی حالت اس قابل نہیں کہ کوئی بیان دے سکیں۔ اس موقع پر اُن سے کچھ کہلوانا زخم کریدنے بلکہ زخموں پر نمک چھڑکنے کے برابر ہوگا۔ انسپکٹر نے حاکمانہ انداز میں اصرار کیا کہ یہ قانونی کارروائی ہے۔ چونکہ قتل کا معاملہ ہے، پس ماندگان کے بیانات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ انھی کے مفاد کے لیے ہے۔ اُسے احساس ہے کہ یہ ایک مشکل وقت ہے تاہم گیتا اور رانی کو زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اُن سے چند ہی سوالات کرنے ہیں۔ شاید اس طرح پولیس کو تفتیش میں کوئی مدد مل سکے۔ جولین نے اُس سے درخواست کی کہ اگر یہ اتنا ہی ضروری ہے تو وہ دو تین دن بعد آجائے مگر انسپکٹر بہ ضد رہا اور کہنے لگا اگر اُسے اُن دونوں سے نہ ملنے دیا گیا تو اس کے بہت سے معنی لیے جا سکتے ہیں گویا گھر والے حقائق چھپانا چاہتے ہیں اور پولیس سے بوجوہ تعاون نہیں کر رہے۔ جولین کے کہنے کے مطابق، اُس نے انسپکٹر سے بہت عاجزی کی مگر وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا چنانچہ جولین کا لہجہ بھی سخت ہوگیا۔ اُس نے کہا "ٹھیک ہے پھر آپ یہی سمجھیں۔ تعجب ہے کہ ایک نہایت نازک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اس وقت وہ کیا بیان دے سکیں گی اور اس کارروائی سے ہونے والے حادثے پر کیا اثر پڑ سکے گا۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ جولین جیسی نرم بیاں لڑکی میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی مگر جرأت تو ساری صداقت کی ہوتی ہے جس کی جولین میں کوئی کمی نہیں تھی۔ کہنے لگی "اُس نے سوچا کہ شکلا کا حوالہ دے لیکن اُسے یہ بھی نامناسب لگا اور شکلا کا نام اُس کی زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر انسپکٹر ہی کو پسپا ہونا پڑا۔" جولین کا کہنا تھا کہ وہ ناراض ہو کے چلا گیا۔ اُس کے بعد سے اب تک کوئی نہیں آیا ہے لیکن اُسے اندیشہ ہے کہ پولیس کسی بھی وقت پھر آ سکتی ہے۔ جمرو کے پوچھنے پر جولین نے بتایا کہ اُس نے ابھی مچھل سے اس بابت کوئی بات نہیں کی ہے، اس کا وقت بھی نہیں ملا۔ مچھل جب سے آیا ہے، گیتا کے ساتھ ہے اور اُسے آتے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ میں فوراً کوئی رائے نہیں دے سکا۔ ظاہر ہے وہ لوگ دوبارہ آ سکتے ہیں اور اس بار اُن کا رویہ پہلے سے کہیں تلخ ہو سکتا ہے۔ میں نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ دادا کے گھر میں ہماری مسلسل موجودگی اور گیتا اور رانی کے آگے دیوار بنے رہنے سے پولیس کا سر پھر گھوم سکتا تھا۔

جمرو، شامو اور مارٹی بھی یہی سوچ رہے تھے۔ جولین دوبارہ بھی یہی جواب دے سکتی ہے۔ پولیس دوبارہ واپس چلی جائے گی، اس کے سوا اُس کے پاس چارہ بھی کیا ہے لیکن اس طرح وہ گیتا اور رانی کی اشک شوئی کے لیے اُن کے گھر میں رہنے والے غیر متعلق لوگوں سے کس درجہ بدگمان ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت تو پولیس کے سارے متعلق اہل کاروں کی جیبیں بھوکے آدمی کے مانند ہیں لہٰذا کیوں نہ گیتا اور رانی کو سمجھا بجھا کے اُن کے سامنے کر دیا جائے تاکہ وہ زہر کا یہ گھونٹ بھی پی لیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتیں لیکن پولیس بھلا اس جواب سے کیوں مطمئن ہونے لگی۔ سوال کرنا پولیس کا مشغلہ بھی ہے، شوق بھی، اور سب سے آسان کام ہے۔ وہ تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سوال کریں گے، یہ دیکھے بغیر کہ اُن کے مخاطب پر کیا عالم گزر جائے گا۔ یقیناً پولیس اُن سے پاڑے کا تذکرہ بھی کرے گی، دادا کے معمولات سے متعلق، شروع سے اب تک دادا کے مشاغل کے بارے میں۔ اگر کسی نے ذرا بھی تیز آواز میں گیتا سے کچھ کہہ دیا اور پاڑے کا حوالہ دیا کہ اُس کا باپ ممبئی کے سب سے بڑے پاڑے کا دادا تھا تو بے شک گیتا سے اب کچھ بھی چھپا نہیں رہے گا۔ کل سے آس پاس کی عورتیں جو چہ میگوئیاں کرتی رہی ہیں، وہ اُس کے کانوں میں بھی پڑی ہوں گی لیکن ایک ہی وقت میں اتنے سارے انکشافات سے تو وہ اور بے حال ہو جائے گی۔

جولین سامنے کی کرسی پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میرا دماغ بھٹک رہا تھا۔ اگر گیتا کو نہیں تو رانی کو اُن کی جناب میں پیش کر دیا جائے۔ رانی نے نسبتاً اپنے ہوش و حواس تھام کے رکھے ہیں۔ اُسے پیری کے پاڑے کے متعلق بھی سب کچھ معلوم ہے۔ وہ اُن کے سامنے آ سکتی ہے یا گیتا اور رانی کو یہاں سے ہٹا ہی کیوں نہ دیا جائے۔ ابا جان انھیں اپنے گھر لے جائیں گے۔ پولیس کی آمد پر شتی چاچا کوئی بھی عذر کر دے گا مگر اس طرح تو پولیس اور شک میں پڑ سکتی ہے۔ مارٹی، جمرو اور شامو بھی اسی کشمکش سے دوچار تھے۔ اسی لیے میری طرح کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ پھر مارٹی نے اٹکتی زبان سے کہا کہ کیوں نہ ڈاکٹر کیلاش کو آگے کر دیا جائے یا کسی اور ڈاکٹر کو۔ کوئی ڈاکٹر انھیں باور کرا سکتا ہے کہ اس ناچاری و نامرادی کی حالت میں یہ سوال جواب تو انھیں اور شکستہ کر دیں گے۔ ڈاکٹر کی بات پولیس نہیں ٹالے گی۔ کسی وکیل کی بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ جمرو نے مارٹی کو دھتکار دیا۔ مارٹی کا مشورہ ایسا غلط نہیں تھا لیکن اُس نے غور نہیں کیا کہ رانی اور گیتا کے تگڑے دار کون لوگ ہیں اور پولیس انھیں کن نظروں سے دیکھتی رہی ہے۔ ہر عذر پولیس قبول کر سکتی ہے اور ہر عذر پر اُسے حیلے کا گمان ہو سکتا ہے۔ پولیس کوئی ایک شخص نہیں جسے قائل کر دیا جائے۔ پولیس کی نفری کے قرار کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ دونوں اُس کے سامنے جا کے غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیں، سماعت کے حوصلے کا۔ وہ پولیس کے ہر سوال کا جواب صبر و سکون سے دیں۔ جولین کو اُن کی طرف سے اس ہوش مندی یا مصلحت کوشی کی ذرا بھی خوش گمانی ہوتی تو وہ پولیس کو منع نہ کرتی۔ اُسے معلوم تھا کہ غم تو نشے کی طرح ہوتا ہے۔ نشے سے کہیں زیادہ اندھا اور بہرا۔ اس عالم میں وہ ڈھنگ سے کیا بات کر سکیں گی، وہ تو سسکنے بلکنے لگیں گی۔ آنسوؤں کے سوا اب اُن کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔ جولین کو پولیس کی طرف سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کسی بلاغت اور نزاکت کا لحاظ رکھے گی۔ پولیس تو انھیں ایک پاڑے کے دادا، شہر کے مشہور دادا کے خاندان کے طور پر برتے گی۔ کون سفارش کرے گا کہ دادا نے انھیں پاڑے سے بہت دور شیش محل میں رکھا تھا، شہزادیوں کی طرح اور ساری زندگی ریشم ہی دیا تھا۔ جولین کو معلوم تھا کہ پولیس ہمارے بارے میں بھی کوئی گوشہ رکھ کے اُن سے بات نہیں کرے گی۔ لیجے کی مروت پولیس کو نہیں آتی۔ آتی ہو تو وہ پولیس ہی کیوں ہو۔ شک پولیس کا طرۂ امتیاز ہے۔ شک یوں بھی اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ شک ہی کوئی راستہ دکھاتا ہے۔ شک یقین کا زینہ ہے۔ کوئی ایک تیر تو نشانے پر بیٹھتا ہی ہے۔

مارٹی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ پس منظر میں ہم موجود ہیں۔ کسی بھی تاویل سے پولیس کو ہمارے حوالے کا پس منظر الگ کرنے میں مشکل پیش آئے گی اور بالفرض سب کچھ ممکن بھی ہو جائے، گیتا اور رانی میں اپنے باپ کے ترکے کی کوئی جرأت عود کر آئے تو بھی کیا لازم ہے کہ پولیس اُن کے بیان کی سادگی کو ہمارے نرغے اور حصار پہ محمول نہ کرے۔ ہم جو ادھر دھرنا دیے بیٹھے ہیں، یہی سب جمرو اور شامو کے دماغ میں کھٹک رہا تھا، یہی کچھ جولین نے اپنے طور پر اخذ کیا تھا۔ سارا تردد اُن دونوں کے لیے تھا۔ اُن کے لیے ہمیں اپنی ضرورت تھی۔ ہم درمیان میں نہ ہوتے تو جانے اُن کا کیا حال ہوتا ورنہ ہمارا کیا ہے، پولیس زیادہ سے زیادہ ہمیں ساتھ لے جائے گی اور سلاخوں کے پیچھے ڈال دے گی۔ یہ کچھ بھی ہمارے لیے نیا نہیں ہے، نہ سلاخیں نہ کٹہرا۔ اس سے زیادہ پولیس اور کیا کر سکتی ہے۔ یہاں بدنامی اور رسوائی سے کون ہراساں ہے۔ یہ ڈول، عزمی، دل تنگی، یہ شکستہ خاطری تو اُن دونوں کی خاطر تھی۔ اُن کے لیے ہمیں خود کو محفوظ رکھنا ہے، صرف چند دنوں کے لیے۔ جب تک اُن کا حوصلہ استوار نہ ہو جائے، اتنے دنوں کے لیے۔

بار بار میری نظروں میں شکلا پھر جاتی تھی، اُسی سے یہ مہلت مل سکتی ہے۔ شکلا سے کہہ کے انھیں روک دیا جائے۔ وہ ایک مختلف پولیس والا ہے، کرشنا جی کی طرح۔ شکلا اپنی آنکھوں سے گیتا اور رانی کا حال دیکھ سکتا ہے مگر جولین کو میں نے شکلا کا نام یاد نہیں دلایا۔ شکلا سے اپنی تمام نسبتوں کے باوجود جانے کیوں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس سے کچھ کہنے کا مطلب اپنے معاملوں میں اُسے مداخلت کی دعوت دینا ہے۔ گویا ایک سفارش کے لحاظ میں بہت سی ناگفتنیاں آشکارا کی جائیں اور قدم قدم پر اُسے ضروری غیر ضروری ہدایتوں کا استحقاق دیا جائے۔ میرا تو کچھ نہیں مگر مچھل کو شاید یہ سب گوارا نہ ہو۔ مچھل کا منہ دیکھے بغیر شکلا سے کوئی بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہر چند کہ اب ہم سب کے بارے میں شکلا کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کل شام گھاٹ پر جاتے وقت وہ جس اضطراب کا اظہار کر رہا تھا، اُس نے اُسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنے دیا ہوگا۔ شکلا کے لیے مجھ سے تعلق خاطر کا تقاضا بھی تھا اور کچھ اپنے منصب کا بھی کہ وہ ہر طرح باخبر رہے۔ اور مجھ سے وہ کچھ نہیں جان سکا تھا تو اُس کے پاس وسیلوں کی کمی نہیں تھی۔ کل سے وہ اسی جستجو میں رہا ہوگا اور اب شاید اُسے اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ مچھل کون ہے اور اصل میں میں کون ہوں۔ میرے بارے میں اُس کے علم میں کوئی کمی تھی تو اب نہیں رہی ہوگی۔ چھنگا کا پاڑا چاقو کے زور پر حاصل کرنے کا واقعہ، بالم خاں کے پاڑے پر قبضہ اور بھی بہت کچھ...... ماہم کے پاڑے پر مچھل کی گدی نشینی کی خبر بھی اُسے پہنچ گئی ہوگی اور خبر کاروں نے سب کچھ اپنے لب و لہجے

اپنے مشاہدے اور تجربے کے مطابق بتایا ہوگا —

کو الف کہنے والا بے تصرف رہ نہیں سکتا
بڑھانے کا اگر موقع نہ ہوگا تو گھٹائے گا

اس آگاہی کی آسودگی کے باوجود شکلا کا اضطراب کم ہونے کے بجائے فزوں ہونا چاہیے۔ کل کی نسبت اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ تجمل ماہم کے پاڑے بلکہ شہر کے سب سے بڑے پاڑے کا دادا ہے۔ سو شکلا کے لیے احتیاط لازم ہے۔ کل بھی وہ اسی احتیاط کے سبب سادہ لباس میں یہاں آیا تھا۔ خود مجھے بھی اُس کی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اُس کی حیثیت پر حرف نہ آنے کی حد تک ہی سفارش کی جا سکتی ہے۔ وہ خود بھی اس حد سے تجاوز نہیں کرے گا۔ وہ پولیس کا ایک اعلا افسر ہے اور بہ ظاہر اُس کے لیے ایک ادنا بات ہے۔ اس ادنا بات کی ہمارے لیے کتنی اہمیت ہے یہ ہم ہی جانتے ہیں، اُسے بتا نہیں سکتے مگر شکلا جیسا ذہین اور باریک بیں افسر ہر پہلو پر غور کیے بغیر کوئی حکم ایسے ہی جاری نہیں کرے گا۔ تجمل سے پوچھنے کی بات تو بعد کی ہے۔ شکلا کے سامنے زبان کھولنا خود مجھے کچھ نامناسب سا لگتا تھا۔ جولین نے بھی غالباً یہی کچھ سوچ کے اُس کا نام نہیں دُہرایا۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ہزار آدمی ایک سمت ایک ہی ارادے سے دیکھیں تو سب کو ایک جیسا دکھائی دیتا ہے۔ تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہزار آدمی بھی یک جان ہو سکتے ہیں اور ہر شخص ایک نیا منظر اخذ کر سکتا ہے۔ یہ تو دیکھنے کی نیت پر، شدت اور شمولیت پر منحصر ہے۔ کون کتنا شامل ہے، کیسی کتنی جستجو ہے۔ اُن تینوں کے سروں میں بھی وہی اندیشے گردش کر رہے تھے جن سے میں دوچار تھا۔ جولین کو بہت دیر ہو گئی تھی۔ اُس نے اُٹھنا چاہا تو جمرو نے اُسے روک لیا اور وہی کچھ کہا جو ماں کا دھرم میں سے کوئی بھی جولین سے کہتا۔ جمرو نے اُسے ہدایت کی اگر اب وہ لوگ دوبارہ آئیں تو بھی اُنھیں یہی جواب دیا جائے اور بہتر ہے کہ جولین ہی اُن سے بات کرے۔ گویا کوئی مرد نہیں۔ جمرو کا خیال تھا کہ شاید اب وہ آئیں ہی نہیں اور اپنے پہلے ہی تاثر پر اکتفا کریں۔ اُنھیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ دوبارہ بھی اُنھیں یہی جواب دیا جا سکتا ہے۔ بے شک یہ امکان بھی تھا تو پھر کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں پھر تو سب کچھ بعد از وقت ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو اُس کے لیے سینہ کھلا رکھنا چاہیے۔ اُس نے جولین سے کہا کہ وہ موقع ملتے ہی تجمل کو یہ سب بتا دے۔ چاہے کچھ دیر کے لیے تجمل کو گیتا کے پاس سے اُٹھانا پڑے۔

جولین کے جانے کے بعد ہم آنکھیں مسلتے ہوئے بستر پر لوٹتے رہے۔ کسی کو نیند نہیں آئی۔ شہ پارہ اور فرخ چائے کا طشت لے کے آئیں تو وقت کا اندازہ ہوا۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم بہ عجلت کمرے سے نکل آئے جیسے کوئی چوک ہو گئی ہو جیسے گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ باہر آ کے سب شانے ڈھلک گئے۔ سارا مکان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عمارت کے باہر فقیروں کی ٹولیاں جا چکی تھیں، اُن کی آوازیں اندر نہیں آ رہی تھیں۔ شبی چاچا نے سرِ شام ہی ساری روشنیاں جلا دی تھیں تاکہ گھر بھر میں لحظے بھر کے لیے بھی اندھیرے کا احساس نہ ہو۔ آدمی خود کو کیسے کیسے بہلاوے دیتا ہے! پھر تو موت پر چراغاں ہونا چاہیے۔ ہمیں سرکے پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کیلاش آ گیا۔ اُس کے ہمراہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس رما بھی تھی۔ میں دونوں کی پذیرائی کے لیے اُٹھا تو کیلاش مجھ سے چمٹ گیا جیسے بہت دنوں کا بچھڑا ہوا ہو۔ مجھے آداب کہہ کے رما اندر چلی گئی۔ کیلاش میرے برابر کرسی پر بیٹھ گیا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچے ہوئے دیر تک وہ مجھے ڈوبی ڈوبی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ مچل سا گیا۔ "کیا حال ہے آپ کا؟" وہ بے ترتیبی سے بولا۔

"ٹھیک ہے سب۔" میں نے خوش روی سے کہا۔

"سویرے بھی میں آیا تھا، آپ نہیں تھے۔"

"اَچ چھا۔" میں نے چونک کے کہا۔ "کب؟"

"آپ کے جانے کے چند منٹ بعد ہی۔"

"جولی نے مجھے نہیں بتایا۔"

"میں ٹھیرا ہی کتنی دیر۔" وہ جلدی سے بولا۔ "بس خیر خبر لے کے سیدھا اسپتال چلا گیا۔"

میں نے سوچا اُس کا شکریہ ادا کروں لیکن اُس کی وارفتگی کے جواب میں یہ شائستگی مجھے مصنوعی لگی۔ یہ اُسے اُداس کر دیتی۔ میں خاموش رہا تو وہ زیرِ لبی سے بولا۔ "گیتا نے بہت اثر لیا ہے۔" میں کیا کہتا، کوئی آدمی کسی کے لیے ساری دُنیا ہوتا ہے۔ کہنے لگا۔ "رما کا حال بھی کچھ کم غیر نہیں ہے۔ رات گھر جانے کے بعد دیر تک جاگتی رہی اور یہی..... یہیں کا ذکر کرتی رہی۔ مجھ سے پوچھتی تھی، کیسی! بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ خوشی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے؟ غم دینا اتنا آسان کیوں ہے؟ رات وہ یہیں رہنا چاہتی تھی۔ میں اُسے زبردستی

ساتھ لے گیا۔"

"کیوں کیا حرج تھا؟"

"کوئی حرج نہیں تھا، بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا مگر کبھی کبھی مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر! وہ تو ایک نہایت....."

میری بات اُس نے کاٹ دی۔ "وہ کبھی بہت عجیب باتیں کرنے لگتی ہے، سرکشی کی حد تک۔ اب دیکھیے آپ یہ لباس پہن کے آئی ہے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگی گیتا کو احساس ہونا چاہیے کہ زندگی ابھی بہت باقی ہے۔ گیتا میں شگفتگی کا احساس رہنا چاہیے، اس طرح وہ جلد ہی..... میں نے اُس سے کہا مگر اور لوگ کیا کہیں گے، نہیں مانی، بولی کہ وہ لوگ دوسرے ہیں۔"

"دوسرے کیا؟"

"یہی کہ اُس کا مطلب تھا کہ وہ مختلف لوگ ہیں۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا اور اُس نے وضاحت ضروری سمجھی۔ "کوئی اور بات نہیں، اُسی دن گھر پہ صرف ایک بار آپ سے کھُل کے بات ہو پائی تھی، بس اُسی دن سے آپ کا چرچا ہے۔ کہتی ہے تم نے ظہیر صاحب کو غور سے نہیں دیکھا۔ لگتا ہے ایک نوجوان نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے۔ وہ جتنی حقیقت پسند ہے اتنی ہی تصوراتی بھی ہے۔ سب کو آپ کے پیمانے سے ناپتی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ کیلاش کے قلب و دماغ میں کیسی ہلچل مچی ہوگی، طرح طرح کے سوال، دادا، پاڑا، چاقو، خون، پولیس۔ اُس نے اِس بابت کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اُسے اپنے مخاطب کے اُلجھنے کا احساس تھا۔ رما سے ہٹ کے وہ موسم کی باتیں کرنے لگا جو مہذب لوگوں کا شعار ہوتا ہے اور جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میری نظریں برآمدے پر لگی تھیں۔ کانوں کے ساتھ آنکھوں کا ارتکاز بھی ضروری ہے۔ بینائی منتشر ہو تو سماعت آدھی رہ جاتی ہے تاہم میں سر ہلا کے ہوں ہاں کرتا رہا۔ تجمل باہر نہیں نکلا۔ میرا خیال تھا کہ سہ پہر کھانے کے بعد نہیں تو شام کو تجمل ضرور کسی طرف کا رُخ کرے گا۔ سارے کانٹوں کا ایک ہی مداوا، سارے سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم کسی طور اُن لوگوں تک پہنچ جائیں جنھوں نے اتنے بہت سے لوگوں کو درہم برہم کیا ہے۔ سب سے بڑی پیش بندی یہی ہے۔ تجمل نے پولیس سے وقت کی رعایت حاصل کر لی تھی لیکن یہ مہلت لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھی۔ معلوم ہوتا ہے، تجمل کو کوئی جلدی نہیں ہے تبھی وہ اطمینان سے اندر بیٹھا ہے۔

میں نے کیلاش کے سامنے اشارۃً جولین سے پوچھ لیا تھا کہ اُس نے پولیس کی آمد سے تجمل کو مطلع کر دیا ہے؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ جواب میں تجمل نے کم و بیش وہی کہا ہے جو جمرو نے کہا تھا۔ اس کے باوجود تجمل کے سکوت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جمرو، شامو اور رمائی کے چہروں پر چھائی ہوئی دُھند بتا رہی تھی کہ وہ بھی تجمل کی اس رَدّ و قدح کا جواز سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بھی بس منتظر بیٹھے تھے۔ کبھی برے پر ٹہلنے لگتے، کبھی برآمدے میں چلے جاتے اور پھر آ کے وہیں میرے پاس کرسیوں پر ڈھیر ہو جاتے۔ تجمل کی تاخیر بے سبب بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں باتیں ممکن تھیں، یا تو وہ کسی سمت کی نشان دہی نہیں کر پایا تھا مگر اس گوشہ نشینی سے تو کوئی الہام ہونے سے رہا۔ کیا وہ اتنی آسانی سے ہاتھ آ جائیں گے، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر، گلی گلی کی خاک چھانی پڑ سکتی ہے یا پھر یہ تھا کہ تجمل نے اُن لوگوں کو پہچان لیا ہے اس لیے اُسے کوئی عجلت نہیں، وہ کوئی ایسا ہی یقین اور اعتماد رکھے ہوئے ہے کہ وہ لوگ اُس کی دست رس سے دُور نہیں ہیں، کسی وقت بھی وہ اُن کے سروں پر پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت تو پولیس ہماری نقل و حرکت پر گہری نظر رکھے ہوئے ہوگی۔ ہم جہاں بھی جائیں گے، وہ سائے کی طرح ہماری نگراں رہے گی۔ ہو سکتا ہے تجمل کے ذہن میں بھی یہی ہو۔ اُس پر بھی یہ وقت کچھ کم گراں نہیں گزر رہا ہوگا۔ گیتا اور رانی کے چہرے دیکھ دیکھ کے اُس کا خون بہت جلتا ہوگا۔ اُن کے آنسو تو اُس کی رگوں میں سُلگتی ہوئی آگ اور بھڑکاتے ہوں گے۔ جیسا کہ اُس نے پولیس اسٹیشن پر کہا تھا کہ اُسے اتنی دیر کے قرض کی عادت نہیں ہے۔

مگر وہ سرفروش خود اپنے دشمن کون ہیں جنھیں تجمل نے کھوج لیا ہے یا جو ابھی تک اُس کی نگاہ کی زد پر نہیں آ سکے ہیں۔ کل سے یہی سوال میرے سارے وجود پر منڈلا رہا تھا۔ میں کیا، پاڑے کا ہر دادا، علاقے کا ہر آدمی جس نے پیرو اور ماچھی کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور جو کل اُن کی ارتھیوں پر اپنے کسی عزیز کی موت کی طرح گریہ کناں تھے، یہ سوال اُن سب کے سینے بھی کھرچتا ہوگا۔ پانڈے اور سکندر نے صبح پاڑے میں کہا تھا کہ وہ لوگ ہمارے درمیان ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے نام یاد نہیں کسی اور نے بھی اس شبے کا اظہار کیا تھا۔ خود میرا دل بھی یہی کہتا تھا اور میری نگاہیں مسلسل اُن سب پر بھٹکتی رہی تھیں لیکن سب کے چہرے ایک جیسے نظر آتے

تھے۔ صبح پاڑے پر میں نے زورا اور چھیدا سے بھی سُن گُن لینے کی کوشش کی تھی اور میرے کان داداؤں کے درمیان ہونے والی قیاس آرائیوں پر لگے ہوئے تھے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میری طرح وہ سبھی ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے اور سبھی کو دادا اور ماچھی پر اُٹھنے والے ہاتھ قلم کر دینے کی بے چینی تھی۔ سبھی پر خون سوار معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اُنھی میں سے کوئی تھا تو اُس نے کیسا بہروپ بھرا تھا۔

گزشتہ تین چار دن سے پیرو اندھیری کے راجن دادا کے پاڑے کی دیکھ بھال کے لیے اندھیری ہی میں مقیم تھا۔ علاقے کی ایک عورت کی جان لینے کے الزام میں راجن کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ عورت سے راجن کا پرانا تعلق تھا لیکن پیرو کو یقین نہیں تھا کہ راجن جیسا دل کا زندہ دادا کسی عورت کو ختم کرنے کا گناہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی پیرو اندھیری چلا گیا تھا۔ بعد میں اُسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا اعتماد درست تھا اور خاصی تگ و دو کے بعد وہ پولیس کو راجن کی بے گناہی باور کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب راجن چند دن میں جیل سے چھوٹ کر آجائے گا لیکن ابھی اندھیری کے پاڑے کی نگرانی کے لیے پیرو کا وہاں رہنا ضروری ہے۔ اندھیری کے پاڑے کا بھتا بھی ماہم کے پاڑے آتا تھا اس لیے پیرو کی یہ منصبی ذمے داری بھی تھی کہ وہ راجن کی مدد کو پہنچے۔ جن لوگوں نے راجن کو قتل کے الزام میں جیل بھجوایا تھا، وہ پیرو کی دخل اندازی سے خوش نہیں ہوں گے۔ پیرو راجن کے لیے ثبوت اور شہادتیں جمع کر رہا تھا اور اُس نے اندھیری کے علاقے میں جا کے پاڑا منتشر نہیں ہونے دیا تھا۔ راجن کی زندگی اُسے ناپسند کرنے والوں کی موت تھی۔ اُسے جیل سے چھڑا کے پیرو کا اُن لوگوں کی طرف پلٹنا لازم تھا۔

راجن کے بدخواہ خود اُس کے پاڑے کے دادا بھی ہو سکتے ہیں دوسرے پاڑوں کے دادا بھی لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ دادا ہی ہوں اور اُن کا تعلق پاڑے ہی سے ہو۔ وہ کرائے کے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکو قسم کے ورنہ پیرو کو انھیں شناخت کرنے یا اُن کی جانب پولیس کو اشارہ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگتی۔ جن لوگوں نے انھیں کرائے پر حاصل کیا تھا وہ اندھیری کے با اثر اور صاحبِ حیثیت لوگ ہی ہوں گے۔ سنا ہے راجن بل کا پکا اور خون کا کچا ہے۔ اُس کا خون ذرا سی تپش سے بھڑک جاتا ہے۔ ایسا دادا کبھی نہ کبھی نقصان ضرور اٹھاتا ہے۔ اندھیری کا پاڑا بھی اُن تین پاڑوں میں شامل تھا جس نے پیرو کی عدم موجودگی کے دوران ماہم کے پاڑے پر بھتا بھیجنا بند کر دیا تھا لیکن پیرو کو راجن کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑی جیسا کہ وہ بالی کلا کے دادا دینا اور قلابے کے دادا جارجی کو خبردار کرنے گیا تھا کہ وہ کل صبح تک اُس کے پاڑے پر بھتا پہنچا دیں تو خیر ہے۔ راجن کے پاس بھی پیرو کو جانا تھا مگر دوسری صبح خود راجن ماہم کے پاڑے پر بھتے کی پوٹلی لے کر حاضر ہو گیا۔ میں نے اُسی وقت اُسے دیکھا تھا۔ وضع قطع اور لب و لہجے سے وہ پختہ کار اور ارادے کا مضبوط دادا نظر آتا تھا۔ اندھیری کے علاقے میں اُلٹا سیدھا کاروبار کرنے والے بہت سے سیٹھوں کو اُس سے خار کھانا چاہیے۔ پیرو نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اُس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ راجن کا قصہ پاک کرنے کے لیے علاقے کے کسی جوشیلے رُپے پیسے والے نے کرائے کے آدمی خرید کے راجن کی محبوب عورت کو آڑ بنا لیا۔

عجب نہیں جن لوگوں نے اُس عورت کو ختم کیا ہے اُنھوں نے ہی دادا کا تعاقب کیا ہو۔ اگر وہ واقعی پاڑے کے آدمی نہیں تھے تو اُن تک پہنچنا ایسا آسان نہیں ہے۔ اس سے پہلے اندھیری کے اُن امیر کبیر لوگوں کو شناخت کرنا چاہیے جو راجن کی حکمرانی سے نالاں تھے اور جو اوپر بیٹھے بس ڈوریاں کھینچتے اور ڈھیل دیتے رہتے تھے۔ پرسوں رات جب پیرو، ماچھی کے ساتھ کاٹنے کے چالیسویں پر جولین کے گھر آیا تھا تو دیر تک جھجل سے باتیں کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اُس نے اس سلسلے میں جھجل کو کچھ بتایا ہو، پھر تو وہ سب کچھ جھجل تک محدود ہو گا اور جب تک جھجل چاہے گا اُسی تک محدود رہے گا۔ اندھیری کے پاڑے کے آدمی راجن سے ناراض اپنے ہر ساتھی اور دوسرے پاڑوں کے داداؤں اور اپنے علاقے کے امیر کبیر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ سب سے زیادہ تو راجن انھیں جانتا ہو گا۔ پاڑے کے آدمی نفرت و عداوت کی بو جلد سونگھ لیتے ہیں۔ راجن نے یا اُس کے ساتھیوں میں سے کسی نے کسی کی جانب شک ظاہر نہیں کیا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ بھی کچھ طے نہیں کر پائے ہیں، وہ بھی تذبذب میں ہیں۔ راجن کا کوئی ایسا نمایاں حریف نہیں تھا جس کی جانب بے دریغ، بے تردد انگلی اٹھا دی جائے۔

اُدھر اندھیری کی پولیس کو بھی خوب معلوم تھا کہ راجن کی وکالت کے لیے پیرو اندھیری کے پاڑے پر آچکا ہے۔ تین چار دن کی اس مدت کے دوران راجن سے ملنے کے لیے پیرو کا کئی بار اندھیری کے تھانے پر بھی جانا ہوا ہو گا۔ پولیس بھی اس اندیشے سے بے خبر نہ ہو گی کہ کسی نے راجن کے لیے پیرو کو اُس کی فعالیت کی سزا تو نہیں دی ہے۔ ایک شخص کو راستے سے ہٹا دیا گیا جو راجن کے لیے پیر

بنا ہوا تھا۔ ایک راجن کو ہٹانے سے کیا حاصل ہوا، اب ایک ایسا شخص اندھیری کے پاڑے پر موجود ہے جو کئی راجنوں کا حاصل جمع ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیرو نے انھیں پہچان لیا ہو اور دانستہ تامل کر رہا ہو۔ اُس کے خیال میں پہلا مرحلہ راجن کے دفاع کا ہو گا۔ راجن کو محفوظ کرنے کے بعد وہ دوسرے مرحلے پر عمل کرتا۔ پاڑے کے آزمودہ کار دادا کا یہی طور ہونا چاہیے۔ جھجل بھی یہی کچھ کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی ذرا سا تامل بہت گراں پڑ جاتا ہے، زندگی کی قیمت پر۔ کوئی آدمی مرتے وقت یا کسی کو مارتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ ایک آدمی کی زندگی صرف اُس کی نہیں ہوتی اور بھی کئی زندگیاں اُس میں شامل ہوتی ہیں۔

اور اگر یہ سب میرا قیاس ہے کہ پہلے اندھیری کی طرف قدم اُٹھانا چاہیے، اندھیری ہی سے کوئی سلسلہ نکلتا ہے تو پھر دوسرا کون ہے۔ جارجی کے خیال نے کئی بار میری آنکھیں انگارا کی تھیں۔ اُس کا نام آنے پر کئی بار میرے سارے جسم میں آگ لگی تھی مگر جب بھی اُس کی طرف نظر جاتی، وہ اپنا ہی کوئی چہرہ، اپنا ہی کوئی عکس نظر آتا تھا۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی لال لال آنکھیں، سُتا ہوا زرد چہرہ، ٹوٹا پھوٹا سا کوئی جسم۔ وہ اتنا ہی آزردہ اور شکستہ خاطر تھا جتنا پیرو سے رفاقت کا کوئی بھی مدعی ہو سکتا تھا۔ گنگیا اور لکھی نے مجھے بتایا تھا کہ جس رات دادا اور ماچھی پر گولی چلی تھی، جارجی پاڑے پر موجود تھا۔ پہلے ہی کئی دن سے وہ وہاں تھا بلکہ جس رات پیرو نے اُس کے جوئے اور شراب کے اڈے پر اچانک پہنچ کے اُس کی گوشمالی کی تھی، اُس کے بعد سے جارجی بیشتر ماہم کے پاڑے پر دھرنا دیے بیٹھا رہا تھا۔ آخر پیرو نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ اُس نے جارجی سے قلابے کا پاڑا نہیں چھینا۔ اِس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ جارجی نے پیرو کے حکم کی تعمیل میں فی الفور اپنے خفیہ اڈے کا کاروبار بند کر دیا تھا، اس کا سبب یہ بھی ہو گا کہ جارجی، ماری کا شوہر تھا اور ماری پیرو کو بہت عزیز تھی، اپنی بیٹی کی طرح۔ دونوں ابتدا ہی سے پیرو کے سامنے رہے تھے۔ دونوں کی شادی بھی اُسی نے کرائی تھی۔ پیرو ہی نے جارجی کے بازو کو کوٹ کوٹ کے اُسے زور آزما بنایا تھا، اُس کی انگلیوں کو چاقو کا مزا آشنا کیا تھا۔ پیرو ہی نے جارجی کو قلابے کے پاڑے کی گدی پر بٹھایا تھا۔

بمبئی آنے کی دوسری رات کا واقعہ ہے، ڈیڑھ مہینے پہلے جب پیرو، میرے اور جھجل کے ساتھ اُس کے ساحلی اڈے پہنچا تھا۔ جارجی اُس وقت نشے میں چور تھا۔ دوسرے دن وہ پاڑے پر بھتا لے کے آیا تو سرتاپا خجالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس عرصے میں وہ مسلسل پیرو کا تکدر دُور کرنے، اُس کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا رتبہ بحال کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پیرو سے اپنی سفارش کے لیے اُس نے پاڑے کے ہر آدمی کی، یہاں تک کہ میری اور جھجل کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی تھی۔ میرا جی نہیں مانتا تھا کہ وہ جارجی ہو سکتا ہے۔ اُس میں اتنی جرأت کہاں سے آتی۔ پیرو نے اُس کے ساتھ ایسا بُرا بھی کیا کیا تھا۔ اُس نے اُسے بس چوری چھپے کا کاروبار بند کرنے کا حکم دیا تھا، بازاری عورتوں کا کاروبار جو پاڑے کے دادا کا شیوہ نہیں ہے۔ پیرو نے اُسے پاڑا بدر نہیں کیا تھا اور اُس کی انگلیاں نہیں کاٹ لی تھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے چاقو سے محروم ہو جاتا۔ سب کو معلوم تھا کہ جارجی بل کا کتنا ہی کھرا ہو، پیرو کے بغیر آدھا بھی نہیں ہے۔ پیرو کے دم سے تو شہر میں اُس کا اعتبار فزوں ہوتا تھا۔ ہر جنون کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ اتنی بڑی دیوانگی کے لیے کوئی بڑی ضد، کوئی بڑا جواز چاہیے۔ جارجی ایسا دیوانہ نہیں لگتا تھا۔ وہ ہوتا تو جھجل کبھی کا اُس کی گردن دبوچ لیتا اور جھجل کا وقت ہی نہ آتا، پاڑے کے آدمی اُس سے پہلے ہی اُس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔ جارجی بھی خود سب کے درمیان اس طرح موجود نہ رہتا۔ پاڑے میں کسی ایک کی نظر تو اُس پہ جا کے ٹکتی۔

میرے سر میں ریت اُڑ رہی تھی اور میرے دماغ ہی کا قصور تھا کہ حیدرآباد سے ہمارے تعاقب میں آنے والے دو آدمیوں کو بھی میں نے کٹہرے میں کھڑے دیکھا۔ وہ دونوں کتنے دن تک ماہم کے پاڑے کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند رہے تھے۔ سسکتے ہوئے، انھیں چھوڑ دیا گیا تھا کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکے تھے اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔ ہڈیوں کو اس سے زیادہ اذیت کی استطاعت نہیں ہوتی۔ گنگیا اور لکھی جس پردہ پوشی سے انھیں پاڑے لائے تھے اُسی بے خبری کی حالت میں انھیں کسی جگہ چھوڑ آئے تھے۔ ہمارے ٹھکانوں کے کسی راستے سے وہ واقف نہیں ہو سکے تھے۔ اُن کی حالت ہی اس قابل نہ تھی کہ وہ مزید ایک دن بھی بمبئی میں ٹھہر سکیں۔ انھوں نے سیدھے حیدرآباد کا رُخ کیا ہو گا اور جلد سے جلد اپنے آقا نواب حشمت جنگ کے خاص معتمد نسبت شاہ خاں کی خدمت میں حاضر ہو کے سارا ماجرا گوش گزار کیا ہو گا۔ انھیں مزید کمک کے ساتھ بمبئی جیسے شہر میں از سرِ نو ہماری تلاش، ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھنے اور موقع ملتے ہی گولی مار دینے کا حکم دے کے دوبارہ بمبئی بھیج دیے جانے کا امکان نہایت موہوم معلوم ہوتا تھا۔ اُن کا مقصد صرف ایک تھا، ابا جان کے پاس لعل و جواہر کے ذخیرے کا سُراغ لگانا۔ اُس کی تکمیل کے لیے ہماری

زندگی شرط تھی۔

سفر کے دوران بہروپ بھرے دو آدمیوں کو ہم نے ریل سے پھینک دیا تھا اور دوسرے ڈبّوں میں تیار بیٹھے اُن کے مسلح ساتھیوں کو ناکام لوٹا دیا تھا۔ انھوں نے کسی اور نواب، نواب قطب الدین علی کا نام بتایا تھا۔ اُن کے بیان کے مطابق اُس کے مطلوب بھی ہیرے جواہر تھے۔ ریل میں بیتی ہوئی ساری رُوداد سُن کے اُس طالع آزما نواب کا پیمانہ بہت لبریز ہوا ہوگا۔ صاحبانِ زر کے پیمانے جلد لبریز ہو جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ نازکی کے علاوہ تنگی بھی ہو سکتی ہے۔ ہر چند کہ اِس آتشِ غضب میں ہماری شکر گزاری کا ایک پہلو بھی نواب کے پیشِ نگاہ رہنا چاہیے۔ ہم نے اُس کے زر خریدوں کو گٹھری میں بند کر کے چلتی ریل سے زمین پر صرف لڑھکا دیا تھا، ختم نہیں کیا تھا مگر آدمی کا کیا ہے۔ دنیا میں سب سے گراں اور سب سے ارزاں چیز آدمی ہے۔ نقد اُدھار ہر بھاؤ پر مل جاتا ہے۔ نہ ملے تو ساری دُنیا کے خزانے بھی تھوڑے ہیں۔ ممکن ہے، واپس جانے والوں نے اپنی ہزیمت کے انتشار میں نواب کے رُوبرُو یہ اعتراف بھی کر لیا ہو کہ اُنھیں ہمارے سامنے اپنے فرستادے کا نام بھی بتانے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ انکشاف مستزاد تھا، ایک اور تازیانہ۔ یہ جان کے نواب قطب الدین علی کی رگوں میں بھڑکتا ہوا خون ایک لمحے کے لیے ضرور جم گیا ہوگا۔

اگر وہ وہی تھا جس نے حیدرآباد میں ابّا جان کی حویلی پر شب خوں مارنے کے لیے ۲۴ مسلح زور آوروں کا دستہ بھیجا تھا تو وہ ہم سے خوب واقف تھا۔ اُس وقت رہ جانے والی کوئی کمی ہمارے تعاقب کے سفر سے واپس آنے والوں نے پوری کر دی ہوگی۔ اتنی شناسائی آئندہ کے لیے احتیاط کا سبب ہونی چاہیے تاہم حالتِ اشتعال میں احتیاط کی تلقین کبھی اور زہر گھول دیتی ہے۔ حیدرآباد کے اُن اقبال مندوں کے پاس مال و زر کی کمی ہے نہ زور و اثر کی۔ ایسے میں ارادے خود رو پودوں کی طرح آدمی کے سر میں اُگتے ہیں۔ نواب حشمت جنگ کے تزک و احتشام، لاؤ لشکر کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نواب قطب الدین علی بھی اُس کا کوئی ہم سر ہوگا۔ وہ ایک فوج کی فوج تیار کر کے ہماری سرکوبی کی مہم پر روانہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے ایک ایک کو چُن چُن کے ختم کر دیا جائے اور یوں حیدرآباد میں ہمارے پلٹنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔ یہ اُن کا آبائی شغل ہے۔ ریاست میں وارد ہو کے ہم اور کچھ نہیں تو اُن کے حواس ضرور منتشر کر سکتے ہیں۔ ریاست سے باہر اُنھیں اپنی عزت و حرمت پر آنچ آنے کا کھٹکا بھی نہیں ہے۔ ابّا جان کی حویلی کے نقب زن،

سفر میں ہمارا پیچھا کرنے والے، شہر کے تمام اڈّوں کے دادا، عالم تاب کے محل کے ملازمین، شہر میں کیتی آنکھوں کو ہمارے نقش و نگار ازبر ہو گئے، سو بمبئی میں ہماری کھوج کچھ ایسی مشکل بھی نہیں ہے۔ اِس کے لیے وہ یہاں کے باڑوں کے داداؤں سے بھی مدد لے سکتے ہیں کرائے کے آدمیوں کی خدمات بھی خرید سکتے ہیں۔ وہ آدمی سے زیادہ نواب ہیں۔ پہلے ہی اُنھوں نے کون سے کم درجے کے فیصلے کیے تھے۔ ریل میں ہم نے جن دو بہروپیوں کو پکڑا تھا، اُن کے پاس ہتھیار تھے اور اُن کے کہنے کے مطابق اُنھیں حکم دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ذرا بھی تامّل نہ کریں۔ ہتھیار کی موجودگی سے اور مراد بھی کیا ہوتی ہے۔

اِن تمام دُور دراز اندیشوں کے باوجود میرا دل انھیں یہ یک جنبشِ لب مسترد کر دیتا تھا۔ یہ سب مجھے اپنے حواس کا فشار اپنے اعصاب کا خلفشار لگتا تھا۔ وہ چاہے نواب حشمت جنگ ہو، نواب قطب الدین علی، مہاراجا دھرم ویر یا کوئی اور نواب راجا، وہ آدمیوں سے زیادہ پتھروں کے شائق ہیں۔ مکین سے زیادہ مکان کے مشتاق۔ پہلے اُنھیں اس امر کا یقین کرنا چاہیے کہ ہماری تحویل میں نوادر کا کوئی بیش بہا خزینہ ہے بھی یا یہ محض دیوانے کا خواب ہے۔ اِس تعیّن کے بعد اُنھیں ہمارے سلسلے میں کسی تشویش و توحش کی ویسے بھی حاجت نہیں۔ ہماری جانب سے کسی ردِعمل کا خدشہ پیشِ نظر ہوگا تو اُس سے نمٹنے کے لیے ریاست کی حدود ہی زیادہ موزوں ہیں۔ اپنی حدود، زیادہ یقینی، زیادہ اعتباری، جہاں زمین اُن کی، آسمان اُن کا، حکم اُن کا، محکوم اُن کے۔ جہاں سب کچھ اُن کی دست رس میں ہے۔ وہ بس اتنے پر اکتفا کر کے وہیں ہماری آمد کا انتظار کیوں نہ کریں۔ نواب حشمت جنگ کو تو ہماری واپسی کا ایک مستقل گداز حاصل ہے کہ خانم وہاں موجود ہے۔ کسی یرغمالی کے طور پر یہ بات دُوسروں کے لیے بھی کچھ کم وجہِ قرار نہیں ہے۔

اُن کی دانست میں اُن کے جاہ و حشم کا اندازہ ہمیں خوب ہوگا۔ ہماری مشاقی، مستعدی، عزم اور ارادے کا سچ اپنی جگہ لیکن اُن کی سطوت و شوکت بھی کوئی افسانہ نہیں۔ بڑی حقیقت چھوٹی حقیقت کو مٹا نہیں دیتی تو اوجھل ضرور کر دیتی ہے۔ اُن کے خیال میں یا بیت میں گزرے ہوئے شب و روز ہم اتنی جلدی نہیں بھولے ہوں گے۔ اُن کے نجی قید خانے، مسلح خدمت گار، اُن کی اپنی عدالتیں۔ نواب جہاں تاب کی حویلی کا محبس بھی ہمیں خوب یاد ہوگا اور بھی بہت کچھ۔ سو ہماری جانب سے کسی عاجلانہ، عاقبت نااندیشانہ ردِعمل کا امکان قرینِ قیاس نہیں، قرینِ عقل بھی نہیں ہے۔ حیدرآباد آ کے ہماری طرف سے کسی ممکنہ اقدام کا خدشہ اُنھیں اُسی قدر ہوگا جو ہوش

مندی کا تقاضا ہے۔ اُنھیں تو اب ہمیں ایک دوسرا ہی تاثر دینا چاہیے، بے نیازی کا، تجاہلِ عارفانہ کا، استغنا کا تاکہ ریاست میں کسی طور جلد از جلد ہماری آمد ممکن ہو سکے۔ اپنے آدمیوں کی واپسی پر پتھروں کے لیے اُن کی بے کلی اور سوا ہونی چاہیے۔ اُنھیں بتلایا گیا ہوگا کہ ہم کتنے بیدار، کیسے اپنے سائے سے بھی محتاط سفر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے بمبئی اُتر کے اپنے ٹھکانوں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ ہم اُن دونوں کو اندھا کر کے کس طرح اپنی منزل تک لے گئے تھے اور کس طرح اُن کی آنکھ کھلی تو وہ کوڑے کے ڈھیر پر پڑے تھے۔ سارے سفر میں ہم ابّا جان کو حصار میں لیے رہے۔ ابّا جان جیسے ایک مختلف شخص کے ساتھ اتنے لوگوں کی ہمہ وقت موجودگی کس طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ نگہ داری، نگہبانی کس متاع کی حفاظت کے لیے ہے۔ کسی قیمتی شخص ہی کو اتنے پاسبانوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ایسے پاسبان؟ اُن دونوں نامرادوں نے اپنی بدبختی کا جواز پیدا کرنے کے لیے کچھ اور بھی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ یہ سب اُن کے آقاؤں کی جستجو کو سند دینے، اُن کا عزم تازہ کرنے کے مترادف ہے۔ ہماری ہر مزاحمت پر اُن کی لَو اُور بڑھنا چاہیے، ہم اُنھیں اور زیادہ مطلوب اور زیادہ مرغوب ہوتے جائیں۔ لیکن یہ کہ وہ ہماری نابودی کے درپے ہوں۔ وہ پاڑے کے آدمی نہیں، نواب لوگ ہیں۔ اُن کے آبا و اجداد نے ورثے میں کوئی ناعاقبت اندیش حکایت بھی نہیں چھوڑی ہے۔ اُنھیں ہمارا حوصلہ بقدرِ ہوش ہی آزمانا چاہیے۔ ہوش سے بے گانہ تو پھر کچھ نہیں دیکھتا۔ وہ کتنے ہی بد دماغ ہوں، بے دماغ نہیں ہیں۔ اُنھیں ہماری کمی بیشی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ دہشت مراد ہے تو اِس طرح گویا ہماری واپسی کے راستے بند کرنا، ہمیں کھو دینا اور ہمیں خود سے دُور کر دینا ہے۔ اتنا جان بوجھ کے تو اُنھیں ہمارا خیال رکھنا چاہیے۔ اُن کیمیا گر راز دانوں اور چشم دید گواہوں کی طرح جن کے مٹ جانے سے سب خاک بسر ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیلاش، جمرو، نشا مو اور مارٹی میرے اردگرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا میں خنکی تھی۔ جولین نے کیلاش کے لیے چائے کا اہتمام کیا تھا۔ مَیں نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ جسم و جاں کی موجودگی کیسا سراب ہے۔ ہوش و حواس کی یکجائی، ارادہ و خیال کے بغیر کیسی عجیب۔ آدمی کا سامنے رہنا اُس کی موجودگی کی شہادت نہیں۔ آدمی محض جسم نہیں ہوتا، کسی بُت کی طرح۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی کتنا وہاں موجود ہے جہاں نظر آتا ہے۔ کون کس گمان، کس تصوّر، کس دُنیا میں ہے، یہ خود وہی جانتا ہے۔ شاید

ہر آدمی کے ساتھ یہی ہے، موجود، ناموجود، حاضر، غائب، کبھی پورا، کبھی اُدھورا، بٹا بٹا سا۔ پھر یہ اصرار کیا معنی رکھتا ہے کہ آدمی تو نظروں کے سامنے ہی رہے؟ شاید اِس لیے کہ اِس طرح کسی نہ کسی لمحے کُلّی طور پر اُس کے موجود رہنے کا امکان رہتا ہے ورنہ تو کچھ بھی نہیں۔ مگر سُنا ہے، آدمی کہیں بھی ہو، اُس کی صدا پہنچ جاتی ہے بشرطیکہ صدا میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور اُسے کوئی سُننے کا بھی منتظر ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سمندروں پار بھی رشتہ قائم رہتا ہے، نفس کا رشتہ، بشرطیکہ دوسری جانب بھی کوئی بہت مشتاق ہو۔ یہ لہروں کا سفر ہے اور بے حد و حساب ہے۔ لوگ اور بھی کیا کچھ کہتے ہیں۔ کون جانے اِس میں کتنی شاعری، کتنا افسانہ ہے یا بعض رحم دل لوگوں نے ستم زدگاں کے لیے کچھ ایسی باتیں عام کر رکھی ہیں پر کبھی کبھی یہ بہت سچ لگتا ہے۔ مَیں خود اِس کا شاہد ہوں۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے، کوئی میرے قریب کہیں موجود ہے، وہ مجھے آواز دے رہی ہے، مجھے یاد کر رہی ہے، میرے لیے رو رہی ہے۔ ایسا ہے تو میری آواز بھی ضرور اُس تک پہنچتی ہوگی۔

ہمیں وہاں بیٹھے بیٹھے خاصی دیر ہو گئی۔ تجمّل باہر نہیں آیا۔ جولین اور شہر یارہ کھانا تیار ہونے کی اطلاع دینے آئیں تو کسی نے عذر نہیں کیا۔ تجمّل کو مَیں نے وہیں بیرونی کمرے میں دسترخوان پر بیٹھے دیکھا۔ سُوجے ہوئے پپوٹے، بھاری بھاری چہرہ لیکن یہ ایک سکون آمیز خاموشی تھی بلکہ حسرت آمیز۔ بے صدا کھنڈروں اور بے برگ درختوں کا سا سکوت۔ مَیں نے تجمّل کو غور سے دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر اضطراب کی کوئی علامت نہیں تھی۔ یہ کوئی اور کیفیت تھی۔ اِس میں نہ کھنڈروں کی مردم بیزاری تھی نہ ننگے درختوں کی بے حسی۔ وہ اور گیتا دونوں اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں ہی کا جزو معلوم ہوتے تھے، اُن سے الگ نہیں۔ مَیں نے بھی گرد جھاڑنے اور ہمہ ہوش و حواس اُن میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر ہر بات اختیار میں کب ہوتی۔ یہ قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے تو کمی کس بات کی۔ میرے سارے جسم سے جیسے بچھو چمٹے ہوئے تھے جو بار بار ڈنک مارتے رہتے تھے۔

کھانے کے بعد ابھی سب وہیں بیٹھے تھے کہ مَیں چپکے سے اُٹھ کے باہر چلا آیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ مَیں سبزے پر ادھر سے اُدھر چکر لگاتا رہا۔ چند ہی لمحوں میں اِس تنہائی سے میرا دل گھبرانے لگا۔ جانے کیا بات تھی جو کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ مَیں دوبارہ اندر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ یکایک ایک خیال نے میرے قدم تھم

کردیئے مجھے یاد آیا، حیدرآباد میں ہم نواب ثروت یار کو اپنا پتہ بتا کے آئے تھے وہی نواب ثروت یار جس کا پتہ مولوی صاحب نے مراد آباد کے مسافر خانے کے رجسٹر میں اپنی قیام گاہ کے طور پر درج کرایا تھا اور جسے دیکھ کے میں کچھ اور دیکھنا سننا بھول گیا تھا۔ میں نے پیرو سے صرف ایک دن کے لیے حیدرآباد جانے کی ضد کی تھی اور اُن سب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا راستہ بدل دیں۔ میں اُس وقت یہ عجلت نہ کرتا، ایک ذرا تحمل کر لیتا تو سب کچھ اتنے تواتر سے پیش نہ آتا۔ نہ ہم حیدرآباد کا رُخ کرتے، نہ سونا ملتی۔ آدمی کو خواب کیسے زندہ رکھتے ہیں، میری صورت نے اُس کے خواب چھین لیے۔ میں نے اپنا فسوں ہی توڑ دیا۔ نواب جہاں تاب کا زنداں، ابّا جان کے منہ پر طمانچے، ابّا جان کا گریبان تار تار ہونے کا منظر، آدمی کی بینائی چلی جائے تو بھی بعض منظر اوجھل نہیں ہوتے۔ نواب عالم تاب کی سانس بھی کسی آس میں اٹکی ہوئی تھی، زندگی تو باقی تھی، خاتم بھی کیسی آزمائش سے دوچار ہوئی۔ نہ ہم وہاں جاتے، نہ ابّا جان کو اپنے لعل و جواہر کی پوٹلی کھولنی پڑتی۔ اُس ادھورے پتھر کی چمک نے کتنے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ کانتے بھی اُس کی بھینٹ چڑھ گیا اور وہاں جانے سے حاصل کیا ہوا؟

حیدرآباد پہنچتے ہی ہوٹل میں اپنا بندوبست کر کے میں اور پیرو، نواب ثروت کے مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اُسی پہلی ملاقات میں ہم نے نواب کو بمبئی کا پتہ بتایا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ دوسری ہی گھڑی حیدرآباد کی زمین ہمارے لیے کتنی تنگ ہو جائے گی۔ درمیان کے ستّرہ دن برتنے کے بعد ہم نواب ثروت یار کے پاس جاتے تو شاید بمبئی کا پتہ کبھی نہ لکھواتے۔ دوسری ملاقات میں اُس نے بتایا تھا کہ اُسے ہمارا پتہ یاد ہے۔ دوسری بار ہم بمبئی روانہ ہونے سے ایک پہر پہلے اُس کے گھر گئے تھے۔ نواب حشمت جنگ کی موٹر ہماری تحویل میں تھی اور دادا نے احتیاطاً نواب ثروت کے مکان سے خاصی دُور موٹر رکوائی تھی۔ باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا تھا اور اچھی طرح یقین کر لیا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا ہے مگر ہماری آنکھیں دھوکا بھی کھا سکتی ہیں۔ بعد میں نواب حشمت جنگ کے ڈرائیور کی نشان دہی پر ہمارے دیوانے اُس علاقے کے چکّر اور گرد کے ایک ایک مکان پر جا کے دستک دے سکتے ہیں کہ ایسی شکل و صورت کے دو آدمی فلاں وقت اُن کے ہاں آئے تھے کہ نہیں۔ نواب ثروت یار نے ہماری آمد کا مقصد انھیں کھل کے بتایا ہو گا۔ چھپانے کی اُسے ضرورت بھی کیا تھی۔ ہم نے اُسے جولین کے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ جولین کے گھر کے قریب ہی گولی چلی تھی۔ سامنے پیرو اور ماچھی آ گئے، اُن کے ساتھ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی زد پر آ جاتا۔ اگر یہ سب اُسی زنجیر کی ایک کڑی ہے تو یہ سلسلہ دادا ہی پر تمام کیوں ہو گیا۔ ابھی دو سر کئی باقی ہیں۔ جمرو، شامو، مارتی، زورا ٹھگو، ابّا جان، منیر علی، میں اور تجمّل۔ سبھی حیدرآباد میں تھے۔ دوسروں کی باری بھی جلد آ سکتی ہے۔ اب نہیں تو چند دن بعد وقت کے کچھ ٹھہر جانے پر، شہر میں پولیس کا جوش ٹھنڈا پڑنے پر۔ جولین کے گھر سے انھوں نے ہر شخص کا تعاقب کیا ہو گا اور انھیں ہمارے سارے ٹھکانے معلوم ہو گئے ہوں گے۔ باڑا، ابّا جان کا گھر، پیرو کا گھر......

میرا سر بھن بھنا رہا تھا۔ تجمّل نے بھی اس پہلو پر کچھ سوچا یا نہیں؟ میرے جی میں آئی کہ فوراً تجمّل کے پاس جا کے اُسے بتاؤں۔ میں نے جھپٹتے قدموں سے برآمدہ طے کر لیا تھا لیکن اندر کمرے میں جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں تجمّل کو اُٹھانا مناسب نہیں، سب منتشر ہو جائیں گے لیکن یہی ایک بات نہیں تھی جس نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔ یہ دلیل اپنی جگہ برقرار تھی کہ انھیں اپنے سوال کا حتمی جواب ملنے کے بعد ہی اس کشت و خون کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ کیا انھیں اُن کے سوال کا جواب مل گیا یا انھیں آدمیوں سے اتنا سروکار نہیں جتنا پتھروں سے ہے۔ ہم کسی خزینے کے راستے کی دیوار بنے ہوئے ہیں تو بے شک یہ دیوار ڈھا دینا چاہیے مگر اس یقین کے بعد کہ پیچھے کوئی خزینہ واقعی موجود ہے یا یہ محض نظر کا فریب ہے۔ نواب ثروت یار کے ذریعے انھیں ہمارا پتہ معلوم ہو گیا تھا تو اپنے آدمیوں کو ایک اجنبی شہر میں بھیجنے اور خطرے میں ڈالنے سے بہتر یہ تھا کہ وہ نواب ثروت یار ہی کی جانب سے ایک خط لکھوا کے ہمیں حیدرآباد بلا لیتے یا کہیں اور اپنی کسی جاگیر میں جہاں پرندے بھی اُن کی اجازت سے پرواز کرتے ہیں۔ نواب ثروت کا یہ چند لفظی خط ہی بہت ہوتا کہ مولوی صاحب اور کورا فلاں شہر، فلاں گاؤں میں موجود ہیں۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ جاتے۔ نواب ثروت یار کی جانب سے ایسا کوئی خط ہمیں نہیں ملا تو یہی مراد ہے کہ وہ اُس تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں ورنہ اس سے محفوظ اور یقینی تدبیر کون سی تھی۔

میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ میں منڈیر پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میں نے آنکھیں موند کے اپنے آپ سے نجات پانے کی کوشش کی۔ پھوار سے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ اندر سے کوئی بھی نہیں آیا۔ میں دیر تک تنہا بیٹھا رہا اور از خود مجھ پر غفلت سی طاری ہو گئی۔ شاید اس لیے کہ اتنا ہی میرے بس میں تھا۔ سر بھی تو کسی پیمانے کے مانند ہوتا ہے لیکن چند ثانیوں کا یہ وقفہ دم لینے کا سا تھا۔ میرے رگ و پے میں پھر وہی جلن ہونے لگی۔ نواب ثروت یار کی طرف سے اب اگر کوئی خط آئے بھی تو اُس کی صداقت کا کیا بھروسا؟ کیا کسوٹی ہے؟ وہ یقیناً جھوٹا خط ہو گا۔ مولوی صاحب جس انداز سے اُس کے گھر سے گئے ہیں، اُن کے لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایسی جگہ کیوں آئیں گے جہاں میرے آنے کی امید ہو، جو گھر میں نے دیکھ لیا ہو۔ نواب نے بتایا تھا کہ مولوی صاحب نے میرا پتہ معلوم کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ دوسرے ہی دن وہ وہاں سے چلے گئے جیسے انھیں علمِ غیب ہو گیا تھا کہ میں حیدرآباد ہی میں ہوں اور وہ وہاں رہیں گے تو میں کسی وقت اُن کے سامنے پہنچ کے دعوا کر سکتا ہوں۔ مجھ سے تو انھیں خوف آتا ہو گا۔ قتل کے جرم میں سات سالہ سزا یافتہ سے خوف آنا ہی چاہیے۔ نواب ثروت یار کی طرف سے مولوی صاحب کی خیر خبر کا خط آنے کی کوئی امید میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہے تو اُسے یک سر خارج کر دینا چاہیے۔ نواب کی طرف سے ایسا خط کبھی نہیں آئے گا۔ آئے بھی تو اُس پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔

میں خود کو یہی کچھ باور کرا رہا تھا کہ ناگہاں ایک خیال نے میرے حواس معطل کر دیے۔ کہیں نواب ثروت یار نے دروغ گوئی نہ کی ہو، مولوی صاحب نے میرے بارے میں اُلٹا سیدھا بتا کے اُسے آمادہ کر لیا ہو کہ میرے آنے پر وہ اسی قسم کا کوئی جواب دے دے تاکہ میں دوبارہ حیدرآباد کا رُخ ہی نہ کروں، اُس کے گھر پر دوبارہ دستک ہی نہ دوں۔ مجھے کورا سے دُور رکھنے کے لیے "قتل ہی کیا" مولوی صاحب اور بھی سنگین الزام لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا نواب ثروت یار نے ایک کہانی تراش کے مجھے سُنا دی اور یوں مولوی صاحب سے اپنی خاندانی رفاقت کا حق نبھایا جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا، کورا سے اُسے واقعی کوئی دلچسپی تھی تو مولوی صاحب کی ہم نوائی میں اُسے اور شدت اختیار کرنی چاہیے۔ مولوی صاحب نے جیسلمیر میں ارشد کا رشتہ مسترد کر دیا اور رانا مہتاب کا پیام بھی اور اس دوران جانے کس کس کا۔ ظاہر ہے، وہ اُسے ایسے کب تک ساتھ رکھیں گے، کب تک دربدری کی زندگی بسر کریں گے۔ کسی ایک دن تو اُن کے اعصاب جواب دے ہی جائیں گے۔ نواب ثروت یار میں بظاہر کوئی خامی نہیں ہے۔ اُس کا نسب نوابوں کا ہے، وہ وجیہ اور شائستہ ہے اور سب سے بڑی خوبی تو دولت کی ہے۔ دولت آدمی کے دس عیب چھپا لیتی ہے۔

میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ نواب کے چہرے سے بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو مولوی صاحب کے رویّے سے دل برداشتہ تھا۔ دادا کو بھی احساس نہیں ہوا۔ اُسے آدمیوں کی پرکھ میں بڑی مہارت تھی۔ دادا کی آنکھ بھی دھوکا کھا گئی! آدمی بہروپ کیسے بھر سکتا ہے۔ ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی گمان نہیں ہوا تھا کہ نواب داستان طرازی کر رہا ہے۔ اُس نے ازخود بہت زیادہ ہمدردی ظاہر کی تھی۔ ہمیں روکنا بھی چاہا تھا۔ پھر اُسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اُس کی والدہ نے کورا کو پسند کر لیا تھا اور مولوی صاحب سے رشتے کی بات کی تھی۔ اُسے یہ سب بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صاف صاف کہہ سکتا تھا کہ مولوی صاحب آئے تھے اور اچانک کچھ بتائے بغیر چلے گئے تو ہم کیا کر لیتے۔ مگر یہ سب کچھ تو وہ اپنے بیان کا سچ ظاہر کرنے کے لیے بھی کہہ سکتا ہے۔ اُسے یہی تاثر دینا چاہیے تھا کہ مولوی صاحب کو یہ رشتہ نامنظور تھا اور اُن میں صاف انکار کی جرأت بھی نہیں تھی اس لیے وہ کچھ کہے سُنے بغیر چلے گئے۔ یعنی وہ دوبارہ نہیں آئیں گے اور میں اس طرف سے بالکل مایوس ہو جاؤں۔

میرے ہاتھ پاؤں بالکل شل ہو گئے تھے اور پورے جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اگر یہی سچ ہے تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے فوراً حیدرآباد جانا چاہیے۔ میرا وجود یہی کہہ رہا تھا کہ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ حیدرآباد سے ہمیں چلے ہوئے ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے۔ سامنے دروازے پر چوکی دار موجود تھا اور بھی خالی پڑا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر منڈلاتی رہیں۔ کسی کے باہر آنے سے پہلے ہی میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے، ورنہ بہت دیر ہو سکتی ہے۔ مجھ پر خفقان سا طاری تھا۔ میں نکل جاتا اگر مجھے ہوش نہ آ گیا۔ یہ ندامت کا پسینہ تھا جو ذہن سے اُبل رہا تھا۔ دادا کو گئے ابھی دو دن ہوئے ہیں۔ میں اُس کے قاتلوں کو فراموش کر کے حیدرآباد چلا جاؤں؟ وہ سب جو اندر بیٹھے گیتا اور رانی کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ اُن دونوں کے کون ہوتے ہیں؟ میں نہیں ہوتا۔ اُن سب کے لیے یہ کیسا تماشا ہو گا۔ میں انھیں بتا کے بھی جاؤں تو بھی وہ کیا سوچیں گے کہ یہ کیسا آدمی ہے، اسے صرف اپنی طرف دیکھنا آتا ہے۔ میں ہمیشہ یہی کرتا ہوں۔ میں نے مراد آباد میں مولوی صاحب کا پتہ دیکھ کے یہی عجلت کی تھی۔ اُس وقت بھی میں پاگل ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا ہے تو چند دن اور سہی اور ایسے بھی میں حیدرآباد کس طرح جا سکتا ہوں۔ میں کتنی ہی احتیاط کروں، بھیس بدل کے جاؤں یا اندھیروں کی آڑ لے کے۔ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو شاید میں کبھی نواب ثروت یار کی دہلیز تک نہ پہنچ سکوں۔ وہ تو تاک لگائے بیٹھے ہوں گے اور ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ دادا کو ختم کرنے والے حیدرآباد سے آئے تھے یا کوئی اور تھے، وہیں کے تھے تو حیدرآباد میں ایک نواب ثروت

کیا، جانے کس کس نواب اجا کی فصیل پھاندنی پڑے۔

یہ بھی تو محض مفروضہ ہے کہ نواب ثروت یار نے مجھے اور دادا کو مولوی صاحب کے بارے میں غلط بتایا تھا۔ ممکن ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ درمیان میں کورا بھی تو ہے۔ اُس کی آمادگی کے بغیر مولوی صاحب اور نواب ثروت یار کی مرضی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ وہی نواب تک مولوی صاحب کو روکے ہوئے ہوگی۔ وہی انکار کرتی ہوگی اسی لیے مولوی صاحب نے ہر جگہ معذرت کر دی تھی۔ اُس کے چہرے پر غبار آجانے کے خوف سے وہ زیادہ اصرار بھی نہ کر پاتے ہوں گے۔ وہ تو اُسے مسلسل آسرا دلاتے رہے ہوں گے کہ وہ مجھی کو ڈھونڈ رہے ہیں اور ایک دن میں ضرور مل جاؤں گا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ کسی دن دنیا خود اُس پر غالب آجائے گی۔ کبھی تو اُس کا حوصلہ ماند پڑے گا اور آخر وہ اُن کی بات مان لے گی۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ تنہا زندگی گزاری ہے۔ نہ بیوی نہ بال بچے۔ پہلی مرتبہ کوئی یوں اُن کے ساتھ رہا ہے۔ اس عرصے میں وہ اس کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ اُس کی جدائی کے تصور ہی سے اُن کا دل ہول جاتا ہوگا۔ زہرہ اور منیر علی کہتے تھے کہ مولوی صاحب اُس کے لیے پلکیں بچھائے رکھتے تھے۔ مستقل سایہ بنے رہتے تھے۔ مولوی صاحب اُس کے لیے ایسے رشتے کی تلاش میں ہوں گے جو اُن کی طرح کورا کے آبگینے کا خیال رکھ سکے۔ اُن سے زیادہ کون کورا سے واقف ہوگا کہ وہ کتنی شیشہ ہے اور اُنھوں نے کس طرح ریشم میں اُسے محفوظ رکھا ہے۔ اُنھیں اندازہ ہوگا جس دن اُنھوں نے کسی اور کے بارے میں کورا سے کچھ کہا تو وہ اُسے کھو دیں گے چنانچہ وہ کسی ایسے دن کے شدت سے منتظر ہوں گے جب کورا کی استقامت میں خود ہی لغزش آجائے مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے کورا کا ارادہ اُس کی رگوں میں اور رچ بس رہا ہوگا۔ کسی درخت کی طرح

نواب ثروت یار کے پاس کتنی ہی دولت ہو اور مولوی صاحب اُسے کتنا ہی لائق آدمی سمجھتے ہوں، کورا کا اقرار بھی تو ضروری ہے۔ مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ فیصلہ کرنے والے صرف مولوی صاحب نہیں ہیں۔ اصل فیصلہ کورا کا ہوگا۔ اُس کی آنکھیں تو مجھی کو ڈھونڈتی ہوں گی۔ میرے خواب دیکھتی ہوں گی۔ میری طرح اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کہتا ہوگا۔ وہ بھی آہٹوں پر چونک پڑتی ہوگی اور مولوی صاحب کا آسرا کیا، خود اُس کی امید اُس کی توانائی ہوگی۔ کیا معلوم کسی دن مولوی صاحب ہی کا پتھر پگھل جائے اور وہ جان لیں کہ کورا کا عزم کتنا توانا ہے۔ وہ اُسے اس لیے میرے سپرد کرنا نہیں چاہتے کہ میں سزا یافتہ ہوں اور اُس کے لیے موزوں نہیں ہوں لیکن جب اُن کے اعصاب جواب دینے لگیں گے تو مآل کار اُنھیں میری جستجو ہوگی۔ وہ مجھ تک پہنچنا چاہیں گے۔ میں اُن سے کہیں دُور نہیں بشرطیکہ وہ اسی نتیجے پر پہنچیں۔

میں بستر پر بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اردگرد کی کوئی خبر نہ رہی تھی مگر میں یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں کے لیے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ بیداری ہے یا کچھ اور ...... میرے سامنے ڈاکٹر کیلاش کی بہن رما کھڑی تھی۔ آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس بال کھلے ہوئے۔ تیز روشنی میں اُس کا چمپئی رنگ دمک رہا تھا۔ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں صرف وہی تھی۔ برآمدے سے شبنمی چاپ گزر رہے تھے۔ پھوار پڑنی بند ہو گئی تھی تاہم کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ "آپ یہاں بیٹھے ہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں بس ایسے ہی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ میں مخل ہوئی۔"

"نہیں۔" میں نے اپنے شانے سیدھے کیے اور مستعدی سے کہا "ایسے ہی اپنے آپ سے مخاطب تھا۔"

"سب سے آسان اور دلچسپ مشغلہ۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا رفیق وہ خود ہوتا ہے اور رقیب بھی۔ وہی خود کو سب سے زیادہ رُلاتا ہے، ہنساتا ہے۔ وہی اپنی سب سے زیادہ سنتا اپنی سُناتا ہے۔" میں سر جھکائے خاموش رہا تو بے تابی سے کہنے لگی۔ "کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ باقی سب کہاں ہیں؟"

"اندر اسی کمرے میں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"گیتا اور رانی سے جھوٹ بولنے کی کوشش۔"

"کیسا جھوٹ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"جو موت پر سب ایک دوسرے سے بولتے ہیں۔ جھوٹ ہمیشہ بُرا نہیں ہوتا۔ کبھی سچ بہت بے رحم ہوتا ہے۔ کبھی جھوٹ بہت معصوم۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "ایسے میں سب یہی کرتے ہیں۔ اور کریں بھی کیا۔"

"جھوٹ کا تعلق نیّت سے ہے۔"

"ہاں اور پھر سچ کا بھی۔" وہ پلکیں جھپکتے ہوئے بولی۔ "نیّت اچھی نہیں تو سچ لعنت ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اُس نے میری ہدایت پر عمل کیا
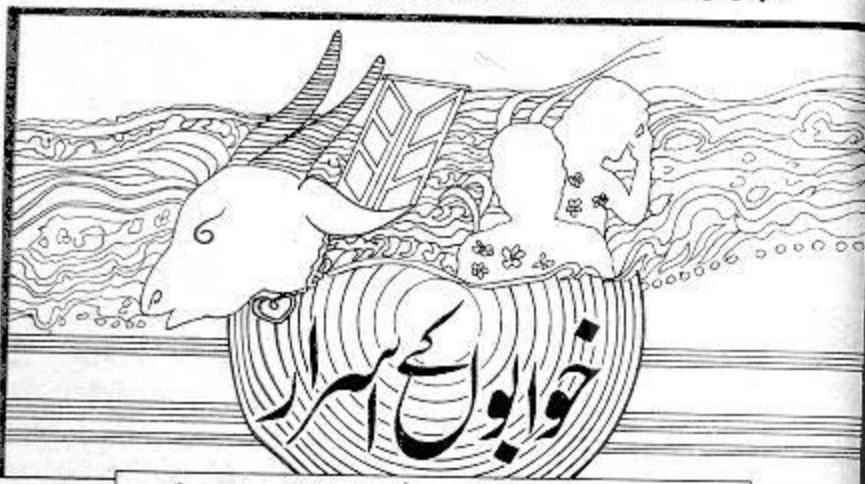
اور گہری سانس بھرنے لگی پھر آہستگی سے بولی "آپ کیسے ہیں؟"

"مَیں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔"

"کمال! چہرہ کیسا بجھا ہوا ہے۔ آپ تو ایک پڑھے لکھے، جوان اور مضبوط ارادے کے آدمی ہیں۔"

مَیں پہلو بدل کے رہ گیا۔

"کل بھی میں آپ کو دیکھتی رہی، پہچانے نہیں جاتے تھے۔"

"واقعہ ہی کچھ ایسا ہے۔ پرسوں رات آپ بھی جولین کے گھر تھیں۔ دادا کو آپ نے دیکھا ہو گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر بعد...."

میری آواز بھرّانے لگی۔

"مَیں نے انھیں دیکھا تھا اور اچھی طرح، زندگی سے بھرپور۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولی "کیلی نے بھی مجھے بتایا ہے کہ وہ کیسے آدمی تھے، کتنے اچھے دوست، بہادر اور.... گیتا اور اُس کی ماں رانی کو بھی اُس رات مَیں نے دیکھا تھا۔ دونوں پھولوں کی طرح لگیں۔ اُن کے چہروں کی خوشی بتا رہی تھی کہ دادا کیسے شوہر، کتنے اچھے باپ ہیں۔ یہاں سبھی الگ ہیں، بالکل نئے آدمی۔ میرے لیے تو یہ سب حیرت ناک ہے۔ مَیں آپ کو بتاؤں کیلی نے مجھے منع کیا تھا کہ آپ سے یا کسی سے گیتا کے باپ کے بارے میں، اِس سانحے کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں کہ یہ سب کیا ہے، کیوں ہوا، وہ کون لوگ تھے۔ اُس کا خیال ہے یہ ذکر تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ مجھے خود احساس ہے کہ نہ اِس کا یہ موقع ہے نہ یہ ضروری ہے لیکن آدمی کا دماغ سوالوں کا جنگل ہے۔ یہ سب دیکھ کے طرح طرح کے سوال سر اُٹھاتے ہیں۔"

"آپ سب کچھ خود جان جائیں گی۔"

"مگر اِس کی ضرورت نہیں۔" اُس نے شدّت سے کہا "ضروری نہیں کہ جوابوں کے بغیر ہم زندہ نہ رہیں۔ کتنے ایسے سوال ہیں جنھیں جانے بغیر ہم اِس دُنیا میں پوری زندگی کے ساتھ موجود ہیں اور شاید زندگی گزارنے کا یہ ایک نہایت آسان نسخہ ہے کہ کم سے کم سوال کیے جائیں یا کم سے کم جواب چاہے جائیں۔" وہ میری جانب مضطربانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور توقع کم رکھیے، ہر جواب کی کوئی توقع ہوتی ہے۔ ناقابلِ یقین جواب کی توقع کی جائے تو شاید سب ٹھیک رہتا ہے۔"

"جانے دیجیے۔" وہ سر جھٹک کے بولی "مَیں آپ سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اتنے دنوں بعد تو آپ یوں ملے ہیں۔ پھر یہ وقت نکل جائے گا۔ اِس سے پہلے کہ یہاں کوئی آجائے اور آپ سے بات ممکن نہ ہو سکے، مَیں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" مَیں نے پٹ پٹاتی نظروں سے پوچھا۔

"کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ مُسکرا کے بولی "آپ اُس دن گھر آئے تھے کیلی کے ساتھ تو بہت اچھا لگا تھا، پھر آپ کا انتظار رہا۔ مَیں نے کیلی سے کئی بار کہا بھی لیکن وہ ایک غیر ذمّے دار آدمی ہے۔ جہاں مَیں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں تو ضرور بتایئے؟ یہ مَیں رسمی طور پر نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" مَیں نے بہ عجلت کہا۔

"سُنتے ہیں کہ ایسے وقت میں دوستوں کا رُخ کرنا چاہیے۔ اُن کی چھاؤں درختوں کے مانند ہوتی ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اِس چھاؤں کی بڑی ضرورت ہے۔"

"چھاؤں کی کسے ضرورت نہیں ہوتی۔"

"اور لوگ کہتے ہیں، درختوں میں چھاؤں اتنی نہیں ہوتی جتنی آدمیوں میں ہوتی ہے۔"

"لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اور جانے کیوں، ہر درخت کی طرح ہر آدمی کی چھاؤں یکساں نہیں ہوتی۔"

"درختوں کی بھی یکساں نہیں ہوتی، کسی کی کم، کسی کی زیادہ، کسی کی گھنی، کسی کی چھدری اور کسی کی بالکل نہیں ہوتی۔ یہ درخت درخت کی توفیق پہ منحصر ہے۔"

"ہاں۔" وہ چمکتی آنکھوں سے بولی "اور لوگ گھنی چھاؤں کے درختوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ہر آدمی کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ کسی کی چھاؤں بہت گھنی ہوتی ہے پر لوگ اُدھر نہیں پھٹکتے یا لوگوں کو نظر نہیں آتی؟"

"ہو سکتا ہے۔" مَیں نے شائستگی سے کہا "اور کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سی چھاؤں کے لیے کتنا طویل سفر طے کیا، کتنے درخت پیچھے چھوڑ آئے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگی۔ مَیں نے اُس سے کہا "کسی کے اندر ہی بہت آگ جل رہی ہو تو چھایا کیا کرے گی۔"

"ہاں۔" اُس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہوئی۔ "بے شک یہ آدمی پر بھی منحصر ہے کہ اُسے کتنی چھاؤں کی ضرورت ہے۔ اُس کے اندر کتنی دھوپ ہے۔" وہ آدھی ہندستانی اور آدھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔ کچے کچے منہ سے پکّی پکّی باتیں نہایت انہماک سے۔ نفاست اور تپاک کے باوجود اُس کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، بے ساختگی تھی۔ یہ کلام کی بات ہے کہ وہ کتنا دل نشیں ہے۔ شروع میں اُس کی آمد پر مجھے گھبراہٹ سی ہوئی تھی لیکن اب اُس کی خلقی

جھجکتی آواز پر میرے کان مرکوز تھے اور مجھے ہلکا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ کہنے لگی "پر دو آدمی جب بھی ملتے ہیں ایک دوسرے کے لیے کسی نہ کسی قدر سایہ ضرور رکھتے ہیں۔ درختوں کا مقصود صرف سایہ کاری ہے، یہ مسافر کی مرضی ہے کہ آگے کتنا بڑا سفر درپیش ہے اور اُسے کتنی دیر ٹھیرنا ہے۔ درختوں کو غرض اپنی چھایا سے ہوتی ہے اور یوں اُنھیں اپنے وجود کا جواز مل جاتا ہے۔ کوئی کسی درخت سے پوچھے کہ اُسے سایہ دے کے کتنا سکون ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے، آدمی کے ساتھ بھی تو ایسا ہو سکتا ہے۔ آدمی بھی تو ایسے ہو سکتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ چونک سی پڑی اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "معلوم نہیں یہ باتیں آپ کو کیسی عجب لگتی ہیں لیکن مجھے آگے پیچھے کی ایسی تمیز نہیں آتی اور مَیں سمجھتی ہوں، آپ بھی اِس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔"

"نہیں نہیں، آپ تو بہت دل کش باتیں کرتی ہیں، خیال آفریں۔ آپ چھاؤں کی بات کر رہی تھیں۔ سچ پوچھیے تو مجھے اسی کا احساس ہوا۔"

"مجھے یہ جان کے خوشی ہوئی لیکن باتیں ہی نہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی "باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ مَیں ایک عملی آدمی ہوں۔"

"مَیں جانتا ہوں۔" مَیں نے جلدی سے کہا۔

"مَیں نے کئی بار آپ سے ملنے کا ارادہ کیا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن بس رہ گئی۔ آپ کا جی نہیں چاہا؟"

"چاہا۔" مَیں نے جھجکتے ہوئے کہا "پر اُدھر مہلت ہی نہیں ملی۔"

"میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ ہم مرحلوں کے محتاج کیوں ہوتے ہیں۔ ہم تمام مرحلے ایک ہی جست میں کیوں طے نہیں کر لیتے۔"

"مجھے یاد آرہا ہے یہ بات آپ نے پہلے بھی کہی تھی۔"

"مجھے رسوم و آداب کبھی نہیں بھاتے۔ یہ زندگی مشکل کر دیتے ہیں۔"

"لیکن ہم سب اِن سے مشروط ہیں۔"

"مگر کیوں؟ ہم پہلے مرحلے میں آخری مرحلے کے دوست کیوں نہیں بن سکتے۔"

"کیوں نہیں بن سکتے، لوگ بن جاتے ہیں۔"

وہ کہیں کھو سی گئی، مَیں بھی اُسے گُنگ نظروں سے دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بے چینی سے کہنے لگی "لیکن ہاں، ایک اہم بات میرے ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ضروری ہے دونوں شخص ایک ہی کیفیت سے دوچار ہوں۔ ایک شخص کو جلدی ہے، دوسرے کو نہیں، ایک کا تاثر کچھ اور ہے، دوسرے کا کچھ اور۔ مثلاً مَیں نے آپ سے جو شدید تاثر لیا ہے، آپ نے، ہو سکتا ہے، اِس طرح

مجھے محسوس نہ کیا ہو۔"

"جی، جی ہاں، مگر مگر۔" میری زبان لکنت کرنے لگی۔

اُس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ کہنے لگی "بعض اوقات مراحل عذاب بن جاتے ہیں۔ یہ زندگی کو بوجھل کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ اِن کی تاب نہیں لا پاتے اور دُور ہو جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آدمی کا ایک دوسرے پر اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ آدمی کو آدمی سے بہت تلخیاں ملی ہیں اس لیے وہ ترازو لیے پھرتا ہے۔ وہ بہت محتاط ہو گیا ہے یا یہ کوئی خوف ہے یا اِس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کسی انسانی قدر کی پاس داری کر رہا ہے، وضع نبھا رہا ہے اور کسی عہد و پیمان کی گرفت میں ہے۔ ہر پیمان ایک دوسرے کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے۔ کسی کے مفاد پر ضرب نہ پڑتی ہو تو پیمان پر کہاں ضرب پڑی۔ پھر ایک ایسا پیمان، ایسا جبر آدمی خود پر کیوں مسلط کرتا ہے جس میں تیسرے آدمی کا داخلہ ممنوع ہو جب کہ تیسرا آدمی بھی ایک حقیقت ہے اور موجود ہے۔ کیا یہ دُنیا محض دو آدمیوں کے لیے ہے؟ تیسرے کی شرکت اس کا انتظام بگاڑ دیتی ہے؟ یہ کون سی انسانی قدر کی پاس داری ہے جس میں تیسرا، چوتھا یا پانچواں شخص نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیا درخت کی چھاؤں صرف ایک شخص کے لیے ہے۔ ایک ہی شخص کے پاس رہتا ہے؟ زندگی تو ایک مستقل مسافت ہے۔ درمیان میں ہزار منزلیں، ہزار آدمی، ہزار چیزیں ہیں۔ دو آدمی زیادہ تحفظ اور سکون سے رہ سکتے ہیں۔ دو آدمیوں کی خلوت دُنیا کی بہترین راحت ہے، مگر کیا ساری زندگی کے لیے؟ کیا ایک شخص متعدد لوگوں کو مطلوب نہیں ہو سکتا؟"

مَیں نے جواب دینا چاہا لیکن خاموش رہا کہ اُس کا سلسلہ نہ ٹوٹ جائے۔ کوئی بپھری بپھری سی لہر متلاطم تھی۔ وہ تیز تیز انگریزی میں باتیں کر رہی تھی، کھنکتی، چہچہاتی، چہکتی آواز میں۔ کہتے ہیں حلق تو آواز کا صرف وسیلہ ہے، آواز میں تو سارا بدن شامل ہوتا ہے۔ بدن کا انگ انگ جیسے اُس کی آواز میں شامل تھا۔ مَیں سُنتا رہا۔ کہنے لگی "کبھی کبھی مَیں سوچتی ہوں ایسی کیا بات ہے، یہ کیسا گورکھ دھندا ہے، کیسا تماشا ہے۔ آدمی کی سرشت جستجو ہے مگر یہ کیا ہے کہ وہ تجربے سے بھی گریزاں ہے۔ وہ اتنا دُور دُور کیوں رہتا ہے، لوگوں کے پاس کیوں نہیں آتا، اُن کا مشاہدہ، اُن کا جلوہ کیوں نہیں کرتا۔ مَیں اکثر یہ سوچتی ہوں اور اپنے طور پر طرح طرح کے نتیجے اخذ کرتی رہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، ایک ہی شخص سے کسی کا جی سیر نہ ہوا ہو، ایک شخص کا طلسم بڑا ہے۔ ایک شخص کی دریافت سے کوئی نہ نکلا ہو یا اسرار کھول نہ پایا ہو، وہ زخم خوردہ ہے یا اپنی انا کا اسیر ہے۔ کوئی شخص آتا بن گیا

ہے وہ اعلا درجے کے ترکِ ایثار پر کمربستہ ہے یا پھر وہ مستقل تلاش میں ہے۔ آہ وہ شخص کیسا خوش نصیب ہے جو اتنے لوگوں کے ہجوم میں مرکز و محور قرار پایا۔ جواب تو مل جاتے ہیں یا میں اپنی آسودگی کے لیے انھیں تراش لیتی ہوں، قیاس کر لیتی ہوں لیکن میرا مقصد کچھ اور ہے۔ یہ کیوں طے کر لیا گیا کہ درمیان کے چھوٹے چھوٹے سالوں سے آدمی کنارہ کیے رہے۔ ہو سکتا ہے یہی راستے کبھی اپنا دائرہ بڑھا لیں اور سفر تیز کرنے اور کسی مطلوبہ منزل تک جلد پہنچنے کا سبب بن سکیں اور میں کہنا چاہتی ہوں کہ دوسرے محض غاصب نہیں ہوتے، رہزن یا کم نگاہ۔ بوٹ کلب میں مجھے طرح طرح کے لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک شائستہ پرست لڑکی کسی مکمل شخص کی تلاش میں اپنے خواب ناک دن گنوا رہی تھی۔ وہ پابندی سے کلب آتی اور اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ وہ اپنے خیال و تصور میں اتنی دور جا چکی تھی کہ شاید اس کے سوا کسی کی رفاقت اُس کے لیے چھوت کی بیماری کے مانند تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اُس نے بہت دلچسپ جواب دیا۔ خبر ہے اس نے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اُس نے کہا، اُسے درمیان میں ٹھہر جانے اور منتشر ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہے۔ تعبیر ادھوری رہ جانے کا ڈر، تصویر نا تمام رہ جانے کا خوف۔ میں نے کہا کہ یہاں کون درجۂ کمال پر فائز ہے اور تکمیل سے کیا مراد ہے اور انسان تو لمحہ لمحہ بدلنے والے عناصر کا مرکب ہے اور تم خود کس منتہائے کمال کی دعوے دار ہو۔ حسن کوئی کمال نہیں، نقش و نگار کا دل آویز تناسب، رنگ و روپ سب حسنِ کامل کا ایک رُخ ہے۔ وہیں مجھے ایک اور لڑکی ملی۔ اُس کے ہاں ایک اور نفسی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ اُس پر مضحکہ خیزی کی حد تک ایک اندیشہ طاری تھا کہ رفاقت اتنی جاں فزا نہیں جتنی جدائی جاں سوز ہوتی ہے۔ لوگ جدا ہو جاتے ہیں اور پھر عذاب نازل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے بدلنے کو بھی جدائی سے تعبیر کرتی تھی۔ لوگوں کا بدل جانا بھی اُس کے خیال میں جدائی کے سانحے سے کم نہیں تھا۔ وہ بے شک لوگوں سے تپاک سے ملتی تھی مگر طنابیں کھینچ کے۔ عقل و ہوش کی بات ہوتی تو ٹھیک تھی، اُس کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اُس نے شدید قسم کی رفاقت کا کوئی تجربہ نہ کیا ہو یا اس بے پناہ انسانی جذبے سے نا آشنا ہو مگر وہ اپنی وارفتگی و شیفتگی کسی متاع کی طرح اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے، زندگی کوئی دکان نہیں جس پر گاہک آیا، چلا گیا۔ جس رفاقت میں آدمی ہمہ جاں شامل نہ ہو وہ سراب ہے۔ مہرباں لمحے آنے والے کڑے وقت کی مآل اندیشی میں کیوں گنوا دیے جائیں۔ یقیناً ہر شخص اعلا درجے کی رفاقت کا متحمل نہیں ہوتا۔ آدمیوں کے ظرف ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اُسے قریب آنے دیا جائے مگر کوئی ہم زباں کبھی مل جائے جس میں ردِ آشنائی کا وصف اور چند قدم ساتھ چلنے کی استطاعت ہو تو اُس کے ساتھ رُتے کا بَل جھر کرنے کے مترادف ہے۔ یہ منافقت ہے، خود سے منافقت۔ اور میں نے کہا کہ کل تو ہمیشہ سے بے اعتبار ہے۔ آدمی کی وسعت ہمیشہ پھیلتی رہتی ہے۔ آدمی جُدا ہوتے رہتے ہیں اور شاید آسمان سے نہیں اُترتے، اُترتے ہیں تو زمین پر بہت گرد و غبار ہے۔"

وہ کہتی رہی اور میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ یہ اُس کے بیان ہی کا لطف نہیں تھا، کچھ اور بھی تھا جو مجھے مبہوت کیے ہوئے تھا۔ کہنے لگی، "کلب میں ایک نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ تعلیم یافتہ، وجیہ اور ایک اچھے خاندان کا حوالہ رکھتا تھا۔ اُس سے کوئی بچھڑ گیا تھا اور اُس کے انتظار میں اُس نے گویا جوگ لے لیا تھا۔ وہ شائستگی سے لوگوں سے ملتا تھا مگر اُس شائستگی میں ایک عجب نخوت اور اجنبیت تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اُس نے زندگی کے حاشیے پر چلنا کیوں شروع کر دیا ہے۔ اِس گریز میں کیا رمز ہے؟ اُس نے جو جواب دیا وہ تصوری تھا۔ اُس کی بات میری سمجھ میں آئی اور مجھے اچھی بھی لگی، سنسنی خیز سی۔ اُس نے کہا، میں جس شخص سے مخاطب ہوں وہ محض ایک جسم، ایک خول ہے، اُس کی رُوح اُس سے جدا ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا کیا اُس کے دوبارہ ملنے کا امکان ہے۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ کون جانے۔ مجھے اُس سے بہت ہمدردی ہوئی۔ میں نے اُس کی دل داری کی کوشش کی لیکن وہ اپنے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر میں نے اُس سے کنارہ کر لیا۔ میں نے جانا کہ میری موجودی میں اُس کے بادل گرجنے لگتے ہیں، اُس کی آنکھیں اُمڈ آتی ہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے اُس سے کہا تھا کہ یہ کائنات اتنی مختصر نہیں ہے۔ کہنے لگا تمھیں کوئی ملے تو جانو کہ کتنی بڑی ہے۔ میں نے کہا، میں سمجھنا چاہتی ہوں۔ کہنے لگا، یہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ کوئی کبھی ملے گا تو خود بخود سمجھ میں آ جائے گا کہ اِس آگ میں کیسا نشہ ہے۔ میں نے کہا مگر یہ تو فنا کا راستہ ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اسی کی تو اُسے آرزو ہے۔ وہ بہت شراب پینے لگا تھا۔ میں نے روکا تو بولا، "آگ اور بڑھ جاتی ہے۔" اُس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ کلب سے ناغے کرنے لگا۔ پھر ایک دن کسی طرف نکل گیا۔ کہاں؟ کیا خبر۔ میں نے اِس سلسلے میں اُس کے ایک عزیز سے پوچھا تھا۔ جواب ملا، دیوانہ کہاں جائے گا۔"

میری رگوں میں خون رکنے لگا تھا۔ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں سُنا رہی ہے؟ ایسا لگا جیسے وہ مجھے آئینہ دکھا رہی ہو۔ اس نے جان بوجھ کے کلب کے ایک نوجوان کا افسانہ تراشا ہے اور اُن دو لڑکیوں کا ذکر بھی دانستہ اسی سیاق و سباق میں کیا ہے۔ میں نے کہنا چاہا کہ اُس کی داستانیں نہایت نا تمام ہیں۔ دنیا میں اتنا ہی نہیں ہے جتنا اُس نے جانا ہے۔ اس سے بہت سوا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ آدمی کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسی گرہ یا ذہنی کجی نہیں۔ جانے کیا ہے، کون کس موڑ پر مل جائے۔ یہ تو آدمی کے ملنے پر ہے اور زندگی پر ہے کہ وہ کس سے کیسا برتاؤ کرتی ہے۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ وہ تو بالا اپنے آپ میں گم تھی۔ اُس کی سیاہ لٹیں شانوں پر جھول رہی تھیں اور پھول جیسے چہرے پر یاسیت اور تاسف کی دُھند چھائی ہوئی تھی، جیسے چاندنی ٹھٹھکی ہوئی ہو۔ نوجوان کے ذکر پر اُس کی آنکھیں بھاری ہو گئی تھیں، آواز بھی بکھر گئی تھی۔ اُس کا انداز بھی خود کلامی کا سا تھا۔ اس میں کسی تردد اور پشیمانی کی کیا بات ہے؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ میں نے اُس کی صاف بیانی اور بے باکی اپنی سبکی پر کیوں محمول کر لی؟ یہ میری اپنی کدورت ہے، اپنا اکراہ ہے، جو میری رگیں کھنچنے لگی ہیں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جسے اشاروں اور کنایوں کی ضرورت پڑے۔ وہ میرے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتی ہوگی؛ اسے بتائے گا بھی کون؟ وہ ایک ذہین و فطین لڑکی ہے اور اس نے میرے چہرے پر لکھا ہوا کچھ پڑھ لیا ہے۔ اس کے خیال میں میری مستقل سرگرانی و سرگشتگی کا سبب یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ سو یہ رویّے کی خیرات نہیں، معذوروں اور مفلوجوں سے خوش خصال لوگ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ میرے کتنے ہی درد مند مجھے میرے سوال اور کسی کشکول کے بغیر اسی نرمی اور گداز کی بھیک دیتے ہیں اور مجھے مزید ناتواں اور ہلکان کر دیتے ہیں۔ پہلے مجھے رما کی باتوں پر اسی خیرات کا گمان ہوا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ تو دلیلیں دے رہی تھی۔ اُس کے اظہار میں تو بہت انکسار اور تپاک تھا۔ وہ ایک حسین و جمیل لڑکی، یہ اس کا التفات، اس کی عنایت ہے کہ اتنے لوگوں کے درمیان سے اُٹھ کے میرے پاس آ کے بیٹھی ہے اور اپنے ریشم اپنی چھاؤں سے میری دھوپ کم کرنے کا جتن کر رہی ہے۔ میری اور اس کی شناسائی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے لیکن اُس کے بہ قول شناسائی میں مدت کی شرط کب ہوتی ہے اور مرحلوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی نقش مٹا دینے کو کب کہہ رہی ہے یا اُس سے انکاری ہے۔ وہ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔ اِس سے زیادہ کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور کسی کو کسی سے اتنی غرض کہاں ہوتی ہے۔

میرا جی اُس کے لیے بہت اُمڈا۔ ایک لحظے کے جی میں آئی کہ اُٹھ کے اُسے سینے سے لگا لوں اور بتاؤں کہ کلب کا نوجوان تم نے جس آگ کا ذکر کیا ہے، وہ اُس نے طنزاً کیا ہوگا۔ لوگوں نے طرح طرح کے نام دے دیے ہیں مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ آگ تو بینائی جھلسا دیتی ہے۔ یہ کوئی نظریہ یا عقیدہ نہیں جس پر اصرار کیا جائے۔ یہ تو اپنی بقا کا اصرار ہے۔ بے شک زندگی ایک فرد سے دوسرے فرد تک نہیں رکی مگر ایک فرد ہی راستہ بن جاتا ہے، راستہ بھی وہی، منزل بھی وہی۔ دو آدمی مل کے کبھی ایک بن جاتے ہیں۔ ایک شخص پہلے سے دوسرے کا جزوِ جاں بن جائے تو دوسرا کیا کرے۔ اُس کا اختیار تو چھن جاتا ہے۔ کوئی فنا نہیں چاہتا مگر راستہ دوسرا نہیں دکھائی دے تبھی تو۔ میں اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے تحمل کیا۔ اُس نے کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا، نہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ وہ تو خود تائید طلب تھی اور اپنی دانست میں چارہ گری کے طور تجویز کر رہی تھی اور اُس کا لب و لہجہ وہی تھا، نرم و لطیف، مترنم اور دل سوز۔ میری ترخ اندازی سے اُس میں شکن پڑنے کا احتمال تھا، اس لیے میں بس سنتا رہا۔

پھر کیلاش کی آواز پر سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔ رما بھی اچھل پڑی اور خجل خجل سی ہو گئی۔ کیلاش برآمدے سے آوازیں لگاتا ہوا ایک ہمارے سامنے آ گیا اور شکایت جیسے انداز میں رما سے کہنے لگا، "تم یہاں کب سے بیٹھی ہو؟" دوسرے ہی لمحے اُسے میری موجودی کا خیال آ گیا۔ اُس نے پیشانی کے بل صاف کرنے کی کوشش کی اور جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ یہ فتنہ انگیز کب سے یہاں بیٹھی ہے۔

میری نگاہیں رما کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے نرمی سے کہا، "پہلے تمھیں مخل ہونے کی معذرت کرنی چاہیے۔" رما چہکتی آواز میں بولی۔

کیلاش سچ مچ معذرت کرنے لگا۔ میں نے اُسے تسلی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور اپنی اُلجھی ہوئی سانسیں ہموار کرتا رہا۔ "یقیناً اس شریر نے غیر متعلق باتیں کی ہوں گی؟" اُس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں نے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن نہایت دل نواز اور فکر انگیز باتیں کر رہی تھی۔ اس سے زیادہ متعلق باتیں ممکن ہی نہیں تھیں۔

"پھر تو میں واقعی مخل ہوا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "کیا گفتگو ہو رہی تھی؟"

"تمھارے بارے میں نہیں تھی۔" رما نے چہکتی آواز میں کہا، "کچھ آدمیوں کے بارے میں۔"

"شکر ہے، تمھیں آدمیوں کی باتیں کرنا تو آئیں۔"

اُس کی برجستگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ دونوں بھی کھِل کھلا اُٹھے۔ کیلاش کہنے لگا: "مجھے آپ کے چہرے پر شگفتگی دیکھ کے یقین کیجیے بہت خوشی ہوئی۔" میں اُسے صرف دیکھ کے رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں اسی خوشی کی غماز تھیں۔

"تم پھر احساس دلا رہے ہو۔" رما نے اُسے ٹوکا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" کیلاش نے فوراً تردید کی اور حسرت آمیز لہجے میں بولا: "آپ ایسے ہی رہیے، ایسے ہی خوش خوش۔ میں تو ڈر رہا تھا۔ یہ رما میری باؤلی بہن اکثر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی ہے مگر آج تو مجھے اپنے دیکھے پر یقین نہیں آ رہا۔ آج تو اس نے کمال کر دیا۔"

"اِن میں بہت خوبیاں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو دردمندی ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو میں اپنی محفوظ رائے پر نظرِ ثانی کروں گا۔" کیلاش نے چہک کر کہا۔

"نہیں نہیں، تمھیں ملال ہوگا کہ تم نے کتنی دیر بعد یہ فیصلہ کیا بلکہ بعد از وقت۔" رما نے جواب دینے میں ایک لمحے بھی تامل نہیں کیا۔

کیلاش سے کوئی بات نہ بن پڑی یا اُس نے میرے خیال سے نوک جھونک جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں میں فقرے بازی خوب ہوتی ہے۔ میں نے کیلاش سے کہا کہ اُس کی بہن کئی اعتبار سے ایک منفرد لڑکی ہے۔

"انفرادیت تنہا کر دیتی ہے۔"

"اور ممتاز بھی...." میں نے کہا۔

"ایسا نہ کہیے، یہ اور سرکش ہو جائے گی۔"

میرے منہ پر فقرہ آیا کہ کہوں پھر تو اور دل کش ہو جائیں گی مگر میرے ہونٹ بس پھڑک کے رہ گئے۔

"لگتا ہے آج اسی کی باری تھی۔ یہی بولتی رہی ہے۔" کیلاش نے تیکھی آواز میں مجھ سے پوچھا: "کیا زہر اُگل رہی تھی؟" پھر اُس نے دلکش نظروں سے رما کو دیکھتے ہوئے بعجلت ترمیم کی: "میرا مطلب ہے کیسی گل افشانی...."

"بہت کچھ...." میں نے گہری سانس لی۔

"یہ آپ سے ملنے کو بہت بے تاب تھی۔ آج اسے موقع مل گیا۔ میں سمجھ رہا تھا، یہ اندر کسی کمرے میں ہے۔ جولین سے پوچھنے پر مجھے یہی تاثر ملا تھا۔ دیر ہو گئی تو مجھے بے چینی ہوئی کہ یہ کہیں آپ کے پاس نہ پہنچ گئی ہو اور ایسے وقت اپنی نکتہ طرازیاں نہ بگھار رہی ہو، حالانکہ اُدھر منیر علی صاحب کچھ اپنے کچھ پرائے قصے سنا رہے تھے۔ گیتا اور رانی کی دل دہی کی خاطر سبھی متوجہ تھے مگر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ میں نے اُن سے معذرت کی اور اسے اندر ڈھونڈتا ہوا یہاں آنکلا اور میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔"

"تم نے جولی سے پوچھ لیا ہوتا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں بلکہ اُسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔"

"جولین نے؟...." میں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں، وہ وہاں مصروف تھی۔" رما سادگی سے بولی: "اُسے احساس تھا کہ آپ یہاں تنہا بیٹھے ہیں۔"

"تو کیا وہ محض جولین کی فرستادہ تھی اور ایک مہربان مہذب لڑکی کی طرح کوئی فرض نبھا رہی تھی؟ جولین نے اس سے کچھ اور بھی کہا ہوگا۔ کیا کچھ کہا ہوگا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ ایسا تھا تو جولین خود بھی آ سکتی تھی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟" رما نے شاید چہرے سے میرے سینے کی گھٹن محسوس کر لی۔ اُس نے وضاحت ضروری سمجھی اور بے تابانہ بولی: "میں آپ ہی کو دیکھنے کے لیے وہاں سے اُٹھی تھی۔ اتفاق سے جولین اندر مل گئی اور اُس نے جیسا کہ کہتے ہیں، میرے منہ کی بات چھین لی۔"

ابھی کیلاش نے کہا تھا، جولین سے استفسار پر اُسے تاثر ملا تھا کہ رما اندر کسی کمرے میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جولین نے کیلاش کو دخل اندازی کے خیال سے جان بوجھ کر نہیں بتایا ہوگا۔ وہ خود بھی اسی لیے نہیں آئی اور شاید اُسی نے کسی کو اس طرف نہیں آنے دیا۔ کسی نے کچھ پوچھا ہوگا تو اُس نے کوئی بھی عذر کر دیا ہوگا۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" کیلاش کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ میں اُسے کیا بتاتا۔ اپنی کیفیت خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی۔ یہ ندامت کا کوئی احساس تھا یا اپنی بے چارگی کا یا گراں خوابی کا۔

"آپ کہیں کھو سے گئے؟" کیلاش نے اُداسی سے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" رما چپکے سے بولی۔

"کیا، کیا بات ہے؟" کیلاش مضطرب ہونے لگا۔

"تمھارے سمجھنے کی نہیں ہے۔" رما شکستہ لہجے میں بولی۔

"غالباً مجھی سے کوئی بھول ہوئی۔" کیلاش کی آنکھیں بجھنے لگیں۔ "میں مخل ہی ہوا اگر یہ سانحہ تو گزر چکا۔"

رما نے کوئی تکلف نہیں کیا، کہنے لگی: "آہ کاش تم ابھی نہ آتے۔ رات گزر جاتی اور ہم ایک...."

اُس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے شرمندگی کا اظہار کیا۔ میں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ رما جولین کی سفارش پر آئی تھی یا

از خود، یہ شرافت و شائستگی تھی یا از خود رفتگی۔ دونوں صورتوں میں اصل مقصود میری دل بستگی تھی ورنہ نیت میں کیا ابہام ہے۔ مجھے آخر کیا مطلوب تھا جس کی محرومی میرے سینے میں سوزش کا سبب بنی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اپنے گھر سے دُور، اپنے مشاغل سے کنارہ کیے میری خاطر یہاں بیٹھے ہیں اور مسلسل میری جستجو میں لگے ہیں۔

مجھے خود کو یکسو کرنے میں دیر نہیں لگی کیونکہ یہ فیصلہ نہایت آسان تھا کہ مجھے اِن کی نوازش پر بہر صورت شکر گزار ہونا چاہیے اور اپنی کبیدگی، اپنی خلش خود تک محدود رکھنی چاہیے۔ میری آزردہ خاطری سے اُن کی آنکھیں کملانے لگی تھیں۔ اپنے اس تیور کا کوئی استحقاق مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے کیلاش سے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، میرا کچھ یہی ہے۔ مجھے یوں ہی بیٹھے بٹھائے کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا، دخل اندازی کیسی؟ ہم تو یہی دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ رما اپنے کلب کے مشاہدات سنا رہی تھیں اور جیسا کہ میں نے کہا، وہ سب کچھ نہایت دل نشیں تھا۔

"اور میرے آنے سے ختم ہو گیا؟"

"ختم تو کسی وقت ہونا ہی تھا، اب نہیں تو کچھ دیر بعد۔"

"ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔" رما نے اُداسی سے کہا: "کوئی نہ کوئی حارج ہو جاتا ہے، کبھی وقت کبھی موسم۔ زندگی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ شاید زندگی اور موت میں یہی امتیاز ہے۔ ایک مسلسل تغیر ہے، ایک مسلسل سکوت۔ موت شاید سب سے بڑا سکون ہے۔"

"پتھر کا سکون۔" کیلاش نے کہا اور مچلتے لہجے میں بولا: "ایک بات کہوں آپ سے؟"

"کیا بات ہے؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"آپ چند دن ہمارے ساتھ، ہمارے گھر چل کے کیوں نہ رہیں، کیوں کیا؟"

"اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" رما کی آواز سے سرشاری جھلک رہی تھی۔

"یہ، یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں ممکن نہیں۔ یہاں بہت لوگ ہیں گیتا اور رانی جی کو دیکھنے کے لیے، اور پھر ہم کسی دور کے شہر تھوڑی جا رہے ہیں۔ کسی وقت بھی جب بھی آپ چاہیں یہاں آ سکتے ہیں۔ دن میں دو بار، تین بار۔ اس تبدیلی سے دیکھیے کتنا اثر پڑے گا۔ رما کی داستانیں کبھی ختم نہیں ہوتیں، ورق پلٹتے جائیے۔ یہ ایک بہترین نگراں اور منتظم بھی ہے۔ ویسے بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔ اسے چارہ گری ہی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے ہمارے ہاں چل کے آپ خوش ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کیسے؟.... یہ کیسے ممکن ہے۔" میں نے اُسے کچھ اور نہیں کہنے دیا: "میں کیسے کہیں جا سکتا ہوں۔ یہاں رہنا میرے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لیے۔ گیتا اور رانی بھابی بہت برداشت کا ثبوت دے رہی ہیں لیکن اپنے دل کا حال وہ خود ہی جانتی ہوں گی۔ اس وقت تو سبھی کو ان کے سامنے رہنا چاہیے اور ابھی ابھی تو مجھے کئی کام کرنے ہیں۔ ابھی تو دادا کے خون...." میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"دادا کا خون!" کیلاش بے قراری سے بولا: "آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا: "ابھی دادا کے بہت سے معاملات بھی نمٹانے ہیں۔" اُس نے تکرار نہیں کی، کسمساتا رہ گیا۔

"نہیں کیلی!" رما مایوسی سے کہنے لگی: "یہ ابھی مناسب نہیں ہے۔"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔ دیر تک خاموشی رہی۔ رات ہو گئی تھی۔ میں نے یاد دلایا کہ اُنھیں گھر بھی جانا ہوگا۔ میری وجہ سے وہ نہ ٹھہریں، گھر میں بھی اُن کا انتظار ہوگا۔

"جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔" کیلاش بے ساختہ بولا: "ممی سے ہم کہہ کے آئے تھے۔ موٹر باہر کھڑی ہے۔ کسی وقت بھی چلے جائیں گے، ہاں اگر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، نیند کہاں۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"پھر چائے کیوں نہ پی جائے۔" کیلاش بچوں کی طرح ہمک کے بولا۔

"میں اندر دیکھتی ہوں کہ کیا صورت ہے۔" رما فوراً اُٹھ گئی۔ کیلاش میرے پاس بیٹھا زمین کرید رہا، پھر زیرلبی سے بولا: "دادا کے قاتل کا کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں، چل جائے گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مناسب ہو تو مجھے کچھ بتائیے۔" اُس کا لہجہ التجائی تھا۔

"چھپانے کے لیے اب رہا بھی کیا ہے۔"

"میں اور بھی جاننا چاہتا ہوں، آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"میں بھی خود سے یہی پوچھتا ہوں مگر جو بھی ہے یا جو بھی ہیں، اُن کے پاس بھی وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"یقیناً۔" وہ بے چینی سے بولا: "وہ زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکیں گے۔ مآلِ کار اُنھیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا ہے۔ یہ میں بھی سمجھتا ہوں۔ گیتا اور رانی جی کے چہرے دیکھ کے جی کرتا ہے، جیل کچہری، سزا، انصاف تو دور کی بات ہے، اُنھیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔"

"یہی ہوگا۔" میری آواز اکڑ گئی تھی۔

"میں نے سوچا تھا کہ اس سلسلے میں آپ کو ذرا بھی پریشان نہیں کروں گا لیکن بس خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ طبیعت بحال ہو تو مجھے کچھ اور بتایئے؟"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، چھوڑیے، کسی اور وقت سہی....."

"پیرو دادا بمبئی کا سب سے بڑا دادا کہا جاتا تھا۔"

"میں نے سُن لیا ہے مگر جس دادا کو میں نے دیکھا ہے وہ سراپا محبت تھا۔"

"مگر وہ پاڑے کا مشہور دادا ہے ساری بمبئی اور آس پاس کے شہروں میں سبھی اُس کے نام اور چاقو سے واقف تھے۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہوا ہے۔ ارتھی کے ساتھ امڈتے لوگ میں نے خود دیکھے تھے، وہ بُری طرح رو رہے تھے۔ اُن کے درمیان ہونے والی بہت سی چہ میگوئیاں میرے کانوں میں بھی پڑی تھیں۔ سب مشتعل تھے۔ میں نے ایسے واقعات پر مشتمل جھوٹی سچی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں۔ یورپ میں یہ واقعات عام ہیں اور جتنے عام ہیں اتنی ہی پولیس کی گرفت مضبوط ہے۔ اگر سامنے کوئی سُراغ نہیں ملتا تو وہ پہلے محرک پر توجہ دیتے ہیں۔"

"پاڑے کے دادا کا سب سے بڑا محرک خود پاڑا ہے۔"

"تو کیا وہ پاڑے سے متعلق آدمی ہو سکتے ہیں؟"

"دوسرے کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"ہاں دوسرے بھی پاڑے سے کبھی کوئی گھاٹا اُٹھانے والے، پاڑے کے آداب و قواعد سے زک پانے والے لوگ۔" وہ تیزی سے بولا۔ "میں نہیں جانتا سُنا ہے پاڑے کے اپنے لگے بندھے اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔"

"کہاں نہیں ہوتے۔"

"میں نے پاڑا کبھی نہیں دیکھا، سب سُنا سنایا ہے یا کتابوں میں اس بابت کچھ پڑھا ہے۔ میرے ذہن میں میں آپ سے کیا کہوں، پاڑے اور پاڑے سے متعلق لوگوں کا تصور میرے لیے بہت عجیب اور مختلف تھا لیکن یہاں تو....."

اُسے اپنا مدعا بیان کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ "اچھوت سمجھتے تھے۔"

"ہاں کچھ یہی، میں آپ کو سچ بتاؤں، کوئی اچھا تصور ذہن میں نہیں تھا۔ دھاندلی، زور، ظلم، چاقو یہی کچھ لیکن یہاں یہ سب دیکھ کے کہنا چاہیے کہ سب جھوٹ سا لگتا ہے۔ اپنی آنکھوں کا دھوکا، یہ بہت ناقابلِ یقین ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

شاید یوں ہے کہ ہم ایک ہی حوالے سے آدمی کو شناخت کرنے کے عادی ہیں مگر زندگی تو گوناگوں ہے۔ ہم ایک ساتھ کئی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ تقریباً ہم سبھی بازار میں کچھ اور گھر میں کچھ اور، سوچ میں کچھ اور اندر کچھ باہر کچھ۔ پاڑے کے لوگ بھی آدمی ہوتے ہیں، بگڑے ہوئے، سنبھلے ہوئے، خانوں میں بٹے ہوئے مگر تم جو یہاں دیکھ رہے ہو تمام ایسا ہی نہیں ہے وہ بھی ہے جس کا تصور تمھارے ذہن میں ہے۔ ایک ہی آدمی میں بڑے فاصلے ہو سکتے ہیں۔"

"مگر اچھائی اور بُرائی کا ایک جوہر تمام فاصلوں میں رہنا چاہیے، کیا ہر فاصلے پر جوہر بدل جاتا ہے۔ بہر حال میں اب پاڑے کے لوگوں سے سہما ہوا آدمی نہیں ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے آپ مجھے پاڑے لے چلیں۔"

"کیا کرو گے وہاں جا کے۔"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں قریب سے دیکھنا پھر کبھی کسی مناسب وقت۔"

"وہاں یہی لوگ ہوتے ہیں۔ پاڑے سے دور ہی رہنا ٹھیک ہے۔"

"میں پاڑے میں شامل کب ہو رہا ہوں۔"

"تم شامل بھی نہیں ہو سکو گے، ہر شخص پاڑے کا آدمی نہیں بن سکتا۔"

"آپ سے بہت سی باتیں جاننے کو دل مچلتا ہے، میں سمجھتا ہوں اس کا یہ موقع نہیں ہے اور سوچتا ہوں کہیں یہ دخل در معقولات تو نہیں، میں تجاوز تو نہیں کر رہا ہوں؟"

"تم تو اسی گھر کے فرد معلوم ہوتے ہو۔"

"میرے لیے یہ عزت ہے۔ میں بہت کچھ نہیں جانتا لیکن یہ سب لوگ کیسے سادہ اور کیسے دل پذیر ہیں۔ کیلاش سے تو میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ لگتا ہے ہم نے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔" میں نے کچھ نہیں کہا، اُس نے بھی چُپ سادھ لی مگر چند ہی ثانیوں بعد وہ بے کلی سے بولا۔ "پولیس نے اب تک کیا کیا ہے؟ وہ بھی بہت سرگرم ہو گی؟"

"ہونی چاہیے مگر پولیس اپنے طور پر کام کرتی ہے۔"

"آپ لوگوں سے بھی رابطہ قائم کیا ہو گا اُس نے؟"

"کیا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"سُنا ہے پولیس پہلے قریبی لوگ ٹٹولتی ہے اور اُس کا انداز سنگ دلانہ ہوتا ہے لیکن میرا کچھ کہنا نہ کہنا کیا، آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"ہاں مجھے اس کا اچھا تجربہ ہے۔"

"میرا مطلب ہے۔" وہ مجوبی سے بولا۔ "کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کی صورت میں پولیس پر وحشت بھی طاری ہو سکتی ہے اور پولیس یہ خیال نہیں کرتی کہ کس پر کیا گزر جائے گی۔ اُنھی پر شک کرتی ہے جن کا نقصان ہوا ہو۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔"

"کیونکہ کبھی مطلوبہ اشخاص اُنھی میں سے نکل آتے ہیں۔"

"جی جی ہاں۔" وہ بوکھلا سا گیا اور سمجھا کہ میں کہیں قریب کے کسی آدمی کی طرف تو اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ ذہانت ہمیشہ زود حس ہوتی ہے۔ اُس کی نگاہیں بے اختیار برآمدے کی طرف اُٹھیں۔ میں نے صراحت کوئی نہیں کی تاہم ایک لمحاتی تردد کے بعد اُس نے خود یہ نکتہ اخذ کر لیا کہ یہ کوئی بلیغ اشارہ نہیں، بس زبان پر آئی ہوئی ایک بات ہے۔ پولیس کے ذکر پر اُس کی آواز سنسنانے لگی تھی۔ پولیس سے واسطہ نہ پڑنے والوں کی آواز میں یہی اضطراب ہوا کرتا ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں مجھے احتیاط کی تلقین کرنے لگا۔ وہ صاف طور پر جو کہہ نہیں پا رہا تھا، میں اُسے سُن رہا تھا۔ میں تو اُسے کب سے سُن رہا تھا۔ اُس کی مراد یہی تھی کہ پھر ہم نے کیا سوچا ہے؟ میں کیا جواب دیتا۔ ہمارے سوچنے کے لیے کیا ہے۔ تجمل سر پھرے اندر بیٹھا ہے۔ جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی ہاتھ پاؤں توڑے اندر پڑے ہیں۔ میں یہاں سبزے پر بیٹھا تازہ ہوا کھا رہا ہوں۔ اب رات ہو گئی ہے۔ پولیس دوبارہ یہاں نہیں آئی ہے لیکن صبح ہوتے ہی یہ خدائی فوج دار پھر آ جائیں گے۔ تجمل نے جولین سے کہا تھا کہ پولیس کے دوبارہ آنے پر وہی جواب دیا جائے جو پہلے دیا جا چکا ہے۔ پولیس اس طرح واپس چلی جائے گی لیکن پھر آ جائے گی۔ یہ بات تو تجمل کو اچھی طرح معلوم ہو گی کہ گیتا اور رانی کو تا دیر پولیس کے سوال جواب سے دور رکھنا مشکل ہے اور اپنے آپ سے بھی۔

کیلاش یہی کہہ رہا تھا کہ پولیس کی بھٹکتی منڈلاتی نظریں آل کار ہم پر آ کے ٹک جائیں گی اور کیا ہو گا؟ وہ پوچھیں گے بمبئی آنے سے پہلے دادا ہمارے ساتھ کہاں گیا تھا؟ ہمارا تعلق کن اڈوں اور پاڑوں سے ہے؟ ہم بمبئی کیوں آئے تھے؟ جولین کون ہے جس کے گھر دادا اُس رات گیا تھا؟ وہاں کون کون تھا؟ وہی سوال جن کے جواب اُس رات تھانے میں ادھورے رہ گئے تھے اور باقی قرض سمجھ کے انھوں نے ہمیں جانے دیا تھا مگر قرض تو باقی ہے۔ انھوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ معافی کی ایک ہی صورت ہے کہ دادا کے قاتل اُن کے ہاتھ لگ جائیں یا اُن کے حوالے کر دیے جائیں یا اس سلسلے میں کم از کم انھیں ہماری اعانت کا اعتماد حاصل رہے مگر تجمل تو اندر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اور کتنی دیر اُس کا انتظار کریں گے۔ ایک دن، دو دن، ایک ہفتے۔ ممکن ہے، وہ ماہم کے پاڑے پر تجمل کی نگرانی کی خبر سن کے وقت کی کچھ اور رعایت دے دیں لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے اُن کا پارا چڑھتا رہے گا۔ میں کیلاش کو یہی جواب دے سکتا تھا اور خود کو بھی کہ پھر ہم جیل میں ڈال دیے جائیں گے اور سلاخوں کے پیچھے ثبوت و شواہد کے لیے سر مارتے رہیں گے مگر بس اتنا ہی ہے؟ صرف یہی جواب؟ ہم اتنی آسانی سے خود کو پولیس کے حوالے کر دیں اور وہ بھی دادا کے خون کے الزام میں؟ یہ جواب مجھی کو تسلی نہیں دیتا تھا، کیلاش سے میں کیا کہتا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر برآمدے میں آہٹ سُن کے چُپ ہو گیا۔ رَما خود چائے کی ٹرے لے کے آئی تھی، سر پر ساری کا پلو ڈالے ہوئے لگتا تھا جیسے وہ اسی گھر سے متعلق ہو۔ جولین بھی اُس کے ساتھ تھی۔ "اب ایک ہم زبان بھی میرے ساتھ ہے۔" آتے ہی وہ کھنکتی آواز میں بولی۔ "جولی کو میں پکڑ لائی ہوں۔ اس کے بغیر یہاں کوئی کمی سی لگتی ہے۔"

جولین کا بدن بل کھا گیا۔ وہ سمٹ کے میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر شہ پارہ بھی وہیں چلی آئی اور فرخ بھی۔ رَما نے سب کے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔ اُس نے ابھی اور بیٹھنے کے ارادے سے چائے کا مشورہ دیا تھا اور جولین کو بھی اسی لیے ساتھ لائی تھی مگر جولین، شہ پارہ اور فرخ اندر کا حبس سمیٹے آئی تھیں۔ یہ کھلی فضا، سبزے پر کرسیوں کا ماحول اُن کے لیے نیا تھا۔ اس سے مانوس ہونے میں انھیں کچھ نہ کچھ دیر تو لگتی، مجھے بھی لگی تھی۔ وہ چُپ چاپ جیسے ایک دوسرے کے بولنے کی منتظر رہیں۔ میرا دماغ بھی حاضر نہیں تھا۔ کیلاش بھی گم سم بیٹھا تھا۔ رَما نے سحر طرازی کی اپنی سی کوشش کی۔ کیلاش کو مخاطب کر کے تیکھے لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے اب کے میں مخل ہوئی؟" کیلاش نے مضطربانہ میری طرف دیکھا۔ "تم نے محاسبی شروع کر دی ہو گی جو مردوں کا شیوہ ہے، دو مرد جب بھی اکیلے ہوتے ہیں، اُن پر حقیقتیں طاری ہونے لگتی ہیں۔"

کیلاش اُس کی صورت تکنے لگا۔ "اور عورت ساتھ ہو تو حقیقت گریزاں۔" وہ تنک کے بولا۔

"زندگی حقائق کے سوا بھی ہے۔"

"اور وہ فریب ہے۔"

"فریب بھی حقیقت ہے کیوں کہ زندگی کے لیے لازم ہے جیسے خواب۔ ہم خواب نہ دیکھیں تو یہ صبر آزما زندگی کیسے عبور کریں۔"

کیلاش نے اُس سے جرح نہیں کی، وہ پکی ہوئی ساری

چائے ایک گھونٹ میں انڈیل کے کرسی سے اُٹھ گیا۔ رما نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا اور کلائی کی گھڑی دیکھ کے چونک پڑی۔ جولین، فرخ اور شہپارہ نے اُس سے رات وہیں ٹھیر جانے کے لیے اصرار بھی کیا مگر رما نے اپنی ماں کا عذر کیا کہ وہ گھر کہہ کے آتی تو ٹھیک تھا۔

دروازے تک ہم انھیں رخصت کرنے آئے۔ گلی دور تک سنسان پڑی تھی اور کتے بھونک رہے تھے۔ موٹر تک جاتے جاتے رما معاً پلٹ پڑی اور میرے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ "مجھے شبہ ہے کہ میزبان بھی کو وقت تھا۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"بس یوں ہی جو دل میں آ گیا......"

"مجھے سب یاد رہے گا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ہو سکے تو کل آئیے۔"

"کل شاید ممکن نہ ہو مگر میں جلد ہی...... زندگی رہی تو جلد ہی ضرور آؤں گا۔"

"یہ آپ نے کیا کہا۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "زندگی کی آرزو کرو تو زندگی راضی رہتی ہے۔ بہت خوشامد پسند چیز ہے یہ۔"

"مگر وہ دوسرے جو کسی کی نابودی کے لیے اس سے زیادہ شدید آرزو رکھتے ہیں، زندگی انھیں بھی مایوس نہیں کرتی۔"

وہ ٹھٹکی ہوئی سی کھڑی پلکیں جھپکاتی رہی۔ کیلاش نے موٹر میں بیٹھتے ہی ہارن بجانا شروع کر دیا۔ اُسے جانا پڑا۔ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے وہ سب کو ہاتھ ہلانا نہیں بھولی۔

بیرونی کمرے سے گزرتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ اندر جا کے تھیل کو دیکھوں۔ دروازہ بند تھا لیکن کھڑکیاں روشن تھیں۔ میں آگے بڑھ گیا۔ جولین نے مکان کے عقبی حصے کی جانب ایک اور کمرے میں سونے کا انتظام کیا تھا۔ مارتی، جمرو، شامو اور ٹنگو فرش پر بچھی ہوئی چاندنی پر اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ چاروں بڑبڑاتے ہوئے اُٹھ گئے۔ میرے پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ ابھی کوئی آدھ پون گھنٹے پہلے ہی وہ یہاں آئے ہیں۔ سب تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ میرا جسم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ رما شاید ٹھیک کہتی تھی، کوئی چھاؤں ہی تھی جس میں مجھے نیند سی آ گئی تھی اور اتنی دیر تک جیسے سب دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ چھاؤں گزر جانے کے بعد اُس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ آدمی اور درخت دونوں سایہ رکھتے ہیں لیکن بڑا فرق ہے۔ درخت کا سایہ سب کے لیے یکساں، آدمی کا ہر ایک کے لیے جدا جدا۔ کسی کے لیے ہے، کسی کے لیے نہیں۔ ایک لمحے ہے، دوسرے لمحے نہیں۔ آدمی کا سایہ چھوئی موئی کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے ہی کیلاش آیا، رما کا سایہ بھی سکڑتا سمٹتا گیا۔

اُن چاروں کے آرام کی خاطر میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور ایک کونے میں جا کے لیٹ گیا مگر وہ لوٹتے لوٹتے میرے پاس چلے آئے اور جمرو کو جانے کیا ہوا، آ کے مجھ سے چمٹ گیا جیسے پناہ کی تلاش میں ہو جیسے بہت گرد و غبار اکٹھا ہو گیا ہو۔ میں نے بھی اُس کا سر اپنے بازو میں جکڑ لیا۔ "کیا بات ہے جمرو بھائی؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

وہ سانسیں کھینچتا رہا۔ میں نے پھر پوچھا تو ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا۔ "کیا بولے لاڈلے!"

"دم گھٹ رہا ہے نا؟" میں نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے سب......" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہے؟ تم تو بہت بہت......"

"سینگ نہیں ہیں اپنے کے بس......" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

"نہیں نہیں، میں تو کہہ رہا تھا کہ تم سے دوسرے سیکھتے ہیں، خدا نے تمھیں بہت حوصلہ دیا ہے۔"

"کیا لاڈلے!" اُس کی آواز ڈوبتی گئی۔ "اپنے سے چھوئی کو نہیں دیکھا جاتا۔"

"گیتا کو؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں جانی! اُسے دیکھ کے خون بدن میں بہت کھولتا ہے۔"

"اب تو کچھ ٹھیک ہے وہ۔"

"ٹھیک ہے پر ایسی ٹھیک بھی نہیں۔ استاد بیچ میں نہ ہوتا تو ماں قسم اپنے سے ایک پل بھی نہ ٹھیرا جاتا۔"

"تھیل بھائی سے کوئی بات ہوئی؟"

"کیسی بات؟"

"یہی، کہیں آنے جانے کی؟"

"نہیں لاڈلے! تجھ کو استاد کا پتہ ہے۔ سب ایک دم مٹھیا میں باندھ کے رکھتا ہے، پوچھیں بھی کیا اُس سے۔ سامنے کا سارا اُلٹا سیدھا دکھائی دے رہا ہے تب استاد کرے بھی کیا۔ گیتا کو چھوڑ کے کدھر جائے۔ کدھر جانے کو سوچے۔"

"پر اُستاد ایک اسی مارے نہیں ٹھیرا جمرو بھائی۔" شامو بیچ میں بولا۔ "باہر نہیں دیکھا، براتیوں کو باجے بجانے لیے؟" براتیوں سے شامو کی مراد پولیس تھی۔ پاڑے سے واپس آتے ہوئے ہم نے انھیں تمام راستوں پر تعینات دیکھا تھا جہاں وردی والے نہیں تھے، وہاں سادہ لباس والے گشت کر رہے تھے۔ کیلاش اور رما کو دروازے پر رخصت کرتے وقت میں نے غور نہیں کیا لیکن شامو بتا رہا تھا کہ اُس نے کھانا کھانے سے پہلے مکان کے اطراف بھی کئی سادہ پوش گھومتے دیکھے ہیں۔

"استاد ابھی کچھ جان کے ہی اید رہے۔" مارتی دبے لہجے میں بولا۔

"استاد کو اگر تھوڑا بہت پتہ ہو تو بھی اُسے اِدھر سے نہیں ٹلنا چاہیے۔ اِدھر گیتا کے پاس اُس کا ٹکنا ضروری ہے۔"

"پر اپن تو نکل سکتا ہے جمرو بھائی۔" مارتی نے کہا۔ "گھر بیٹھنے سے تو ابھی کچھ نہیں ملنے کا۔"

شامو نے بھی اُس کی تائید کی۔ کہنے لگا کہ میرے آنے سے پہلے وہ یہی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی سُن گُن مل سکتی ہے تو پاڑے سے یا کہیں بھی باہر جانے پر۔ گھر میں بند پڑے رہنے سے ہوائیں آ کے تو ہمیں کوئی خبر دینے سے رہیں۔ شامو نے مشورہ دیا کہ اگر بر درست تھیل کا باہر جانا مناسب نہیں تو ہم تو نکل سکتے ہیں۔

"اپن لوگ چاہے تو ابھی بھی جا سکتا ہے راجا بھائی۔" مارتی تمتاتی آواز میں بولا۔

"ابھی؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"کیا ہے راجا بھائی! موٹر اوری کھڑی ہے۔ ڈرائیور کو اپن جگا لے گا۔"

"گھڑی پہ بھی ایک نظر مارلے ماسٹر!" جمرو پھنکارتی آواز میں بولا۔

"دیکھ لیا ہے جمرو بھائی، اور ہم دیکھ کے ہی بول رہا ہے۔ ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اپن ابھی چلے تو سویرا ہونے سے پہلے پلٹ آئے گا۔ تھوڑا چل کے دیکھتا ہے ابھی۔"

"تھوڑا چل کے دیکھتا ہے......" جمرو نے اُسے دھتکار دیا۔ "ماسٹر! تیری کھوپڑی اُلٹ گئی ہے۔"

"کھوپڑی تمھاری بھی اپنے کو جگہ پر دکھائی نہیں پڑتی۔" شامو نے بگڑے لہجے میں کہا۔ "ماسٹر کیا اُلٹا بول رہا ہے۔ موٹر میں جائیں گے، اُسی میں لوٹ کے آئیں گے۔"

"تو پھر چلا جا، جا جا، روکتا کون ہے۔"

"ہاں چلے جائیں گے، تم سے پوچھ کے نہیں۔" شامو وحشت سے بولا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کیوں لاڈلے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ جمرو پھنکارتی آواز میں بولا۔ "پر لوٹ کے اِدھر آنا ہے تو اپنے باپ اُستاد کو بول کے ضرور جانا۔"

"تم تو گرم ہونے لگے۔ ماسٹر تو ایک بات بول رہا تھا۔ بات پر کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔" شامو ناراض ہونے لگا۔ "ہم لوگ ابھی بات کر رہے ہیں، دفع نہیں ہو گئے اِدھر سے۔"

میں نے اُٹھ کے اُسے دلوچ لیا اور سمجھایا کہ جمرو غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ خود بھی یہاں آرام سے نہیں ہے، ہماری طرح باہر نکلنے کے لیے بے کل ہے لیکن نہ یہ کوئی وقت ہے، نہ تھیل کو بتائے بغیر باہر جانا مناسب ہے۔ میں نے شامو سے کہا کہ ابھی وہ خود شہر میں پھیلی ہوئی پولیس کا ذکر کر رہا تھا۔ اس صورت میں باہر نکلنا کسی طور قرینِ عقل نہیں۔

جمرو بڑبڑانے لگا کہ ابھی صرف دو دن ہوئے ہیں۔ تھیل کو پورے دو دن ہمارے ساتھ، ہمارے سامنے رہا ہے۔ جتنا ہمیں معلوم ہے، اُتنا ہی اُسے۔ کوئی بات اوپر تلے ہو گئی تو ہم تھیل کے لیے اور مصیبت کھڑی کر دیں گے۔

"ٹائم کا کیا ہے جمرو بھائی۔" مارتی پژمردگی سے بولا۔ "دو دن ہو گیا، پر جان پڑتا ہے دو برس ہو گیا، اُس کے بھی اوپر۔ ماں قسم اپن کیا بولے کیسا لگا جسم میں......" مارتی کی آواز بھرانے لگی۔ "اپن نے اپنے کو ایسا کتا کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے مارتی کو اشارہ کیا کہ اب وہ اور کچھ نہ کہے۔ شامو کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا سر سینے میں چھپا لیا۔ وہ پھڑکنے لگا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ جمرو اور شامو کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے شامو کو مجھ سے چھین لیا اور بچوں کی طرح اُسے چمکارنے لگے۔

وہ دیر تک جاگتے رہے۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ انھیں بتاؤں میرا ذہن کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے لیکن وہ پہلے ہی کیا کم بے آرام تھے جو میں انھیں اور پریشان کرتا۔

رات کے آخری پہر کسی وقت اُن کی آنکھ لگ گئی۔

دیواری گھڑی میں سات بج چکے تھے۔ شتی چاچا کی آواز پر ہماری آنکھ کھلی۔ وہ ہمیں اُٹھانے کے علاوہ کپڑے دینے بھی آیا تھا اور جولین کی یہ ہدایت منتقل کرنے کہ نہا دھو کے اور لباس بدل کے ہم ناشتے کے لیے باہر آ جائیں۔ سب نے جلدی کی مگر کچھ دیر ہو گئی۔ باہر آ کے معلوم ہوا کہ بیرونی کمرے میں سب ناشتہ کر چکے ہیں۔ جولین اور فرخ نے دوسرے کمرے میں ہمارے لیے پھر الگ انتظام کیا۔ جولین نے بتایا کہ وہ ہمیں اور آرام کرنے دیتی مگر تھیل کے حکم پر اُسے شتی چاچا کو کمرے میں بھیجنا پڑا۔

"استاد بولے تھے؟" شامو نے بے تابی سے تصدیق چاہی۔

"ہاں شامو بھائی! باباجی کا حکم تھا۔" جولین نے مسکرا کے کہا۔ اُس کی مسکراہٹ پر شامو جھینپ سا گیا۔

کسی سے پھر ٹھیک طرح ناشتہ نہیں کیا گیا۔ جولین نے ٹوکا بھی کہ ایسی جلدی نہیں ہے لیکن سب نے جیسے تیسے چائے ختم کی، بسکٹ زہر مار کیے اور برآمدے میں آ کے بیٹھ گئے۔ مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر کے لیے گیتا اور رانی کو کیوں نہ دیکھ آؤں مگر میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

سامنے سے تجمل کو آتا دیکھ کے ہم سب یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُسے کپڑے پہنے تیار دیکھ کے میری طرح اُن چاروں نے بھی اطمینان کی سانس لی ہوگی یا اُن کے دل بھی میری طرح دھڑکے ہوں گے۔ دل کا دھڑکنا بھی کبھی اطمینان کا سبب ہوتا ہے۔ میر علی، اباجان اور مولوی اکرم بھی تجمل کے ساتھ تھے۔ تجمل برآمدے میں نہیں رکا، ہم منتظر تھے۔ اُس کے اشارے پر ہم نے تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کیں۔ تجمل اتنی ہی دیر برآمدے سے پہلے زینے پر ٹھیرا جتنی دیر میں اباجان نے اُس سے جلد واپس آنے کو کہا۔ میر علی نے کچھ پڑھ کے ہم سب پر دم کیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گیتا اور رانی کی صورت دیکھنے اور انھیں اپنی صورت دکھانے اندر جاسکتا۔ دروازے پر موٹر کھڑی تھی۔ تجمل نے ٹنگو کو روک دیا۔ تجمل ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا۔ میں، مانی، جمرو اور شامو پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ موٹر منٹوں میں بڑی سڑک پر آ گئی۔ اُس کا رُخ پاڑے کی جانب تھا۔

دن خوب روشن ہو چکا تھا اور سڑکوں پر گاڑیوں کا شور گونج رہا تھا۔ چوراہوں پر جابجا پولیس ڈیوٹی پر تھی۔ جمرو، شامو اور مانی کا حال تو نہیں معلوم لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دن بعد باہر نکلنا ہوا ہے۔ سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر کی رفتار بھی تیز نہیں تھی۔ راستے بھر نہ تجمل نے ہم سے کوئی بات کی، نہ ہم نے آپس میں کچھ کہا سُنا۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے موٹر چلاتا رہا جیسے وہ موٹر ہی کا کوئی حصہ ہو۔ آدھے گھنٹے میں ہم ماہم کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ ابھی پاڑے سے دُور تھے اور چوراہے کے کیفے شیراز نامی چائے خانے سے گزر رہے تھے کہ ناگہاں مجید ہوٹل والے کی صورت میری آنکھوں میں گھوم گئی۔ مجھ سے سیدھا نہ بیٹھا گیا۔ اِس کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہی مجید جس نے مولوی اکرم سے اپنے لڑکے کے لیے فرخ کا رشتہ مانگا تھا اور انکار پر مغلوب الغضب ہو گیا تھا۔ اُس نے علاقے کی مسجد میں مولوی اکرم کو رسوا کرنے کی کوشش کی تھی اور الزام لگایا تھا کہ مسجد کے چندے کے لیے اُس کی طرف سے دی جانے والی رقم کا ایک بڑا حصہ مولوی اکرم نے خورد برد کر لیا ہے۔ اُس کا لڑکا بھی شہدا تھا۔ اُس نے کسی سُنسان گلی میں مولوی اکرم کو زدوکوب بھی کیا تھا اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ یہ ہمارے بمبئی آنے کے دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ کالتے ابھی موجود تھا۔ مولوی اکرم کی زبانی مجید کی ڈھٹائی کا سارا ماجرا سُن کے پیرو مولوی اکرم کو لے کے مجید کے ہوٹل پہنچا تھا۔ میں اور تجمل بھی ساتھ تھے۔ پیرو نے بھرے ہوٹل میں مجید کو کاؤنٹر سے اُٹھا کے فرش پر پٹخ دیا تھا۔ مجید نے پیرو اور مولوی اکرم کے پیر پکڑ لیے تھے۔ اِس دوران دادر کے علاقے کا دادا بالے بھی آ گیا تھا۔ اُس نے بھی بعد میں مجید کے ساتھ کچھ کم ذلت آمیز سلوک نہیں کیا ہوگا۔ پیرو نے چلتے چلتے مجید کو حکم دیا تھا کہ وہ دوسرے دن مسجد کے چندے میں پورے آٹھ ہزار روپے داخل کرائے کیونکہ مجید نے مولوی اکرم پر آٹھ سو روپے کی بددیانتی کا الزام لگایا تھا۔ مجید نے کسی چون وچرا کے بغیر یہ حکم قبول کر لیا تھا مگر وہ کینہ پرور اور سفلہ آدمی نظر آتا تھا۔ پیسوں کی بھی اُسے کمی نہیں تھی۔ اُس کا لڑکا بھی اُٹھائی گیرا تھا اور ہر وقت اُٹھائی گیروں ہی کا جمگھٹ اُس کے ہوٹل میں جمع رہتا تھا اور پیرو کے لیے وہ باہر کے آدمی بھی بلا سکتا تھا۔ بظاہر اُس میں اتنی بڑی جرأت معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن یہ بات جرأت کی بات نہیں کینے کی ہے اور کینے کے لیے ناتواں، توانا کی شرط نہیں ہوتی۔ آدمی کو کمینہ بنتے دیر نہیں لگتی۔ اُس نے مولوی اکرم کو بھی معاف نہیں کیا تھا حالانکہ اُن کی خطا ہی کیا تھی۔ رشتے آتے ہیں، منع کر دیے جاتے ہیں لیکن وہ مجید تھا۔ کٹ حجت، کٹ کھنا۔ ہو سکتا ہے اُس کا دماغ پھر گیا ہو۔

میرے برابر گھسے بیٹھے ہوئے شامو نے میرے ہاتھ پیروں کی اینٹھن محسوس کر لی تھی۔ اُس نے بھن بھناتی آواز میں مجھ سے پوچھا: "کیا بات ہے لاڈلے؟"

میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ ویسے بھی ڈرائیور کی موجودی میں کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ پاڑا قریب آ رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے تجمل سے بات کرنی چاہیے۔ ممکن ہے اُس کے ذہن میں یہ سب کچھ نہ ہو۔ آخر اس میں حرج بھی کیا ہے۔ تجمل زیادہ سے زیادہ دھتکار دے گا۔ پھر میں نے سوچا، تجمل سے بات کرنے سے پہلے کیوں نہ میں بالے کو اشارہ کروں۔ وہ دادر کے علاقے میں ہے اور مجید کو طلب کر کے اُسے اُلٹا لٹکا سکتا، اُس کی کھال کھینچ سکتا ہے۔ کم از کم مجید تک تو ہم پہنچ سکتے ہیں ورنہ اندھیری کے علاقے میں جا کے راجن کی محبوب عورت کو ختم کرنے اور اِس کا الزام راجن کے سر تھوپنے والوں کی پہچان ڈھونڈ کر ہی سکتے ہیں۔ حیدرآباد کے لوگوں کی بات دُور کی ہے جہاں تک

بمبئی کا تعلق ہے، ہم یکے بعد دیگرے تمام لوگوں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں جو دادا سے ناخوش تھے یا جنھیں چھ سات مہینے کے غیاب کے بعد دادا کی بمبئی واپسی اچھی نہیں لگی تھی۔ ہو سکتا ہے اُنھی میں سے کوئی ہو۔ آگے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

پاڑے کی گلی کے سِرے پر موٹر ٹھیر گئی۔ باہر کئی آدمی موجود تھے، ہمیں دیکھتے ہی ہماری طرف دوڑ پڑے اور ہمارے ساتھ ہی عمارت میں داخل ہوئے۔ اندر لوگوں کی تعداد کل جتنی تو نہیں تھی مگر اتنی کم بھی نہیں تھی۔ چوکی کے اطراف دری پر متعدد لوگ بیٹھے تھے۔ ہماری آمد کا شور سُن کے چوکی کے وسط میں بیٹھا ہوا پانڈے دادا اُچھل پڑا اور سر جھٹکتا، چیختا، دونوں ہاتھ پھیلائے تجمل کے سینے سے آ کے چمٹ گیا: "کیا دادا! اپن کو کیدر کو چھوڑ گیا؟" وہ منڈلاتی آواز میں بولا۔

تمام لوگوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔ پانڈے دادا تجمل کی کمر پکڑے اُسے چوکی پر لے گیا۔ جب تک تجمل بیٹھ نہیں گیا، سب کھڑے رہے۔ "اپن سے جاستی دیر ایدر رکا نہیں جائے گا، سمجھا دادا!" پانڈے کسی توقف کے بغیر بڑبڑاتا رہا، کہنے لگا کہ کل سے یہاں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور رونا شروع کر دیتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ وہ کس کس سے بات کرے اور کس کس کو سمجھائے۔ لوگ جاتے ہی نہیں جیسے اُن کے بیٹھے رہنے سے دادا لوٹ آئے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس نے صبح سویرے ہمارا انتظار شروع کر دیا تھا کہ تجمل آئے تو اُس کے پیر پکڑ کے اُسے اِس ذمے داری سے سبک دوش کر دینے کی منت کرے۔ گُلیا نے بھی اِس کی تصدیق کی اور بتایا کہ کل ہمارے جانے کے بعد بھی رات تک بہت سے پاڑوں کے دادا بیٹھے رہے۔ جو ہمارے سامنے چلے گئے، اُن میں سے کئی پھر شام کو واپس آ گئے۔ آخر پانڈے کو اُن سے کہنا پڑا کہ بہتر ہے اب وہ اپنے پاڑے دیکھیں اور اپنے اپنے علاقوں میں جا کے دادا کو ختم کرنے والوں کا کھوج لگائیں۔ جتنی دیر ہوگی، دادا کی روح بے قرار رہے گی اور اِس میں خود اُن کا قرار بھی مضمر ہے۔ یوں وہ دادا سے اپنی وابستگی کا حق ہی ادا نہیں کریں گے بلکہ اپنے ساتھ بھی سلوک کریں گے۔ جتنی دیر ہوگی، ثابت ہوگا کہ دادا بہت بے وقار، بہت حقیر اور بہت اکیلا تھا۔ پھر تو پاڑے کا ہر دادا ایسا ہی ہے، ایسا ہی بے اماں۔ یہ رسم چل پڑی تو۔۔۔۔ گُلیا کے کہنے کے مطابق پانڈے دادا نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ یہاں حاضری سے کچھ نہیں ہوگا۔ اِس طرح اگر وہ دادا سے اپنا تعلق جتانے اور اُس کے پاڑے کے لوگوں پر کچھ تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نئے دادا کو جیسے پہچانتے خوب آتے ہیں اور شہر کے پاڑوں سے اُس کے مراسم پہلے کسی ہو گئے

اور سفارش پر کتنی دیر چلیں گے۔ سب کو نئی کھیتی بونی ہوگی۔ تاہم کے پاڈے پر پیرو دادا کے پسماں دگان اور اُس کی چوکی پر بیٹھنے والے نئے دادا کی نظروں میں سُرخ رُوئی مقصود ہے تو اُس کا یہی طریقہ نہیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے دادا کے لیے اپنے دکھ کا اظہار ہے تو بے شک جم جم کرتے رہیں لیکن دادا کا حساب صاف کر کے۔

پانڈے نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ بالے اور جارجی کے سوا تقریباً وہ سبھی چلے گئے تھے لیکن رات گئے تک دُوسرے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور پانڈے اُن کے درمیان بیٹھا خود کو توجیت کھسوٹتا رہا۔ گلیا کہتا تھا کہ پانڈے لوگوں کی باتیں سُن سُن کے اور اُن سے باتیں کرتے کرتے خود رونے اور تلملانے لگتا ہے کہ اُسے کن کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہے۔ یہاں اُس کے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے ہیں۔ بار بار پیرو دادا اُس کے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ رات کو صرف ایک دو گھنٹے کے لیے پانڈے سو پایا۔ سو بھی پا پایا نہیں۔ زورا اور چھیدا نے اُسے زبر دستی چوکی سے اُٹھا کے پیرو کے خاص کمرے میں پہنچا دیا۔

ہم پاڈے پہنچے تو بالے موجود تھا۔ دینا بھی کچھ دیر میں آ گیا اندھیری سے سکندر بھی۔ جارجی وہاں نہیں تھا۔ میں نے بالے کو الگ لے جا کے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر رُک گیا کہ پہلے مجھے خود بالے کی لوہ لینی چاہیے اور پاڈے کے دُوسرے لوگوں کا احوال سُننا چاہیے۔ ایک نہیں جانے کتنے، جن کا دادا اور ماہی سے عمر بھر کا ساتھ رہا ہے، ایسے بے تعلق نہیں بیٹھے رہے ہوں گے۔ وہ جتنے شکستہ ہیں، اُتنے ہی برگشتہ بھی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ افواہیں ساتھ لائے ہوں گے۔ خالی زمین میں خود رَو پودے اُگ آتے ہیں۔ سبھی بے کار نہیں ہوتے۔ افواہوں کا بھی یہی ہے۔ دس میں سے کسی ایک کی تو کوئی بنیاد ہوگی۔ مجھے خیال آیا، پولیس نے واردات کی جگہ کے آس پاس مکینوں اور راہ گیروں سے اچھی طرح پوچھ گچھ کی ہوگی۔ پولیس کو اُن سے کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ ضروری نہیں کہ پولیس ہر آدمی تک پہنچ گئی ہو اور ہر آدمی نے اپنا سینہ کھول رکھا ہو۔ لوگ خوف و دہشت میں نہیں بتاتے اور پولیس سے دُور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ میں وہاں جا سکتا ہوں۔ ایک کوشش کر لینے میں کیا جاتا ہے۔

زورا نے تجمل کے سامنے حقّہ رکھ دیا۔ پانڈے کے حکم پر سما وار بھی لا کے رکھ دیا گیا۔ سکندر آتے ہی تجمل کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی پانڈے دادا چپ ہوا، اُس نے تجمل کو اطلاع دی کہ رات گئے اندھیری کے علاقے میں پولیس نے اچانک کئی گھروں پر چھاپے مارے ہیں اور کئی آدمی گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ سب کے سب کاروباری ہیں اور اندھیری کے پاڈے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کا رابطہ رہا ہے۔ میں تجمل کے قریب بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا۔ سکندر نے صرف اطلاع دی تھی، تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن اُس کا اشارہ واضح تھا کہ پولیس کو اندھیری کے علاقے میں کوئی نشیب نظر آیا ہے یا کوئی اور راستہ نہ دیکھ کے پولیس بھی آخر اسی مفروضے پر تکیہ کر رہی ہے کہ راجن کے سر ایک عورت کے خون کا الزام ڈالنے والے لوگ پیرو کے لیے بھی بہت تنگ دل، بہت بے رحم ہو سکتے ہیں۔ پیرو راجن کی لوار جو بنا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے حوالات میں بند راجن ہی نے اس طرف پولیس کی توجہ دلائی ہو۔ سکندر گرفتار ہونے والوں کے نام بتا رہا تھا۔

ہمیں پاڈے آئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ بڑے دروازے سے لچھی لپکتا جھپکتا اندر داخل ہوا اور درمیان میں بیٹھے لوگوں کو پھلانگتا ہوا چوکی پر سیدھا تجمل کے پاس آیا۔ اُس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کے نہیں آیا ہے۔ "دادا!" تجمل کے پوچھنے پر وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں سے بولا۔ "اپن قلابے سے آتا ہے۔ اُدر تھانے میں اپن کو پتہ لگا، ماری اندر ہے۔"

تجمل نے منال ہونٹوں سے ہٹالی۔ "کیا بولتا ہے رے؟"

"ہاں دادا! ماری اُدر تھانے میں پڑا ہے۔"

"ماری!" پانڈے حیرت سے بولا۔ "جارجی کا گھر والی؟"

"ہاں دادا!"

"کیوں؟ سیدھا بول۔"

"اپن نے تھانے میں جانے واسطے بہت ہاتھ پیر مارا پر اُدر آگے پیچھے اکھا پولیس لگا پڑا ہے اور لوگ اپنا اپنا بولیاں نکالتا ہے۔ اپن بھاگ کے جارجی کا پاڈے طرف گیا۔ اُدر بھی پولیس تھا۔ پھر گھر دیکھنے کو نکلا۔ پولیس اُدر بھی کسی کا اندر جانا نئیں مانگتا۔"

پانڈے نے متوحش لہجے میں پوچھا۔ "جارجی کیدر ہے؟"

"اپن پوچھا تھا پر اُدر کوئی بھی ٹھیک نئیں بولا۔ آدھو بار و تلابے پاڈے کا ایک بھی آدمی اپن کو دکھائی نئیں پڑا۔"

پانڈے نے تجمل کی طرف دیکھا۔ تجمل کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ سب کی نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں مگر وہ بُت بنا رہا۔

"اپن کو بہت اُلٹا دکھائی پڑ رہا ہے دادا! تھانے پر پولیس کا بہت سا موٹر گاڑی کھڑا ہے۔" لچھی نے اضطراری انداز میں بتایا کہ وہ جارجی ہی سے ملنے کے لیے قلابے کی طرف گیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا کے قریب اُسے ایک شناسا سپاہی نظر آیا لیکن اُسے بھی کچھ علم نہیں تھا کہ ماری

تھانے میں کیوں موجود ہے اور پولیس نے جارجی کا پاڈا اور گھر کیوں گھیر میں لے رکھا ہے۔ سپاہی نے لچھی کو مشورہ دیا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے علاقے سے نکل جائے یا کہیں چھپ جائے اور جب تک کچھ واضح نہ ہو، باہر نہ نکلے۔ کسی سنگین واقعے ہی پر پولیس کی اتنی بڑی تعداد حرکت میں آ سکتی ہے۔ سپاہی کی اطلاع کے بموجب ماری کو تھانے میں آئے گھنٹے بھر سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لچھی وہاں نہیں رکا اور گلیوں گلیوں نکلتا سواری پکڑ کے سیدھا پاڈے آ گیا۔

چوکی پر سکوت چھا گیا تھا۔ تجمل خاموش بیٹھا حقّے کے کش بھرتا رہا۔ لمحوں بعد اُس نے بالے اور زورا کو اشارہ کیا۔ "دیکھ کے آؤ رے! یہ لاڈو کا کیا بولتا ہے؟"

بالے اور زورا فوراً اُٹھ گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ اُٹھا تھا مگر تجمل نے تند لہجے میں مجھے اپنی جگہ بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ میرا خیال تھا، ہم تو ابّا جان کی موٹر میں جائیں جو پاڈے کی گلی کے سرے پر کھڑی ہے۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ جب بالے اور زورا جا سکتے ہیں تو تجمل مجھ پر پابندی کیوں لگا رہا ہے لیکن اُدھر سے جمرو نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے چپ چاپ بیٹھ جانے کی تلقین کی۔ ناچار میں بیٹھ گیا تاہم میں نے تجمل سے کہا کہ بالے اور زورا موٹر ساتھ لے جائیں تو بہتر ہے۔ میرا مقصد تھا کہ وہ جلد واپس آ جائیں گے۔ تجمل نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ بالے اور زورا نے بھی تجمل کے ردِ عمل کا انتظار نہیں کیا جیسے میں نے کوئی بہت فضول بات کہی ہو۔ وہ دونوں ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بغیر دروازے سے نکل گئے۔

"لوگ باگ اُدر کیا بولتا تھا؟" جیسے ہی زورا اور بالے نگاہوں سے اوجھل ہوئے، پانڈے دادا لچھی پر ناراض ہونے لگا کہ وہ اصل بات جانے بغیر وہاں سے کیوں چلا آیا؟

"اپن نئیں آنے کا تھا پر ....."

تجمل نے ہاتھ اُٹھا کے لچھی کو روک دیا اور دھیمی آواز میں پانڈے سے کہا کہ فی الحال زورا اور بالے کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔

گویا تجمل کی مُراد یہ تھی کہ لچھی کو اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہو سکتا وہ بتا چکا ہے اور ابھی کوئی قیاس آرائی قبل از وقت ہوگی یا اس احتیاط کی وجہ دوسری تھی۔ چوکی کے اطراف فرش پر مختلف پاڈوں کے دادا اور علاقے کے آدمی بیٹھے تھے، اُن کے سامنے کوئی گفتگو مناسب نہیں تھی۔ انھیں بس ایک حد تک شامل رکھنا چاہیے تھا مگر یہی بات تھی تو تجمل لچھی کو لے کے اندر جا سکتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا اور چند ثانیوں بعد لچھی اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

مجھ سے وہاں بالکل نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ کم و بیش سبھی کا یہی حال تھا۔ جمرو، شامو، ماری، چھیدا، دینا، سکندر، گلیا، سبھی کا۔ اُن کے چہروں پر رنگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ سب بار بار تجمل کو دیکھتے۔ تجمل سر جھکائے حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ شاید کسی کو بھی اُس کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔ لگتا تھا، وقت جیسے نکلا جا رہا ہے اور تجمل یقیناً کسی غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پانڈے دادا سے برداشت نہیں ہوا۔ "ایسا کیسے دادا!" وہ متشر لہجے میں بولا۔ "ماری ایسا کیا؟...."

تجمل نے اُسے بات پوری نہیں کرنے دی اور ناگواری سے کہا۔ "کیا بولیں دادا!"

"اپن یہی سوچتا ہے، ماری اُدر کیسے چلا گیا؟" پانڈے اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماری کو اپن چھوکری سے جانتا ہے۔ دادا ہی نے اُس کا شادی جارجی سے بنایا تھا۔" تجمل کی خاموشی پر پانڈے پیچ و تاب کھانے لگا اور لچھی کو گالیاں بکنے لگا۔

"جارجی تو رات ایدر اپن لوگ کے ساتھ تھا دادا!" دینا نے

جھجکتے ہوئے کہا۔ "رات اپن سب ساتھ میں باہر نکلا تھا۔"

"کیدر جاتا تھا۔ ایک دم بھوت مافک شکل بنا تھا، کپڑا میلا چکٹ۔ کتنا دن سے ایدر ہی تھا" اپن بولا "ابھی بہت ہو گیا، گھر جا کے تھوڑا آرام کر بابا! نہیں جانا مانگتا تھا۔ اپن گالی دیا کہ سالا، ابھی دادا کا ایسا واندا ہے تو کاہے کو خالی پیلی ایدر چوڑی ڈالے بیٹھا ہے۔ ابھی گھسے مانپنا ڈال کے تین چار کو ایدر لائے تو اپن بولے، ہاں دادا کا سگا، دادا کا جانی ہے دفع ہو گیا۔ اپن کو بعد میں دھیان بھی آیا کہ تھوڑا جاستی بول گیا۔"

پانڈے جو منہ میں آیا کہتا رہا، تجمل نے دخل نہیں دیا۔ وہ شاید سن بھی نہیں رہا تھا، معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

ماری کا تھانے میں ہونا اتنی بڑی بات نہیں تھی جتنی اُس کے گھر اور قلابے کے پاڑے کے اطراف پولیس کی سرگشت۔ لچھی کی اطلاع بہت ادھوری تھی۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ ہو سکتا ہے رات اندھیری کی طرح پولیس نے اب قلابے کا رُخ کیا ہو اور یہ محض معمول کی بات ہو۔ یا رات اندھیری سے گرفتار ہونے والے تاجروں نے قلابے کی طرف اشارہ کیا ہو۔ پولیس کی ہر کارروائی دُور سے اتنی شدید نظر آتی ہے۔ گزشتہ تین دن سے پولیس مختلف جگہوں پر چھاپے مارتی رہی ہے مگر ماری کیوں؟ ماری نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟ کہیں ماری لپیٹ میں نہ آ گئی ہو۔ گو لچھی نے اُسی کے بارے میں بتایا تھا، ممکن ہے جارجی اور قلابے کے پاڑے کے دوسرے آدمی بھی تھانے میں موجود ہوں۔

زورا اور بابے کو جلد یا بدیر واپس آنا ہی تھا مگر اُن کے آنے سے پہلے مختلف امکانات کا ایک اندازہ لگا لینا بہتر تھا۔ قلابے کے پاڑے پر ہونے والے کسی بھی واقعے سے باہم کے پاڑے کا ردِ عمل مشروط تھا۔ تجمل کی خاموشی اُس کے اضطراب کی غماز تھی، پیش بینی و پیش بندی کے اضطراب کی۔ میری نظریں بھی جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں اور کسی ایک جگہ ٹھیرتی ہی نہ تھیں۔ نگاہ کا تعلق بینائی سے نہیں ہے، نگاہیں بے نور آنکھوں کی بھی ہوتی ہیں اور اُن کے لیے پردے، زاویے اور فاصلے کی شرط نہیں اور اڑنے کی بھی۔ پانڈے دادا کچھ دیر کے لیے کون سے بیٹھا رہا تھا کہ پھر بے چین ہونے لگا اور جھینپتی آواز میں تجمل سے بولا۔ "ابھی اپن ہی خود قلابے طرف کیوں نہ چلے دادا؟"

میں نے بھی بے اختیار اُس کی تائید میں آواز اُٹھائی، میرے پیچھے سے کسی اور نے بھی۔ تجمل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے پہلے مجھے دیکھا پھر پانڈے دادا کو اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اُدھر ہی کون گئے ہیں دادا! اپنے ہی آدمی ہیں۔"

پانڈے دادا سر ہلا تا رہ گیا۔

تجمل کی کوئی خواہش نہ ہوگی۔ یقیناً اُس نے پانڈے اور اُس کے گرد بیٹھے ہوئے داداؤں کی رسیاں ڈھیلی کرنے کے لیے جانے کا ذکر کیا تھا۔ پانڈے ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا جیسے اُس سے کوئی بڑی فروگزاشت ہو گئی ہو۔ سماوار سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور بالو، ماری پاڑے کا ایک آدمی منتظر بیٹھا تھا۔ پانڈے نے زور سے چیختے ہوئے اُسے جانے کا حکم دیا حالانکہ بالو قریب ہی تھا۔ چھید انے چائے کی پہلی پیالی تجمل کے آگے رکھی تھی کہ یک بیک سب کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ کرتے، پاجامے اور واسکٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ آدمی دروازے پر گلیا سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ درمیانہ قد، درمیانہ تن و توش، مرچئی رنگ، وضع قطع سے وہ اجنبی لگتا تھا۔ اجنبی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور کسی طرح کی روک ٹوک نہیں تھی۔ جانے اُس نے کیا پوچھا تھا کہ گلیا کو حجت کرنی پڑی۔ اُسے وہاں رُک کے گلیا لپکتا ہوا چوکی کی طرف آیا اور تجمل کے پاس پہنچ کے بولا۔ "دادا! وہ ظہیر کا نام لیتا ہے، بولتا ہے اپن کو اُس سے ضروری کام پڑا ہے۔"

"ظہیر!" میں نے چونک کے کہا۔

"اپن بولا اپن کو بول دو۔" گلیا نے تیزی سے کہا۔ "پر وہ....."

میں فوراً اُٹھ گیا لیکن تجمل نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے منع کر دیا اور نووارد کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اپن کو اوپر کا دکھائی پڑتا ہے دادا!" گلیا نے دبے لہجے میں کہا۔ اوپر سے اُس کی مراد پولیس تھی۔ مجھے بھی یہی شک گزرا تھا۔

آنی بریں وہ تیز قدموں سے چلتا، فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو عبور کرتا چوکی کے پاس آ گیا اور جوتے اُتار کے تجمل کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے زبان کھولنے سے پہلے تجمل نے درشتی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"اپن کو ظہیر صاحب سے ملنا ہے۔" اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کام بولو؟"

"اپن کو اُنھی سے ملنا ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اُس کے لہجے میں عاجزانہ اصرار تھا۔

میں تجمل کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ تجمل کوئی جواب دیتا، میں نے اُسے بتایا کہ میرا نام ظہیر ہے۔

مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُمڈ آئی، وہ کھسک کے جھٹ میرے قریب آ گیا اور سرگوشی میں بولا کہ مجھے اے ڈی آئی جی صاحب نے بلایا ہے۔

"اے ڈی آئی جی!" میری آواز سٹ پٹا گئی۔

"جی جناب! شکلا صاحب نے۔"

"شکلا جی نے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"جی جناب! آپ کو اور تجمل صاحب کو۔"

میں نے تجمل کی طرف دیکھا اور اُسے بتانا چاہا، مگر تجمل نے سُن لیا تھا۔ "کدھر ہیں صاحب؟" اُس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"اُدھر ہی تھانے کی طرف۔"

تجمل نے بس ایک لمحے تامل کیا ہوگا کہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پانڈے دادا اور چوکی پر موجود سبھی ایک دم ہمارے ساتھ اُٹھ گئے۔ تجمل نے انھیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور چوکی سے اُتر گیا۔

"ابھی کدھر دادا؟" پانڈے دادا وحشت سے بولا۔

میں نے نہیں دیکھا تجمل نے کیا اشارہ کیا تھا جو پانڈے دادا کا پھڑکتا ہوا جسم ٹھٹک گیا تھا۔ تجمل نے اُسے مزید استفسار کی مہلت نہیں دی اور بعجلت دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ماہم کا تھانہ پاڑے سے خاصی دُور تھا۔ باہر منتشر کھڑے ہوئے پاڑے کے کئی آدمی مجھے اور تجمل کو دیکھ کے سیدھے ہو گئے۔ وہ ہمارے پاس آیا ہی چاہتے تھے مگر ہماری بے تپاک آنکھوں سے اُنھوں نے جان لیا کہ فی الوقت ہمیں اُن کی توجہ کی ضرورت نہیں ہے یا ہمیں جلدی ہے، اُن کی دخل اندازی ناگوارِ خاطر ہوگی۔ وہ وہیں چند قدم بڑھ کے رہ گئے۔ گلی کے آخر میں دائیں جانب مڑتے ہوئے میری نظر پاڑے کی طرف گئی، میں نے وہاں چبوترے پر گلیا، لچھی، چھیدا، شنکرا، جمرو اور ماری کے علاوہ بہت سے لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ سب ہمارے پیچھے آنے کے لیے بے چین تھے۔

سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ابا جان کی موٹر میں ڈرائیور اونگھ رہا تھا۔ موٹر سے ہم جلدی پہنچ سکتے تھے۔ میں نے تجمل کو مشورہ دینا چاہا لیکن موٹر کے سامنے پہنچنے کے باوجود وہ آگے چلتا رہا، میں بھی چپ رہا۔ اس اجتناب کی تاویل سمجھ میں آتی تھی۔ تجمل کو کسی آمادگی کے لیے شاید کچھ وقت درکار تھا۔ لچھی کی اطلاع کے چند منٹ بعد شکلا کے ہرکارے کی آمد ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی غیر معمولی بات ہی ہوگی جو شکلا نے اس طور ہمیں طلب کیا تھا اور تجمل کو بطورِ خاص۔ سادہ پوش سے اس سلسلے میں کچھ سُن گُن مل سکتی تھی لیکن تجمل نے اُسے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔

پاڑے پر آتے وقت دھوپ اتنی تیز نہیں تھی، نہ سڑک پر ایسا ہجوم تھا جیسے سارا شہر اسی علاقے میں سمٹ آیا ہو۔ پیدل چلنے والے بہر حال اپنا راستہ نکال لیتے ہیں۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر تیز قدمی سے فاصلے طے کرتے رہے۔ ابھی ہم پاڑے سے کوئی میل بھر دُور آئے ہوں گے کہ شکلا کا فرستادہ سادہ پوش چلتے چلتے ٹھٹکا سا گیا اور اُس نے دونوں ہاتھ پھیلا کے ہمیں روک لیا۔ اُسی لمحے سامنے سے پولیس کی جیپ ہارن بجاتی ایک جھٹکے سے ہمارے قریب ٹھیر گئی۔ اُس میں پولیس افسر اور سپاہی بیٹھے ہوئے تھے، شکلا نظر نہیں آیا۔ رُکتے رُکتے جیپ کچھ دُور گھسٹتی چلی گئی۔ ابھی ڈرائیور نے انجن بند نہیں کیا تھا کہ ایک نوجوان افسر جست لگانے کے انداز میں اُتر پڑا۔ درمیان کا فاصلہ اتنا نہیں تھا، چند قدم بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اُسے دیکھ کے سادہ پوش کا جسم تن گیا اور اُس نے سپاہیانہ تن دہی سے افسر کو سلام کیا۔ نوجوان افسر نے سر کی خفیف جنبش سے اُسے جواب دیا، کسی قدر ناگواری سے۔ اُس کی چیلی چیلی آنکھیں ہم پر جم گئی تھیں۔ اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے جیپ کی طرف اشارے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ تجمل اُسی جانب چل پڑا اور اس سے پہلے کہ ارد گرد ٹھٹکتے راہ گیروں کی بھیڑ لگتی، ہم جیپ کی پچھلی نشست پر جا بیٹھے۔ ڈرائیور کو بہت عجلت معلوم ہوتی تھی۔ جیپ مڑنے پر پاڑے کی طرف جانے والا راستہ سامنے آ گیا۔ میں نے ماری، جمرو، گلیا، لچھی اور پاڑے کے کئی آدمی ادھر اُدھر سڑک پر کھڑے دیکھے۔ ہمیں کچھ خبر ہی نہیں ہوئی وہ ہمارے پیچھے آ رہے تھے اور اتنی دور آ گئے تھے کہ ہمارے اُن کے مابین گزوں کا فاصلہ رہ گیا تھا مگر جیسے جیسے جیپ کی رفتار تیز ہوتی گئی فاصلہ بڑھتا گیا تا آنکہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ڈرائیور اور افسر کے علاوہ دو بندوق بردار سپاہی بھی جیپ میں موجود تھے۔ ہم تینوں کے اضافے سے جگہ کی تنگی ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر گونجتے شور کی وجہ سے کوئی بات کر پانا بھی ممکن نہ تھا۔ ممکن ہوتا بھی تو اب کچھ جاننے سے کیا حاصل تھا۔ ماہم کا تھانہ آیا چاہتا تھا۔ سب گونگے بنے بیٹھے رہے۔ راستے میں نوجوان افسر نے کئی بار مڑ کے ہمیں دیکھا جیسے ہم کہیں غائب تو نہیں ہو گئے۔ میں نے فٹ بھر پر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ اُن میں خشونت نہیں تھی، جتنی وحشت تھی اور حیرانی۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ کسی حد تک بدحواس بھی لگتا تھا۔ ہم سے اُس کا برتاؤ عام پولیس والوں جیسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ شکلا سے تعلق کی رعایت تھی یا شہر کے سب سے بڑے دادا کا لحاظ مانع تھا یا کچھ اور، یہ کوئی خاص ہدایت؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہماری حیثیت کیا ہے، ہمیں خود کو کیا سمجھنا چاہیے۔

جیپ کی رفتار کم نہیں تھی۔ ڈرائیور بھی مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ دُور سے لوگ پولیس کی موٹر دیکھ کے ویسے ہی ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے قریب گزر گئے، جیپ نہیں ٹھیری۔ مجھ سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ ہم ماہم کے علاقے سے آگے نکل آئے تھے۔ میں نے

سوچا، تجمل سے کہوں یا اپنے پاس بیٹھے ہوئے سپاہی کو ٹوکوں کہ وہ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہیں لیکن کہیں بھی کوئی بھی منزل ہو، ہمارے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ تجمل نے بیڑی سلگا لی تھی اور لوہے کے ڈنڈے سے ٹیک لگائے دائیں طرف کے بھاگتے منظر دیکھنے میں گم تھا یا اپنے آپ میں۔

وہ قلابے کا تھانہ تھا جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا۔ چار دیواری کے اطراف بڑی تعداد میں سپاہی گشت کر رہے تھے۔ اندر بھی سپاہیوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود تھانے پر سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جیپ سامنے کے حصے کے بجائے کونے پر ایک کمرے کے سامنے رُک گئی۔ اگلی نشست سے پولیس افسر تیزی سے نیچے اُترا۔ میں بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گیا تھا لیکن تجمل کو بے حس و حرکت دیکھ کے ٹھہر گیا۔ پولیس افسر جب تک جیپ کے پیچھے ہماری طرف نہیں آیا اور اُس نے ہم سے اُترنے کے لیے نہیں کہا، ہم بیٹھے رہے۔ کمرے سے ملحق دالان جیسے ایک مختصر حصے میں پولیس افسر نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور وردی درست کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ دونوں بندوق بردار سپاہی باہر رہ گئے، سادہ پوش بھی۔

پولیس افسر کو گئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اندر سے یکایک شکلا نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ آدمی کی نگاہ پہلے مانوس چہروں پر جاتی ہے، اُس کی نظر پہلے مجھی پر پڑی۔ وہ بے تحاشا میری طرف بڑھا اور میرا شانہ جکڑ کے بولا "آؤ، آؤ، اندر آجاؤ۔" میری نگاہ بے ارادہ تجمل کی طرف گئی۔ شکلا کو یک دم تجمل کی موجودگی کا احساس ہوا اور اُس نے تجمل کے سلام کا جواب جلدی جلدی سر ہلاتے ہوئے دیا۔ "آؤ دادا تجمل!" تجمل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُس نے اُسے بھی اندر چلنے کی تلقین کی۔ اُس کی ہیجانی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے ہمارا شدت سے انتظار تھا۔ اُس کے اضطراب و انتشار کے باوجود مجھے اپنا جسم کھلتا ہوا محسوس ہوا جیسے کہیں کوئی دریچہ وا ہو گیا ہو۔ شکلا کے رویّے میں معاندت نہیں تھی مگر جو بات بھی تھی شکلا کے ہاں ہمارے لیے معاندت تو ویسے بھی محال تھی۔ وہ لوگ اُس اور مایوس ہی ہو سکتا تھا۔ ہمارے لیے وہ پولیس والا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کمرے میں کئی اور افسران بھی جمع تھے۔ سب کرسیوں سے اُٹھ گئے۔ اُن کی متجسس نگاہیں ہم دونوں کو حصار میں لیے ہوئے تھیں مگر وہ لوگ زیادہ دیر کمرے میں نہیں ٹھہرے۔ شکلا نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر کوئی اشارہ کیا ہو گا، سب کمرے سے نکل گئے۔ میرے دل کی حرکت جیسے معدوم ہو گئی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شکلا ہم سے بہت قریب میز کے کنارے پر بیٹھا رہا اور کسی تاخیر کے بغیر اُس نے تجمل سے پوچھا "آپ لوگوں کو کچھ پتہ چلا؟"

"کاہے کا صاحب؟" تجمل نے تھمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ماری کا؟"

"اپنے کو پتہ لگا ہے، ماری ادھری تھانے میں بیٹھی ہے۔"

"صرف اتنا؟ اتنا ہی؟"

"کیا بات ہے صاحب؟" تجمل نے تندی سے پوچھا۔

شکلا نے ہنکاری بھری اور تجمل کو گھورتے ہوئے بولا "ماری تم کو کب سے نہیں ملی دادا؟"

"دادا کے پُرسے میں پرسوں اُس کی صورت دیکھی تھی۔ ایک بار کو بس۔" تجمل نے چڑ چڑ ہو کے کہا "اپنا اُس سے زیادہ ناتا نئیں ہے صاحب! پر دادا کا بہت تھا۔ لوگ بولتے ہیں، دادا نے بس اُسے جنا ہی نہیں تھا۔ کاٹ پیٹ کے اُس کا سارا دادا نے بنایا تھا اُس کو۔ گھورے سے اُٹھا کے گھر میں رانی بنا کے بٹھایا تھا اُس نے۔"

"اور کچھ ......؟" شکلا بے تابی سے بولا۔

"قلابے کے دادا جارجی کے ہاتھ میں دادا نے ہی اُس کا ہاتھ دیا تھا، پر صاف صاف بولو بات کیا ہے صاب؟"

"تم ماری کو کب سے جانتے ہو؟"

"زیادہ ٹائم سے نہیں۔ بیس پچیس دن سے اوپر نہیں ہوئے۔" تجمل نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا "بعد کو بھی ہم نے دوبارہ سے زیادہ اُس کو نہیں دیکھا۔"

"لیکن، لیکن ماری تو تم کو خوب جانتی ہے۔"

"ہم کو؟" تجمل کی آواز اونچی ہو گئی "اپنے کو نہیں پتہ کیسے۔ دادا نے بولا ہو گا۔ ہر جگہ اپنے لیے ایسا ہی اُلٹا سیدھا بولتا تھا۔"

"تم ظہیر! تم کب سے اُسے جانتے ہو؟"

"یہی، جو تجمل بھائی بتا رہے ہیں۔" میری زبان لکنت کرنے لگی "مگر آپ ..... آپ کیا، ماری نے کہیں ہمارا نام لیا ہے؟"

"ہاں!" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ماری یہاں کس جرم میں آئی ہے؟"

"قتل کے۔" شکلا نے سر جھکا کے کہا۔

میری سانس سینے میں اٹک گئی "ماری نے قتل کیا ہے؟ کس کا؟" میں نے تجمل کی طرف دیکھا، وہ بھی ساکت بیٹھا تھا۔

"اُس نے اپنے شوہر کا خون کر دیا ہے۔"

"اپنے شوہر! جارجی کا؟"

شکلا نے ہونٹ بھینچ لیے اور اضطراری انداز میں اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔

"کب؟" میری آواز ٹھٹھر گئی تھی "جارجی تو رات سُنا ہے دیر تک پاڑے میں تھا، ہم کے پاڑے میں۔"

"ماری نے اُسے سویرے قتل کر دیا۔"

"کیوں؟ مگر ماری کیوں؟ نہیں نہیں، ہو سکتا ہے کسی اور نے اُسے ..... ماری تو ایک عورت، ایک اچھی عورت .....!"

"ماری نے یہاں آ کے خود کہا ہے۔"

"ماری نے اقبال کیا ہے؟"

"ہاں، اُسی نے۔"

میرا جسم سُن ہو گیا۔ تجمل بھی کچھ نہیں بولا۔ ہم دونوں اُس کا چہرہ تکتے رہے۔

"ماری نے آلۂ قتل بھی پولیس کو پیش کر دیا ہے، ایک خنجر....." شکلا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر کیوں؟ ماری نے اس کا کچھ سبب بھی بتایا؟"

"تمہارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تجمل دادا! آپ بولو؟"

تجمل سر اُٹھا کے رہ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ خاصی دیر بعد تجمل نے زبان کھولی "اُدھر اکیلا جارجی تھا صاب؟"

"یہ تم نے کیوں پوچھا دادا؟" شکلا کی آواز تڑخ رہی تھی۔

"ایسے ہی ......" تجمل نے منہ بنا کے کہا۔

"تم دوسرے کو جانتے ہو دادا؟"

"نہیں، پر جارجی اکیلا نہیں ہونا چاہیے۔ اکیلا ہوتا تو تھوڑے دن ابھی اور مل جاتے، ماری اِتنے دن کی بھیک اُس کو اور دے دیتی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اپنا کہنا سننا بعد میں رکھنا، ٹائم پڑا ہے اور ہم اِدھری ہیں۔ آپ اپنی بولو صاحب! اور ایک بات اچھی طرح جان لو، آپ کو ہم وردی والا نہیں سمجھتے۔ آپ وردی والی بولو گے تو ہم سے ٹھیک....."

"نہیں دادا!" شکلا نے ہاتھ اُٹھا کے تیزی سے کہا "ایسا مت کہو، کچھ ہرگز، مت سمجھنا۔ میں کچھ پوچھنا، کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے کھل کے بتاؤ، کچھ مت چھپاؤ۔"

"چھپانے کا اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔" تجمل نے تلخی سے کہا "اور آپ سے کیا چھپائیں گے، پھر ایک حکم پر نہیں آجاتے؟"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"ہم کو ابھی سب آپ کی زبان سے پتہ چلا ہے۔"

"وہاں ایک اور بھی تھا۔" شکلا نے بتایا "جارجی کا رشتے دار وکی نام کا، گوا میں رہنے والا غنڈا ..... اُس کی شناخت ہو گئی ہے۔ تم اُسے جانتے ہو؟"

"نہیں صاحب! ماری سے اُس کا نام سُنا تھا، دیکھا نہیں، پر وہی ہو سکتا ہے۔"

"وہی کیوں؟"

"یہ ماری نے آپ کو بول دیا ہو گا۔" تجمل سڑے لہجے میں بولا۔

"وہ جارجی اور وکی ....." میں نے سٹپٹائی آواز میں کہا "جارجی کی طرف بھی میرا دھیان گیا تھا لیکن وہ تو مسلسل دادا کے پاس، اُس کے پاڑے پر، وہ تو بالکل ہی ..... اُسے اُن دنوں اُدھر ہی رہنا چاہیے تھا۔"

"مگر ماری کو، ماری کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ بولتی ہے، اُسے پتہ تھا۔"

"پتہ تھا، جانتی تھی وہ؟" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

"نہیں، بولتی ہے، یقین تھا اُسے۔"

"یقین، غلط بھی ....." میں کہتے کہتے رُک گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔ پولیس نے ماری سے اُس کے یقین کے ثبوت ضرور چاہے ہوں گے۔ کوئی عورت اپنے شوہر کو یوں قتل کر سکتی ہے! میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا اور لگ رہا تھا جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔

شکلا میز سے اُٹھ کے ہمارے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور رومال سے ماتھے کا پسینہ خشک کرتے ہوئے آہستگی سے بولا "دادا! ماری تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"اپنے سے؟" تجمل نے چونک کے کہا۔

"اُس نے تھانے آتے ہی تم کو بلانے کو کہا تھا۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے، تم سے بھی اور راجا سے بھی۔" مجھ پر نظریں جماتے ہوئے شکلا تیکھے لہجے میں بولا "وہ ظہیر سے بھی ملنا چاہتی ہے۔"

"اب کیا چاہتی ہے وہ؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"پولیس نے جاننے کی کوشش کی تھی مگر ماری نے انکار کر دیا، بولی کہ اُسے کچھ اپنے لیے بات کرنا ہے اور صرف تم سے۔ کسی کو اُس نے نہیں بلایا۔" نہ میں نے کچھ کہا، نہ تجمل نے۔ شکلا

کلبلانے لگا۔ "کیا سوچنے لگے دادا؟"

"کدھر ہے وہ شیر کی جنی؟" تجمل نے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"یہیں، یہیں تھانے میں۔"

"اپنے کو لے چلو اُس کے پاس۔"

"ہاں۔" شکلا نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "لیکن دادا مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟"

"اُس سے پوچھ کے بولیں گے۔"

شکلا نے کچھ کہنا چاہا' پھر گہری سانس لے کے دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے اور اُس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئے۔ وہاں سپاہی اور ہمیں لانے والا پولیس افسر موجود تھے۔ اُن کی طرف توجہ دیئے بغیر شکلا دالان کے اندر ہی کھُلنے والے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں' تاہم اپنا بُت گھسیٹتا ہوا میں تجمل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

ماری چوتھے کمرے میں تھی۔ باہر سنگین بردار پولیس والوں کا پہرا تھا۔ یہ حوالات نہیں تھی۔ تھانے کے پچھواڑے کوٹھری جیسا ایک تنگ کمرا حوالات بنا دیا گیا تھا۔ ایک کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر ماری دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ دن کی روشنی کے باوجود کمرے میں اجالا نہیں تھا۔ سپاہی نے بلب جلا دیا۔ ہم جیسے ہی اندر پہنچے' ماری یک لخت اُٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے تو چند لمحے گُنگ کھڑی رہی' پھر اُس کے بدن میں جیسے کوئی لہر متلاطم ہوئی' وہ وحشیانہ انداز میں تجمل کی طرف جھپٹی۔ تجمل نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ماری بلک بلک کے رونے لگی۔ تجمل اُسے بازوؤں میں لیے خاموش کھڑا رہا۔

سپاہیوں نے جلد از جلد باہر سے تین کرسیاں لا کے رکھ دی تھیں۔ شکلا نے ایک کرسی اور لانے کا حکم دیا۔ ماری ہچکیوں سے رو رہی تھی' زار و قطار۔ جیسے بس کسی نشیب کے لیے اُس کی آنکھوں کا سیلاب رُکا ہوا تھا' جیسے اُسے بس تجمل ہی کا انتظار تھا۔ تجمل اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا' اُس کی کمر سہلاتا رہا۔ ماری کی سسکیاں اور کراہیں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ در و دیوار بھی جیسے شامل ہوں۔ ایسی آہ و زاری کہ دیکھنے اور سننے والے کو پاگل کر دے۔ آدمی کو خاک کر دے۔ "کیا کر لیا ری؟" بہت دیر بعد تجمل نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ "مر گئے تھے ہم کیا' اتنی جلدی کاٹے کو پڑی تھی؟"

ماری اور سسکنے لگی۔

شکلا وہیں کھڑا تھا۔ تجمل نے بہ مشکل ماری کو بازوؤں سے ہٹا کے کرسی پر بٹھایا۔ "بڑے صاحب اُدھری ہیں' کیا بولیں گے؟" تجمل نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو جانا چاہیے دادا؟" شکلا تذبذب سے بولا۔

"بیٹھو صاحب! اس کے لیے ابھی سب ایک جیسا ہے۔" تجمل نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ کرسی پر بیٹھی ماری گری گری جا رہی تھی۔ بہت تھکی ہوئی' بہت دن کی تھکی ہوئی لگتی تھی۔ بال بکھرے بکھرے' چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ دھنسی ہوئی لال لال آنکھیں۔ نیلے رنگ کی چادر پیروں میں پڑی ہوئی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسی خستہ شکستہ عورت سے خنجر اٹھایا گیا ہوگا۔ "بڑے صاحب باہر کے نہیں ہیں۔" تجمل نے اُس سے کہا۔ ماری کو جیسے اپنی خبر ہی نہ تھی۔ منہ چھپائے سسکیاں بھرتی رہی۔ "اب کیوں بلایا ہے ری؟" تجمل کی آواز میں درشتی آ گئی۔ "پھوٹتی کیوں نہیں منہ سے' لوٹ کے مت دیکھ اب ....."

ماری کے ہونٹوں پر لرزش طاری ہوئی اور وہ تجمل پر ایک یاس بھری نظر ڈال کے رہ گئی۔

شکلا کے تالی بجانے پر ایک سپاہی اندر آ گیا۔ شکلا نے اُس سے پانی منگایا اور نرم لہجے میں ماری کو متنبہ کیا کہ اُس کی خواہش پر ہم دونوں کو بلایا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ وہ اپنے حواس قابو میں رکھے جس کا وہ پہلے مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ یہ تھانا ہے' ملاقاتی بہت دیر تک اُس کے سامنے نہیں بیٹھ سکتے۔ سپاہی پانی لے کے آ گیا۔ شکلا کے اشارے پر اُس نے گلاس ماری کے آگے بڑھایا تو ماری نے منہ پھیر لیا مگر تجمل کے دخل دینے پر اُس نے چند گھونٹ اکراہ سے حلق میں اُتار لیے۔ شکلا اُسے سمجھانے لگا کہ ماری جتنا سچ بولے گی اُتنی ہی اُس کے لیے آسانی ہوگی۔ ماری نے اُس تلقین پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اُس نے تو جیسے سنا ہی نہیں۔ شکلا پہلو بدلنے لگا کہ کہیں اُس کی موجودگی تو ماری کی لب کشائی میں حارج نہیں ہو رہی؟ وہ اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ تجمل نے ماری سے پوچھا۔ "بچّے کدھر ہیں؟"

ماری پھر پھٹ پڑی اور بلکتی آواز میں بولی کہ بچّے پونا کے اسکول میں ہیں اور اُنھی کے لیے اُس نے ہمیں بلایا ہے۔ "اُن کا اب کوئی نہیں ہے دادا! کوئی بھی نہیں۔" وہ اپنا چہرہ کھسوٹنے لگی۔

"اُن کی ابھی تُو خود ہے۔"

"اپن جانتا ہے؟ اپن ابھی کدھری ہے دادا! اور ابھی اپن رہنا بھی نہیں مانگتا۔" ماری کی آواز کے ساتھ اُس کا سارا بدن بھی

تڑپ رہا تھا' ہاتھ جوڑ کے مجھ سے اور تجمل سے التجا کرنے لگی کہ اب ہی کو اُس کے بچّوں کا خیال رکھنا ہے۔ "وہ ایک دم بچّہ ہے' بہت چھوٹا ہے دادا! اُن کا کوئی بھی نہیں۔"

"اُن کا دھیان تھا تو پھر ایسا کیوں کیا ری؟" تجمل نے گرج کے کہا۔

"اپن کو ایسا ہی کرنے کا تھا۔ اپن نے کوئی غلط نہیں کیا۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ "اپن اُسی دن اُن لوگ کو ختم کر دیتا پر وہ۔" وہ اپنے شوہر جارجی کو گالیاں بکنے لگی کہ جارجی گھر پہ تھا ہی نہیں۔ کل رات ہی وہ کئی دن بعد گھر لوٹا تھا۔"

"اپنے پاس کیوں نہیں آئی؟ اُدھر دادا کے گھر دیدن کرنے آئی تھی تو بولا کیوں نہیں؟"

"کیا بولتا دادا! اپن اُس کا حال دیکھا تھا' گنپا کا اور دادا کی رانی کا..... اُن لوگ کو تمھارا ضرورت تھا' اُن لوگ کو تمھارا ضرورت ہے' پھر اپن تم کو کیا بولتا۔"

"پر یہ تیرا کام نہیں تھا۔"

اپن جانتا ہے' کس کا تھا' تم بھی یہی کرتا۔ نہیں تو اپن اوپر جا کے دادا کو کیا منہ دکھاتا اور اپن اکھا زندگی اپنے کو بھی کیا منہ دکھاتا۔ دادا نے اپن کو شادی میں خنجر دیا تھا اور جارجی کو بھی....."

"دیا تھا پر ....."

"اپن اُسی دن اُن باسٹرڈ کو اوپر بھیج دیتا۔ اتنا دیر ہی کبھی نہیں لگاتا۔"

"وکی اِدھری تھا؟"

"اُسی رات سے وہ گھر پہ تھا۔" ماری نے ترشی آواز میں بتایا۔ "دوسرا بھی تھا' نامی کُتّے کا جنا' پر وہ نکل گیا۔ وکی بھی نکل جاتا۔"

"وکی اُس رات گھر پہ تھا؟ کیا بولتی ہے' اُس کو تو نکل جانا چاہیے تھا۔ ہم سمجھے تھے' وہ اُدھر اپنے ٹھکانے گوا کو چلا گیا ہوگا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' تجمل کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اتنے یقین سے وکی کا نام کیوں لے رہا ہے۔ گویا تجمل نے جارجی کو پہچان لیا تھا۔

"وہ نکل جاتا پر وہ باسٹرڈ زخم کھا کے آیا تھا۔ آگے نہیں جا سکنے کا تھا۔ اُس رات کو سیدھا گھر آیا اور بولا' اپن کا لفڑا ہو گیا ہے ماری' اُدھر اندھیری ما۔ اپن اُس کے بولنے پر کوئی ڈاؤٹ نہیں کیا' اُس کا بینڈیج کیا۔ دوسرا صبح جب دادا کا پتہ لگا تو اپن سب جان گیا۔ رات کو وہ رنڈی کا..... کدھر گیا تھا اور کدھر سے چاقو لگا کے آیا تھا۔ بندوق وہ پھینک کے آیا تھا' کسی گٹر شٹر میں' ریوالور اُس کے پاس تھا۔ نامی اُس ٹائم اپن سے بول کے گیا تھا کہ وکی کے لیے ابھی تھوڑا سگریٹ اور برانڈی لے کے آتا ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ گوا بھاگ گیا یا اُدھری کہیں چھپا پڑا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے' پولیس کے ہاتھ پڑ گیا ہو' اپن کو نہیں معلوم....."

شکلا کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا مگر تجمل نے اُسے روک دیا اور ماری سے پوچھا۔ "تُو بولتی ہے' وکی چوٹ کھا کے آیا تھا؟"

"ہاں دادا!" ماری کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگی۔ "وکی کے بازو پر چاقو لگا تھا۔ ذرا سا سائڈ مار گیا' نہیں تو ٹھیک دل پہ لگتا۔ اپن وکی سے کچھ نہیں بولا' سمجھ گیا کہ دادا یا ماچھی نے گولی لگتے پہ گرتے گرتے چاقو مارا ہے۔ اپن کو پتہ ہے' دادا کا نشانہ کبھی آؤٹ نہ جاتا' پر گولی اندر اُتر گیا تھا....."

"مگر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وکی دادا کو مار کے آیا ہے اور اُس کا زخم دادا یا ماچھی کے چاقو ہی کا ہے؟" شکلا نے تمتماتی آواز میں پوچھا۔

"اپن اُن لوگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک نمبر کا بھڑوا لوگ ہے۔ اپنا ماں بہن کو بیچ دے۔ وہ آدمی کا....." ماری کی زبان اُس کے قابو میں نہیں رہی تھی۔ کہنے لگی' اُس رات زخمی حالت میں وکی اُس کے گھر آ گیا تھا۔ وہ نہ آتا تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اِس دوران کوئی اور' کوئی دوسرا آگے آ کے دادا کے خون کا اقبال نہ کر لیتا۔ ماری نے بتایا' جارجی نے گو پیرو کی سرزنش پر اپنا جوئے اور شراب کا خفیہ اڈّا بند کر دیا تھا اور پیرو سے معافی بھی مانگ لی تھی مگر جارجی بہت دُور جا چکا تھا۔ پھر یہ سانحہ ہُن کے گوا سے وکی آ گیا اور کئی بار آیا۔ وہ دیکھتی رہی کہ وہ دونوں کمرے میں رات رات بھر بند رہتے تھے اور ہر چند اُنھوں نے ماری کو اپنے راز و نیاز میں کبھی شامل نہیں کیا تھا لیکن ماری کے بہ قول وہ اُن کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اُس نے ایک بار جارجی کو تنبیہ بھی کی کہ وہ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہ دُہرائے' بہت پشیمانی ہوگی' پیرو دادا کو اب ممبئی سے کہیں نہیں جانا ہے۔ اِس بار وہ معاف نہیں کرے گا کیونکہ وہ ایک مرتبہ رعایت دینے کا قائل ہے۔ اُس نے جارجی کو سمجھایا کہ ہمارے لیے پیرو دادا سے مفاہمت ہی میں عافیت ہے۔ پیرو کے پہاڑ سے ٹکرانے میں اپنا ہی نقصان ہوگا اور ویسے بھی پیرو دادا نے ہم سے بدسلوکی کیا کی ہے۔ اُس نے جارجی کو

قلابے کے پاڑے کا بادشاہ بنایا ہے۔ ماری اپنے شوہر سے یہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ جارجی ناراض ہونے لگا کہ ماری کے دل میں ایسا خیال ہی کیوں آیا۔ جارجی نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ پیرو دادا کے لیے اُس کے دل میں کوئی عناد نہیں۔ ماری یہ سُن کے خاموش ہو گئی لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جب تک ڈکی جارجی کے ساتھ رہے گا، جارجی کے قدم بھٹکتے رہیں گے۔ پھر جب ایک دن ڈکی اُسے کسی بڑے عذاب سے دوچار کر دے گا تب شاید جارجی کی آنکھ کھلے۔ اُس نے کئی بار اپنے شوہر کو ڈکی سے دُور رکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ جتنا وہ جارجی کو ڈکی سے دُور رکھتی، ڈکی اُتنا ہی اُس سے قریب ہوتا جاتا۔

ڈکی کے گوا سے بار بار بمبئی آنے کے باوجود اُس کا جارجی کے پاڑے پر نہ جانا، اپنی آمد محض گھر تک محدود رکھنا، اپنی سرگرمیوں میں ماری کو شریک نہ کرنا، جارجی کی مستقلاً پیرو کے پاڑے پر ٹلنے اور عاجزی۔ لیکایک اپنی بیوی سے جارجی کا بدلا ہوا رویّہ، خوش کلامی اور خوش اطواری، ڈکی کا احترام۔ ماری نے رُندھی آواز میں بتایا کہ یہ سب دیکھ کے اُسے دھڑکا لگا ہوا تھا اور اُس کے خیال میں جارجی اور ڈکی کی سازباز، پُراسرار قسم کی سرگرمیوں کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ جوئے اور شراب کا منفعت بخش اڈّا دوبارہ کھولنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ سونے کا یہ درخت پیرو دادا نے ایک ہی ٹھوکر میں اکھاڑ دیا تھا۔ اسے دوبارہ پیرو دادا کی آندھی سے محفوظ رکھنے کی تدبیر یہی ہو سکتی تھی کہ اب کے اڈّا کسی دوسرے مقام پر کھولا جائے جہاں پیرو دادا کی رسائی نہ ہو سکے لہٰذا پیرو دادا کو کسی معاملے میں اُلجھانے کی سازش کی جائے۔ پولیس وغیرہ کا کوئی چکر چلایا جائے یا شہر کے داداؤں کو ورغلایا جائے تاکہ پیرو آئندہ اس قسم کی انفرادی آزادیوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ ماری کو یقین تھا کہ اس سے زیادہ اُن کے بس میں نہیں ہے اور وہ دادا کو کوئی نقصان پہنچائیں گے، اپنی رہی سہی بھی خاک میں ملا لیں گے۔ جارجی اور ڈکی کی تمام کمینگی اور مکاری کے باوجود ماری کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دونوں دادا کا پتھر ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ اتنے اندھے، اتنے پاگل ہو گئے ہیں۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے پہلے ماری نے ماہم کے پاڑے جا کے پیرو کو اشارۃً بھی کر دیا تھا کہ جارجی کا دماغ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ پیرو ہنسنے لگا اور ماری سے بولا کہ ہو جائے گا، وقت گزرنے پر خود ٹھکانے پر آ جائے گا مگر لگا خون آتنی آسانی سے نہیں چھوٹتا۔ وہ چلی آئی تاہم ڈکی اور جارجی کی ٹوہ میں لگی رہی، اس سے اُسے اضطراب کے سوا کچھ نہیں ملا۔ چار دن پہلے ڈکی پھر گھر آیا اور طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے زیادہ تر گھر میں بند رہا۔ اس مرتبہ ٹامی بھی اُس کے ساتھ تھا۔ ماری نے اُن کے گھر سے باہر چلے جانے کے بعد اُن کے سامان کی تلاشی بھی لی تھی اور سامان میں بندوق دیکھ کے اُس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ایک بار اُس کے جی میں آیا کہ وہ ڈکی کا کام تمام کر دے، ماری بلبلاتی آواز میں بولی۔ کاش اُس میں یہ حوصلہ آ جاتا تو آج سب کچھ بدلا ہوا ہوتا۔ ماری کے کہنے کے مطابق اُس نے ایک آدمی کے ذریعے ڈکی اور ٹامی کی آمد کی اطلاع ماہم کے پاڑے پر بیٹھے ہوئے جارجی کو پہنچا دی تھی۔ جارجی اپنے عزیز دوست ڈکی کو دیکھنے نہیں آیا تھا، اُس کی علالت کی خبر سُن کے بھی نہیں آیا، وہ ماہم کے پاڑے پر ڈیرا جمائے رہا حالانکہ تین چار دن سے پیرو اپنے پاڑے کے بجائے اندھیری کے پاڑے میں مقیم تھا اور اُس کی عدم موجودگی میں ماہم کے پاڑے پر جارجی کے مُکے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ دوسرے دن وہ گھر آیا تو خاصی عجلت میں تھا، تھوڑی دیر رُکا، پھر چلا گیا۔ ماری کو حیرت ہوئی، اُس نے ڈکی سے اپنی غیر حاضری کا نہ کوئی عذر کیا، نہ ڈکی نے اُس سے شکوہ کیا۔

اُس رات سورج غروب ہونے کے بعد ڈکی اور ٹامی گوا جانے کا کہہ کے نکلے تھے، اپنا مختصر سامان ساتھ لے کے جس میں بندوق بھی تھی۔ ماری نے سکون کی سانس لی۔ ڈکی کے چلے جانے پر ہمیشہ اُسے سکون نصیب ہوتا تھا مگر رات گئے ڈکی زخمی حالت میں واپس آ گیا اور اُس نے ماری کو بتایا کہ وہ گوا نہیں جا سکا، راستے میں اُس کا جھگڑا ہو گیا تھا، سامان بھی اُس سے چھن گیا ہے۔ یوں سمجھو کہ جان بچ گئی۔ ماری نے بظاہر ہمدردی کا اظہار کیا، اس مرتبہ ڈکی کی آمد سے اُس کا سینہ ایسا متلاطم نہیں ہوا۔ اُسے ایسا لگا جیسے قدرت نے خود ڈکی کو اُس کے پاس بھیجا ہو۔ ڈکی اُس کے رحم و کرم پر تھا۔ اُس نے سوچا کہ ڈکی کا شگاف اور گہرا کر دے اور پولیس کو خبر کر دے کہ زخم خوردہ ڈکی اُس کے گھر میں موجود ہے لیکن اُس نے یہ سوچ کے تحمل کیا کہ عجلت میں اُٹھایا ہوا کوئی قدم اُس کے لیے کسی بڑی مصیبت کا سبب نہ بن جائے۔ بہرحال اُس نے طے کر لیا تھا کہ ڈکی سے نجات کی ایک ہی صورت ہے، ڈکی کی موت۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار اُس کے دماغ میں آئی تھی لیکن پہلے اگر یہ کوئی خواہش تھی تو اب اِس نے فیصلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عزم کی استواری اور توانائی پر اُسے یک گونہ ڈھارس سی ہوئی۔ ماری کے بہ قول بس اُسے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

ماری کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ تجمل چُپ بیٹھا اُس کی صورت تک رہا تھا۔ شکلا نے چند لمحے توقف کیا کہ ماری دوبارہ زبان کھولے مگر ماری کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور کہنے کے لیے اِس کے سوا اُس کے پاس شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ "مگر یہ بہت ناکافی ہے۔" شکلا متوحش لہجے میں بولا۔ "ڈکی اور جارجی کو مجرم قرار دینے کے لیے یہ ثبوت ناکافی ہیں۔"

ماری نے بے چارگی سے اُسے دیکھا جیسے اُس کی سمجھ میں شکلا کی بات نہ آئی ہو یا کوئی جواب بن نہ پڑ رہا ہو۔

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ ڈکی ہی تھا؟" شکلا نے بے تابی سے کہا۔ "ڈکی دادا کے چاقو سے زخم لگوا کے آیا تھا، اُس نے تمھیں بتایا؟ کسی اور نے؟ یا محض تم نے پیرو دادا کے قتل کی خبر سُن کے یہ سمجھ لیا۔ ڈکی اور جارجی کی کوئی بات، دادا کے خلاف ہونے والی کسی بھی سازش کا، کوشش کے باوجود تمھیں پتہ نہیں چل سکا تھا۔ جیسا کہ تم نے کہا، تم سمجھتی تھیں کہ وہ دونوں پیرو دادا سے چھُپ کے اپنا کاروبار دوبارہ شروع کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اُن میں یہ جرأت نہیں...."

"پر ابھی کون دادا کا...." ماری چیخ کر بولی۔

"کیا بولتے ہو صاحب!" تجمل نے تلخی سے کہا۔

"دادا!" شکلا تیز آواز میں بولا۔ "پولیس عدالت میں ماری سے سوال کرے گی کہ...."

"کرے صاحب!" تجمل نے کہا۔ "اب آپ ٹھیکا لگاتے رہو، اس کے پاس دوسرا جواب کدھر ہے اور پھر کیا آپ اس کو تھپکی دے کے گھر کو لوٹا دوگے۔"

شکلا کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ پہرے دار دروازے پر منڈلا رہے تھے۔ "ٹھیک ہے ری!" تجمل لیکایک اُٹھ گیا۔ "کچھ اور رہ گیا ہو تو بول دے۔" ماری پر خفقان سا طاری ہوا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم، تم جا رہے ہو دادا؟...."

"بچوں کا پتہ بول دے۔" تجمل نے بھن بھناتے لہجے میں کہا۔

ماری سرتاپا لرزنے اور گھگھیانے لگی، ہاتھ جوڑ کے بولی۔

"اُن کو کچھ مت بولنے کا ہے، ایک بات بھی نہیں۔ ابھی ہو سکے تو اُن کو اپنا ہی میں رکھے رکھنے کا ہے، بول دینا، تمھارا ماں باپ دونوں مر گیا، کچھ بھی بول دینا۔ اپن نے بچہ لوگ سے ابھی تک اُکھا چھپا کے رکھا ہے، اُن کو نہیں بولا کہ اُن کا باپ پاڑا چلاتا ہے اور اپن.... اُن کو کچھ نہیں پتہ۔ ابھی چھوٹا ہے، وہ لوگ یہ سب دیکھے گا اور سنے گا تو کچھ نہیں پڑھ سکے گا۔ اپن کے پاس، اپن کے پاس...." ماری نے اپنے لباس میں کہیں چھپی ہوئی پوٹلی جیسی کپڑے کی ایک تھیلی نکالی اور تجمل کے قدموں میں ڈالتے ہوئے بولی کہ یہ اُس کی جمع پونجی ہے۔

"یہ کیا ہے؟" تجمل نے تھیلی اُٹھا کے ہلائی۔ وہ زیورات ہی ہوں گے، سکّے اور اشرفیاں وغیرہ، اُن کی جھنکار سے تجمل کی بھویں سکڑ گئیں۔ ماری نے تجمل کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کے بولی کہ یہ اتنا زیادہ نہیں ہے مگر یہی کچھ اُس کے پاس تھا۔ یہ مال چند سال ضرور اُس کے بچوں کی کفالت کر سکے گا۔

"اپنے پاس اس کی کمائی نہیں ہے ری!" تجمل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ تھیلی واپس کر دیتا لیکن اُسے خیال آیا کہ حوالات میں ماری کو اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔

ماری کہنے لگی کہ صبح اُن دونوں کو ختم کر دینے کے بعد وہ اپنے سینے میں بھی خنجر بھونک لیتی لیکن عین وقت پر اُس کا ہاتھ رُک گیا کیونکہ تجمل سے بات کرنے کے لیے اُسے کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔ وہ یہ باتیں کر رہی تھی اور اُس کی آواز تڑپ رہی تھی، اُس کا سارا وجود لرزاں تھا۔ کہنے لگی، دادا نے میرے اور تجمل کے بارے میں اُسے بہت کچھ بتایا تھا، بمبئی سے جانے سے پہلے اور آنے کے بعد بھی۔ دادا نے اُسے بتایا تھا کہ تجمل سے مل کے ایسا لگتا ہے جیسے کسی طویل خواب سے آنکھ کھل گئی ہو۔ اپنے ادھورے پن کا احساس اُسے تجمل سے مل کے ہوا تھا۔ ماری وہی کچھ کہہ رہی تھی جو میرے اور تجمل کے بارے میں پیرو کی زبانی سُن سُن کے پانڈے، سکندر اور پاڑے کے دوسرے دادا ہم سے کہہ چکے تھے۔ آدمی چلا جائے تو یہ سارا شہد زہر بن جاتا ہے۔ پیرو نے ماری سے کہا تھا کہ اب وہ ایک بڑے کنبے والا آدمی ہے۔ ایک بھائی اور بیٹا ہی نہیں، اُس کنبے میں اس کے اور بھی کئی بزرگ، کئی بیٹے بیٹیاں ہیں اور اُس نے ماری سے کہا تھا کہ اگر سچ پوچھو تو اب اُسے پاڑے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ پاڑے کا کوئی انتظام کر کے وہ باقی زندگی تجمل کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا، اپنے خاندان کے ساتھ ایک راحت کدے میں۔ ماری نے اُس سے التجا کی تھی کہ پیرو اپنے اُس کنج عافیت میں کوئی گوشہ اُس کے لیے بھی محفوظ رکھے۔ اُسے بھی تو وہ اپنی بیٹی کہتا ہے۔ ماری نے اُس سے کہا تھا کہ وہ بھی

بہت تھک چکی ہے اُس کا بس چلے تو وہ کہیں دُور چلی جائے اُسے جارجی کی بھی ایسی پروا نہیں وہ صرف اپنے بچّوں کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہتی ہے تاکہ اُن پر ماں باپ کی چھوٹ نہ پڑنے پائے پیرُو نے ہامی بھری تھی کہ ماری کو بھی وہ قلابے سے اپنے ساتھ لے جائے گا مگر یہ سب کچھ آنے والے وقت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلد پاڑے سے نجات پاتا ہے۔ یہ کنارہ کشی اتنی آسان نہیں تھی۔ ماری کے اصرار پر پیرو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مچھے اور جھل کو لے کے اُس کے گھر آئے گا اور اُس کے ہاتھ کی بھنی ہوئی مچھلی اور تلے ہوئے جھینگے کھائے گا۔ یہ چیزیں پیرو کو بہت مرغوب تھیں۔ ماری بزعم خود گنتی کے اُن چند لوگوں میں تھی جو پیرو کے گھر اُس کی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ جانتے تھے حالانکہ وہ پیرو سے اتنے تعلق خاطر کے باوجود اُس کے گھر کبھی نہیں جا سکی تھی۔

ماری مسلسل رو رہی تھی۔ جھل کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے شکلا اور میں بھی۔ ماری کی سسکیاں ہمیں دُور تک سنائی دیتی رہیں۔

کمرے میں کئی افسران موجود تھے اور شور گونج رہا تھا۔ شکلا کو دیکھ کے سب کھڑے ہو گئے اور سنّاٹا چھا گیا۔ ہیڈ میز پر پہنچ کے شکلا درمیان کی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی ہدایت پر وہ سب کمرے سے چلے گئے تھے لیکن شکلا دیر تک ہماری موجودگی سے اور اپنے آپ سے بھی بے خبر سا بیٹھا رہا۔ جھل نے بھی زبان نہیں کھولی، بیڑی پھونکتا رہا۔ اردلی چائے کی ٹرے لے کے آیا تو شکلا کو کچھ ہوش آیا اور کرسی پر اُس کا بکھرا ہوا جسم سمٹ گیا۔ اردلی نے چائے بنانے کے لیے اُس سے اجازت طلب کی تھی۔ شکلا نے جھڑکنے کے انداز میں اُسے منع کر دیا اور خود اپنے ہاتھ سے پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ میں نے چاہا کہ اُس کے ہاتھ سے چائے دانی لے لوں لیکن میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے۔ میں انکار بھی نہ کر سکا کہ مجھے چائے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اُس نے پیالی میرے آگے رکھی تو میں نے کسی معمول کی طرح تعمیل کی۔ شکلا نے چند گھونٹوں میں چائے ختم کر لی تھی۔ کرشنا جی کی طرح اُس کے چہرے سے بھی کسی تاثر کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن بر بست جیسے اُس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ آدمی بہت سمندر ہے پر سمندر ہے نہیں۔ سمندر کا پیالہ بھی کبھی تنگ پڑ جاتا ہے۔ شکلا کی آنکھوں میں دھند سی بھری تھی۔ چہرہ بھی جل سا رہا تھا۔

پھر دفعتہً جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ اردلی کے آنے پر شکلا نے نام بہ نام کئی افسران کو طلب کیا۔ وہ باہر منتظر ہی کھڑے تھے۔ اِدھر اردلی گیا، اُدھر وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ وہی افسران تھے جنھیں کچھ دیر پہلے شکلا نے کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ اُس نے اُن سے کرسیوں پر بیٹھ جانے کو بھی نہیں کہا اور منتشر لہجے میں ماری کے بارے میں پوچھا کہ کوئی تازہ رپورٹ ہو تو اُسے مطلع کیا جائے۔ ایک پختہ کار افسر نے، جسے شکلا نے پاٹل کے نام سے مخاطب کیا تھا، ایک قدم آگے آ کے ٹھیری ٹھیری آواز میں بتایا کہ ماری کے گھر سے مزید کوئی قابل ذکر چیز برآمد نہیں ہوئی۔ مکان کے اردگرد سے پولیس کا پہرا اٹھا لیا گیا ہے تاہم چند سپاہیوں پر مشتمل نفری مکان پر تعینات ہے۔ پاٹل کے پہلو میں کھڑے ہوئے ایک دوسرے افسر نے درمیان میں دخل دیا اور مودبانہ لہجے میں کہا کہ پولیس نے گھر کے اندر تمام کارروائی مکمل کر لی ہے۔ جس کمرے میں خون ہوا تھا، اُس کا سارا فرش لتھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے فرش صاف کرا دیا ہے۔ گھر کی الماری کا تالا توڑنے پر پرانے طرز کی ایک بندوق نکلی ہے، وہ استعمال کے قابل ہے لیکن اُسے استعمال نہیں کیا گیا۔ صندوقوں اور مچان پر پڑے کاٹھ کباڑ کی تلاشی کے دوران مختلف قسم کے چند چاقو بھی برآمد ہوئے ہیں اور کارتوسوں کے ڈبے بھی۔ اس کے علاوہ ایک تنبورا، ایک بینجو، ہارمونیم اور شراب کی بوتلیں۔ دیسی ولایتی دونوں قسم کی۔ گزشتہ رات واردات والے کمرے میں یقیناً شراب پی گئی تھی اور صرف دو ہی آدمی شریک تھے۔ کمرے میں خالی بوتل کے ساتھ دو گلاس پائے گئے ہیں۔ سارے گھر میں روپے پیسے اور زیورات وغیرہ جیسی کوئی چیز پولیس کو نظر نہیں آئی۔ گھر کی تمام چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ کسی جگہ بے ترتیبی کے آثار نہیں تھے اور گھر میں ضرورت کی تقریباً ہر چیز موجود تھی۔ سامان سے اہل خانہ کی نفاست، حسنِ ذوق اور نظم و ضبط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پولیس افسر بیشتر انگریزی میں مخاطب تھا۔ درمیان میں کہیں کہیں ہندوستانی بھی اُس کی زبان پر آ جاتی۔ جانے کیوں بار بار اُس کی نظر مجھ پر اور جھل پر منڈلاتی تھی اور اُس کی آواز دھیمی پڑ جاتی تھی۔ اُس کے بیان کے مطابق ماری از خود پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، واردات کے وقت سے پولیس اسٹیشن آنے تک کی مدت کے دوران ماری گھر میں کیا کرتی رہی ہے، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم ایسا لگتا ہے کہ ماری نے خاصی دیر گھر ہی میں لگائی۔ اُس نے روپے پیسے، زیورات وغیرہ کا کوئی انتظام کیا یا کچھ اور۔ ممکن ہے پولیس

اسٹیشن آنے اور اعتراف کرنے کا فیصلہ کرنے میں اُسے کچھ دیر لگی ہو۔ خنجر پر ماری کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ کسی پڑوسی نے شور غل کی آواز نہیں سُنی۔ قیاس ہے کہ اوّل صبح جب جارجی اور وکی سو رہے تھے، کمرے بند کر کے ماری نے اُنھیں ختم کیا۔ دونوں گہری نیند اور گہرے نشے میں تھے۔ محلّے کے لوگوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پڑوسی جارجی کے گھر سے دُور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ گنتی کے چند پڑوسیوں کے سوا اُس کے گھر کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ جارجی کی وجہ سے وہ ماری سے بھی کنارہ کیے رہتے تھے حالانکہ اُن کی نظروں میں ماری کو ایک خوش وضع، دردمند اور مظلوم خاتون کا درجہ حاصل ہے۔ ماری کے بچّے بہت سے پڑوسیوں نے نہیں دیکھے۔ کسی کے پوچھنے پر ماری نے بتایا تھا کہ اُس نے دونوں بچّوں کو اپنے ایک عزیز کے ہاں پونا بھیج دیا ہے۔ موجودہ مکان میں ماری اور جارجی کو رہتے ہوئے چند سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے وہ قلابے کے گنجان آباد عیسائی پاڑے میں رہتے تھے۔ وکی کے بارے میں بھی محلّے والوں کو کچھ علم نہیں، بس اتنا ہی کہ وہ کبھی کبھی اُسے جارجی کے گھر آتے جاتے دیکھتے اور گوا میں مقیم جارجی کے ایک رشتے دار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ جس وقت محلّے والوں سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی، اُنھیں جارجی کے گھر میں ہونے والے کسی حادثے کا علم نہیں تھا۔ پولیس کو اپنے علاقے میں جارجی کے گھر پر دیکھ کے وہ پریشان ہوئے تھے لیکن صرف جارجی کا گھر پولیس کا مرکز و محور تھا اس لیے اُن کی تشویش دہشت میں نہیں بدلی۔ اُن کے خیال میں جارجی کے ہاں کسی وقت بھی پولیس دستک دے سکتی تھی۔ اُنھوں نے صبح صرف ماری کو دیکھا جب وہ تھانے جانے کے لیے گھر سے نکلی۔ کسی کو اُس کی رفتار سے کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اُس نے کئی پڑوسیوں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔ وہ اُنھیں معمول کے مطابق پُرسکون اور خاموش نظر آئی۔

انسپکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شکلا نے اُسے روک دیا اور ایک تیسرے افسر کی جانب انگلی اُٹھائی جو اپنے ساتھی کی خاموشی کا منتظر تھا۔ شکلا کو اُس سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اوسط عمر کے اُس افسر نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق وکی کے بائیں بازو پہ چاقو کا ایک گہرا زخم لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں یہ زخم تازہ نہیں، کئی دن پہلے کا ہے۔ دونوں مقتولین کو ایک ہی خنجر سے ختم کیا گیا ہے، ایک ہی لمحے میں اور ایک وار پر اکتفا نہیں کیا گیا، پے در پے کئی وار کیے گئے کہ دونوں کو سنبھلنے

کا موقع نہیں ملا اور اُنھوں نے کم و بیش ایک ہی وقت آخری سانسیں لیں۔ انسپکٹر نے شکلا کو بتایا کہ ڈاکٹروں کی حتمی رپورٹ کا انتظار ہے اور بظاہر کسی پیچیدگی کا امکان نہیں ہے۔

شکلا کے استفسار پر پختہ کار افسر نے بتایا کہ قلابے کے پاڑے سے جارجی کے کئی ساتھی حراست میں لے لیے گئے ہیں لیکن باقاعدہ تفتیش ابھی شروع نہیں کی گئی ہے۔ شکلا نے اُس سے کہا کہ ٹامی نامی گوا کے ایک نوجوان داوا کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ ہو سکتا ہے، وہ گوا کی طرف نکل گیا ہو اور گزشتہ تین دنوں کے چھاپوں میں گرفتار ہو گیا ہو۔ وہ کہیں بھی نظر آئے، اُسے حراست میں لے لیا جائے۔ اگر وہ پہلے سے پولیس کی تحویل میں ہے تو اُسے قلابے کے تھانے منتقل کر دیا جائے۔

"یہ کون ہے جناب؟" پاٹل نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ بھی؟"

"نہیں۔" شکلا نے تندی سے کہا۔ "احتیاطاً کوئی حرج نہیں ہے۔" پھر شکلا نے خود ہی تردید کی۔ "یہ شخص بھی ایک کڑی ہے پاٹل اور پولیس کو شدت سے مطلوب ہونی چاہیے۔ فی الحال اتنا ہی سمجھو۔"

تینوں افسر دروازہ عبور کیا چاہتے تھے کہ شکلا کی آواز پر ٹھیر گئے۔ شکلا نے پاٹل کو مخاطب کر کے ماری کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُسے کسی دوسرے روشن اور ہوادار کمرے میں منتقل کر دیا جائے نیز ماری سے متعلق عدالت میں داخل کیے جانے والے تمام کاغذات پہلے شکلا کے سامنے پیش کیے جائیں۔

تینوں افسروں کے چہرے کھنچ گئے تھے تاہم اُنھوں نے مستعدی سے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئے۔

لمحے گزر گئے۔ اُن کے جانے کے بعد شکلا ساکت بیٹھا رہا۔ میری نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ خاصی دیر ہو گئی تو جھل نے دھیمی آواز میں کہا: "ایک چھٹی کرو صاحب۔"

"ہاں ہاں۔" شکلا سٹ پٹا سا گیا۔ "ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "آپ لوگ کو اب جانا چاہیے۔"

"بولو گے تو پھر آ جائیں گے، نہیں تو آدمی بھیج دینا۔"

شکلا نے جواب نہیں دیا، کچھ سوچتا رہا۔ جھل اُٹھنے لگا تو شکلا اضطراری لہجے میں بولا۔ "ایک منٹ ٹھیرو داوا!"

جھل کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"داوا! وہ کہتی ہے، اُسے یقین تھا کہ پیرو کو ختم کرنے والے وہی دو تھے۔ یہ خون اُس کے یقین کا ثبوت ہیں لیکن داوا! اُس کا یقین غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"پر آپ کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔" شکلا تیزی سے بولا۔ "لیکن دادا کے قاتل پھر رہ جاتے ہیں اور پولیس کا کام ختم نہیں ہوتا سمجھے دادا!"

"پولیس کا کام تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔" تجھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پھر آپ لوگ کا کیا ہوگا۔"

"ہونہہ! یہ بھی ٹھیک بولتے ہو دادا!"

"تھوڑا دھیان دیں تو ایک بات بولیں صاحب۔" تجھل نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"کیا، کیا بات ہے دادا؟"

"ہو سکے تو آپ اندھیری کے راجن دادا کو چھوڑ دو۔"

مجھے بھی حیرت ہوئی۔ شکلا بھی چونک پڑا۔ "راجن کون راجن؟"

"اندھیری میں شیلا نام کی جس عورت کے خون میں اُس کو اندر رکھا گیا ہے۔"

"ہاں ہاں لیکن اُس کا اِس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"سمجھیں تو بہت نکل سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! صاف صاف بولو دادا!"

"سب صاف ہے صاحب! ابھی پولیس نے اُس کا کھوج کب لگایا ہے۔"

"ہاں نہیں لگا سکی ہے لیکن پولیس نے اندھیری کے علاقے سے اور گرفتاریاں کی ہیں۔ وہ کچھ کم اُلجھا ہوا معاملہ نہیں ہے مگر مگر....." شکلا بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ختم ہونے سے پہلے پیرو دادا تین چار دن سے اُدھر اندھیری میں تھا۔ اندھیری کا باڑا ماہم کے باڑے سے جُڑا ہوا ہے۔ دادا کو پتہ لگنے پر اُدھر جانا تھا۔ آپ شاید جانتے ہیں، باڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"آگے بولو دادا!"

"دادا نے اُدھر پہنچ کے ساری گھما پھری چھان پھٹک کی تھی اور تھانے جا کے بولا تھا، راجن کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ راجن کوئی زنخا ہنڈیلا نہیں ہے جو ایک عورت پر ہاتھ اُٹھائے۔ جس ٹائم راجن کی رکھیل کا خون ہوا، راجن اُس کے پاس نہیں تھا۔"

"مجھے یہ کیس کسی حد تک معلوم ہے۔ معلوم بھی ابھی پیرا بھی لیس کی چھان بین کے دوران ہوا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، پیرو دادا تین یا دن سے اندھیری میں تھا اور اُس نے راجن کو بے گناہ قرار دینے کی بہت کوشش کی تھی۔ وہ بار بار پولیس سے یہی کچھ کہتا رہا۔ اُس نے چند ایسے لوگوں کے نام ثبوت کے طور پر بتائے جنھوں نے راجن کو اُس رات اُس کے گھر سے باہر دیکھا تھا۔"

"اُس رات راجن اپنی رکھیل کے ساتھ گھر پہ ہی تھا صاحب!"

شکلا کرسی پر سیدھا ہو گیا۔

"پر کوئی حرام کا..... اُدھر دہائی دیتا ہوا آیا اور راجن کے پرانے اسامی کسی سیٹھ ساہوکار کا نام لے کے بولا، اُس کے ہاں چکر ہو گیا ہے اور پولیس آئی پڑی ہے۔ یہ سُن کے راجن اُلٹا ہو گیا۔ رکھیل سے بول کے باہر کو نکلا۔ اُدھر سیٹھ کے ٹھکانے پہنچا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ لوٹ کے رکھیل کے پاس آیا تو وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔"

"راجن یہی کہانی سناتا ہے۔" شکلا نے برہمی سے کہا۔ "سیٹھ کے آدمی بھی یہی کہتے ہیں کہ اُس رات راجن گھبرایا ہوا سیٹھ کے گھر آیا تھا، وہاں سناٹا دیکھ کے گالیاں بکتا لوٹ گیا۔ پولیس کو اِس کہانی پر یقین نہیں ہے۔ اسی بیچ اُس عورت کا قتل ہوا۔ سیٹھ کے ہاں ہنگامے کی خبر سُن کے گھر سے نکلنے اور گھر واپس آنے کا عرصہ اتنا کم ہے کہ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایک بالکل اجنبی آدمی کے آنے پر راجن کچھ سمجھے سوچے بغیر گھر سے نکل جاتا ہے۔ آدمی سے کچھ پوچھتا پاچھتا اور روک کے ساتھ چلنے کو نہیں کہتا۔ بہرحال پولیس نے عدالت میں یہ کیس پیش کر دیا ہے۔ راجن چھوٹ بھی سکتا ہے، سزا بھی پا سکتا ہے۔"

"پر وہ راجن نہیں تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو، کس بنیاد پر؟"

"راجن کو ہم نہیں جانتے پر وہ باڑے کا دادا ہے، اندھیری کے باڑے کی گدی کا دادا۔ ایسے ہی کوئی باڑے کی گدی پر نہیں بیٹھ جاتا۔ پیرو دادا نے ہم کو اُس کے بارے میں سارا بولا تھا۔ دادا ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا اور شاید ہم آپ سے۔ آپ عدالت بھی نہیں ہو جو ہم کو کانٹے پہ رکھ کے زبان کھولنی پڑے۔ راجن اپنی رکھیل کو بیوی کی طرح رکھتا تھا۔ اُس کو ختم کرنے کے لیے راجن کے پاس آدمی لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ راجن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خبر سُن کے گھر میں نہیں رُک سکتا تھا۔ وہ اُس آدمی کو نہیں جانتا تھا پر جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کوئی بھی آدمی اُسے خبر دینے آ سکتا تھا۔ اُس کو روک کے اور آگے پیچھے کا جان کے گھر سے نکلنے والا کوئی اور ہوتا صاحب! باڑے کا دادا نہیں ہوتا۔ دادا اپنے بل پہ جُرم کرتا ہے، گھر میں چھپ کے نہیں بیٹھ جاتا۔ زیادہ دُوری نہیں تھی اور آدمی نے نام ایسے سیٹھ کا بولا تھا کہ راجن کو گھوم جانا تھا۔ اپنی رکھیل

سے بول کے وہ گھر سے نکلا اور جلدی لوٹ آیا۔ آیا تو سارا بگڑا ہوا تھا۔ راجن کو پھر کیا کرنا تھا صاحب؟"

شکلا تجھل کی صورت دیکھتا رہا اور کسمساتی آواز میں بولا۔

"راجن کو پاس پڑوس کو جگانا چاہیے تھا۔"

تجھل نے اُس سے کہا کہ شور مچا کے راجن تماشا بناتا اور لوگوں کو شہادت میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ کیا اِس طرح وہ الزام سے بری ہو جاتا؟ راجن کو سب جوں کا توں رہنے دینا چاہیے تھا، کوئی چیز چھیڑنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ محلّے میں ہنگامہ نہیں کرتا۔ مشکل وقت میں باڑے کے دادا کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ راجن کو بہت اہم فیصلہ کرنا تھا۔ ایک دادا کی طرح اُس نے ضبط اور حوصلے کا ثبوت دیا اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے باڑے جا کے پہلے اپنے آدمیوں کو بتائے پھر پولیس کو خبر کرے۔ راجن نے یہی سوچا تھا کہ پولیس نے پھندا ڈال دیا۔

"مگر پولیس نہیں سمجھتی کہ راجن گھر سے نکلا تھا۔ سیٹھ کے آدمی اُس کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے۔ پولیس کا خیال ہے کہ نہ کوئی آدمی آیا، نہ راجن کسی سیٹھ کے ہاں گیا، نہ وہاں سے لوٹ کے گھر آیا۔"

"تو پولیس کو کیسے پتہ چلا صاحب!" تجھل نے زیرِ خند سے کہا۔

"پولیس کو!" شکلا پہلو بدلنے لگا۔ "مجھے علم نہیں کہ پولیس کو اِس واردات کا کب اور کیسے علم ہوا۔"

"اپنے کو پتہ ہے۔" تجھل نے سرد لہجے میں کہا کہ راجن کے جانے کے بعد کسی نے شور مچا کے محلّے والوں کو متوجہ کیا کہ اندر گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اُس نے چیخیں سُنی ہیں اور گلی میں ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ راجن کی طرف اشارہ نہ کرتا تو بھی اُس کا شور مچانا ہی کافی تھا۔ حواس باختہ پڑوسی گھروں سے باہر نکلے۔ انھوں نے اُس عورت کے گھر پہ دستکیں دیں۔ جواب نہیں ملا تو انھوں نے کسی گشتی پولیس والے کو ڈھونڈا، سارا ماجرا اُسے سنایا اور یوں وہ گھر میں داخل ہوئے جہاں معاملہ کچھ اور تھا۔

"ہاں شاید یہی کچھ پیش آیا۔" شکلا مذبذب سے بولا۔

"وہ لمبے کان والا..... کا جنا کون تھا جس نے فیل مچا کے پاس پڑوس کی نیند چوپٹ کی۔ کسی کو اتنی جلدی پتہ چل گیا کہ اُدھر اندر سے خون کی بو آتی ہے۔ پڑوسی بولتے ہیں اُن لوگ نے کوئی شور شرابا نہیں سُنا، سڑک پہ چلنے والے نے سُن لیا؟"

شکلا مضطربانہ انداز میں سر ہلانے لگا۔ تجھل نے اُس سے کہا کہ واویلا کرنے والے راہ گیر نے اپنی چیخ پکار پہ گلی میں اکٹھے ہونے والے پڑوسیوں کو بتایا کہ اُس نے فلاں گھر سے چیخیں سُنی ہیں اور گلی میں ایک آدمی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی بیک وقت یا چند لمحوں کی تاخیر سے دونوں کام ہوئے، چیخ سننا اور گلی میں آدمی دیکھنا۔ اُس نے چیخ پہلے سُنی یا آدمی پہلے دیکھا؟ اُس نے پہلے آدمی دیکھا اور چیخ بعد میں سُنی تو گویا عورت اُس وقت زندہ تھی اور راجن ایک عورت کو زخمی کر کے گھر سے بھاگ رہا تھا اور بالفرض راہ گیر نے چیخ پہلے سُنی جب وہ گھر سے کچھ فاصلے پر تھا اور راجن کو گھر سے نکلتے ہوئے بعد میں دیکھا جب راہ گیر گھر سے کچھ قریب ہو چکا تھا تو اُس نے راجن کا نام نہیں لیا، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ پڑوسیوں کی نظر میں اُس عورت کے حوالے سے وہ راجن کے سوا کون ہو سکتا ہے مگر وہ راجن ہی کیوں ہو؟ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ راہ گیر نے راجن کا نام بھی لے دیا تھا، کسی خوف سے اُس نے راجن کے دُور چلے جانے کا انتظار کیا تب شور مچایا مگر وہ خود کہاں چلا گیا؟ کیا وہ پولیس کو دستیاب ہو گیا، پڑوسیوں نے اُسے کہاں کھو دیا؟ وہ اُنھیں جگا کے پھر کہاں غائب ہو گیا؟ اُسے کسی نے تلاش کیا؟

تجھل چپ ہو گیا اور نئی بیڑی سلگا کے کش لینے لگا۔

"تم تم پھر کیا سمجھتے ہو دادا؟" شکلا بے چینی سے بولا۔

"آپ وردی والے ہو اور بڑے افسر ہو۔ آپ کو ہم سے زیادہ چھلنی کرنا آتا ہے۔ ہم آگے کیا بولیں۔"

"میں نے تمھیں بتایا ہے دادا کہ میں اِس کیس سے اتنا باخبر نہیں ہوں لیکن اگر اِس کا تعلق پیرو دادا سے نکلتا ہے تو میں جاننا چاہوں گا۔ تم بولو دادا!" شکلا کی آواز میں اصرار شامل تھا۔

تجھل نے اُسے بتایا کہ رات کا وقت تھا، گلی سنسان ہو چکی تھی۔ راجن چپکے سے گھر سے نکل جاتا تو باقی رات بھی گزر جاتی۔ صبح ہو جانے پر کسی کو معلوم ہوتا مگر اُسی وقت کسی نے شور کیوں مچایا؟ اِس لیے کہ وہ راجن کو لاش غائب کرنے اور کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت دینا نہیں چاہتے تھے۔ راجن کو وقت مل جاتا تو وہ ایک ہی رات میں سارا نقشہ بدل سکتا تھا۔ وہ راجن سے خوب واقف تھے۔

شکلا میز پر کچھ اور جھک آیا۔ تجھل نے کہا کہ پولیس نے ضرور کسی دوسرے امکان پر غور کیا ہوگا لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تو اُس نے راجن ہی کو غنیمت جانا تاہم علاقے میں چھاپے اور دوسری گرفتاریوں سے یہ مراد ہے کہ پولیس کا یقین متزلزل ہوا ہے۔ پولیس کو کوئی آلہ بھی گھر سے دستیاب نہیں ہوا۔ وقت کا تعین بھی مشکل ہے اور کوئی چشم دید گواہ بھی نہیں ہے۔

"تمھارے خیال میں پھر وہ کون تھے؟" شکلا نے بے تابانہ پوچھا۔

"اب بھی آپ پوچھتے ہو وہ کون تھے صاحب!" تجمل نے ناگواری سے کہا۔ "اُن کو پتہ تھا کہ راجن کس ٹائم کو عورت کے پاس جاتا ہے کب تک اُدھر پڑا رہتا ہے۔ کون سے سیٹھ سے اُس کا لاگ الاپ ہے جس کے وہاں ٹنٹے کی ہوائی سُن کے اُس کی کھوپڑی اُلٹ سکتی ہے اور اُس کا جیل جانا دادا کتنا دل پر لے سکتا ہے کیا مرکھنا ہو سکتا ہے۔"

تجمل نے شکلا کو بتایا کہ وہ پیرو کے مزاج آشنا تھے۔ پیرو کی ذمے داری بھی کہ وہ اپنے زیرِ نگیں اندھیری کے پاڑے پر فوراً جائے اور صورتِ حال سمجھے اور اُسے قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔ کسی پاڑے کے بھتے میں حصے دار بننے کا مطلب اُس پاڑے پر آنے والی کسی آفت میں شرکت بھی ہے اُسے ہر ممکن تحفظ کی ضمانت دینا۔ چنانچہ راجن کے دفاع کے لیے پیرو کا اپنے پاڑے سے باہر نکلنا لازم تھا۔ وہ پیرو کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُسے اپنے پاڑے سے باہر نکلنے اور اُس کے معمولات میں رخنہ ڈالنے میں۔ پیرِ اندھیری پہنچ کے مسلسل دوڑ بھاگ کرتا رہا۔ اُس کے کام بہت سے تھے۔ ایک طرف اندھیری کے پاڑے کے دل شکستہ اور برگشتہ لوگوں کی لگام کھینچے رکھنا علاقے میں اصل واقعے کے شواہد ڈھونڈنا، پولیس سے راجن کی وکالت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ادھر اُنھوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کے اُسے سکون سے نہیں بیٹھنے دیا۔ پیرو کی نظر میں اگر راجن کا جرم ثابت ہو جاتا تو اُس کا اندھیری میں تادیر ٹھیرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اُس کا کام کسی نئے دادا کی تقرری پر ختم ہو جاتا لیکن راجن کی روداد میں اُسے بہت سارا سچ نظر آیا اس لیے پیرو کو زیادہ تگ و دو کرنی پڑی۔ اچھا پھل برآمد ہونے کی امید آدمی کی کوشش بڑھا دیتی ہے۔ یقیناً پیرو نے پہلے اندھیری کے پاڑے پر راجن کے ساتھی ٹٹولے ہوں گے، پھر علاقے کے سیٹھ ساہوکار چھانے ہوں گے جن سے راجن کے خاص مراسم تھے یا جو راجن سے ڈر کھاتے تھے۔ کسی اور جانب بھی اُس کی نگاہیں بھٹکتی رہی ہوں گی۔ یہ پیرو کے لیے، شہر کے سب سے بڑے دادا کی حیثیت سے وقار کا مسئلہ تھا اور خود اُس کے اپنے دل کے اطمینان کا بھی۔

ایک اور وجہ بھی تھی۔ ممبئی سے پیرو کی عدم موجودگی کے دوران تین پاڑے سرکشی اختیار کر چکے تھے۔ اندھیری کا پاڑا بھی اُن میں شامل تھا اور گو سبھی پیرو کی واپسی پر دوبارہ ماہم کے پاڑے سے وابستہ ہو چکے تھے لیکن اُن میں اپنا اعتماد بحال کرنے بلکہ فروغ کرنے اور شہر کے دیگر پاڑوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ پیرو ایک زندہ حقیقت ہے اور اُس سے مفر ممکن نہیں، راجن کے معاملے میں پیرو کی سرگرمی ایک فطری واقعہ ہے مگر اُسے کیا اندازہ تھا کہ وہ خود نرغے میں آ چکا ہے، گلی کے کتوں نے ایکا کر لیا ہے اور گھات لگائے اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ جنگل کے شیر کو اُس کے پس خوردہ پلے ہوئے بھیڑیے پہلے ہی سے مار سکتے ہیں۔ وہ بس کسی ایک موقع کی تلاش میں تھے۔ اس کام میں اُنھیں دیر بھی لگ سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے، اُن کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو لیکن اُنھیں ماہم کے پاڑے پر کسی سے معلوم ہو گیا کہ آج رات کاٹنے کا چالیسواں ہے اور پیرو جولین کے گھر بائدرے جا سکتا ہے۔ پیرو نے شرکت کا مشروط وعدہ کیا تھا کہ آ سکا تو آ جائے گا مگر اُس نے کسی طرح وقت نکال لیا کیوں کہ گھنٹے کی بات تھی۔ اُدھر وہ اندھیرے میں چھپ کا ڈھے اُس کی واپسی کی راہ تکتے رہے۔ مایچی پیرو کے ساتھ تھا۔ اس سے بہتر صورت اُن کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

"تمھارا مطلب ہے جارجی اور دکی؟" شکلا ہکلاتے ہوئے بولا۔

"جارجی تو شور کا ..... ماہم کے پاڑے پر پڑا ایڈ رہا تھا۔" تجمل کی آواز کڑوی گئی۔ اُس نے شکلا کو بتایا کہ دکی اور ٹامی کے علاوہ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے یہاں کے نہ ہوں گو اسے اُن کے ساتھ آئے ہوں اور ماری بھی اُنھیں نہ جانتی ہو۔ کسی اور کا نہیں، پیرو دادا کا معاملہ تھا، اُن کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ راجن نے جارجی کی دیکھا دیکھی جارجی کی شہ پر ماہم کے پاڑے کا بھتا بند کر دیا تھا لیکن جیسے ہی اُسے پیرو کی واپسی کی خبر ملی وہ رقم لے کے آ گیا اور اُس نے پیرو کے پیر پکڑ لیے۔ راجن کی یہ ہزیمت جارجی کے لیے دل شکنی کا باعث ہو گی کہ ایک اور بُت ٹوٹ گیا۔ راجن کی محبوب عورت کے قتل کا سبب راجن سے عناد نہیں تھا۔ جارجی کو معلوم تھا کہ راجن کے پاس ورارات بھی ہے، وہ بدنصیب تو چارہ بن گئی۔ اندھیری کا انتخاب اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ ماہم سے اندھیری کا فاصلہ خاصا ہے۔ قلابے سے اور زیادہ۔ پولیس اُن سے دُور ہی رہے گی اور اُنھیں راجن کی رکھیل جیسی کسی اجنبی عورت ہی کو منتخب کرنا چاہیے تھا۔ ایک ایسی عورت جس کا تعلق کبھی بازار سے رہا ہو اور متعدد آشناؤں سے ربط خاطر۔ اُس عورت سے جارجی اور دکی کا کوئی رابطہ یا واسطہ نہیں ہو گا۔ وہ کبھی راجن کے گھر بھی نہیں گئے ہوں گے۔ عورت سے کہانی ہی کچھ اور سمجھ میں آتی ہے پولیس کرداروں کو کھوجتی رہے، پس منظر کے لیے مایتی رہے۔ اندھیری ہی کے علاقے میں راجن کے ساتھیوں اڑوسیوں پڑوسیوں کو نوچتی رہے اور راجن کے سر پر تلوار لٹکی رہے اور پیرو بھی اندھیری میں گلی گلی بھٹکتا، سر پٹکتا رہا ہے۔ اندھیری میں پیرو کی آمد، راجن کے دفاع کے لیے اُس کی بے تابیوں سے پولیس اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اندھیری کے علاقے میں راجن کے حریف ڈھونڈ رہا تھا اور اُس نے راجن کے جرم پر پولیس کا یقین پھیکا کر دیا تھا۔ پولیس جانتی تھی کہ یہ بات راجن کے بدخواہوں اُس عورت کے قاتلوں کے لیے کتنے تردد کا سبب ہو گی۔ سو اُنھوں نے اپنے گریبان تک پیرو کے ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہی اُس کا کام تمام کر دیا۔ ایسی صورتِ حال میں پولیس کو یہی قیاس کرنا چاہیے۔ جارجی اور دکی پر آنچ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جارجی مستقل ماہم کے پاڑے پر رہا اور دکی کو ممبئی کی پولیس جانتی نہیں تھی۔

تجمل خاموش ہو گیا۔ شکلا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں مگر ابھی یہی حال تھا۔ تجمل بڑی بیتاب رہا۔ شکلا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو تجمل نے اجازت مانگی۔

"نہیں دادا! ابھی بیٹھو۔" شکلا ٹھٹھری ہوئی آواز میں بولا۔

"ہو سکے تو ایک چائے اور منگوا دو صاحب!"

"ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں۔" شکلا نے گھنٹی بجائی۔ اردلی کے آنے پر اُس نے تیز تیز لہجے میں چائے لانے کا حکم دیا اور تجمل سے پوچھا کہ اُسے کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ تجمل نے انکار کر دیا۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا، ابھی میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہ چونک کے بولا۔ "کھانے کا وقت بھی ہو چکا ہے، بلکہ گزر رہا ہے۔ مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔"

"نہیں صاحب! مہربانی۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"گھر اتنا دُور نہیں ہے۔" شکلا جھجکتے ہوئے بولا۔ "ہم موڑ میں جائیں گے۔"

"اپنے کو بھوک نہیں ہے صاحب!"

"سچ پوچھیے تو مجھے بھی نہیں ہے۔"

شکلا نے اصرار نہیں کیا اور کہنے لگا۔ "کچھ اور تو نہیں رہ گیا ہے دادا؟"

"یہ تو آپ بولو صاحب!"

"نہیں دادا! شاید کچھ بھی نہیں۔" شکلا کی آواز پر افسردگی چھا گئی۔ "یہ سب کچھ میرے لیے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"ابھی تو لمبی پڑی ہے صاحب!" تجمل نے تنک کے کہا۔

"پر کبھی جی کرتا ہے کہ بہت مختصر ہو جائے۔" شکلا شکستہ لہجے میں بولا۔ "یہ قلابے کا دادا جارجی تو پر دادا کا بنایا ہوا تھا۔"

"بنایا تھا پر شرط نہیں ہے صاحب! اوپر والے کے ساتھ بھی ایسا ہے۔"

شکلا پلکیں جھپکانے لگا۔

"وہ دادا نہیں رہے تھے صاحب!" تجمل نے کہا۔ "اڈے پاڑے کا دادا اور ہوتا ہے۔"

"وہ کیسا ہوتا ہے؟"

تجمل نے کہا کہ دادا لوگ کبھی ایک دوسرے کو ایک پل نہیں بھاتے پر بل بوتا نہ ہو تو اپنے حریف کو ٹھکانے لگانے کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کرتے ہیں۔ تجمل کے بہ قول ادھر کی لڑائی لڑتے ہیں، شطرنج کی بازی کھیلتے ہیں لیکن وہ بندوق تان کے پیٹھ پیچھے سے وار نہیں کرتے، جو ایسا کرتے ہیں وہ دادا کے بھیس میں چور اچکے اُٹھائی گیرے ہوتے ہیں۔ کسی دادا کو اُٹھائی گیرا بننے میں دیر نہیں لگتی۔ دادا بننے میں عمر لگ جاتی ہے۔ دادا تو بہت کم ملتے ہیں اور اُنھی کے دم سے پاڑا آگو اچھلتا ہے۔ دادا گیری الگ چیز ہے، دادا ہونا الگ۔

شکلا انہماک سے سُنتا رہا اور بے کلی سے بولا۔ "لیکن یہ دادا کیا بات تھی جو جارجی اس حد تک، میرا مطلب ہے، اتنی دُور چلا گیا یا مشتعل ..... ماری کی اور تمھاری باتوں سے مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چکا ہے لیکن ....."

"دھندے میں پڑنے والا دادا، دادا نہیں رہتا صاحب!" تجمل نے بھڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "دادا لوگ بہت اُلٹ پھیر کرتے ہیں پر عورت نہیں چلاتے۔ دھندے میں پڑنے والا دادا دل

بنانے والا دادا بچھو بن جاتا ہے۔ جارجی نے پہلی بار دھن دولت دیکھی تھی۔" تجمل نے شکلا سے کہا کہ دھن دولت میں دارو کا سا زور ہے، جتنا پیتے جاؤ، نشہ بڑھتا ہے لیکن پاڑے کے دادا کا نشہ اُس کا بَل ہے۔ دولت اڈّے پاڑے کی ضد ہے اور بَل کے لیے زہر ہے۔ سانپ کی طرح بَل کو جکڑ لیتی ہے۔ پاڑے میں آدمی مال بنانے نہیں آتا ورنہ سارے اڈّے پاڑے جوہری بازار ہوتے اور اُن کی جگہ محل دو محلے کھڑے ہوتے۔

"مگر دولت بھی بڑی طاقت ہے دادا! بہت زور ہوتا ہے اُس میں۔" شکلا نے بے دلی سے کہا۔

"ہوتا ہے صاحب! بہت ہوتا ہے پر اپنا بَل نہیں رہتا، مانگے کا، پرائے جیسا۔ آدمی اپنا بھی کھو دیتا ہے۔ دُوری کہیں بھی نہیں ٹوٹتی۔ آدمی بھاگتا رہتا ہے، ساری سمیٹ لینے کو۔ دولت کا مطلب ہے، آدمی صرف اپنا ہو گیا۔ پاڑے کا آدمی ایک اپنا ہی نہیں ہوتا۔ آپ نہیں سمجھو گے صاحب!" تجمل نے تندی سے کہا۔

"میں سمجھ رہا ہوں دادا اور..... اور سمجھنا چاہتا بھی ہوں۔"

تجمل نے کہا کہ وکی نے جارجی کی آنکھوں میں چربی بھر دی تھی۔ جارجی کی عمر اتنی پختہ نہیں تھی اور عمر سے ایسا فرق بھی نہیں پڑتا۔ آدمی خود کچا ہو تو ماہ و سال کی گردش بھی کچھ کر نہیں پاتی۔ تجمل نے شکلا کو بتایا کہ ممبئی سے پیرو کی سات آٹھ ماہ کی عدم موجودگی کے باعث جارجی نے اپنے ایک نوجوان رشتے دار وکی کی تحریک اور اعانت سے قلابے کے ساحل پر جوئے، شراب اور عورتوں کا خفیہ اڈّا کھول لیا تھا۔ یہ سمجھ کے کہ پیرو کہیں مر کھپ گیا ہے۔ اُس نے ماہم کے پاڑے سے بھی ناتا توڑ لیا۔ ممبئی واپس آنے پر پیرو کو جیسے ہی خبر ملی، وہ جارجی کے سر پہ پہنچ گیا اور اُس کی خوب گوشمالی کی کہ یہ حرکت کسی دادا کا شیوہ نہیں ہے۔ جارجی کو اڈّا فوراً بند کرنا پڑا اور دوسرے دن اُس نے ماہم کے پاڑے آ کے خود کو پیرو کے سپرد کر دیا اور پیرو کی زندگی تک بیشتر پاڑے پر بیٹھا ہوا عاجزی کرتا رہا۔ بگڑا ہوا دادا کتا بن جاتا ہے پھر اُس کے لیے کوئی سمت، کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ پیرو دادا کو اُسی رات اُس کی آنکھیں نکال لینی چاہیے تھیں۔ پیرو نے اُسے چھوڑ دیا۔ بعد میں وہ پاڑے آیا تو بھی اُس کا خیال آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ پیرو اُسے اندر باہر سے جانتا نہ ہو۔ یقیناً پیرو نے ماری کی خاطر اُسے چھوٹ دی تھی اور سمجھا تھا کہ لوٹ پھیٹ کے ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔ بیٹھا تو وہ مستقل پاڑے ہی پر ہے۔ داداؤں کو یہ رعایتیں راس نہیں آتیں۔

لگتا ہے، پیرو ابتدا ہی سے اُسے ماری کی رعایت دیتا رہا تھا جبھی گدی پر بٹھا دیا۔ کچا دادا کچے لوہے کی طرح پگھل جاتا ہے۔ پیرو کے بل وہ چلتا رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ پیرو دادا سے اس کا کیا تعلق ہے۔

اردلی نے چائے لا کے رکھ دی۔ تجمل کے منتشر ہونے کے خیال سے شکلا نے ٹرے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تجمل خاموش ہو گیا تو اُس نے چائے بنائی۔ پیالی خالی کرتے ہی تجمل اُٹھ کھڑا ہوا۔ شکلا بھی گھبرائے ہوئے انداز میں کرسی سے اُٹھ گیا۔ وہ کہیں اور رکنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کے رہ گیا اور ہمارے ساتھ ہی دروازے سے باہر نکلا۔ کمرے کے باہر موجود افسران اور سپاہی شکلا کو دیکھ کے اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ شکلا ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ "آپ بیٹھو صاحب!" تجمل نے چبوترے کی سیڑھی سے اُتر کے کہا۔ "ہم چلے جائیں گے۔"

"نہیں دادا! آپ جیپ میں بیٹھو۔" وہ قریب کھڑی ہوئی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ کو چھوڑ آئے گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں صاحب!"

"بیٹھ جاؤ دادا!" شکلا کا لہجہ گزارشانہ تھا۔ "میں نے آپ لوگوں کو بلایا تھا۔"

"آپ کسی ٹائم بھی حکم کر سکتے ہو۔ آپ کی ڈیوٹی ہے۔"

"نہیں دادا! ایسا مت کہو۔" شکلا کی آواز تمتما رہی تھی۔ اُس نے تجمل کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔ "بہت بوجھ تھا سر پہ دادا!"

"اپنے کو پتہ ہے صاحب!"

"جیسے ہی تھانے میں ماری کے آنے کی خبر ملی، میں سیدھا پیرو دادا کے گھر گیا تھا۔ وہاں جولین سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ دس منٹ پہلے نکل گئے ہیں۔ میرا پاڑے آنا شاید ٹھیک نہیں تھا۔"

"وہ آپ کی جگہ نہیں ہے۔"

"پر اب پاڑا دیکھنے، پاڑے پہ آنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اُدھر آدمی لوگ ہی ہوتے ہیں صاحب!"

"ہاں ہاں دادا!" شکلا بے قراری سے بولا۔ "اُنھی کو دیکھنے، اُنھی کو دیکھنے۔"

"ضرور آؤ صاحب!" تجمل کے لبوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ وہ ڈنڈا پکڑ کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ میں بھی بیٹھنے کو تھا کہ شکلا نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے افسوس ہے ظہیر!" وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ "میں تمھیں بتاؤں، مجھے بہت خوف تھا۔ یقین کرو، میں ان دنوں سو بھی نہیں پایا ہوں۔"

"کس بات کا خوف؟" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"یہی کہ تم..... کہیں تم..... میرے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہم آتے تھے اور ایک بار تو میں نے سوچا، کچھ دنوں کی چھٹی پر دُور چلا جاؤں مگر پھر تمھارے خیال نے مجھے روک لیا۔"

"نیند کسی کو بھی نہیں آئی....."

"تمھیں یوں اچانک اس طرح دیکھ کے نہ پوچھو کیا حال ہوا، لیکن اب مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ تم محفوظ ہاتھوں میں ہو حالانکہ اب بھی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"نہیں آئیں گی شکلا جی!"

اُس نے میری کمر تھپتھپا کے جیپ میں بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں نے دیکھا، اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جیپ ابھی چلی نہیں تھی کہ وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے تجمل کے پاس آیا۔ "گھر ہی جا رہے ہو دادا؟" تجمل نے اقرار میں سر ہلایا۔ شکلا کہنے لگا کہ میں بھی ساتھ چلتا لیکن یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔

"اب کیا رہ گیا ہے صاحب!"

"سارا نئے سرے سے دیکھنا پڑے گا دادا!"

"ہو سکے تو اُس ابھاگن کو جلدی کچہری بھیج دو۔ ٹھکانے سے ہو جائے گی۔"

"اُسی کے بارے میں سوچتا ہوں دادا!"

"سوچنے کو کیا دھرا ہے صاحب!"

"دادا!" شکلا مچلتی آواز میں بولا۔ "مجھے بتاؤ، ہم اُس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"آپ بولو تو اُس کی جگہ بیٹھ جائیں۔"

"اوہ نہیں، نہیں دادا!" شکلا سر جھٹک کے بولا۔ "میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ سوچتا ہوں، بچے کس طرح رہیں گے۔ کاش کچھ میرے بس میں ہوتا۔"

"اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دو صاحب!"

"اُس کے بچوں کا خیال آتا ہے۔"

"روپیٹ کے ٹھیک ہو جائیں گے حرام کے.....! اُن کے پاس بھی جائیں گے ابھی۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گا دادا! ابھی دیکھو، میں کاغذات دوبارہ دیکھتا ہوں اور وکیلوں سے مشورہ کرتا ہوں۔"

تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ شکلا جیپ کے پاس سے ہٹ گیا۔

جیپ پاڑے کی عمارت کے سامنے ٹھہری تو گلی میں کھڑے وہ سبھی ہماری طرف ٹوٹ پڑے۔ اُنھیں خبر مل گئی تھی کہ جارجی اور وکی نامی اُس کا کوئی دوست ختم کیا جا چکا ہے۔ باقی تفصیل کا اُنھیں علم نہیں تھا۔ تجمل نے اندر جاتے ہی پانڈے دادا سے کہا کہ وہ آدمی بھیج کے شہر کے تمام پاڑوں کے داداؤں کو بُلا لے۔

اُس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ کسی نے ہمارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا لیکن شاید کسی کو بھی خواہش نہیں تھی۔ پہلے وہ ہم سے کچھ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ پانڈے دادا تو بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تجمل کو چوکی پر بیٹھ کے سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سوالات شروع کر دیے۔ اُنھیں معلوم ہو گیا تھا کہ جیپ ہمیں قلابے کے تھانے لے گئی تھی۔ اِس دوران پاڑے پر آنے والے دادا بھی مختلف افواہیں لاتے رہے تھے۔ تجمل کے تحمل کی تلقین سے اُن کی سیری نہیں ہوئی، آخر تجمل کو صاف طور پر اُن سے کہنا پڑا کہ وہ تمام داداؤں کے جمع ہو جانے ہی پر زبان کھولے گا۔ جلد یا بدیر اُنھیں سب کچھ معلوم ہونا ہی تھا۔ تجمل کے اجتناب کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی تھی کہ ایک جواب کے بعد واویلا ہونے لگتا۔ اُس کی خاموشی پر پانڈے دادا رنجیدہ خاطر سا ہو گیا۔ تاہم وہ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ تجمل کی پس و پیش اُس نے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے داداؤں کے سبب سے جانی ہو یا کچھ اور، بہرحال اُس نے مزید اصرار نہیں کیا اور کبیدہ کبیدہ اپنی جگہ چپ بیٹھا رہا۔ ہمارے تھانے جانے سے پہلے جو دادا چوکی پر بیٹھے تھے وہ اب بھی موجود تھے بلکہ اُن کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تجمل نے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے کھانا لگانے کا حکم دیا۔ سب نے بس جیسے کوئی ذمے داری نبھائی۔ کھانا کھاتے ہی تجمل اُٹھ گیا اور پیرو کے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اُن کی متوحش نگاہوں سے بچنے کا یہی ایک مناسب طریقہ تھا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد پانڈے بھی چلا گیا۔

وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ پہلے میں نے سوچا، اُن سے لاعلمی کا اظہار کروں کہ میں تھانے سے باہر بیٹھا رہا تھا اور تجمل نے اندر جا کے افسروں سے بات کی تھی، گو اُنھیں میری بات کا یقین نہ آتا لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میرے شش و پنج پر وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ میں نے جھوٹ بولنے کے بجائے یکسر انکار کر دیا کہ سرِدست میں اُنھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ جو کچھ ہے، اُنھیں جلد ہی تجمل کی زبانی معلوم ہو جائے گا۔ وہ زبردستی تو کر نہیں سکتے تھے۔ گھُٹ کے رہ گئے۔ پھر میں نے بھی وہی کیا۔ جمرو، شامو، ماری اور زہرا کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں آ گیا۔ اُن چاروں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا، میں نے از خود اُنھیں بتایا کہ ہم تھانے میں کیا کرنے گئے تھے اور کیا دیکھ

کے آئے ہیں، وہ گنگ ہو گئے۔ اُنھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

پانچ بجے تک شہر کے تقریباً سارے دادا پاڑے میں جمع ہو چکے تھے۔ ہر طرف شور گونج رہا تھا۔ پانڈے دادا نے تجھل کو مطلع کرنے کے لیے کمرے میں آدمی بھیجا تو تجھل فوراً باہر آ گیا۔ اُس نے بس چوکی کے وسط میں آنے کی مہلت لی اور کسی تمہید کے بغیر اُن سے کہا: "قلابے کے تھانے میں جارجی کی بیوی ہاری نے آکے بولا ہے کہ اُس نے جارجی اور اُس کے رشتے دار وکی کو ختم کر دیا ہے، بولتی ہے اُن لوگ نے ہی پیرو دادا کو ختم کیا تھا۔"

عمارت میں سناٹا طاری ہو گیا پھر دوسرے ہی لمحے ایسا شور اُٹھا جیسے اُن سب کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ پانڈے دادا نے کھڑے ہو کے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اُنھیں خاموش کرنے کی کوشش کی مگر تجھل ہی کی آواز اُن کے شور پر غالب آئی۔ تجھل نے نسبتاً اونچی آواز میں اُن سے کہا: "ہم جو بول رہے ہیں، وہ ذرا دھیان سے سُنو۔ اپنے کو تھوڑا ہی بولنا ہے۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی تم کو دوبارہ بُلانا پڑے گا۔ بات آج بھی وہی ہے پر کل تم نے فیصلہ کیا تھا اور تمھارے بولنے پر ہم نے تمھاری بات مان لی تھی۔ پیرو دادا کی خاطر بھی ہم چپ ہو گئے تھے۔ آج صرف اپنے کو بولنا ہے۔ پیرو دادا کا سارا حساب چکتا ہو گیا ہے۔ جیسے بھی ہوا، ٹھیک ہے۔ اپنے کو ایسا نہیں چاہیے تھا۔ پر اس کی مار کھانے ایک ہی نہیں تھے اور بھی نہیں تھے۔ دوسرے کا ہم سے بھی زیادہ ناتا تھا۔" تجھل کی آواز بھاری ہو گئی۔ ایک لمحے کے تامل کے بعد وہ بولا: "قلابے کے تھانے سے ہم سیدھا اپنے گھر کو نکل سکتے تھے۔ پانڈے دادا اِدھر ہی تھا، بیٹھا رہتا پر سوچ کے چلے آئے کہ سامنے سب صاف کر دیں تو اچھا ہے۔ ہم نے تم سے پہلے بول دیا تھا کہ ہم کو اِدھر ہی نہیں رُکنا، آگے جانا ہے۔ تم کو اسی واسطے اِدھر بُلایا ہے کہ اب ہماری چھٹی کرو۔ گدی پر کسی اور کو بٹھا دو۔ ایک سے زیادہ دادا ہونے پر چاقو اُٹھا کے فیصلہ کر لو۔"

راجن کی جگہ اندھیری کے موجودہ دادا سکندر نے بے تابانہ اُٹھ کے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ تجھل نے اُسے ڈپٹ دیا: "کسی کو کچھ نہیں بولنا، کوئی سوال جواب نہیں کرنا۔ بمبئی میں ہم پاڑا گیری کرنے کو نہیں آئے تھے۔ دادا نہیں رہا تو اب ہمارا کوئی کام بھی اِدھر نہیں ہے۔ بمبئی میں پاڑا چلانے کی ہم کو کبھی کھجلی ہوتی تو اپنے پاس چاقو ہے۔"

سب حیرت و اضطراب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ سکندر کے بعد کوئی نہیں اُٹھا۔ تجھل نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی: "اپنے کو پتہ ہے، ابھی اِدھر کوئی پیرو دادا نہیں ہے۔ ایسے دادا کا لانا مشکل ہے جو شہر کے سارے پاڑے باندھ کے رکھے، تو نال کاٹ دو۔ آج سے کوئی پاڑا ماہم کے پاڑے سے بندھا نہیں ہے۔ سب کو اپنا الگ الگ بھگتنا ہے۔ کسی کو آکے اِدھر کوئی بھتا نہیں پہنچانا۔ آگے نئے دادا کی مرضی ہے سب کو ساتھ رکھے یا الگ کر دے اور تمھاری مرضی ہے کہ تم اُس کے رہتے ہو یا کٹ کے۔ ہم ماہم کے کھونٹے سے سب کو باندھ کے جائیں تو بھی یہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ اپنے کو تھیلی لگا کے اِدھر نہیں بیٹھنا اور نہ لوٹ کے بار بار کو بمبئی آنا ہے۔ پنجرے کی ایک تیلی کھوٹی ہو تو ایک ایک کر کے پنچھی اُڑ جاتے ہیں۔"

"ابھی ابھی اپن کو تھوڑا بولنے دو۔" باندرے کے دادا دینا نے چلا کے کہا۔

"بیٹھ جا رے۔ اپنی بات پوری نہیں ہوئی۔" تجھل درشتی سے بولا: "ابھی ہم اِدھر کی گدی کے دادا ہیں اور تم سب نے مل کے ہم کو اس پہ بٹھایا ہے۔ جو ہم بولتے ہیں ٹھنڈے ہو کے اُس کو سُنو۔ ماہم کے پاڑے کی گدی کے دادا کا فیصلہ جان کے، سمجھا؟"

▪ دینا بے چین کھڑا تھا۔ اُس کے برابر بیٹھے ہوئے دادا وَن نے اُسے کھینچ کے بٹھا دیا۔ تجھل نے پھر اُن سے کہا: "پاڑے کی زمین اور در و دیوار سب پیرو کی جاگیر ہے۔ وہ نہیں ہے تو اب اُس کی بیوی اور بیٹی اس کی مالک ہے۔ تم لوگ کو یہ پاڑا چلانا ہے تو کوئی تم کو اِدھر سے نہیں نکالتا۔ بھاڑا چکاتے رہو گے تو سب ٹھیک چلتا رہے گا۔ یہ منظور نہیں ہے تو ابھی پاڑا خالی کر دو اور اپنے لیے اِدھر کوئی دوسری منڈھیا ڈال لو۔" سب جیسے بُت بنے بیٹھے رہے۔

"اپنے کو اور کچھ نہیں بولنا۔" تجھل نے حتمی آواز میں کہا: "جو بھی ماہم کی گدی پہ بیٹھنا چاہتا ہے، اپنے کو بولے۔"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ تجھل نے چند لمحے انتظار کیا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اُٹھی تو تجھل نے اُن سے کہا کہ اُن کے خاموش رہنے کی صورت میں ماہم کے پاڑے کی گدی کے دادا کی حیثیت سے وہ پاڑا بند کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔

"ایسا کیسے دادا؟" بنارسی دادا چیخ کے بولا۔ اُس کے ساتھ بھی شور مچانے لگے۔

"ایسا کیسے چلے گا دادا؟" دادر کا دادا پالے بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہیجانی انداز میں بولا: "یہ پاڑا بند ہو جائے گا؟ پیرو دادا کا پاڑا؟ یہ اُس کی نشانی ہے۔"

چوکی پر کئی دادا کھڑے ہو گئے اور ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔ وہ ہاتھ چلا چلا کے صدائیں بلند کر رہے تھے۔ پانڈے دادا دوبارہ

اُنھیں خاموش کرنے کے لیے اُٹھا مگر اُس کی آواز پاڑے کے گونجتے شور میں گم ہو گئی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ سب تجھل پر پل پڑیں گے، تجھل نے جیسے اُنھیں کوئی گالی دی ہو۔

تجھل ساکت کھڑا رہا۔ وہ دُہائیاں دیتے اور گرجتے برستے رہے تجھل کے بُت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ آخر اُن کی آوازیں از خود ماند پڑنے لگیں۔ پانڈے نے سب کو عاجزانہ لہجے میں صبر و ضبط کی تاکید کی اور کہا کہ تجھل کی بات سمجھنے کی کوشش کریں۔

"اِن سے پوچھو دادا، یہ کاہے کا رولا کرتے ہیں۔" تجھل نے برہمی سے کہا۔

"تم پاڑا بند کرنے کی بات مت کرو دادا۔" بنارسی پھنکارتی آواز میں بولا۔

"نہیں کرتا! پھر؟" تجھل نے گرج کے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہونے گا۔"

"نہیں ہو گا، کون روکتا ہے تیرا ہاتھ۔"

"پاڑا چلے گا اور ایک دم چلے گا، پیرو دادا کے نام پہ چلے گا۔"

"پھر ٹنٹا کیا ہے؟ نیا دادا بٹھلاؤ۔"

سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ کسی جانب سے کوئی صدا نہیں اُٹھی۔ پھر پالے نے آگے آکے اور ہاتھ جوڑ کے تجھل سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ سب کے لیے وہ اس وقت پیرو دادا کی جگہ ہے۔ اُس نے پہلے بھی اُن کی بات مان لی تھی، ہمیشہ کے لیے نہیں تو کچھ عرصے کے لیے ابھی وہ پاڑے پر بیٹھا رہے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ اُسے یقین ہے، فی الحال کوئی بھی ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ جہاں تک پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی کا تعلق ہے، وہ ہم سب کی ماں بہن ہے۔ پاڑے کا کرایہ کیا، اُن کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تجھل سُنتا رہا۔ پالے کے بعد شنکرا تجھل کی منت کرنے لگا کوئی دادا بھی ماہم کے پاڑے کی گدی پر بیٹھنے کا خواہش مند نہیں ہے۔ اُس نے پاڑے میں بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہو کے پوچھا کہ کوئی ہو تو سامنے آئے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ شنکرا بار بار لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ نوجوان سورت والے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے خاموش کر دیا اور تجھل سے بولا کہ اُسے دادا کی بیوی اور بیٹی کا اتنا خیال ہے، ہم بھی تو دادا کی اولاد کے مانند ہیں۔ سب نہیں تو ماہم کے پاڑے سے متعلق سارے دادا پیرو کی نگرانی میں پروان چڑھے ہیں۔ وہ سب اُجڑ جائیں گے۔ تجھل، دادا کے ان یتیماں دگان کو کیوں بھولے

ہوئے ہے اور سب سے اتنی بے رُخی، بے تعلقی سے کیوں مخاطب ہے۔

سورت والا جارجی کو مغلظات بکنے لگا اور بولا، مجھے یقین نہیں آرہا کہ جارجی نے ایسا کیا ہے۔ کل تک کل رات تک وہ ہمارے درمیان بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ وہ اتنا بڑا کمینہ ہے، کوئی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ تجھل کی بد دلی کا سبب شاید وہی ہو لیکن ایک نمک حرام کی غداری کی سزا اتنوں کو کیوں دی جا رہی ہے۔ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ جارجی کے نطفے میں ضرور کوئی فرق تھا جو اُس نے اپنے مربّی، اپنے محسن کے ساتھ کیا۔ بے شک یہاں بہت سے دادا، پیرو دادا سے خار کھاتے تھے، اُس سے حسد کرتے تھے۔ وہ جنھیں ماہم کے پاڑے کی بالادستی ناپسند تھی اور جنھیں تیواڑی کے خاتمے کے بعد مجبوراً ماہم کے پاڑے سے وابستہ ہونا پڑا تھا۔ ہمیں معلوم ہے، اُن میں کئی رتی تڑانے کے لیے سر پر پارتے تھے لیکن پیرو کا پہاڑ ہٹانے کے لیے کسی کے دماغ میں بھی یہ بزدلانہ خیال نہیں آیا ہو گا۔ یہ کسی دادا کا کام نہیں۔ اِلیا لگے تو پھر یہ بات آسان ہے۔ سورت والا بلند آواز میں بولا کہ دادا کی بیوی اور بیٹی کے لیے پاڑے کا کرایہ ہی نہیں، اس کے علاوہ بھی ماہ بہ ماہ کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ پہنچایا جاتا رہے گا، اپنے گھر کی طرح۔ یہ بمبئی شہر ہے اور یہاں کے پاڑے ایسے نادار نہیں ہیں جو اپنے پیرو دادا کا گھر نہ چلا سکیں۔

"بیٹھ جا۔" تجھل نے غرا کے کہا: "زبان کاٹ لیں تیری، رام کے......چندے کو بولتا ہے؟ ابھی ہم جیتے ہیں سنی کے......"

"نہیں نہیں دادا! ایک دم نہیں۔" سورت والا سٹپٹا کے بولا: "ماں قسم اپن کا......"

پانڈے دادا نے جھڑک کے اُسے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ شنکرا، دینا، پالے، زورا اور پانڈے دادا وضاحتیں کرنے لگے کہ سورت والے کا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔

"زیادہ باتیں نہ بناؤ رے۔" تجھل نے جھڑکتی آواز میں کہا۔ "ہم نے تم سے بولا تھا، اپنے سے ضد بحثی مت کرنا۔ پورا نہیں سُنتے ہو کیا؟"

"سُن لیا ہے مائی باپ!" پانڈے کی نرم گوئی میں تھرتھری بھی شامل ہو گئی۔

"پھر آگے کا بولو دادا!" تجھل نے برگشتگی سے کہا۔

"کیا بولے مہاراج!" پانڈے دادا چوکی پہ بیٹھے ہوئے دادا دَل کو مضطرب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا: "تم سُنتے تو ابھی کچھ بولتے۔

جھل نے اُن سے کہا کہ تکرار سے کچھ حاصل نہیں، جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا ہے۔ واضح رہے کہ وہ اُن سے اجازت طلب نہیں کر رہا۔ اُس کا فیصلہ اُن کی تائید یا انکار سے مشروط نہیں ہے۔ انھیں نے صرف اپنا فیصلہ کرنا ہے۔ دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا۔ اتنی سیدھی اور آسان بات اُن تک کیوں منتقل نہیں ہو رہی۔

"ایسا سیدھا اور صاف نہیں ہے جیسا تم بولتا ہے دادا!" بالے نے کہا۔

"ایسا کیا بات ہے دادا جو تھانے سے آکے تم ایک دم لوٹ گیا؟" پانڈے دادا بے چارگی سے بولا کہ ابھی تو کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا کہ یہ سب ہوا کیا ہے، کیسے ہو گیا۔ جارجی نے یہ سفاکانہ قدم کیوں اُٹھایا؟ یہ سب تو تفصیل جاننے کے منتظر ہیں۔ جارجی کے ملوث ہونے کی خبر سُن کے ششدر ہیں۔ "تھوڑا سا سانس لینے دو دادا!" پانڈے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"اس کے جاننے سے اپنی بات پر فرق نہیں پڑتا۔ تم پاڑے کے آدمی ہو۔ آگے پیچھے کا سارا سامنے آجائے گا۔"

"پر ایسا جلدی کا ہے کو ہے۔" شنکرا بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "لگتا ہے اپن لوگ سے کوئی بھول ہوا ہے کہ ابھی اوپر سے دادا کو......"

جھل نے خشمگیں نظر سے اُسے دیکھا تھا۔ شنکرا کی آواز حلق میں گھٹ گئی لیکن اُسی لمحے بنارسی دادا چیخنے لگا اور جھل کے بجائے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے داداؤں سے مخاطب ہو کے بولا کہ کیا اتنے ہی وقت کے لیے اُن سب نے خوشامد کی حد تک جھل سے منت کی تھی۔ ایک دن کے بل میں کیا وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ جھل نے اُسے جواب دیا کہ پہلے اگر اُس نے اُن کے اصرار پر بہ اکراہ ہامی بھر لی تھی تو اس کی وجہ دوسری تھی۔ دادا کے خون کا قرض واجب تھا۔ اب کچھ نہیں رہ گیا اس لیے اب اُسے تادیر پاڑے پر ٹھیرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ کیا اُس نے واضح طور پر نہیں کہا تھا کہ اُسے زیادہ دن نہیں ٹھیرنا۔ بہتر ہے، خوش اطواری سے اُسے جانے دیا جائے۔ جو فیصلہ انھیں کل کرنا ہے، وہ آج کیوں نہ کرلیں۔

پانڈے کے پیچھے کھڑا ہوا سکندر آگیا۔ "اجازت ہو تو اپن ایک بات پوچھے دادا؟" سکندر کا لہجہ ٹھیرا ٹھیرا، ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا۔

"کیا ہے بے؟" جھل نے ناگواری سے کہا۔

"اپن کو یقین ہے، تم دادا کا پاڑا بند کرنے کو نہیں مانگتے۔"

"پھر اتنا بولنے کی کیا ضرورت تھی لاڈو کے؟"

"ایک دم دادا! اپن بھی یہی سمجھتا ہے۔ پیرو دادا نے اس کو بہت لگن اور چاؤ سے بنایا تھا۔ اکھا بمبئی میں ہیرا پاڑا ہے یہ، تم نے دیکھ لیا، اس ہیرا پاڑے کی گدی سنبھالنے کو کوئی اپنی ماں کا جنا آگے نہیں بڑھا۔ تم نے سب کو الگ کر کے بھی بولا۔ کوئی نہیں اُٹھا۔ کسی نے چھاتی پر ہاتھ مار کے نہیں بولا کہ ابھی وہ دادا کی جگہ بیٹھنا مانگتا ہے۔ تم جانتا ہے، ایسا کس واسطے ہے دادا! تم خود بولا ہے، ابھی ادھر کوئی بھی پیرو دادا نہیں ہے۔ دادا لوگ کو پتہ ہے، وہ کتنے دن کھینچ پائے گا۔ بیٹھنے کو بیٹھ جائے گا پر اکھا بمبئی میں لوٹ کے منہ دکھانے کا بھی ہے۔ پچھلی دفعہ ہم سب ادھر بیٹھا کیا بولتا تھا، بولتا تھا، ادھر اینٹ اینٹ پہ دادا کا رنگ چڑھا ہے۔ پاڑے کے اندر کیا، باہر کیا، بہت پکا رنگ ہے اُس کا۔ پھیکا پڑنے میں تھوڑا ٹائم لگے گا۔ دادا کے تھوڑا دور ہو جانے پہ۔ دھیرے دھیرے ہی اُس کا نشہ......"

"کام کی بات کر بے!" جھل نے جھنجلائی آواز میں کہا۔

"وہی بولتا ہوں دادا! ایک دم وہی۔" سکندر تیزی سے بولا۔ "اپن کا مطلب ہے، ابھی ادھر کوئی نہیں ہے جو چاروں طرف کا کھینچ کے باندھ کے رکھے۔ کوئی بھی آگے نہیں آنے گا۔ تم بھی چلا جائے گا تالا مار کے۔ پاڑا خلاص ہو جائے گا۔ ابھی دل پہ ہاتھ رکھ کے بولو تم کو چین پڑ جائے گا اور اُدھر دادا کا روح بھی خوش ہو جائے گا؟" سکندر کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ ساری عمارت میں خاموشی چھا گئی۔

"کون سی بات کا جواب دیں رے تیری۔" جھل نے بیزاری سے کہا۔ "ایک ہی رٹا لگائے ہے۔" پہلی مرتبہ اُس کے لہجے میں نمی اور نرمی کی آمیزش تھی۔

"کسی بات کا مت دو دادا! اپن جواب کے لیے نہیں بولا سب۔ اپن کو پتہ ہے، تم کیا بولے گا۔ اب بھی دادا کی خوشی کی بات کرتا ہے حرام زادے۔ پر دادا اس بات سے خوش نہیں ہوئے گا۔ تو دکھی بھی نہیں۔ آگے پیچھے سب لوگ ٹھکانے سے ہو جائے گا۔ پاڑا بند ہو جائے گا تو سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر چلا جائے گا۔ پانڈے دادا سورت لوٹ جائے گا، دینا پانڈے کو، بالے داور کو، اپن اندھیری میں۔ ادھر ماہم کا لوگ بھی کدھر سر چھپا لے گا۔ دادا کا پاڑا ابھی صرف ماہم علاقے کا پاڑا ہے یا اکھا شہر کا۔ اس کو رہنا ہے۔

دادا! یہ خلاص ہو گیا تو پھر ہر پاڑا..... پھر آگے سدا کو ایسا ہی ہوتا رہے گا۔"

"ہم سے کیا بولتا ہے، ادھر شہر کے سارے شیرامستا بیٹھے ہیں۔ چاقو کے دھنی، اُن سے بول۔ یہ تھوڑے دن کے لیے ایک دوسرے کو کندھا نہیں دے سکتے۔ ایک ہی تجھ کو بے ڈرے نبلے گھرے دکھائی پڑتے ہیں۔ پاڑے کا، دادا کا اتنا درد پیٹ میں اُٹھتا ہے تو ان کو بول۔ ہم ادھر تیرے مہمان ہیں۔ آج نہیں کل ادھر سے چلے جائیں گے اور دادا کے ساتھ اُس رات ہم بھی نکل پڑتے تو... تو اپنا نمبر بھی آجاتا۔ پھر کس کو ادھر لاتا گدی سجانے کو؟"

"اپن کو یقین ہے، ساتھ تم ہوتے تو ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" سکندر نے بے ساختہ کہا۔ "وہ بات دوسری تھی پر ابھی تم ادھر ہے اور اپن زیادہ ٹائم کے لیے نہیں بولتا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے ابھی اس پہ تمھاری ضرورت ہے۔ تم بھی سمجھتا ہے، کیوں؟ اس کے بعد تم چلے جانا، جدھر مرضی میں آئے چلے جانا، کون روک سکتا ہے تم کو؟"

"پھر کیا ہو جائے گا؟ سینگ نکل آئیں گے تم لوگ کے؟"

"نہیں نکلے گا پر یہ ٹائم بھی نہیں رہے گا، یہ جانگلی ٹائم اور کچھ نہیں ہوئے گا تو تم تالا مار دینا۔"

"اپنے کو آگے بہت کام ہے رے!"

"ابھی دادا ہوتا تو تم کیا نہیں رُکتا؟"

"پر دادا نہیں ہے۔" جھل نے بھاری آواز میں کہا۔

"دادا نہیں ہے تبھی تو اتنا بولتا ہے۔" سکندر عاجزی سے بولا۔ "مان جاؤ دادا! دادا کے ناتے سے اپنا حق نکلتا ہے تم پہ، ابھی اپن لوگ تم کو اسی کا قسم دیتا ہے۔"

"کیا! کیسا بولتا ہے رے؟"

"تم رہو گے تو ادھر سب ٹھیک رہے گا۔ ابھی دیکھو کیسا مل کے بیٹھا ہے۔ ادھر کبھی ایسا نہیں ہوا، دادا کے ہوتے بھی....."

جھل گم کھڑا رہا۔ اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور چہرے پر گہری لکیریں تھیں۔ عمارت میں سرگوشیاں گونجنے لگیں پھر چوکی پر بیٹھے ہوئے دادا آوازیں اُٹھانے لگے کہ جھل کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اتنے لوگوں کی بات نہیں ٹالنی چاہیے۔

"پھر ویسا ہی رہے گا؟" جھل نے جلتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"کیا! کیا بولا تم؟" سکندر بدحواسی سے بولا۔ پانڈے دادا بے اختیار جھل کے پہلو سے چمٹ گیا اور اُس کے بازو پر سر مارنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں اُٹھتا تو ایک رستہ اور بھی ہے۔"

سب کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ جھل نے اُن سے کہا کہ کوئی پاڑا بند کرنا نہیں چاہتا، نہ آگے آکے گدی پر بیٹھنا چاہتا ہے اور اُس کے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ کوئی یہ سمجھنا نہیں چاہتا کہ اُس کے انکار کی کوئی وجہ ہی ہو سکتی ہے ورنہ اتنے بڑے پاڑے کی گدی کی کسے خواہش نہ ہو گی، خصوصاً ایسا پاڑا جو اُس کے عزیز دوست بھائی پیرو کی امانت ہو۔ ایک اجنبی کو شہر کے اتنے دادا یہ مرتبہ دینے پر مُصر ہیں تو انکار ویسے بھی مناسب نہیں۔ اس صورتِ حال میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی آدمی گدی پر بٹھا دے۔ "پاڑا اپنے نام پر چلے گا۔" جھل نے گونجتی آواز میں کہا۔ "بیٹھے گا یہاں کوئی اور۔ جب تک ہم پاڑے سے باہر رہیں گے، اپنا آدمی، اپنی جگہ بیٹھا رہے گا۔"

چند لمحوں کے سکوت کے بعد عمارت میں وہی شور بلبلانے لگا۔ جھل نے ہاتھ اُٹھا کے انھیں خاموش کیا اور کہا۔ "تم کو منظور نہیں تو منع کر دو۔ پانڈے اپنی جگہ بیٹھے گا اور اُس کو ٹیکی دینے کے واسطے جس کو ہم بولیں۔"

پانڈے دادا اپنا نام سُن کے اُچھل پڑا اور وحشت زدہ انداز میں بولا۔ "نہیں نہیں دادا! اپن کو معافی دیو۔ اپن ایک دم نہیں ٹھیرے گا۔ اپن ابھی بہت بھگت لیا۔"

جھل نے اُس کی جانب نہیں دیکھا اور اس سے پہلے کہ کسی طرف سے کوئی صدا بلند ہوتی، اُس نے کہا۔ "بالے پانڈے کے ساتھ ادھر رہے گا۔ جب تک ہم پلٹ کے نہ آئیں اور تم لوگ کو بلا کے نہ پوچھیں کہ ابھی تم میں سے کون جوان بلوان نے کھال کتنی موٹی کی ہے۔ کس نے چاقو کی بولی کتنی سیکھی اور اُس کو اپنی کتنی سکھاتی ہے۔ اپنے تین پاڑوں کے سوا سارے پاڑے ہم کے پاڑے سے الگ رہیں گے، جتنا بھی نہیں پہنچائیں گے۔ قلابے، اندھیری اور داور کے پاڑے کے سوا۔ ہمارے پیچھے کسی کا دماغ اُلٹے گا تو اُس کو ادھر چھاتی پھلا کے آنے سے تم سب روکو گے۔ جدھر ہم پانڈے اور بالے کو بول کے جائیں، وہ ہم کو خبر کریں گے۔ ہمارے لوٹنے تک تم اُس بیس مار کو انتظار کرنے کا بولو گے۔ ہمارے آنے سے پہلے کسی نے پانڈے اور بالے کو چھیڑا اور تم ہاتھ ناپتے رہے تو ہم تم کو دوبارہ اس طرح نہیں بلائیں گے۔ ہم خود اُس کو دیکھ لیں گے اور

پھر آگے ہم بولیں گے بھی نہیں۔"

تجھل نے کسی کو دخل دینے کا موقع نہیں دیا اور کہا کہ یہ سب اُن کی خاطر ہے کیوں کہ نہ وہ پاڑا بند کرنے پر آمادہ ہیں، نہ چوکی کے وسط میں آ کے پاڑے کی باگ ڈور سنبھالنے پر تیار ہیں مگر یہ ایک مشورہ ہے جسے وہ یک سر رد کر سکتے ہیں۔ اُن کی تائید کے بعد یہ فیصلہ بن جائے گا۔ اچھا ہو گا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کے جواب دیں اور چاہیں تو باہم مشورہ بھی کر لیں۔ اُن پر کوئی جبر نہیں ہے۔

وہ بنارسی دادا تھا جس نے اُٹھ کر کتراتے ہوئے، چباتے ہوئے لفظوں میں پوچھا کہ کوئی دادا پاڑے کی گدی پر بیٹھنے کا دعوے دار ہو تو کیا صورت ہو گی؟ بنارسی نے وضاحت کی، کیا اُسے چاقو نکال کے اپنا مطالبہ پیش کرنا پڑے گا یا کچھ اور؟ تجھل نے کسی تاخیر کے بغیر جواب دیا کہ یقیناً اُسے چاقو سمیت ہی اپنا دعوا پیش کرنا ہو گا۔ چاقو ہی کسی دادا کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔ مقابل کوئی نہیں اُٹھا اور یہاں موجود سارے داداؤں کو منظور ہوا تو اُسے پاڑے کی گدی سونپ دی جائے گی۔ تجھل نے بھی صراحت ضروری سمجھی کہ وہ اور اُس کے ساتھیوں میں سے کوئی پاڑے کی گدی کا خواہش مند نہیں ہے۔ سو خاطر جمع۔ نہ وہ چاقو اُٹھائے گا نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ ساتھیوں سے تجھل کی مراد شامو، جمرو اور مجھ سے تھی۔ اُس نے بنارسی سے کہا کہ یہاں سارے داداؤں کو اسی لیے طلب کیا گیا ہے کہ وہ آپس میں کوئی فیصلہ کر لیں کیونکہ پہلے بھی انھوں نے یہی کیا تھا۔

دادا کے پاڑے کے ترکے میں شہر کے وہ تمام دادا شریک ہیں جو باہم کے پاڑے سے متعلق تھے مگر ظاہر ہے پاڑا تقسیم نہیں کیا جا سکتا، نہ اِس کے اعتبار اور اِس کی ساکھ کی تقسیم ممکن ہے۔ اِس کا انتظام کسی ایک ہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور اس لیے کسی ایک کا انتخاب لازم ہے یا دوسرا طریقہ ہے، چاقو کے ذریعے خود کو دادا کے ترکے کا حق دار ثابت کیا جائے۔

بنارسی نے پھر سر نہیں اُٹھایا۔ تجھل نے ایک بار اُن سے اور پوچھا کہ کوئی آرزو مند ہو تو سامنے آئے، بہ صورتِ دیگر وہ سمجھے گا کہ سب اُس کے فیصلے پر متفق ہیں۔ پانڈے دادا کچھ بولنا چاہتا تھا، تجھل نے اُسے روک دیا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ تھانے سے آنے کے بعد یکایک تجھل کو کیا ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں مجھے سب کچھ عجیب سا لگا تھا۔ جیسے تجھل کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ اتنے تسلسل سے آتی بے ربطیاں پیش آئیں، ایسی ناگہانیاں ہوں تو آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

اُس نے پانڈے دادا اور بالے کے نام تجویز کیے تھے تو بھی مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔ پھر اتنے لوگوں کی طلبی اور اِس حجت و تکرار سے کیا حاصل تھا مگر یہ میری اپنی خستگی، اپنی بے مائگی تھی۔ تھانے سے آ کے تجھل کو پہلا کام یہی کرنا تھا۔ اِس تجدید کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی دادا کے جانے کے بعد پاڑے پر موجود رہنے کی۔ پاڑے سے دادا کے قاتلوں کی طرف جانے والے راستے نسبتاً آسان ہو جاتے تھے۔ داداؤں کے درمیان رہنے، اُن سے ہر وقت رابطہ رکھنے، اُن میں نظم و ضبط قائم رکھنے، اُن کی اعانت حاصل کرنے اور ادھر پولیس، اُدھر قاتلوں کو کچھ باور کرانے کے لیے تجھل کو پاڑے کا کھونٹا درکار تھا جو بہ زور بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ کوئی دیر نہ لگتی لیکن اس اندھیرے میں یہ اقدام کسی طور قرینِ عقل نہ ہوتا۔ مناسب یہی تھا کہ پیش کش اُن کی جانب سے ہو۔ ایسے غیر یقینی حالات میں اُنھی کی جانب سے پیش کش کا امکان تھا۔ وہ اتنے اندھے نہیں تھے کہ گرد و پیش کی دھند چھٹنے سے پہلے گدی کی طمع کریں۔ گویا اُن کی پیش کش میں تجھل کی ترغیب و خواہش کو جتنا دخل تھا، اُتنا ہی اُن کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی کا تھا، اسی لیے تجھل نے انھیں اکٹھا کیا تھا اور بہ ظاہر اکراہ سے پاڑے کا منصب قبول کر لیا تھا، بباطن بھی دادا کے بعد دادا کی جگہ بیٹھنا کوئی خوش گوار فریضہ نہیں تھا۔

ماری نے بہر حال اِس آزار سے جلد نجات دلا دی۔ اُس کے تھانے چلے جانے کے بعد تجھل کے بہ قول کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ہمیں تھانے سے سیدھے گھر چلا جانا چاہیے تھا۔ پاڑے پر کوئی ہے نہ ہے، چلے نہ چلے، خاک اُڑے یا آگ لگے، ہمیں اب پاڑے سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ غرض ہوتی تو دادا کی موجودگی میں بھی پاڑا کسی اور کا نہیں تھا۔ تھانے سے ہم سیدھے گھر جا سکتے تھے، شام تک وہ ہمارا انتظار کرتے۔ دادا کا گھر انھوں نے دیکھ لیا تھا۔ شام کو وہ لال آنکھوں اور زرد چہروں کے ساتھ گھر آ جاتے۔ تجھل کو اندازہ تھا کہ جارجی کے ملوث ہونے کی خبر اُن کے لیے کیسی ناقابلِ یقین، کتنی دہشت انگیز ہو سکتی ہے۔ اِس سے پیشتر کہ تجھل کے غیاب سے وہ طرح طرح کے وہم و گمان سے دوچار ہوں، آپس میں دست و گریباں ہوں اور نئے نئے شوشے چھوڑتے پھریں، تجھل کو اُن کے پاس جا کے بات صاف کر لینا چاہیے تھا۔ برملا دست برداری کا اعلان۔ تجھل کو احساس تھا کہ خوش وضعی کا یہ مرحلہ کتنا وقت طلب ہو سکتا ہے، جیسا کہ سکندر کہہ رہا تھا۔ پاڑا بند کرنے سے تجھل کو واقعی کوئی خوشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ زورا، چھیدا، نگیا، اچھی اور جانے کتنے

لوگ ماہم کے پاڑے سے وابستہ تھے۔ تجھل کی نظروں سے وہ تمام اوجھل نہیں رہے ہوں گے۔ پاڑا بند کرنے کے اعلان سے مراد تھی ابتدا وہاں سے کی جائے جہاں بات ختم ہوتی ہے تاکہ وہ جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ پاڑے پر دادا کی ملکیت کے دعوے اور کرائے کا ذکر عمداً تھا تاکہ ماہم کے پاڑے کے لیے شہر کے متعدد داداؤں کی لو بھڑکنے نہ پائے اور بھی کئی باتیں تھیں جن کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اپنے سوا کسی دوسری طرف میری نگاہ جاتی ہی کہاں تھی۔ ابھی نہ جانے کتنے دن، کتنے عرصے ہمیں بمبئی میں رہنا تھا اور آگے بھی کتنی بار یہاں آنا تھا۔ ان سے دوبارہ بھی واسطہ پڑ سکتا تھا اور یہ تجھل کے لیے اپنے سکونِ قلب کا معاملہ بھی تو تھا کہ حساب کتاب میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ آئینہ تو پاڑوں کے دادا کے پاس بھی ہوتا ہے۔ شاید تجھل کے گمان میں نہ ہو کہ سال کا رہ وہ اسی کو حرف بنا لیں گے، راستی ہی زنجیر بن جائے گی۔ تجھل کی بے غرضی ہی اُن کے اصرار کا محرک بن گئی۔ اتنی حجت کے بعد تجھل کا انکار بلاغت سے بعید اور مروتِ احباب کے منافی تھا جس کی طرح خود تجھل نے ڈالی تھی۔ تجھل کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اِس دائرے سے اپنی برات کا کوئی گوشہ، کوئی روزن ڈھونڈے۔ وہاں پانڈے اور بالے کے سوا کوئی نہیں تھا جن سے وہ سب دوسروں سے زیادہ مانوس تھے۔ پانڈے کی طرح بالے نے بھی بہت پس و پیش کیا اور کہا کہ تجھل کی نیابت کے لیے کسی کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے میری طرف اشارہ کیا کہ میں موجود ہوں۔ کئی اطراف سے اُس کی تائید میں آوازیں اُٹھیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھل انکار کر دے گا اور اُس نے یہی کیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے اُسی کے ساتھ جانا ہے۔

تجھل نے پھر انھیں مختصراً بتایا کہ ماری نے تھانے میں جا کے کیا بیان دیا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سنتے رہے۔ تجھل نے ماری کے بچوں کا ذکر نہیں کیا اور کہا کہ وکی کا ساتھی نامی غالباً گوا بھاگ گیا ہے۔ قلابے کے پاڑے کے کئی اور آدمی بھی اُن کے معاون ہوں، ممکن ہے وہ بھی گوا کی طرف نکل گئے ہوں یا یہیں شہر میں ہوں اور جارجی کی طرح ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتے بیٹھے ہوں۔ تجھل نے اُن سے کہا، "اب تم جانو، کتنے دن اُن کو کھلا رکھتے ہو۔"

سارے پاڑے میں آگ سی بھڑک اُٹھی۔ وہ نعروں کے انداز میں دہاڑنے لگے اور اُن کی وحشیانہ صدائیں عمارت کے در و دیوار سے ٹکرا کے ٹوٹتی، بکھرتی رہیں۔ پھر اُن پر محرومی اور یاس کا عالم طاری ہوا، وہ آنسو بہانے اور گریہ و زاری کرنے لگے۔ تجھل کچھ دیر اُن کے درمیان بیٹھا، پھر چوکی سے اُتر آیا۔ دروازے کی طرف جاتے جاتے اُس نے ٹھیر کے کہا کہ ابھی وہ بمبئی سے نہیں جا رہا لیکن شاید پاڑے پر اُس کا آنا ممکن نہ ہو سکے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مرتے میں دادا اُسے کیسی امانتیں سونپ کے گیا ہے۔ وہ پاڑے سے بڑی آزمائش میں ہے۔ تجھل نے انھیں یہ جتانا بھی ضروری سمجھا کہ بمبئی سے جانے کے بعد کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی واپسی کتنے عرصے بعد ہو لیکن اگر موقع ملا تو جانے سے پہلے پاڑے آنے کی کوشش کرے گا۔ اس دوران اگر کوئی دادا تیار ہو سکا تو یہ ایک نہایت اچھی بات ہو گی۔

چھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ سب سر جھکائے ہمارے ساتھ پاڑے سے باہر نکلے اور گلی میں ایک ہجوم ہو گیا۔ پھر کسی نے ایک لفظ بھی تجھل سے نہیں کہا۔ پانڈے، بالے، اشکرا، سوورت لال، بنارسی، سکندر، زورا، چھیدا اور جانے کون کون۔ گلی کے آخری سرے تک وہ ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ موٹر کے پاس تجھل ٹھیرا تو پانڈے اُس کے سینے سے چمٹ گیا۔ دیر تک اُس کا جسم تجھل کے بازوؤں میں پھڑپھڑاتا رہا۔ سبھی تجھل سے بغل گیر ہونا چاہتے تھے مگر پھر تو رات ہو جاتی۔ تجھل بہ عجلت موٹر میں بیٹھ گیا۔

سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر کی رفتار سست ہو گئی تھی۔

پھر ایک جگہ موٹر رک گئی۔ آگے کسی موڑ پر کوئی حادثہ ہو گیا تھا، موٹر نہ آگے جا سکتی تھی نہ پیچھے۔ ہر طرف شور مچا ہوا تھا، ٹرموں کی گھنٹیاں، گاڑیوں کی پوں پوں اور راہ گیروں کی چیخ پکار۔ ڈرائیور نے انجن بند کر کے باہر جا کے دیکھا اور آ کے بتایا کہ دور تک راستہ نہیں ہے۔ بجھل نے کچھ نہیں کہا وہ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بے خبر سا بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہم چاروں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ہم میں سے کسی نے موٹر سے اتر کے حادثے کی نوعیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ باہر جتنا شور تھا، اندر موٹر میں اتنا ہی سناٹا تھا۔ کبھی کبھی جمرو، شامو اور مارٹی چونک کے میری طرف دیکھتے مگر کچھ کہہ نہ پاتے۔ مجھے ان کی بے چینی کا تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ پاڑے میں انھوں نے بجھل کی زبانی سب کچھ سن لیا تھا لیکن اس مختصر بیان سے ان کی تسلی نہیں ہوئی ہو گی۔ وہ اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہوں گے

ہم بہت دیر بعد تھانے سے پاڑے واپس آئے تھے اتنی دیر تک ہم وہاں کیا کرتے رہے؟ مارٹی کو آخر کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جارجی اور وکی ہی تھے، وہ دونوں کتے جو پاگل ہو گئے تھے ایک عورت نے انھیں کس طرح قابو میں کر لیا؟ کہیں مارٹی سے کوئی چوک تو نہیں ہو گئی؟ اس نے تھانے جا کے کیا بیان دیا اور وہیں کیا کیا بتایا؟ جب مارٹی نے اعتراف کر لیا تھا تو آخر پولیس کو ہماری ضرورت کیوں پڑی تھی، صرف میری اور بجھل کی۔ ایسے جانے کتنے سوال جمرو، شامو اور مارٹی کی رگیں کرید رہے ہوں گے۔ بجھل کی وجہ سے ان کی زبان ماٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً ان کے اضطراب میں ملال بھی شامل ہو گا۔ میری طرح کا ملال کہ مارٹی نے آخر اتنی عجلت کیوں کی، مارٹی سے پہلے تو ہمیں جارجی اور وکی کے سروں پر پہنچنا چاہیے تھا۔ دادا کی موت کے بعد جارجی مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں کیسی دھول جھونکتا رہا۔ ایسا سوانگ کبھی کسی نے نہ دیکھا ہو گا پھر پچھتاوے میں آدمی اپنا منہ نوچ لے۔ یہ تو ہماری ذمے داری تھی۔ ہمارا حق تھا جو مارٹی نے ہم سے چھین لیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ جو لوگ پاڑے پر دادا کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ بجھل کی زبانی مارٹی کا نام سن کے دم بخود رہ گئے تھے اور چند لمحوں تک سکتے کی سی کیفیت کے بعد ان کے سر جھک گئے تھے۔ جیسے رنج اور ندامت میں کسی کا حال ہوتا ہے۔ وہ بہت کھسیانے کھسیانے سے لگتے تھے۔ وہ جارجی اور وکی کو اتنی آسان موت نہ دیتے۔ مارٹی کی طرح شراب پلا کے وہ ان پر وار نہ کرتے۔ وہ تو انھیں زیادہ سے زیادہ ہوش میں رکھتے، انھیں ٹکڑوں میں، قسطوں میں ختم کرتے۔ وہ انھیں ایک بار نہیں، بار بار مارتے۔

برسوں سے کئی بار پاڑے دادا دیوانہ ہوا تھا، وہ کبھی اپنا چہرہ کھسوٹتا، کبھی سینہ کوٹتا۔ کہتا کہ دادا اور ساچھی کا خون بہانے والوں کے سر اتارے بغیر اسے چین نہیں آئے گا۔ بلے بھی یہی کہتا تھا اور بھی بہت سے لوگ یہی ہذیان بکتے ہیں۔ سر اتار کے کیا سکون آ جاتا ہے، سکون کیا کسی جنون کی ہزیمت سے وابستہ ہے؟ دادا اور ساچھی کیا اتنے ہی ارزاں تھے؟ اب اطمینان ہو جانا چاہیے کہ دو کمینے اور بزدل آدمی بہر حال اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ آدمی کا عوض آدمی ہوتا ہے۔ یہاں یہی دستور ہے۔ چاہے کوئی کسی کو کتنا ہی عزیز، کسی کے لیے کتنا ہی قیمتی ہو، چاہے وہ کئی آدمیوں سے بڑا، کئی جانوں پر بھاری ہو، اپنی ذات میں سمندر ہو یا پہاڑوں کا مثیل، اسے ایک ہی آدمی گنا جاتا ہے۔ اسے اس کے عزیزوں اور طلب گاروں سے جدا کر دینے کی سزا محض ایک حقیر آدمی ہے، ایک یا دو، جارجی اور وکی۔ آدمی کی قیمت تو اس کے طلب گاروں سے طے ہونی چاہیے۔ مجھے اپنے اسکول کے زمانے کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ اسکول سے ملحق ڈگری کالج میں ایک مرتبہ کسی طالب علم نے ایک بزرگ استاد کو ختم کر دیا۔ ہر طرف غل مچ گیا۔ پروفیسر تیس سال سے پڑھا رہا تھا اور بہت محبوب و محترم شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ارتھی اٹھ رہی تھی تو لگتا تھا، سارا شہر ٹوٹ پڑا ہو۔ میں بھی شریک تھا۔ میں نے کالج کے طلبہ کو دھاڑیں مارتے دیکھا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ دیواروں سے سر پھوڑ لیں۔ ایک طالب علم نے صرف اس وجہ سے اپنے استاد کو ختم کر دیا تھا کہ استاد نے اسے اپنے مضمون میں نمبر کم دیے تھے۔ شاگرد نے پورے کالج کو ایک مطلوب شخص سے محروم کر دیا۔ اسے سزا مل گئی مگر کیا واقعی تلافی بھی ہو گئی؟

موٹر کو ساکت و جامد کھڑے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ پھر کہیں دس پندرہ منٹ بعد شور مچاتی گاڑیوں نے رینگنا شروع کیا۔ پولیس والے چیخ چیخ کر ہدایات دے رہے تھے۔ آگے جا کے معلوم ہوا کہ ایک ٹرم کا گھوڑا بدک گیا تھا۔ اس افراتفری میں کئی تیز رفتار گاڑیاں اور موٹریں ٹکرا گئیں۔ سڑک پر کھنچے ہوئے دائرے میں خون بکھرا ہوا تھا۔ نزدیک ہی ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ راستہ بہت تنگ تھا۔ کچھ دور جا کے صاف ہو گیا۔ مگر تیز

رفتاری سے موٹر چلانا پھر بھی ممکن نہیں تھا گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔

سب دروازے کے قریب بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

ہمیں دیکھ کے سبھی چونک سے پڑے جیسے ہماری بہ سلامت واپسی کوئی اَن ہونی ہو۔ اُن کی آنکھوں کی وحشت اور ویرانی سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ بھٹل سب سے پہلے گیتا کے پاس گیا اور اس سے پہلے کہ گیتا کی پلکیں چھلک پڑتیں، بھٹل نے اُس کے گال تھپ تھپا کے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا: "اب کہیں نہیں جانا ری اپنے گو۔" بھٹل کی آواز ہانپ سی رہی تھی۔ اُس نے گیتا سے کہا کہ اب وہ گھر ہی میں رہے گا، مستقل اُس کے پاس۔ اور کوئی بھی نہیں جائے گا۔ گیتا کی اجازت کے بغیر کوئی بھی گھر سے باہر نہیں جائے گا۔ گیتا کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ بھٹل نے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ شاید یہی بہتر تھا۔ وہ گیتا کے پہلو میں رکھی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گیا اور لمحوں تک گیتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے بے سدھ سا بیٹھا رہا۔ شبی چاچا نے حقہ اُس کے آگے لا کے رکھ دیا تھا لیکن منال بھٹل کے زانو پر پڑی رہی۔

آج بھی گھر کی ساری روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا بڑھنے پر روشنیاں اور عیاں ہو گئیں۔ شبی چاچا کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ روشنیوں میں کیا رکھا ہے، ان سے کیا ہوتا ہے مگر جو کچھ دسترس میں ہے، اس میں کوئی کسر کیوں چھوڑی جائے۔ آدمی کے اندر بھی بٹن لگے ہوتے تو سب کچھ کتنا آسان ہوتا۔ جب ذرا اندھیرا گہرا ہوا، بٹن دبا دیا۔ دیر ہو گئی۔ سب گونگے بنے بیٹھے رہے۔ بار بار ہر نظر بھٹل پر آ کے مرکوز ہو جاتی۔ اُس کا سوچا سوچا، اُدھڑا اُدھڑا چہرہ انھیں اجنبی لگ رہا تھا تاہم انھیں بھٹل کو بھی کچھ رعایت دینی چاہیے تھی غالباً اسی سبب سے وہ خاموش تھے یا انھیں نئے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ کرشنا جی کہتے تھے، تکرار سے لفظ بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور دنیا میں جس چیز کی سب سے زیادہ کمی ہے، وہ لفظ ہیں۔ اُن سب کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں رہے تھے۔ کہتے ہیں، آنسو سینہ کچھ ہلکا کر دیتے ہیں مگر آنسو بھی لفظوں کے مانند ہیں، اندر بہت آگ لگ رہی ہو تو جس طرح لفظ ساتھ نہیں دیتے، آنسو بھی کام نہیں کرتے، آنسو بھی جل جاتے ہیں۔

مولوی اکرم نے منیر علی سے وقت پوچھا اور کلمہ پڑھتے ہوئے یک بیک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عشا کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ سبزے پر ایک کونے میں جانماز بچھی تھی۔ شبی چاچا بھی شامل ہو گئے۔ مولوی اکرم نے تکبیر پڑھی۔ امامت بھی انھوں نے کی۔ میں، جمرو، شامو، مارٹی اور منگو اُٹھ کے عمارت کے عقبی حصے میں چلے آئے۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا لیکن یہ اندر کسی کمرے میں جا کے لیٹ جانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ عقبی حصے کے وسیع دالان میں نواڑ کے پلنگ رکھے تھے۔ جمرو اور شامو اُن پر پھیل گئے۔ میری طرح اُن کے جسم بھی اینٹھ رہے ہوں گے۔ آری آدمی کا کتنا پابند ہے۔ اُن کا جی بھی یہاں سے بھاگ جانے کو چاہتا ہو گا لیکن ہر ایک کے پیروں سے کوئی زنجیر لپٹی ہوئی تھی۔ اسیری صرف زنداں کی نہیں ہوتی۔ وہ گُم سُم اِدھر اُدھر پڑے کسمساتے، کلبلاتے رہے۔ میری توقع کے خلاف انھوں نے مجھ سے کچھ جاننے، کچھ پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ گھر آ کے اور سب کے چہرے دیکھ کے شاید اُن کا حوصلہ زیادہ پست ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں انھیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو میں انھیں خود آگاہ کر دیتا اور اگر میں کچھ چھپا ہی رہا ہوں تو مجھے مجبور کیوں کریں۔ عقبی حصے میں بہت سکون تھا مگر یہاں آ کے دم اور گھٹنے لگا تھا۔ نماز کے دوران ہمارا وہاں بیٹھے رہنا بھی نامناسب تھا۔ میں منگو کو بھیج کے دکھوانا چاہتا تھا کہ ابا جان وغیرہ نے نماز ختم کر لی ہو تو اسی طرف چلیں۔ اتنے میں شہ پارہ کی آواز آئی۔ سب ہڑبڑا گئے جیسے سب کسی خواب سے دوچار ہوں۔ شہ پارہ کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آئی تھی۔ کسی کو بھی خواہش نہ ہو گی لیکن کسی نے انکار نہیں کیا۔ ہم گھوم کے عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف آئے تو وہ کھانے کے لیے اُٹھ رہے تھے۔ اُسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی۔ جو جہاں تھا، وہیں ٹھہر گیا۔ ابا جان نے منگو کو باہر جا کے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ اسی اثنا میں بھٹل خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی لپک کے اُس کے پاس پہنچ گیا۔

مجھے ایک لحظے کے لیے گمان ہوا تھا کہ کہیں شکلا نہ ہو۔ اس کے باوجود باہر اُسے اپنے سامنے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ سادہ لباس میں اپنی موٹر کے پاس کھڑا تھا۔ موٹر بھی پولیس کی نہیں تھی۔ بھٹل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ شکلا نے بڑھ کے اُس کا شانہ پکڑ لیا۔

"آؤ آؤ صاحب! اندر آؤ۔" بھٹل نے کسی قدر اضطراری آواز میں کہا۔ "سب خیر تو ہے؟"

"ہاں ہاں، بالکل، سب ٹھیک ہے۔" شکلا جھجکتے ہوئے بولا۔

"اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا...!"

"اچھا کیا صاحب، بہت اچھا کیا۔"

"یہاں آ کے احساس ہو رہا ہے کہ یہ وقت نامناسب ہے۔"

"کیا صاحب! کیسا بولتے ہو۔"

"جی نہیں مانا، بس اِدھر کا رُخ ہو گیا۔"

"اپنے کو شک تھا، آپ آ سکتے ہو۔"

شکلا پلکیں جھپکانے لگا۔ "آپ کو اندازہ تھا؟ کیسے کیسے؟"

"ابھی تک آپ آدھے وردی والے ہو۔"

ایک لمحاتی توقف کے بعد شکلا مسکرا پڑا۔

منیر علی، مولوی اکرم، جمرو، شامو وغیرہ سبھی باہر آ گئے تھے۔ سبھی متعجب تھے۔ مارٹی، جمرو اور شامو کے لیے البتہ وہ نیا نہیں تھا۔ دادا کی موت کی رات وہ اُسے تھانے میں دیکھ چکے تھے۔ شکلا اندر آتے ہوئے ہچکچا رہا تھا، شائستگی کی جھجک۔ بھٹل نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے دوبارہ اندر چلنے کو کہا تو اُس نے مزید تامل نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کے یک بارگی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ اس وقت اس کی آمد بے سبب نہیں ہو سکتی، ابھی سہ پہر تو ہم اس سے رخصت ہوئے تھے، نہ معلوم پھر کیا خبر لایا ہو۔ مگر شکلا کے انداز و اطوار اور لب و لہجے میں کوئی ایسی آلودگی نہیں تھی جو میری وحشت سوا کرتی۔ اندر آ کے روشنی میں جیسے ہی اُس کی نظر ابا جان پر پڑی، وہ ٹھٹک کے رُک گیا۔

"بابا ہیں، اپنے لاڈلے کے بابا۔" بھٹل نے آہستگی سے کہا۔

"میں، میں دیکھ رہا تھا۔" شکلا حیرانی سے بولا۔ ابا جان سے بغل گیر ہونے کے لیے بے ساختہ اُس نے ہاتھ پھیلا دیے۔ "میں آپ کو پہچان گیا تھا۔"

"مجھے!" ابا جان نے تذبذب سے کہا۔ "کیسے؟ مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی جناب سے...؟"

"اتنی بار آپ کا حلیہ سنا اور..." وہ کہتے کہتے ٹھہر گیا اور میری طرف نگاہیں جما کے بولا۔ "آپ میرے لیے بالکل اجنبی نہیں ہیں، ظہیر سے پوچھیے۔"

ابا جان کے علم میں تھا کہ بمبئی میں مجھے بہت سے لوگ بلکہ تقریباً سبھی ظہیر کے نام سے جانتے ہیں اس لیے وہ چونکے نہیں تاہم چندھیائی ہوئی آنکھوں سے شکلا کو دیکھتے رہے۔ یوں بھی اُس کی وضع قطع میں افسرانہ وقار تھا، لہجے میں بُردباری تھی۔ بھٹل نے ابا جان کی پریشانی دُور کی اور مختصراً انھیں بتایا کہ شکلا ہی کی وجہ سے ہم اُن تک پہنچ سکے تھے کرشنا جی نے ابا جان کی تلاش کے لیے ہندوستان بھر کے تھانوں کو خطوط روانہ کیے تھے، اُن کے بعد شکلا ہی اس سلسلے میں پیروی کرتا رہا تھا۔ ہر خط میں میرا اتا پتا ہولا ابا جان کا حلیہ تفصیل سے درج تھا اور شکلا کو تو ازبر ہو گیا تھا۔ آخر آسام میں ابا جان نظر آ گئے۔ شکلا کے تار کے ذریعے ہمیں یہ اطلاع فیض آباد میں ملی تھی۔ بھٹل نے شکلا کو نہیں بتایا کہ آسام میں ابا جان ہمیں نہیں مل سکے تھے، ہمیں تبت کا سفر کرنا پڑا اور ابھی بہت کچھ دیکھنا سننا رہ گیا تھا کہ نشانے چوکتے رہے، ہم زندہ سلامت واپس آ گئے۔ شکلا ٹوہ میں نہ لگا رہتا تو شاید ابا جان ہمیں کبھی نہ ملتے۔ ملتے بھی تو جانے کب، کس حال میں۔ تبت سے لعل و جواہر کے انبار کے ساتھ اُن کی تنہا واپسی کس طرح ممکن ہوتی، اور واپسی کا سوال تو بعد میں آتا، انھوں نے صدیوں پہلے کے مدفون خزانے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اُس محبس کی سنگلاخ دیواروں، دروں میں چھپے ہوئے نوادر کریدنے میں انھیں ایک عمر لگ جاتی۔ ابا جان کے چہرے پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے ہونٹ شکلا کے احسان کی زیرباری سے سل گئے ہیں۔ ممکن ہے، انھیں امی کی یاد بھی آئی ہو اور رقیہ کی بھی اور بھی بہت کچھ اس ذکر پر سب کچھ تازہ ہو جانا چاہیے۔ وہ شکلا سے کچھ نہ کہہ سکے۔

"مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا، آج دونوں کو، دونوں باپ بیٹے کو ساتھ دیکھ کے یقین کیجیے کیسی کیسی۔" شکلا کی آواز بھی بھرا گئی۔ "کاش کرشنا جی آج زندہ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ سب انھی کا...؟"

درمیان میں جولین کے آنے پر شکلا کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ جولین نے رسمی سلام کے بعد اُسے کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی اور سامنے بچھے ہوئے دسترخوان پر چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم میں تعلقِ خاطر کا ناز بھی شامل تھا۔ شکلا نے کہنا چاہا کہ وہ بے شک کھانا کھانے نہیں آیا ہے لیکن اُسے بھوک بھی نہیں ہے۔ جولین نے اُس کا عذر مسترد کر دیا۔ برآمدے میں جانے سے پہلے شکلا نے بھٹل سے خواہش ظاہر کی کہ پہلے وہ پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی سے ملنا چاہتا ہے۔ گیتا اور ردالی، ترنم اور فریال کے قریب کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ بھٹل کے ساتھ شکلا خود اُن کے پاس گیا۔ انھیں ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور لمحوں گُنگ کھڑا رہا۔ "یہ پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں ری، شکلا جی۔" بھٹل نے بھاری آواز میں کہا۔ گیتا اور ردالی نے بیک وقت سر اٹھا کے اُسے دیکھا۔ اُن کے چہروں پر ایک آن کے لیے کوئی تلاطم سا آ کے گزر گیا۔

"مگر میں، میں یہاں پولیس افسر کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں، مجھے آپ سے ملنا تھا۔" شکلا افسردگی سے بولا۔ "مجھے بھی اُن لوگوں میں سمجھیے جو یہاں آپ کے دکھ درد میں شرکت کے لیے موجود ہیں۔" شکلا کی زبان اٹکتی رہی۔ وہ وہی کچھ کہتا رہا جو آدمی کے مقدور میں ہے۔ لوگ مرتے رہیں گے اور اُن کے پسماندگان کے سامنے زندہ رہ جانے والے یہی معمول جملے دُہراتے رہیں گے۔ کوئی نہیں جانتا، سوگوار صرف ایک بات سننا چاہتے ہیں کہ اُن سے بچھڑ کے جانے والا اب تک واپس آ جائے گا، کوئی ترکیب، کوئی تدبیر بتاؤ کہ وہ اُسے دوبارہ حاصل کر سکیں لیکن کوئی یہ دعوا کرتا نہیں، آتا نہیں آتا تو یہ ہمدردیاں کیسی؟ سب بے کار ہے۔

گیتا اور رانی خاموشی سے سنتی رہیں۔ شکلا کے اظہار میں دل سوزی بھی تھی، بے چینی بھی۔ دونوں نے ساڑی کے آنچل سے منہ چھپا لیا۔ پھر نہ جانے شکلا کو کیا ہوا، اُس نے ہیجانی انداز میں گیتا کو اپنے پہلو میں کھینچ لیا، کہنے لگا "میری چھوٹی بہن کا منی بھی بالکل تمھارے جیسی ہے۔ بہت چھوٹی تھی کہ ماں مرگئی، پتاجی بھی چند دنوں بعد چل بسے۔ میں نے ہی اُسے پالا پوسا ہے۔ میرے لیے وہ بیٹی کے مانند ہے۔ تمھیں دیکھ کے ایسا لگتا ہے، سچ مانو، ایسا لگتا ہے کہ اب ایک نہیں، میری دو بیٹیاں، دو بہنیں...."

شکلا کو احساس ہوا تو وہ مضطربانہ گیتا کی پیٹھ سہلانے، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور بولا "نہیں، نہیں، رو دو مت، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ علم تو حوصلہ دیتا ہے، علم سے تو اندھیرا اجالا زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔ جب سے دُنیا بنی ہے، یہی ہوتا رہا ہے، آگے پیچھے لوگ بچھڑ جاتے ہیں۔ یہاں جتنے بھی ہیں، سب ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ سب کی تقدیر ایک جیسی ہے۔ ہر آدمی چھوٹی بڑی مدت کا مسافر ہے۔ تمھارے پتاجی نے تو اتنے لوگ، اتنے اچھے لوگ تمھارے لیے ورثے میں چھوڑے ہیں۔ یہ تو بہت بڑی دولت ہے۔ جانے والے تو کبھی بہت اکیلا، بہت تنہا کر جاتے ہیں۔ تمھارے پاس تو اتنے...."

گیتا اور پھوٹ پڑی۔ مجھل نے شکلا کی مدد کی اور گیتا کو اُس سے جُدا کر دیا۔ وہ روتی سسکتی گیتا کے شانوں پر ہاتھ رکھے برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

دسترخوان پر مجھل نے شکلا کو اپنے پاس ہی بٹھایا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ جولین میرے برابر تھی۔ وہ بار بار شکلا کے آگے ڈونگے رکھتی۔ اُس کے اصرار پر شکلا آخر تک ہاتھ چلاتا رہا۔ میر علی اور مولوی اکرم نے کھانے کے دوران فضا پر چھایا ہوا غبار دُور کرنے کے لیے کئی مرتبہ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اتنا ضرور ہوا کہ گیتا اور رانی کے آنسو تھم گئے۔ کھانے کے بعد بھی شکلا دیر تک دسترخوان پر بیٹھا رہا اور مختلف موسموں میں مختلف غذاؤں کے خواص کے بارے میں میر علی کی باتیں انہماک سے سنتا رہا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے سب کو دیکھتا تھا، کسی حد تک حیران و پریشان آنکھوں سے۔ جب دوبارہ سارے مُر دہ بنے پڑے بیٹھے تو بھی اُس کا یہی عالم رہا۔ ابا جان نے شکلا کے قریب کی کرسی سنبھال لی تھی۔ ایک شخص کے اچھا لگنے کے علاوہ اس قربت کی وجہ اور بھی ہوگی۔ اُن کی نظریں مسلسل شکلا کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کرسی پر بھی انھیں ایک پہلو قرار نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شکلا سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں مگر جیسے سرا نہیں مل رہا ہے۔ گھر کے ایک آدمی کو، دادا سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو جو بے کلی ہونی چاہیے، وہ انھیں بھی ہوگی

اب تک سب کچھ جوں کا توں قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر وہ اندھا وقت گزر چکا تھا۔ ابا جان کو گردوپیش کا جاننے کی بہت تشویش ہوگی، پولیس کے رویے اور اندازے جاننے کی بے تابی۔ ہم پر کوئی آنچ آنے یا کسی طور ہمارے ملوث ہو جانے کا خدشہ اُن کے سینے میں الگ دھڑکتا ہوگا۔ جو بات وہ ہم سے نہیں پوچھ پاتے تھے، مناسب نہیں سمجھتے تھے یا ہم سے کسی معقول بات کی توقع نہیں تھی، اُسے پوچھنے کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ ایک پولیس افسر اُن کے سامنے موجود تھا، مجھل کے بہ قول ایک بڑا پولیس افسر۔ شکلا کی خوش بیانی، وضع و مروّت اپنی جگہ، ادھر جولین نے بھی شکلا کے لیے سب کا تکدر دُور کرنے میں بڑی مدد کی تھی۔ اُس کی بے ساختہ خاطر داری اور غیر ارادی التفات کا بھی بڑا دخل تھا جبھی شکلا کسی کو ایسا اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے بہت دنوں سے وہ اس گھر میں آ رہا ہو۔ جولین کی ماں اور چچا بیگم تو ویسے بھی اُسے اچھی طرح جانتی تھیں۔ انھوں نے بھی شکلا کا ایک اچھا تاثر قائم کرنے میں جولین کی اعانت کی تھی مگر شکلا کا تعلق بہرحال پولیس سے تھا اور ابا جان، ایک سرد و گرم چشیدہ شخص کے خیال میں اُس کی اچانک آمد محض اظہارِ تعزیت کے لیے نہیں ہوگی، کوئی دوسرا مقصد بھی ہوگا۔

شکلا کی طرف ابا جان کی رغبت یک طرفہ نہیں تھی، شکلا بھی کچھ انھی کی جانب مائل تھا۔ وہ بمبئی کے موسم کی نیرنگی کے بارے میں اپنے تجربے سُنا رہا تھا اور کوئی عجب نہیں تھا کہ باتوں باتوں میں کسی لمحے وہ اُن سے پوچھے کہ آخر کیا مجبوری تھی جو انھیں اپنے آبائی گھر اور شہر سے دور ہونا پڑا، کیوں جلد جلد وہ نئے گھر، نئے شہر بدلتے رہے۔ انھوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ اُن کا جوان بیٹا ٹھوکریں کھا کے کسی وقت گھر واپس آ سکتا ہے، اُس کے لیے کوئی پتہ نشان تو بتا کے جاتے۔ کیا انھوں نے اپنی دانست میں اُس پر خاک ڈال دی تھی؟ اُس کی یاد تو انھیں آتی ہوگی، کہیں کوئی اُس کے قد، اُس کی کاٹھی کا نظر آتا ہوگا تو آنکھیں بہت جلتی ہوں گی۔ آخر کیا ستم ٹوٹا تھا، کون سی دہشت تھی جو وہ خود کو بچائے بچائے، چھپائے چھپائے پھرتے رہے؟ شکلا کو بہت کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے ساری بات کرشنا جی کو بھی نہیں بتائی تھی کہ ابا جان کے گھر چھوڑنے کا اصل سبب کیا تھا۔ مجھے خود بھی اتنا کہاں معلوم تھا۔ شکلا کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک اجنبی لڑکی کے ترک کیے ہوئے کاغذات کے نقش و نگار نے اُن کی بینائی خیرہ کر دی تھی۔ نہ معلوم ابا جان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُس کی کیا حالت ہوتی۔ اس جستجو میں عزت و حرمت کے راستے پیچھے تھے۔ ابا جان کو انھیں کھوجنا تھا۔ کسی مہم جو اور طالع آزما کی طرح۔ سمندر کی گہرائی جتنی قریب آتی ہے، آدمی اتنا ہی ڈوبتا ہے۔

پھر کون پیچھے رہ گیا، کس نے صدا لگائی، اس کا ہوش کسے رہتا ہے۔ آدمی اس کمال کی طلب میں ایسے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ ہر کمال کے لیے ایثار شرط ہے، ایثار، قربانی، صبر و ضبط۔ پر ابا جان نے کاغذات سے آگے کے علم پر توجہ نہیں دی تھی جو دیوار کا نوشتہ ہے۔ وہ نقش جو اندھیروں میں بھی روشن رہتا ہے۔ کاغذات میں آبِ حیات کا نقشہ نہیں تھا جس کے بغیر ہر کمال عارضی ہے، ناپختہ اور ناتمام۔

شکلا نے ابا جان سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کا جواب دینا انھیں مشکل ہو جاتا۔ یہی اندیشہ ابا جان کو بھی روک رہا ہوگا جو پھر دادا کا تذکرہ اُن کی زبان پر نہیں آ رہا تھا، کہیں معزز مہمان کوئی اطمینان بخش جواب دینے کے موقف میں نہ ہو۔ جمرو، اشامو، ماریٔ اور ٹنگو کچھ دیر وہاں بیٹھ کے چپکے سے ایک ایک کرکے باہر نکل گئے تھے۔ شکلا نہ ہوتا تو میں بھی اُن کے ساتھ نکل جاتا مگر شکلا نہ ہوتا تو وہ بھی کیوں جاتے۔ اس اثنا میں جولین نے چائے کی ٹرے لا کے رکھ دی تھی۔ میں نے چائے بنائی اور ابا جان نے آدھی پیالی بھی ختم نہ کی ہوگی کہ اچانک اُٹھ گئے۔ شاید انھیں احساس ہو گیا تھا کہ مجھل کی موجودگی میں وہ شکلا سے دادا کا کوئی ذکر نہیں چھیڑ سکتے اور خود اُن کی موجودگی مجھل اور شکلا کی کسی ضروری بات چیت میں حارج ہو رہی ہے۔ انھوں نے شکلا سے واجبی معذرت کی۔ اُن کے ساتھ ہی میر علی اور مولوی اکرم بھی اُٹھ گئے۔

میرے اور مجھل کے سوا کوئی نہ رہا تو شکلا نے بس چند لمحوں کا توقف کیا، سرگوشیانہ انداز میں مجھل سے کہا کہ تھانے سے ہمارے جانے کے بعد وہ پھر ماری کے پاس گیا تھا اور اُس نے ماری سے اُس کے بیان پر نظرِ ثانی کے لیے کہا تھا، ماری نے انکار کر دیا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ شکلا نے بتایا کہ کل صبح ماری کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، پولیس نے کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ ماری کل بھی جیل منتقل ہو سکتی ہے اور اُسے چند دن کے لیے حوالات میں بھی روکا جا سکتا ہے۔ اس دوران ماری اپنے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کر لے تو سزا میں کمی ہو سکتی ہے۔

مجھل سر ہلاتا رہا۔ "وہ نہیں کرے گی صاحب!" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اُس کے بچوں کا خیال آتا ہے۔" شکلا بے قراری سے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کی کیا مدد کی جائے؟"

"اب تو تالی بجاؤ صاحب!"

"وہ ایک اچھی عورت لگتی ہے۔ کاش وہ یہ واردات خود کرنے کے بجائے سیدھی پولیس اسٹیشن آ جاتی، پھر یہ سب نہ ہوتا۔"

"آگے کا دیکھو صاحب!"

"ہاں۔" شکلا مایوسی سے بولا۔ "وہ تھانے آ چکی ہے، وقت کو پیچھے چلنا نہیں آتا۔"

"آپ بولو تو اُس کو اُٹھوا دیں؟"

"جی، جی۔" شکلا اچھل سا گیا۔ "کیا کہتے ہو دادا؟"

"سوچ لو صاحب!"

شکلا کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ "تھانے سے اُسے اُٹھایا جا سکتا ہے؟"

"آپ کی مرضی پر ہے۔" مجھل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اوہ، نو، نو۔" شکلا سر جھٹک کے بولا اور ایک ثانیے کے تذبذب آمیز سکوت کے بعد کہنے لگا۔ "پھر، پھر وہ کہاں جائے گی؟"

"دُنیا کوئی چادر نہیں ہے صاحب!"

"اور بچوں کا....؟"

"ساتھ ہی رہیں گے اُس کے۔"

"اور سب پیچھے رہیں گے؟" شکلا تلخی سے بولا۔ "کب تک؟ کہاں تک؟ وہ قتل کی ملزم ہے دادا!"

"صرف دو ہی تو کیے ہیں صاحب!"

شکلا نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، تم، تم کیا کہہ رہے ہو دادا؟"

"نہیں آتا تو جانے دو۔"

"میری بات دھیان سے سُنو۔" شکلا کی آواز میں ترشی تھی۔ "تم جو کہہ رہے ہو، میرے خیال میں وہ بالکل ممکن نہیں ہے لیکن اگر، اگر ایسا ہو سکتا ہے تو اس سے اُس کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ ایسا مت سوچو دادا! ہم اور بھی کئی طریقوں سے اُس ابھاگن کی مدد کر سکتے ہیں۔ صحیح مشورہ تو ایک اچھا وکیل ہی دے سکے گا۔ ادھر پولیس نے بھی اپنی رپورٹ میں ماری کے لیے نرم رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک عورت ہے، عدالت ضرور اس کا خیال رکھے گی۔" مجھل چُپ بیٹھا رہا تو شکلا جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "قانون بھی عجیب ہوتا ہے۔ عدالت کو اچھی طرح یقین ہوگا کہ ماری ایک عادی مجرم نہیں ہے اور وہ دوبارہ ایسا سنگین جُرم نہیں کرے گی۔ ایک لمبی کارروائی کے بعد عدالت بھی جس نتیجے پر پہنچتی، ماری نے وہی کیا ہے مگر ماری کو سزا صرف اس وجہ سے ملے گی کہ اُس نے عدالت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔" شکلا بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "پر شاید یہی ٹھیک بھی ہے۔ ایک مرتبہ یہ حق عام کر دیا جائے

تو…" شکلا خود چونک پڑا اور حتمی لہجے میں بولا۔ "میری نظر میں ایک قابل وکیل ہے، بیرسٹر بھارگو۔ ذرا مہنگا ہے مگر ہم ماری کے لیے روپے پیسے کی پروا نہیں کریں گے۔ پیسہ ہوتا ہی کس لیے ہے، جتنا پلے ہے پھینکیں گے، کیوں دادا؟"

"آپ زیادہ جانتے ہو صاحب!"

"کیا یہ پیسے کا صحیح استعمال نہیں ہوگا؟"

"ٹھیک بولتے ہو صاحب!"

بجھل کے لہجے میں کسی تندی کی آمیزش تھی جو شکلا نے محسوس کرلی۔ "میرا مطلب ہے دادا!" اُس نے نسبتاً تیز آواز میں کہا۔ "بے شک روپیہ پیسہ ہر جگہ نہیں چلتا۔ سونے کا سکہ بھی بعض جگہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ ہم عدالت کو روپے پیسے سے نہیں خرید سکتے، نہ خریدنا چاہیے مگر ایک تجربہ کار وکیل عدالت میں ماری کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ جتن کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ہم کم از کم اُس کی سزا تو کم کرا سکتے ہیں۔" بجھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔ شکلا منتشر سا ہو گیا۔ "کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ… وہ؟"

"کیسا بولتے ہو صاحب؟" بجھل نے سر اُٹھا کے کہا۔ "ہم تو آپ سے بولے تھے، اُس کی جگہ جا کے بیٹھ جائیں۔"

"نہیں دادا! اس کی ضرورت نہیں۔ تم بس اتنا کرو، ماری سے جا کے کہو کہ اپنی زندگی ہار چکی ہے تو آگے بچوں کی زندگی پڑی ہے۔ اُسے بولو، جیسا وکیل مشورہ دے، ویسا ہی بیان دے، تھوڑی ہوش میں آجا۔"

"ملیں گے تو ضرور بول دیں گے۔"

"رات ہو گئی ہے۔" شکلا گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بھارگو جی سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔ صبح تم جتنی جلدی ہو سکے تھانے پہنچ کے اُس سے مل لو تو اچھا ہے۔ تمھاری بات وہ ضرور مانے گی دادا! ہمیں اُس میں زندگی دوبارہ جگانی ہوگی، سمجھے دادا! دوپہر جب تم نے اُسے دیکھا تھا، اُس وقت وہ کچھ اور تھی۔ لگتا ہے جیسے تم سے ملنے کے لیے اُس نے طاقت بچا کے رکھی تھی۔ شام کو میں دوبارہ اُس کے پاس گیا تو پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اتنی دیر میں وہ ایسی اجڑ گئی تھی کہ مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کی۔ اُکڑو کے بیٹھی اور بس خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں انسپکٹر ٹھاکر کو اُس کا خیال رکھنے کا کہہ کے آیا تھا، ضرورت پڑنے پر فوراً ڈاکٹر کو بھی بلانے کا…"

"آگ اپنے آپ کو بھی جلاتی ہے صاحب!"

"بالکل دادا! وہ تو ریت کا، راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی، دیکھا نہیں جاتا تھا۔" شکلا کی آواز اُس کے اضطراب کی غماز تھی۔ "میں تمھیں بتاؤں، شام اُسے دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ شاید ہی وہ عدالت کے فیصلے تک چل سکے۔"

"نہیں چلے گی صاحب وہ۔" بجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو؟" شکلا تیزی سے بولا۔ "پر دادا سچ پوچھو تو اس میں تمھارا بھی دخل ہے۔"

"اپنا!" بجھل کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ "کیا بولتے ہو آپ صاحب بہادر؟"

"تمھیں بچوں کا وارث بنا کے وہ بے فکر ہو گئی ہے۔ سارے کاموں سے نمٹ چکی ہے، اُسے یقین ہے کہ تم اُس کے بچوں کے لیے اُس سے بڑا سایہ بنو گے، تم، ظہیر اور… گو اُس نے اپنی کل جمع پونجی تمھارے حوالے کر دی ہے مگر وہ جانتی ہے کہ اس کے بغیر بھی ایک بار ذمے داری لے کے تم وہی کرتے جو زیادہ سے زیادہ تمھارے بس میں تھا، جان سے زیادہ اُن کی حفاظت۔"

"وہ تو الٹی ہوئی ہے صاحب! آپ نے دیکھا ہی ہے اُس حرام کی جنی کو، ہم نے آپ کے سامنے اُس کو سارا بولا تھا۔" بجھل نے ترشی سے کہا۔

"میں نے دیکھا تھا۔ تم یہی کرتے، تمھاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا لیکن تمھاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ماری کو اتنا یقین بھی نہ آتا۔ وہ تو تم تھے دادا، کوئی اور نہیں۔ اُس وقت تمھیں اسی طرح سننا چاہیے تھا جس طرح وہ کہہ رہی تھی مگر اب تم، تم اُسے بتا سکتے ہو، تمھیں اُس سے کہنا چاہیے کہ ایک ماں سے زیادہ کوئی اُس کے بچوں کے لیے بہتر نگراں نہیں ہوتا، کوئی بھی نہیں۔ تم اُسے اپنی مجبوریاں بتا سکتے ہو، سیدھے اور سچے عذر… اس صورت میں وہ… وہ… میرے کہنے کا مقصد یہی ہے۔" شکلا کو وضاحت میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وضاحت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بجھل ساکت و جامد بیٹھا اُسے گھورتا رہا۔

"مجھے اٹھنا چاہیے۔ صبح تھانے میں ملاقات ہوگی۔ اُمید ہے، تم جلدی آؤ گے۔" شکلا کا لہجہ حکمیہ بھی تھا، التجائی بھی۔ بجھل نے آنکھیں بند کر کے اثبات کا اظہار کیا۔ "ویسے بھی اب تمھارے پاس وقت بڑا ہوگا۔" شکلا نے کہا۔ "پاڑے تو جانا نہیں۔" میری نظریں یکایک بجھل کی طرف گئیں، میری طرح اُسے بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ پاڑے پر بجھل کے نہ جانے کے بارے میں شکلا کس وثوق سے کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا لیکن بجھل کو خاموش دیکھ کے چپ رہا۔

شکلا تیکھے لہجے میں کہنے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تم نے ابھی

پاڑے سے ناتا توڑنا کیوں ضروری سمجھا حالاں کہ تمھارے اور ظہیر کے کسی بھی ہمدرد کی یہی خواہش ہوگی کہ تم کبھی پاڑے کا رُخ نہ کرو مگر ابھی، ابھی شاید تمھارا وہاں جاتے رہنا کچھ بہتر ہوتا۔"

"اب اپنا اُدھر کوئی کام نہیں تھا۔"

"دوسروں کا تھا، پولیس تمھیں وہاں دیکھنا چاہتی تھی۔ پولیس کو اندیشہ ہے کہ تمھارے جیسے دادا کے پاڑے سے ہٹنے کے بعد دادا لوگ بہت دنوں تک آپس میں جھٹے نہیں رہیں گے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے کیسی لوٹ مار مچے، اُن کے درمیان کتنا سر پھٹول ہو۔ ہمیں فوراً ہی خبر دی گئی تھی۔ شام ہی کو پولیس افسروں کی میٹنگ بلائی گئی۔ میرا خیال ہے، اب تمھیں یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ کئی پولیس افسروں کا ذہن تمھاری طرف سے صاف نہیں تھا۔ صبح ماری کے تھانے آنے سے پہلے، یعنی کل رات تک انھیں شک تھا کہیں وہ تمھی نہ ہو۔ تم نے اُس رات دادا کی موت کی رات تھانے میں بھرپور بھرا تھا اور پولیس کو فریب دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھیں افسوس تھا کہ تمھیں اُس رات تھانے میں کیوں نہ روک لیا گیا۔ اس دوران تمھیں تمام نشانات، شہادتیں مٹانے کا موقع مل گیا ہوگا۔ وہ تم پر ابھی ہاتھ تو نہ ڈالتے، تمھیں کچھ اور وقت دیتے کیوں کہ وہ تمھاری طرف سے پوری طرح باخبر تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ تم نے بہت دیر بعد پاڑے پر پیرو کی جگہ بیٹھنا قبول کیا تھا۔ وہ افسر جو تمھارے جیسے دادا کے ہاتھ آجانے کے بعد اتنی آسانی سے چھوڑ دیے جانے کے فیصلے پر ناراض تھے، اُن کی رائے میں پاڑے پر تمھارے نہ بیٹھنے کی جھجک بھی ایک دکھاوا تھی۔ اُن افسروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اسی وجہ سے اُن کی بات نہ چل سکی لیکن وہ افسر جنھوں نے تم پر اعتبار کیا تھا، کوئی بات واضح نہ ہونے کی وجہ سے ڈگمگانے لگے تھے۔ جیسے جیسے کوئی سُراغ ملنے میں انھیں ناکامی ہو رہی تھی، وہ کمزور ہو رہے تھے۔ لوٹ پھر کے اُن کی نظریں تمھاری ہی طرف آتیں۔ ماری نہ آجاتی تو شاید تمھیں زیادہ وقت نہ ملتا۔"

"اپنے کو بس اتنے ٹائم کی ضرورت تھی۔"

"اتنے ہی ٹائم کی؟" شکلا تعجب سے بولا۔

"دادا کو آگ میں پھونکنا اور تھوڑا ان دونوں کو سنبھالنا تھا۔" بجھل نے برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر وہ بھی دیر نہ کرتیں۔"

"اندازہ ہے دادا!" شکلا گہری سانس لے کے بولا۔ "میں سوچتا ہوں، اُس رات اگر وہ تمھیں تھانے میں روک لیتے اور تمھارے بجائے کسی اور ذریعے سے گیتا اور اُس کی ماں کو دادا کی خبر ملتی تو جانے کیا… کیا کچھ بدلا ہوا ہوتا…"

"نہیں روکتے صاحب وہ اپنے کو۔"

"نہیں روکتے! تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اپنے کو پتہ تھا، وہ روک سکتے ہیں۔ اسی واسطے ہم نے پورا ٹائم لگایا تھا، اُن کو آگے پیچھے کا سمجھانے کو، اس کے بعد اپنے کو جانے ہی دینا تھا۔"

"میں، میں جانتا ہوں۔" شکلا ہکلاتے ہوئے بولا۔ "پہلے نہیں تو بعد میں مجھے اس کا احساس ہوا اور اب یہاں آنے کے بعد کچھ زیادہ معلوم ہوا کہ تم نے وہاں کس لیے اتنی تکرار کی تھی۔ پولیس کے سلسلے میں تمھارا تجربہ کم نہیں ہوگا مگر دادا! میں انھی لوگوں کے درمیان رہتا ہوں، اُن میں سے کسی کا دماغ پھر سکتا تھا، وہی راستے کا پتھر بن جاتا۔ وہ تینوں افسر تمھیں چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ باہر آکے انھوں نے یہی کہا بھی مگر پولیس نے یہ سوچ کے کہ تم پر کڑی نگرانی رکھی جائے گی، تمھیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی، فرض کرو اگر ایسا…؟"

"پھر اپنا بھی اُلٹ سکتا تھا صاحب!"

شکلا کے چہرے پر لکیریں کھنچ گئیں جیسے بجھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہو یا اُسے ناگوار گزری ہو یا بجھل کی دماغی حالت پر اُسے شک ہونے لگا ہو۔ تاہم اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیر تو ہو جاتی دادا! خیر۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "جانے دو، اب سب بعد کی باتیں ہیں۔ بات کہاں سے چلی تھی، کہاں نکل گئی جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔"

"آپ سویرے آنے کا بول رہے تھے۔"

"ہاں!" شکلا مستعدی سے بولا۔ "اور میں، میں کہہ رہا تھا، شکر کرو کہ ماری آگئی۔ وہ نہ آتی تو وہ تمھیں زیادہ وقت نہ دیتے۔"

"ہم بھی نہیں لیتے صاحب!"

"نہیں، نہیں سمجھا نہیں تم۔۔۔"

"اپنے کو جان کاری تھی، وہ اِدھر اپنے پاس ہی پلٹیں گے۔"

"پھر تم!" شکلا چیختی آواز میں بولا۔ "کیا تم تمھیں معلوم تھا کہ وہ جارجی اور وکی ہی۔۔۔"

"نہیں تھا تو ہو جاتا صاحب!" بھُجل نے تنک کے کہا۔ "پہلے ہم اسی سور کی اولاد کے پاس جاتے۔"

جولین کے آنے پر شکلا کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ اُس کی نظریں مسلسل بھُجل پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے جولین کی طرف بھی توجہ نہیں دی۔ جولین بھی ٹھیری نہیں، چائے کی ٹرے اٹھائے خاموشی سے اندر چلی گئی۔ شکلا اپنے آپ میں گم رہا پھر دفعتاً کرسی سے اُٹھ گیا۔ ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہم دروازے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شکلا پھر رک گیا اور بھُجل کا بازو پکڑ کے بولا "میں نے تمھارا بڑا وقت لیا دادا!"

"وقت کی بات تو تالی جیسی ہوتی ہے صاحب!"

"ہاں!" ایک لمحے بعد شکلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ڈھل اُٹھی۔ "مگر یہ سب میری طرف سے تھا۔" وہ اُمڈتی آواز میں بولا۔ "یقین کیجیے، آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، تقریباً شام ہی ہو گئی تھی جب آپ لوگ تھانے سے گئے تھے۔ کچھ دیر مجھے وہاں اور لگی۔ مَن پر بہت بوجھ تھا گھر پہنچ کے نہایا، کپڑے بدلے اور ہیڈ آفس کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اِس طرف نکل آیا۔ میں نے بتایا نا، بس جیسے موٹر کا رُخ خود بہ خود اِدھر ہو گیا۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ آپ لوگوں کو آرام کی ضرورت ہو گی۔ دن بھر تھانے اور پاڑے میں لگ گیا تھا۔ وقت مرضی پر نہ چلے تو تھکن بڑی ہوتی ہے اور غم تو یوں بھی بہت بڑی تھکن ہے۔ پر جی نہیں مانا، سچ پوچھو تو جانے کتنی باتیں دماغ میں اٹک رہی تھیں، کھٹک رہی تھیں۔ یہاں آ کے سب کچھ گڈ مڈ ہو گیا۔ تھانے میں اتنی دیر ملاقات رہی تھی، آمنے سامنے لیکن کوئی کمی محسوس ہوتی رہی اور اب یہ اور بڑھ گئی ہے۔"

"باتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے صاحب! کمی بڑھتی رہتی ہے، پوری ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں، ناتے میں دم نہیں رہتا۔"

"ہاں دادا!" شکلا پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ "تم سے ملنا میرے لیے ایک بہت۔۔۔" وہ کچھ کہہ نہیں پایا، اُس کا جسم بل کھا گیا۔ "کیا کہا جائے دادا؟"

"کچھ مت بولو صاحب! اپنے کو بھی بہت سکھ ملا آپ سے مل کے، اور ہم پر تو آپ کا ویسے بھی بہت ادھار ہے، اُوپر سے نیچے تک بندھے ہیں صاحب! آپ کے واسطے سے لاڈلے کو اس کا بابا مل گیا۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا، یہ سب تو کرشنا جی۔۔۔"

"آپ کا بھی بہت ہے۔ اِدھر بمبئی آ کے ایسا ہی اُلٹ پلٹ ہوتا رہا۔ آنے کو ٹائم ہی نہیں ملا۔ پر آپ کے پاس آئے بنا ٹوٹتے نہیں"

"مجھ پر اعتبار ہے دادا؟" یکایک شکلا نے منتشر لہجے میں کہا۔

"کیا بولتے ہو صاحب!"

"تو پھر بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟"

"کیا صاحب! کس طرف کا بولتے ہو؟"

"میں اور جاننا چاہتا ہوں۔" "اور بہت کچھ۔"

"اپنے کو نہیں پتہ، آپ کیا بولتے ہو؟"

"کاش میں پولیس والا نہ ہوتا۔"

"ہم آپ کو نہیں سمجھتے، ایک دم نہیں۔ آپ بولو صاحب! کدھر کا آپ کو دھکا ہوا لگتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" شکلا نے بعجلت کہا۔ "میں اپنی بات ٹھیک طرح کہہ نہیں پا رہا ہوں۔ بہر حال پھر سہی۔" شکلا سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی موٹر تک ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اُس نے چابی گھما کے دروازہ کھولا مگر موٹر میں بیٹھنے سے پہلے وہ مُڑ کے بھُجل سے بولا۔ "دادا! اُس کے بچوں کے پاس کب جانا ہے؟"

"جلدی صاحب، جلدی جائیں گے۔" بھُجل نے تحمل سے کہا۔

"جلد ہی جانا چاہیے، ممکن ہے، اُن تک کوئی ایسی ویسی خبر پہنچ جائے۔ بچوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ مناسب سمجھو تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں؟"

"ضرور صاحب، ضرور۔"

"اُن سے کیا کہو گے، کیا بتاؤ گے دادا؟"

"ٹائم پر دیکھیں گے۔"

"میں مسلسل سوچتا رہا ہوں، دماغ کام نہیں کرتا، یہ آسان کام نہیں ہے دادا!"

"اپنے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے صاحب!"

"اگر کوئی اچھی صورت نہ بنی تو میں، میں انھیں گھر لے آؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اچھی ماں کے اچھے بچے ہوں گے۔"

"اتنا آگے کا ابھی کیوں دیکھتے ہو صاحب!"

شکلا اضطراب سے سر ہلانے لگا۔ "تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ کوئی کانٹا سا بار بار چبھتا ہے۔ پولیس کی نظر اب تم پر بالکل نہیں ہے لیکن پاڑے کے لوگ! اُن کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ تم سب نمتا کے وہاں سے چلے آئے ہو اور دوبارہ جانا بھی نہیں چاہتے، نہ وہاں بیٹھنے والوں کو تمھاری جلد واپسی کی اُمید ہو گی۔ مجھے معلوم ہوا ہے، اُنھوں نے تمھیں روکنے کی بہت کوشش کی تھی اُس وقت انھیں یہی کرنا چاہیے تھا، پر وقت بہت جلد گزر جاتا ہے۔ آدمی بھولنے پر آئے تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ کل ہمیشہ دوسرا ہوتا ہے۔ وہاں اور بھی بہروپیے ہو سکتے ہیں، اور بھی کئی جارجی۔ انھیں زیادہ دیر تمھارا بمبئی میں ٹھیرے رہنا پسند نہیں آئے گا۔ کچھ بھی ہو، وہ تمھیں سدا پیرو دادا کے رشتے سے دیکھیں گے تم نے پاڑے الگ الگ کر دیے، یہ تم نے اچھا کیا۔ یہی ٹھیک فیصلہ تھا مگر کوئی اور نہیں تو ابھی باہم کا پاڑا باقی ہے۔ آج وہاں سب ایک زبان سے بولتے ہیں۔ کل یہی لوگ ایک دوسرے کے خلاف اُٹھ سکتے ہیں اور سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ جب تک تم بمبئی میں ہو، اُن کا مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ تم کسی وقت بھی اپنا حق جتانے آ سکتے ہو۔ بہت عرصے تک اُنھوں نے پیرو دادا کی من مانی قبول کی، اب پہلی بار اُنھیں چھوٹ ملی ہے۔ وقت کچھ گزر گیا تو شاید وہ ایک دوسرا پیرو برداشت نہ کریں۔ ایک دوسرا پیرو یا اُس کی جگہ کوئی لاڈلا یا راجا۔۔۔" شکلا میری طرف دیکھے بغیر زیر لبی سے بولا۔ "سُنا ہے، چاقو پر راجا دادا کا ہاتھ بھی بہت صاف ہے۔"

میرے کانوں میں چنگاریاں سی لپکیں حالاں کہ شکلا کے لفظوں میں زہر تھا نہ طنز و استہزا۔ میں نے کچھ نہیں کہا، سر جھکائے کھڑا رہا۔ بھُجل نے دخل دینا چاہا تو شکلا نے اُسے روک دیا۔ "پہلے میری سُن لو دادا!" اُس نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "اب وہ پیرو دادا کے گھر کا راستہ بھی جانتے ہیں۔"

"ہم کو بھی جانتے ہیں صاحب! اچھی طرح سے۔"

مجھے علم ہے، وہ کس طرح تمھیں جانتے ہیں، بہت بڑے دادا کی حیثیت سے۔ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟ پر پیرو دادا بھی شہر کا سب سے بڑا دادا تھا۔ کتنی آسانی سے اُنھوں نے۔۔۔ تم کہو گے کہ باہم کے پاڑے پر پیرو کے خاص آدمی ہیں۔ وہ ایک اشارے پر پیرو کے لیے جان قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے۔ اُسی کے پالے ہوئے ایک گٹے نے دادا کو ختم کر دیا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں دادا! بس تھوڑی سی احتیاط مُراد ہے۔ اس گھر کو تمھاری بہت ضرورت ہے۔ اُس دن جب دادا کی ارتھی اُٹھ رہی تھی، میں بھی یہاں لوگوں کے درمیان ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اُس دن میں نے گیتا اور اُس کی ماں کو دیکھا تھا۔ آج وہ بہت سنبھلی ہوئی ہیں۔ سمجھ رہے ہو دادا؟"

بھُجل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"کچھ بُرا لگا ہو تو معاف کر دینا۔" بھُجل کی خاموشی نے شکلا کو مجوب کر دیا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں کہنے لگا۔ "سارا اونچا نیچا تو خود تمھارے سامنے بھی ہو گا۔ نہ جانے میں اتنا کیوں کہہ رہا ہوں، اپنی حد سے زیادہ۔"

"اب آپ جاؤ صاحب!" بھُجل نے آہستگی سے کہا۔

شکلا کے چہرے کا رنگ ایک آن کے لیے متغیر ہوا پھر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہاں دادا! میں چلتا ہوں، پر ابھی جی نہیں بھرا۔ یہاں اس سوگ میں بھی کیسی ٹھنڈک ہے، ہو سکا تو دو ایک دن میں پھیرا لگاؤں گا، وقت نکال کے۔"

"نہیں صاحب! اپنی بنتی ہے، ابھی آپ اِدھر مت آنا۔"

"کیوں، کیوں دادا؟" شکلا کی زبان حلق میں اٹک گئی تھی۔

"آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے، اڈّے کے، پاڑے کے لوگ ہیں صاحب! آپ پولیس کے بڑے افسر ہو مگر یہ بھی یہ پیرو دادا کا ہے۔ اِدھر اب سارے میں گھنٹی۔۔۔"

"مگر مجھے اِس کی، اِس کی پروا نہیں ہے۔"

"اپنے کو ہے صاحب!" بھُجل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔ "آپ کے لیے بولتے ہیں۔"

شکلا تکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ بھُجل نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے موٹر میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شکلا چند لمحے سکوت میں کھڑا رہا پھر اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔

اُس کے جاتے ہی میں سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر میں جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی آ گئے۔ وہ قریب کی جگہیں گھومتے رہے تھے، اُنھوں نے شکلا کی موٹر جاتے ہوئے دیکھ لی تھی، جارو نے جیسے نشہ کیا تھا۔ وہ آتے ہی بستروں پر اوندھے سوندھے پڑ گئے۔ اُنھیں میرے اور اپنے آرام ہی کا خیال ہو گا جو چند رسمی لفظوں کے سوا اُنھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

رات گئے تک مجھے نیند نہیں آئی۔ پھر رات کا آخری پہر ہو گا جب کہیں میری آنکھ لگی اور کئی دن بعد مجھے ٹوٹ کے نیند آئی۔

بے حسی میں شاید یہی ہوتا ہے۔

صبح کسی کا ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر محسوس ہوا تو میری آنکھ کھلی۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھ گیا۔ سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس جولین آئی تھی، نکھری نکھری، اُجلی اُجلی۔ پہلی نظر میں تو مجھے نرس کا گمان ہوا۔ جولین کو اِس لباس میں میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے ہڑبڑانے پر وہ بھی گھبرا گئی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اُس نے متردد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں، بالکل۔" میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ کمرہ خوب روشن تھا۔ جولین کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟" جولین کے جواب دینے سے پہلے میری نظر گھڑی پر گئی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ "اتنی دیر ہو گئی؟" میں نے سٹ پٹاتی آواز میں کہا۔

"تو کیا ہوا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "دنوں کی نیند تھی۔"

"یہ لوگ کہاں گئے؟"

"جمرو بھائی تو سویرے سویرے بابا کے ساتھ نکل گئے تھے باقی سب یہیں ہیں۔"

"کہاں! جھل بھائی کہاں گئے ہیں؟"

جولین کو کچھ معلوم نہیں تھا مگر مجھے یاد آ گیا۔ جھل کو تو صبح ہوتے ہی قلابے کی طرف نکل جانا چاہیے تھا۔ یقیناً اُس نے میرے اُٹھنے کا انتظار کیا ہوگا۔ "مجھے اُٹھایا ہوتا۔" میں نے تن دہی سے کہا۔

"بابا نے منع کر دیا تھا۔ کئی بار میں جھانک کر گئی، فرخ اور فریال بھی، تم بے خبر سو رہے تھے۔" جولین شگفتگی سے بولی۔ "کیا بہت ضروری کام تھا؟"

"نہیں۔" میں نے بہ شدت تردید کی۔ "کوئی ایسا کام نہیں۔"

اتنی دیر میں میری آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ آدمی بھی مناظر اور موسموں کی طرح خواص رکھتے ہیں۔ کوئی تا دیر اُن سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی ہے۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنے بال درست کرتے ہوئے کہا۔

قریب کوئی کرسی نہیں تھی۔ وہ میرے پائنتی سکڑ کے بیٹھ گئی۔ میرے جی میں آیا، اُس سے کہوں کہ تم ان کپڑوں میں کیسی مختلف کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ ہو سکے تو یہی لباس پہنا کرو مگر مجھے مناسب لفظ نہیں ملے۔ "اور اندر تو سب خیریت ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔" اُس کی آنکھیں اور چمک اُٹھیں۔ "رانی بھابی اور گیتا آج اور بہتر لگ رہی ہیں۔ خدا کرے، سب ایسا ہی رہے۔"

"ہاں دیکھو، اتنی جلد تو..." میری آواز گھٹنے لگی۔

"سب اُن کے قریب ہی رہتے ہیں، کسی وقت بھی وہ خود کو تنہا اور بے آسرا نہ سمجھیں۔ انھیں احساس ہے کہ ایک پیرو بابا گئے ہیں، اُن کے پوچھنے والے ابھی بہت سے ہیں۔"

"مگر کبھی بہت سے آدمی بھی ایک آدمی کا بدل نہیں ہوتے۔"

"کوئی بھی اُن کے لیے پیرو بابا کی جگہ نہیں لے سکتا۔" جولین یاس سے بولی۔ "رشتے عہدوں کی طرح نہیں ہوتے۔"

اس نے کیسی سچی بات کس سادگی سے کہی ہے۔ میں اُسے دیکھا کیا۔ "رات تم کلاچی دیر تک بیٹھے رہے؟" مجھے خاموش دیکھ کے اُس نے پوچھا۔ اُس کا لہجہ تجسس سے عاری نہیں تھا۔

"ایسے ہی۔" میں نے کہا اور سوچا کہ ماری کے متعلق اسے بتا دینے میں کیا حرج ہے لیکن پھر یہ بہت سے سوال کرے گی اور مجھ سے شاید ہر بات کا جواب نہ دیا جا سکے، سو میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"رات رما اور کیلاش بھی نہیں آئے۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

"مجھے بھی کئی بار اُن کا خیال آیا، کوئی کام ہو گیا ہوگا۔"

"وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"بہت، کم لوگ ایسے ہوتے ہیں۔"

"کیلاش کو تو دیکھا ہی تھا، رما تو کچھ اور بھی... وہ ایک دم ہمدرد اور..." وہ لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انگریزی میں بولی۔ "ویل مینرڈ اور کری ایٹو..."

"ہاں، اُس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔"

"خوب صورت بھی بہت ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ میں نے کہنا چاہا، تم میں بھی یہ خوبیاں کم نہیں ہیں لیکن میں سوچتا رہ گیا یا اُس نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں دی، سرگوشیانہ لہجے میں بولی "تمھاری بڑی تعریف کرتی ہے۔"

"ہُنھ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تعریف کیا، سب ہمدردی کرتے ہیں۔ میری صورت ہی شاید کچھ ایسی ہے۔"

"صورت کی بات نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو، تمھاری صورت کیسی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم، کوئی بات تو ایسی ہوگی۔ میں تو یہی دیکھتا ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہتا، لوگ خود بہ خود ہمدردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔"

"وہ تم سے خاصی متاثر لگتی ہے۔"

"پہلا تاثر تو صورت ہی کا ہوتا ہے۔"

"مگر پہلا ہی، رما ایسی لڑکی نہیں جو سامنے کی چیزوں پر توجہ دے۔" جولین کی دھیمی آواز میں یقین بھی تھا، تلقین بھی تھی۔ کہنے لگی۔ "تم کسی سے کچھ کہتے جو نہیں، یہ بھی تو وجہ ہو سکتی ہے۔ رما کی نظریں ویسے بھی خوب گہری ہیں۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی کہ اس شخص سے مل کے کسی دریافت کا سا احساس ہوتا ہے۔"

"وہ ایسی ہی دل چسپ باتیں کرتی ہے، خیالی، تصوری۔"

"ایسا غلط تو نہیں کہتی۔"

"تم بھی یہی سمجھتی ہو؟"

"میرا کیا! میں تو اُس کی بات کر رہی ہوں۔" وہ کسی قدر خفگی سے بولی اور چادر کی شکنیں دُرست کرنے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی کشمکش سے دوچار ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے مگر لمحے گزر گئے، وہ چپ رہی۔ میں نے کہا۔ "اب گھر کب جاؤ گی؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"جانا چاہتی ہو؟"

اُس نے پلکیں اٹھا کے ایک نظر مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ "میرا مطلب ہے، اُدھر بھی گھر خالی پڑا ہوگا۔ تمھارے اسکول کا بھی حرج ہو رہا ہوگا۔" میں نے رُک رُک کے کہا۔

"تو کیا مجھے چلے جانا چاہیے؟"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں، میں کہنا چاہتا تھا کہ کب تک ایسے..." میری آواز ٹھٹکنے لگی۔ "کوئی اور بات دل میں مت لانا۔"

"جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، شاید میں خود بھی نہیں جانتا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "بس ایسے ہی خیال آیا کہ سبھی منتشر ہو گئے ہیں۔"

کوئی نئی بات تو نہیں، ایسے وقت میں یہی ہوتا ہے۔ کسی کو بھی یہاں کوئی الجھن یا پریشانی نہیں ہے۔ سب کی یہی کوشش بلکہ آرزو ہے کہ کسی طرح جلد سے جلد دونوں کو قرار آ جائے۔ اِس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ہے مگر، مگر..."

"یہ سب تو کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"لگتا ہے، تمھیں کچھ زیادہ..." وہ لفظ چبا چبا کے بولی۔

"تم بہت تھکے ہوئے ہو، بہت تھک گئے ہو۔"

"یہ تھکن نہیں ہے۔"

"پر کچھ ہے تو سہی۔"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے کبیدگی سے کہا۔

اُس نے حجت نہیں کی اور نگاہیں نیچی کیے بیٹھی رہی، پھر نرمی سے بولی۔ "تم سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ وقت ہی نہیں مل پاتا۔ خیر پھر کبھی، تم اب تیار ہو جاؤ، میں ناشتہ لاتی ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ بیٹھو نا!"

"اندر سے آئے دیر ہو گئی ہے۔"

"اندر تو سبھی لوگ ہیں۔"

"تم تو فکر مند ہو گئے۔" اُس کے لرزیدہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، ایک اختیاری مسکراہٹ، مہذب لوگوں کو جو خوب آتی ہے۔ "ذرا اُدھر کا حال دیکھ کے پھر آتی ہوں۔ اتنی دیر میں تم منہ ہاتھ دھو لو۔ کپڑے باتھ روم میں رکھے ہیں، تبدیل کر لینا۔ نہانے کا ارادہ ہو تو گرم پانی کا برتن بھی رکھا ہوا ہے۔" وہ مجھے ہدایات دیتے ہوئے اُٹھنے لگی تو میں نے غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اُس کی کلائی کانچ کی بنی ہو، ایک ذرا تیز گرفت سے ٹوٹ جائے گی مگر دوسرے ہی لمحے میرے جسم کی طاقت جیسے کسی نے کھینچ لی، میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا یا مجھ سے چھوٹ گیا اور میں نے دیکھا، اُس کا سراپا بھی کسی شاخ کی طرح لچک گیا ہے۔ وہ بیٹھ گئی۔ لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ نہ میں نے اُس سے کچھ کہا نہ اُس نے۔ "کوئی خاص بات نہیں۔" آخر وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔ "جانتے تو تم بھی ہو، سب تمھارے سامنے ہے۔ میں کوئی اضافہ نہیں کروں گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم کچھ بھول گئے ہو، بار بار بھول جاتے ہو۔ بھول جانا اور یاد آ جانا آدمی کے بس میں نہیں، پر آدمی کے بس میں تو بہت کچھ نہیں ہے۔ زندگی بھر وہ اپنے بس کی چادر کھینچتا، پھیلاتا رہتا ہے۔ شاید زندگی بھی اتنی ہی ہے۔"

جولین رک گئی۔ مجھے اُس کے سلسلے میں گرہ پڑ جانے کا اندیشہ تھا، بھی اپنے تجسس کے باوجود میں نے بیچ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اُسے بھی ایک لحظے کی مدت میں میری سماعت کی طرف سے کوئی اطمینان مطلوب تھا کہ اُس کی سمٹی سمٹی آواز قدرے کشادہ ہو گئی، کہنے لگی کہ جہاں تک اُس کے مشاہدے میں آیا ہے، آدمی دو طرح کی زندگی گزارتا ہے، ایک اپنے لیے، ایک دوسروں کے لیے۔ دونوں ساتھ ساتھ۔ اپنے لیے کم دوسروں کے لیے زیادہ۔ اپنے لیے تو اُسے زندگی کا دس فی صد حصہ بھی شاید نہیں مل پاتا۔ یہاں ہر شخص بندھا ہوا ہے، اُس نے یکایک

مجھ سے پوچھا: "تم نے روسو کو تو پڑھا ہوگا؟"

"روسو کو، ہاں ہاں، کبھی پڑھا تھا۔" میری زبان پر جیل کا نام آتے آتے رہ گیا کہ میں نے جیل میں معاہدۂ عمرانی نامی کتاب پڑھی تھی۔ میرا شوق دیکھ کے جیلر صاحب اور سونیا مجھے ہر طرح کی کتابیں فراہم کرتے تھے۔ اُس کے بعد تو مجھے پڑھنے لکھنے کا ایسا موقع ہی نہیں ملا مگر مجھے روسو کا نام اچھی طرح یاد تھا۔

"اُس نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ پیدا ہوتا ہے مگر جدھر دیکھو، زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، جکڑ جاتا ہے۔" جولین کا چہرہ جل بجھ سا رہا تھا، آواز بھی جیسے پگھل رہی ہو، دوپٹے کا کونا انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے بولی کہ روسو نے یہ قول کسی اور پس منظر، حوالے سے کہا تھا لیکن یہ تو بہت وسیع ہے۔ طرح طرح سے اس کی تشریح کی جاسکتی ہے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ جو لوگ صرف اپنی زندگی گزارتے ہیں یا جنھیں اس کا موقع مل جاتا ہے، وہ خوش قسمت ہیں یا دوسروں میں مصروف رہنے والے، دوسروں کی خاطر خود کو بھول جانے والے، دانستہ یا مجبوراً۔ کوئی بھی صورت ہو مگر یہ اچھی بات کہی جاتی ہے اور شاید یہی ہونا بھی چاہیے پھر بھی معلوم نہیں کہ سچ کیا ہے؟ اپنے لیے زندہ رہنا سچ ہے یا دوسروں کے لیے؟ کون سا سچ بڑا ہے، کس میں زیادہ لطف ہے؟

اُس کی آواز اُلجھنے لگی۔ ہندوستانی میں اُسے مشکل پیش آتی تھی تو وہ انگریزی کا سہارا لیتی تھی، میں گونگوں کی طرح بیٹھا رہا۔ "روسو نے کہا تھا کہ آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے مگر کیا واقعی ایسا ہے؟" وہ بکھرے بکھرے انداز میں بولی۔ "یوں کہا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ آدمی پابند پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنگل میں نہیں پیدا ہوتا اور وہ اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، ہر دم اِسی جتن میں رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی گزارے مگر یہ تو اُس کے آگے پیچھے کی دیواروں اور زنجیروں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی اُس پہ مہربان ہوتی ہیں اور آدمی کامیاب ہو جائے، وہ ساری زنجیریں، سارے رینے رین بیز، رشتے ناتے توڑ کے خود کو آزاد کرالے تو کیا وہ جنگل کی طرف نکل جائے۔ اگر وہاں بھی آدم زاد جا نکلے وہ پھر اُس کے گرد گھیرا ڈال دیں گے۔ زنجیروں سے مراد دوسرے آدمی ہیں۔"

اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھ پر کوئی سناٹا سا طاری تھا۔ اُس نے میرے جواب کی ضرورت بھی نہیں سمجھی میرا سکوت میری تائید پر محمول کیا یا لاجوابی پر۔ کسی توقف کے بغیر وہ بولی کہ تنہا آدمی کا شاید کوئی وجود نہیں۔ آدمی آدمی سے عبارت ہے جنگل نشیں کی زندگی کتنی ہی اپنے لیے ہو مگر دوسروں کے لیے اُس کی موت کے مانند ہے۔ آدمی دوسروں کے حوالے سے مرتا ہے کہ اُس کی موت کا احساس کرنے والے اُس کے پسماندگان ہی ہوتے ہیں۔ وہ خود تو ہر قسم کے احساس سے مبرا ہو جاتا ہے۔ کوئی جنگل میں چلا گیا ہے تو صرف اپنے لیے زندہ ہے، دوسروں کے لیے نہیں، تنہائی آزادی نہیں ہوتی اور تنہائی کی یہ آزادی تو پھر بھی مشروط ہے۔ آزادی سے کیا مراد ہے؟ ذات کی آزادی! پھر یہ تو اُسی وقت مکمل ہوگی جب آدمی ہر قسم کے بیرونی اثرات اور نقش و نگار سے مستثنا ہو جائے۔ ابتدا ہی سے اُس کی تربیت مختلف ہو اور انسانوں سے اُس کا واسطہ کم سر نہ پڑے لیکن یہ ایک اَن ہونی بات ہے۔ آدمی کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اُسے ابتدا سے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آزاد کب پیدا ہوتا ہے۔ روسو نے سماجی اقدار، روایات، قانون اور اخلاقی ضابطوں کو زنجیروں اور دیواروں سے موسوم کیا ہے۔ ان سے مفر نہیں تو ملال سے کیا حاصل۔

جولین کے تراشیدہ ہونٹوں پر لفظ جیسے اُمڈ اُمڈ کے آ رہے تھے، کہتے ہیں، نہاں خانے کی تمیدگی کے بغیر لہجے میں یہ سوزش نہیں ہوتی۔ اُس کی آواز دھڑک رہی تھی۔ کہنے لگی یقیناً آدمی کو کچھ دیر اپنے ساتھ بھی رہنا چاہیے کہ دوسروں پر صرف ہونے کے لیے یہ توانائی ضروری ہے۔ وقت جس قدر بھی ایسی مہلتیں دے، انھیں غنیمت سمجھنا چاہیے۔ کاش یہ مہلت ملا ہی نہ کرتی اور آدمی عارضی آزادی کے سراب میں نہ رہا کرتا۔ یہ عارضی آزادیاں تو اُسے اور پریشان کرتی ہیں، اُسے دوبارہ معمول کی زندگی سے مطابقت کرنے کی دشواری پیش آتی ہے پھر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے۔ آدمی کا تعلق اپنی ذات سے بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس کے خواب اپنے ہوتے ہیں، خیال اپنے اور خواب بھی ایک حقیقت ہیں کہ آدمی کو آسودہ رکھتے ہیں یا پراگندہ کرتے ہیں۔ تخلیق کا بھی یہی ہے کہ یہ بھی فرد کے خواب کی طرح ہے بلکہ خواب کی تعبیر کا درجہ رکھتی ہے۔ کوئی تخلیق، کسی فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور فکر خلوت کے بغیر، اور پھر وہی بات کیا خلوت آزادی ہے؟ تخلیق کی قدرت کسی نہ کسی حد تک ذہن و فکر کی آزادی کی نشان دہی کرتی ہے مگر خیال ہو یا خواب یا تخلیق، سب پر اُن کے عہد کی چھاپ ہوتی ہے۔ آدمی خواب اپنی زبان میں دیکھتا ہے اور سوچتا بھی اپنے عہد کے واسطوں سے ہے۔

وہ کہتی رہی، پچکے چکے، دھیمے دھیمے انداز میں تند و تیز باتیں۔ بے شک میری حیرت اور تردد میں اب اشتیاق بھی شامل تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اُسے پہلی بار دیکھ اور سُن رہا ہوں۔

مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ شروع میں جب میں نے کرشنا جی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور اُنھوں نے میری تعلیم کے لیے اُسے مقرر کیا تھا۔ اُس وقت بھی اُس کی جُزرسی اور خیال آفرینی کا یہی حال تھا۔ کرشنا جی اسی وجہ سے اُسے پسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُسے مزید تعلیم اور مطالعے کا مشورہ دیا تھا۔ بعض اوقات وہ اُسے کتابیں بھی پڑھنے کو دیتے تھے۔ کرشنا جی کے بعد اُن کا سارا سامان مجھے منتقل ہوا تھا تو کتابوں کا ایک انبار بھی ساتھ تھا۔ میں نے وہ سب کچھ جولین کے حوالے کر دیا تھا اور میں نے دیکھا تھا، یہ کتابیں جولین نے نہایت سلیقے سے الماریوں میں سجائی ہوئی تھیں، معلوم ہوتا تھا ابھی سے میری عدم موجودگی کے دوران وہ بس انھی سے شغل کرتی رہی ہے۔ کسے خبر تھی، اُس وقت مجھے پڑھانے کے لیے آنے والی نازک اندام کشیدہ قامت، ترشے ہوئے خال و خد، کھلتے ہوئے گندمیں رنگ، کھن کھناتی، گنگناتی آواز میں بات کرنے والی وہ اُداس اُداس اور ہر دم مستعد اجنبی لڑکی گھر کی ایک فرد بن جائے گی۔ میری آنکھوں میں نیند کی دھند کب کی چھٹ چکی تھی مگر جانے دفعتاً اُسے کیا ہوا کہ اُس کی زبان اٹکنے لگی۔ "میں جانے کتنی دُور چلی گئی۔ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔" وہ ندامت زدہ لہجے میں بولی۔ "پھر بھی شاید یہ سب ایسا نہیں جو مشکل سے سمجھ میں آئے۔"

"میں، میں سمجھ رہا ہوں۔"

"مجھے اتنا کچھ نہیں کہنا تھا، بس ...."

"اسی طرح، اِسی طرح کہتی رہو۔"

"کیوں؟" اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"یہ باتیں کرتے ہوئے تم کیسی متاثر لگتی ہو۔"

"اچھی نہیں لگ رہی ہوں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں نے کب کہا۔ کس نے کہا ہے؟"

"اُس کا سر اور جھک گیا۔

"تم چپ کیوں ہو گئیں؟" میں نے مضطربانہ کہا۔

"شاید کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔"

"ضرور تم پر کسی احساس کا غلبہ ہو گیا ہے۔"

"کیسا احساس؟"

"یہی کہ یہی کہ میری کوئی بات بُری لگ جانے کا احساس مگر تم تو بہت اچھی بہت سچی باتیں کر رہی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ "صرف اتنا کہنا تھا کہ تم اکیلے نہیں ہو، بہت سے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں۔ تمھیں دیکھ کے جن کی ہمت بڑھتی ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ تم اُن کے پاس ہو، وہ تمھارے پاس ہیں، بابا جان، فرخ، فریال، اکبر، فارعہ، جہاں گیر، کس کس کا نام لوں، بیچل بابا، زرین، نیساں، خانم اور اب رانی بھابی، گیتا ... یہ بھی تو تمھاری زندگی میں شامل ہیں۔ آدمی دیکھنے میں ایک نظر آتا ہے مگر اُس میں بہت سے اور بھی ہوتے ہیں۔ ان سب سمیت مل کے ہی کسی آدمی ...."

میں نے اضطراری انداز میں تائید کرنی چاہی تو معلوم نہیں وہ کیا سمجھی، عاجزی سے بولی کہ ہر چند میں کچھ نہ کہوں، جو جواب مجھے دینا ہے، مناسب ہوگا کہ میں خود کو ڈوبی اور لٹی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "لگتا ہے، فرخ، فریال تمھیں حاصل کر کے بھی تم سے دُور ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ تمھیں کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی کب اور کتنا ملا ہے۔" میں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے پھر روک دیا۔ "مجھے تمھارے حال کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ تم دوسروں کے لیے خود پر کم جبر نہیں کرتے لیکن وہ اس سے سوا چاہتے ہیں اور سوچو تو تمھارے لیے بھی یہ ضروری ہے۔ وقت بہت گزر گیا ہے پہلے کی بات اور تھی، اب، اب تمھیں اور طرف بھی دیکھنا ہے۔"

"میں اپنی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "دوسرے لوگ جیل خانہ نہیں ہوتے۔ وہ تمھارے کام آنا چاہتے ہیں۔ سب کی یہی آرزو ہے کہ تم کسی طرح خوش رہو۔ دوسرے بھی تو کسی کے کام آتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ...."

اُس نے میری بات نہیں سُنی اور تیزی سے بولی۔ "آدمی کو کبھی نہ کبھی کسی ایک جگہ ٹھیر کے پیچھے کی طرف دیکھنا، کچھ سوچنا ضرور پڑتا ہے۔ ہوا نے جن کا ساتھ نہیں دیا یا لکیروں نے، جو کچھ بھی ہوا، وہ اپنے کام نہیں آسکے یا اپنے نہیں بن سکے تو وہ خود کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم اپنے طور پر بہت کوشش کرتے ہو گے مگر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اب کچھ دوسروں پر چھوڑ دو، کچھ عرصے کے لیے سہی ...."

"میرا، میرا کیا مطالبہ ہے اب کوئی سمجھی نہیں۔" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔"

"اسے شکایت مت سمجھنا، میں شاید اپنی بات کہہ نہیں پا رہی۔"

اُس کا بدن بے قرار سا ہو گیا۔ اور وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ "نہ جانے میں کیا، کہنا چاہتی ہوں۔"

"گھبرا کیوں رہی ہو، تم نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔"
"مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تمھارے لیے کچھ نیا نہیں ہے۔"
"ضروری نہیں کہ صرف نئی باتیں ہی کی جائیں۔ دوسرا کوئی کہتا ہے تو اپنے سوچے ہوئے کو زبان مل جاتی ہے۔ کوئی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یقین کرو، میری تو ہر دم یہی کوشش رہتی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے، کچھ بھی۔ لیکن میں، میں کیا کروں۔۔۔" میری آواز بھرانے لگی۔

"ایسے نہیں، ایسے کوئی کیسے کچھ بھول سکتا ہے۔ اس کے لیے تو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، اور یہ تو گرہوں پہ ہے کہ وہ کتنی پڑی ہوئی ہیں، نقش کتنا گہرا ہے۔ پر آدمی سامنے کی زندگی کیوں کھو دے۔ دھوپ ہی میں کیوں کھڑا رہے۔ رما کے بقول آدمی چھوٹی چھوٹی چھاؤں سے کیوں کنارہ کش رہے۔"

مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ رما اور جولین کی باتوں میں کیسی مماثلت ہے۔ "لگتا ہے، رما نے بھی کچھ دُہرا دیا ہے۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"وہ ایک نفیس لڑکی ہے، کہہ رہی تھی کہ مجھے خوشی ہو گی، اگر میں طیب صاحب کے کسی کام آ سکی اور کہہ رہی تھی، یہاں بمبئی کی بھیڑ بھاڑ میں سکون کی بہت سی جگہیں ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں انھیں وہاں لے جاؤں۔ میں نے کہا، یہ تو بہت اچھا ہوگا۔"

"وہ بالکل اپنے بھائی کے مانند ہے، دوست، درد مند مگر شاید وہ مجھے مریض سمجھتی ہے کوئی۔"
"مریضوں کی کمی نہیں ہے اس شہر میں۔"
"میں بھی کسی مریض سے کیا کم ہوں۔"
"ایسا مت کہو، میرا خیال ہے، اُسے تمھارے بارے میں اتنا کچھ معلوم نہیں ہے، ویسے بھی تو کوئی کسی سے متاثر ہو سکتا ہے۔"
"ہاں ہاں۔" میرے ہونٹ پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔
"اُس سے مل کے اچھا لگتا ہے۔ یہاں سبھی کے دل میں اُس نے گھر بنایا ہے۔ اپنی دل نشیں باتوں، بے تکلفی، دوسروں کے کام آنے کے جذبے اور اپنی ذہانت سے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ میں سمجھتی ہوں، تم اُس کے ساتھ کچھ دن گھوم پھر کے دیکھو، کچھ اور نہیں تو یہ کڑا وقت نکل جائے گا۔ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو کبھی کبھی، کہیں کہیں نظر آتی ہے۔" میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ایک قیمتی لڑکی ہے۔ میری بات سُن کے وہ کھلکھلا ... لیکن یہ سچ نہیں ہے کیا؟ اتنی بہت سی خوبیاں ایک شخص میں کب اور کہاں۔۔۔۔۔۔" اُس نے اپنی لمبی پلکیں اُٹھا کے تائید طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں چپ رہا۔ وہ بے کلی سے بولی۔ "نہیں ہے کیا ایسا؟"

"نہیں۔" میں نے چونک کے کہا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اور کیا کہنا چاہیے۔

وہ دیر تک گُپ چپ بیٹھی رہی، پھر معاً مسہری سے اُٹھ گئی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔"
"کیوں، کیا بات ہے؟" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔
"بس، بہت وقت ہو گیا ہے۔"
"چلی جانا۔"
"آ جاؤں گی پھر۔" وہ تذبذب سے بولی۔
اُسی لمحے باہر سے کسی کی چاپ سُنائی دی۔ جولین نے شانوں پر دوپٹا درست کیا اور ایک مسکراتی نظر مجھ پر ڈال کے جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے بھی اُسے نہیں روکا مگر ابھی وہ کمرے ہی میں تھی کہ دروازے پر فرخ نمودار ہوئی۔ "ارے، آپ یہاں ہیں جولی!" فرخ کی چہکتی آواز کمرے میں گونجی۔ مجھ پر اُس کی نگاہ بعد میں پڑی، وہ پریشان سی ہو گئی، خجل بھی ہوئی۔ اُس نے گھبراہٹ کے عالم میں مجھے سلام کیا۔ جولین ٹھیر گئی اور فرخ کا ہاتھ تھامے ہوئے دوبارہ میرے پاس آ گئی۔

"کیسی ہو تم، تم فرخ!" مجھے اپنا ہی لہجہ مصنوعی لگا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے بے اختیار اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کچھ سہم سی گئی تھی۔ میرے سارے جسم میں یکایک ایک لہر سی اٹھی۔ میں اُسے اپنے سینے سے لگانا اور خوب پیار کرنا چاہتا تھا۔ میں اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیتا لیکن جولین پاس ہی کھڑی تھی۔ یکایک کسی نے مجھے ٹھوکا سا دیا، جولین کیسی اجنبیت محسوس کرے گی۔ چند لمحے پہلے وہ میرے پاس بیٹھی تھی اور میری خاطر اپنا سینہ جلا رہی تھی، کتنی بار اُس کے لیے بھی میرے بازو منڈلائے تھے۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں اُسے سینے سے لگا کے بہت روؤں، اُس سے کہوں کہ میرے لیے کیوں اتنی آزردہ ہوتی ہو، تمھاری ہر دلیل درست ہے، سب سچ ہے لیکن میں کیا کروں، بس اچانک سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے چھن جاتا ہے۔ میں جتنا بھی سمیٹ کے رکھتا ہوں، کسی لمحے سب بکھر جاتا ہے۔ آدمی اپنے بس کی چادر بھی تو بس سے زیادہ نہیں کھینچ سکتا۔ میں نے خود سے پوچھا، جولین کے وقت میرے بازو کیوں اینٹھ گئے

تھے؟ مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ شمار میں کیا فرخ پہلے آتی ہے، جولین بعد میں؟ ایسا بالکل نہیں تھا۔ جولین کے لیے بھی میرے دل میں اتنی ہی ہمک اُٹھتی تھی جتنی فرخ کے لیے۔

وہ دونوں مسہری پر میرے قریب بیٹھ گئیں۔ فرخ میرے پہلو سے چمٹ گئی۔ اُس کے انداز میں وارفتگی تھی جیسے وہ اپنے بھائی کی جزوِ جاں بن جانے کو بے چین ہو۔ اُس کی آنکھوں میں تارے سے چمک رہے تھے، چہرے پر لالی پھوٹی پڑتی تھی۔ اُسے یوں لالہ زار دیکھ کے جولین کی بازگشت میرے رگ و پے میں گونجتی تھی۔ آدمی کو اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے روشنی بن جانا چاہیے۔ اُس لمحے ایک اور سوال نے مجھے حیران و ہراساں کیا۔ جولین اس قدر پاس ہو کے مجھ سے اتنی کھنچی کھنچی کیوں بیٹھی ہے؟ اس میں فرخ جیسی شیفتگی اور بے ساختگی کیوں نہیں ہے؟ بے شک اُس کی آنکھوں میں فرخ سے زیادہ چمک اور رخساروں پر فرخ سے گہری سرخی تھی مگر مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا اور میں نے جولین کا امتناع اپنی کسی کوتاہی کے ردِ عمل پر محمول کیا۔ میں نے جانا کہ یہ میرے کسی سوال کا جواب ہے مگر کون سے سوال کا جواب؟ اور کون سی کوتاہی کا ردِ عمل؟

جولین کے ٹوکنے پر فرخ اُٹھ گئی۔ دونوں نے تحکمیہ انداز میں مجھے جلد از جلد تیار ہو جانے کی ہدایت کی تاکہ وہ ناشتہ لا سکیں۔ اب ناشتے کا وقت نہیں رہا تھا اور مجھے کوئی خواہش بھی نہیں تھی لیکن انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں تا دیر مسہری پر بے ارادہ بیٹھا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اپنی استواری کی کوئی کوشش تھی یا مجھے کسی چیز کی تلاش تھی۔ نہانے کے دوران بھی میری نگاہیں بھٹکتی رہیں، میں اپنے آپ سے وضاحتیں کرتا رہا۔ دو بالٹی پانی سے صرف باہر کی گرد صاف ہوتی ہے، اندر کے گرد و غبار کے لیے تو سمندر بھی ناکافی ہے۔

تجمل کے انتظار میں دوپہر کا کھانا دستر خوان پر نہیں لگایا گیا تھا۔ اُس کی واپسی دو بجے کے قریب ہوئی۔ اتنی دیر کسی سبب کے بغیر نہیں ہوئی ہوگی۔ ابا جان کی موٹر بھی اُس کے پاس تھی۔ پر پوچھنے سے کچھ حاصل نہ تھا، یہ تجمل کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ مجھے تھانے میں ہاری سے ملاقات کے بارے میں کچھ بتائے یا نہیں۔ ہاں مجھے ایک تسلی تھی کہ جمرو بھی اُس کے ساتھ گیا تھا۔ میں اُس سے پوچھ سکتا تھا۔ میں نے تحمل کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو ان کے چہروں پر ضرور نظر آ جاتی۔ تجمل کے چہرے پر نہیں تو جمرو کے چہرے پر۔ وہ مضمحل اور مایوس ضرور دکھائی دیتا تھا، مضطرب اور پریشان نہیں۔

کھانے کے بعد سب بیرونی کمرے میں آ بیٹھے، پیرو دادا کے خاص کمرے میں۔ بشتی چاچا نے حقہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا، فنجان بج رہے تھے۔ ہم مردوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ابا جان نے میر علی اور مولوی اکرم کی طرف دیکھ کے تجمل سے کہا کہ اگر اُس کی طبیعت بحال ہو تو وہ کچھ بات کریں۔ تجمل نے حقے کی نے منھ سے ہٹا کر کسی قدر تردد کا اظہار کیا کہ ایسی کیا بات ہے؟ ابا جان نے جواب دینے کے بجائے کسمساتے ہوئے پوچھا کہ آئندہ کے لیے اُن کا کیا ارادہ ہے؟ تجمل نے استفسار کیا کہ اُن کا اشارہ کس طرف ہے۔ ابا جان نے دبی آواز میں کہا کہ رانی اور گیتا کے بارے میں اُس نے کیا سوچا ہے؟

"کاہے کا سوچنا بابا؟"

ابا جان نے صراحت کی کہ اُن کا مدعا ذرا قبل از وقت ہے لیکن بے حقیقت نہیں ہے۔ جلد یا بدیر ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ اس وقت وہ دونوں سامنے نہیں ہیں۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم ابھی اس معاملے پر کچھ غور و فکر کر لیں۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ضرور ہے لیکن زندگی کی یہی روش ہے، حقیقت سے کہیں مفر نہیں ہے۔

"آپ بولو، آپ کے من میں کیا ہے۔" تجمل کا لہجہ ناخوشگواری سے عاری نہیں تھا۔

"ہاں۔" ابا جان نے نرمی سے کہا۔ "میں نے جو سوچا ہے یا جو مجھے مناسب لگتا ہے، وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میری رائے میں گیتا اور رانی کو جتنی جلد ہو سکے، یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔"

ابا جان نے تجمل کی پیشانی پر ابھرتی سلوٹیں ضرور دیکھ لی ہوں گی مگر انھوں نے کسی تامل کے بغیر اپنی بات جاری رکھی اور تجمل سے کہا، یقیناً اس مکان سے اُن کی وابستگی جذباتی ہے اور انھی دلوں کی کیا، ہم سب کے لیے یہ جگہ پیرو کی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے تاہم جب تک وہ دونوں اس مکان میں رہیں گی، وہ ذہنی اور قلبی طور پر منتشر رہیں گی۔ اس عمارت کے گوشے گوشے میں پیرو موجود ہے۔ اس کی پرچھائیاں اُن کا غم تازہ کرتی رہیں گی۔ اتنے لوگوں کی ہمہ وقت موجودگی، نگہداشت اور تسلیتوں سے اتنا ہوا ہے کہ اُن کا حوصلہ بندھا رہا ہے مگر ظاہر ہے، یہ سارے لوگ مستقل یہاں نہیں رہ سکتے۔ آج نہیں تو کل، اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ انھیں جانا بھی چاہیے۔ یہ مکان بھی اتنا بڑا نہیں کہ سب یہاں رہ سکیں اور

نہ عملاً یہ ممکن ہے اور بھی۔۔۔ اور بھی کئی باتیں ہیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ ہتھل ضرور برہمی کا اظہار کرے گا لیکن اُس نے زبان بند رکھی۔ ابّا جان نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ اُسی وقت منیر علی نے دخل دیا۔ "بات یہ ہے بھائی صاحب! دل میں کوئی فرق مت لائیے۔ بخدا یہاں سے جانے کے لیے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ کوئی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ کسی طرح اُن دونوں بدنصیبوں کا دکھ بٹا سکیں لیکن اب اِس مکان میں خود گیتا اور رانی کا رہنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ پیرو بھائی نے اپنی یہ جنت ساری دُنیا سے چھپا کے رکھی تھی۔ اِس علاقے میں کسی کو بھی۔۔۔" منیر علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "زیادہ بہتر تو آپ ہی سمجھتے ہوں گے۔ کسی کی زبان کون روک سکتا ہے۔ طرح طرح کی باتیں پھیل رہی ہیں۔ پولیس کے لوگ یہاں پورے تین دن چکّر لگاتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے جانے کیا زہر اگلا ہے۔ خدا اس وقت پیرو بھائی بھی ساتھ تھے، صفدر بھائی کہتے ہیں! اُنھوں نے پیرو بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو، وہ بھی یہیں منتقل ہو جائیں جیسا کہ توقع تھی، جواب میں پیرو بھائی نے کہا کہ اِس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ آپ کو کچھ یاد ہے؟" منیر علی نے ہتھل سے پوچھا۔

ہتھل سر ہلا کے رہ گیا۔

"گزشتہ دو دن سے صفدر بھائی وہاں جا رہے ہیں۔ خاصا کام مکمل ہو چکا ہے۔ جو رہ گیا ہے، وہ ہم وہاں جا کے اپنے سامنے پورا کرالیں گے۔ اُس مکان کی خوبی یہ ہے کہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود سب پوری خلوت، اپنے مزاج اور منشا کے مطابق رہ سکتے ہیں۔ گنجائش ہی گنجائش ہے وہاں، اور سب سے بڑی گنجائش تو دل کی ہے۔ سچ تو یہ ہے، اِسی مقصد سے، مل جُل کے رہنے کی غرض سے اُسے خریدا گیا تھا۔" منیر علی نے ٹھہر کے ہماری جانب نگاہ کی کہ شاید ہم میں سے کوئی اُن کی ہم نوائی کرے مگر جب کوئی کچھ نہ بولا تو اُنھوں نے کسی قدر تیز آواز میں ہتھل سے پوچھا۔ "آپ نے غور کیا بھائی؟"

"ہاں بابا!" ہتھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"پھر آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کیا، کیا بولنا ہے اپنے کو؟"

"یہ تو صرف ایک مشورہ ہے، آپ کے ذہن میں کچھ اور ہو تو بتائیے۔"

"سب ٹھیک ہی بولتے ہو آپ۔"

"نہیں، میرا کچھ نہیں، مَیں تو۔۔۔" منیر علی کی زبان لکنت کرنے لگی۔ "آپ فرمائیے۔"

"ابھی پہلے اُن سے بھی پوچھ لو بابا!"

"بالکل درست مگر وہ بے چاریاں کیا کہیں گی۔ اب اُن کے پاس کہنے سننے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔ وہ تو ہر حال میں راضی بہ رضا ہیں اور اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہم اُن کی بہتری ہی کے لیے کوئی فیصلہ کریں گے۔ سُنا ہے کل رانی کے کوئی بھولے بسرے قریبی عزیز عرصے بعد آئے تھے، اُنھوں نے رانی سے کہا تھا کہ اب وہ چاہیں تو اپنے خاندان میں واپس آ سکتی ہیں، تمام تلخیاں اُن کے شوہر کے وقت تک تھیں۔ تفصیل تو مجھے نہیں معلوم، لیکن سُنا ہے، رانی نے شدّت سے انکار کر دیا۔ بہر حال صبح جولین کی ماں اور چمپا بیگم نے یہاں سے جانے کی بابت اُن کا عندیہ لینے کی کوشش کی تھی، دونوں چپ ہو گئیں۔"

"ابھی تو دسواں بھی نہیں ہوا ہے بابا!"

"اللہ آپ کو خوش رکھے، مَیں نے بھی یہی کہا تھا۔ بے شک ابھی تو کم از کم اُنھیں یہیں رہنا چاہیے۔" منیر علی نے یاس سے کہا۔ "ہے تو بہت عجیب سی بات۔ بھرا پُرا گھر ہے اور اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ اِسے چھوڑنا اُن کے لیے دوسرے بڑے صدمے سے کم نہیں ہوگا۔ پیرو بھائی نے یہ مکان اپنے لیے نہیں، اُن کے لیے بنایا تھا۔ لیکن ہر چیز اختیار میں نہیں ہوتی۔ جانے ہی کا مرحلہ مشکل ہے لیکن اللہ نے چاہا، ایک بار وہ یہاں سے چلی گئیں تو اُنھیں اتنا قلق نہیں ہوگا۔ اُنھیں اندازہ ہوگا کہ گھر تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ یوں چھوٹی بڑی چار دیواریاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ دوسری جگہ بھی اُن کا اپنا ہی گھر ہوگا۔ صفدر بھائی نے اُن کے لیے اور بہت کچھ سوچا ہے جس کا اظہار سرِ دست مناسب نہیں ہے۔ ایک پیرو بھائی کو تو ہم واپس نہیں لا سکتے۔" منیر علی گلوگیر آواز میں بولے۔ "البتہ جو امکان میں ہے، انشا اللہ اُس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ اتنے دنوں میں ہم لوگوں کے بارے میں گیتا اور رانی نے اتنا تو۔۔۔" منیر علی نے اپنی آنکھوں سے چھلکتے آنسو چھپانے کی کوشش کی مگر اپنی بِلکتی ٹوٹی آواز نہ چھپا سکے، کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے، کسی موزوں وقت آپ اُن سے بات کر لیجیے گا۔" ہتھل حقّہ گڑگڑاتا رہا۔

منیر علی نے کچھ دیر انتظار کیا تاہم اُنھوں نے ساری تائید و تردید خود کر دی تھی۔ ہتھل اُن سے اور کیا کہتا۔ منیر علی خاموشی سے اُٹھ گئے۔ اُن کے ساتھ ابّا جان اور مولوی اکرم بھی اُٹھ گئے۔ جمرو، شامو، مارٹن اور مُنگو بیٹھے رہے۔ پھر وہ بھی چلے گئے۔ مَیں اکیلا رہ گیا۔ میں ہتھل سے جانے کیا کچھ کہنا اور سُننا چاہتا تھا۔ جبھی باہر چلنے کے لیے جمرو کے اشارے پر مَیں نے انکار کر دیا تھا۔ مَیں لفظ ڈھونڈتا رہا لیکن لفظ تو بعد میں آتے ہیں۔ مجھے کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ اتنی بہت سی باتیں تھیں کہ اوّل و آخر کی ترتیب نہیں ہو پاتی تھی یا ہتھل کی گراں باری کا احساس ہوگا۔ پھر مَیں نے سوچا، بہتر ہے، وہی مجھ سے کوئی سلسلہ جنبانی کرے لیکن اُسے تو جیسے میرے موجود ہونے کی خبر ہی نہیں تھی۔ آدمی کی موجودگی کا تعلق اُس کے جواز سے ہے۔ اکارت آدمی کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ مَیں اُس کی نظر میں کسی بے کار شخص کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے ٹھیک سے بات کرنا ہی کب آتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مَیں صرف ہذیان بک سکتا ہوں، صرف پریشان کر سکتا ہوں۔

آخر مَیں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ میرا قیاس اتنا غلط نہیں تھا، اُس کے بُت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اُس نے سَر اُٹھا کے ایک انھیں سمجھے، کیا کچھ فسانے بنا کے، فسانے سُنا کے گئے ہیں تعزیت کا سلسلہ جاری ہے۔ محلے کی آسودہ حال عورتیں دیکھنے میں تو بڑی سلیقہ مند اور معاملہ فہم معلوم ہوتی ہیں مگر بستیاں بتائیں گی کہ ان میں سے کتنی چُپ سادھے، ہم دردی کا اظہار کرنے آئی تھیں اور کتنی نشتر چبھونے اور تماشا دیکھنے۔" منیر علی نے رُک کے ہتھل کی طرف دیکھا اور ہچکچاہٹ سے بولے۔ "سمجھ رہے ہیں آپ؟"

ہتھل کے ہونٹ باہر نکل آئے تھے۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔

"یہ وجہ ہے۔" منیر علی کی آواز جھرجھرانے لگی۔ "یہ مکان سارے علاقے میں مشہور ہو گیا ہے۔ آپ کہیں گے، ان کی فکر کیوں کرتے ہو۔ لوگ تو جو منہ میں آیا، بک دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، چارہ کچھ نہیں ہے لیکن اُن دونوں نے کیا قصور کیا ہے۔"

منیر علی کی بات ہتھل کی سمجھ میں آ رہی ہوگی جبھی وہ چپ بیٹھا رہا۔ ابّا جان کی نسبت منیر علی کی زبان بل نہیں کھا رہی تھی لیکن وہ بھی کُھل کے نہیں کہہ پا رہے تھے کہ پیرو نے آخر یہ مکان سب سے چھپا کے کیوں رکھا تھا، اپنے قریب ترین ساتھیوں سے بھی اگر اِس کی کوئی وجہ تھی تو وہ اب بھی موجود ہے۔ اگرچہ پیرو سامنے نہیں ہے لیکن ہم ہیں، وہی باڑے کے لوگ۔ پیرو دادا کی ارتھی اُٹھتے وقت بمبئی کے سارے دادا یہاں جمع ہو گئے تھے۔ علاقے کے ہر شخص نے یہ ازدحام دیکھا تھا۔ ارتھی کے جلوس میں ہتھل سب سے آگے تھا۔ اُنھیں اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ ہتھل کون ہے جسے بمبئی کا سب سے بڑا دادا پیرو سر آنکھوں پہ بٹھاتا تھا، جس نے پیرو کے بعد اُس کے باڑے کی گدّی سنبھالی تھی اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔

جو لوگ پیرو دادا کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور اُس جیسی موت مرتے ہیں، اُن کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں تراش لی جاتی ہیں۔ منیر علی نے ہتھل سے یہ سب کچھ نہیں کہا تھا لیکن اشارہ ہی کافی تھا۔ ہتھل نے پلٹ کے اُن سے یہ نہیں کہا کہ یہ مکان نہ محلے والوں کی میراث ہے نہ گیتا اور رانی کسی کے رحم و کرم کی محتاج ہیں۔ جس کی زبان بہکتی ہے اور جس کی آنکھ میں تنکے زیادہ چبھتے ہیں، اُسے دیکھ لیا جائے گا اور یہاں کسی کو یہ صورتِ حال گراں گزرتی ہے تو وہ چلا جائے! ابّا جان، منیر علی، مولوی اکرم، جولین وغیرہ جس کا جی چاہے، اپنے گھر چلا جائے۔ ہتھل اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن وہ سرنگوں بیٹھا رہا۔ شاید اِس لیے کہ منیر علی اور ابّا جان کے مدّعا میں کسی قسم کی آلائش نہیں تھی۔ اُنھیں گرد و پیش کے لوگوں کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا گیتا اور رانی کے آب گینے کا پاس تھا۔ اُنھیں پیرو نے پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ پیرو کی جیب میں ہر وقت چاقو رہتا تھا۔ باڑے کے آدمی کے لیے چاقو تو ایک علامتی چیز ہے، اُس کے دستِ بازو اُس کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ اُس کا ارادہ ہی چاقو ہوتا ہے۔ پیرو نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنا یہ زور نہیں دکھایا تھا کیونکہ گھر اور باڑے کے راستے شاید ایک نہیں ہوتے۔ باڑے کے آدمیوں کو باڑے اور گھر میں مطابقت اور مفاہمت کی یہی مشکل پیش آتی ہوگی۔ پیرو نے اسے یک سر دو حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اُس کی زندگی ساتھ دیتی تو یہی کچھ رہتا۔ یقیناً پیرو کے ذہن میں اچھی طرح واضح ہوگا کہ آگے کسی مرحلے پر اُسے کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اُس نے کیا سوچا تھا، یہ تو وہی جانتا تھا لیکن گیتا اور رانی اور اپنے گھر سے اُس کی گہری وابستگی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کبھی کسی موقع پر باڑے سے مکمل انقطاع کی کوئی صورت اُس کے ذہن میں ضرور ہوگی۔ ممکن ہے اُس نے ہتھل سے اس بارے میں کبھی کچھ کہا ہو۔

ہتھل کی خاموشی پر منیر علی نے ٹوکا۔ ہتھل نے بھاری آواز میں منیر علی ہی سے پوچھا کہ پھر ان کی کیا رائے ہے؟ "کیا بتاؤں بھائی! میں نے تو اِسی لیے آپ سے، آپ کے سامنے ساری۔۔۔" منیر علی بے چارگی سے ابّا جان کی طرف دیکھنے لگے۔

"فیض آباد چلنے کا کریں بابا؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" منیر علی نے بے تابانہ کہا۔ "وہاں

زریں بیٹیا ہے۔ اُس کا آپ کو معلوم ہے۔ اُس کی چھاؤں سب کے لیے
عام ہے، سب کے لیے یکساں ہے۔ تلافی تو ممکن نہیں لیکن زریں
سے مل کے دونوں کو خوشی ہوگی۔ وہ بھی کو راس آئی ہے۔ خدا
نے اُس کی نگاہ اور زبان میں بڑی تاثیر دی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں
میں نہیں کہہ سکتا، اگر زریں بیٹیا فیض آباد میں نہ ہوتی تو جیلیبر سے
اپنا آبائی گھر چھوڑنے کا صدمہ، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح برداشت
ہو پاتا۔ میری بھی یہی رائے تھی مگر صفدر بھائی بھی درست کہتے ہیں
ان کے خیال میں ماحول کی اتنی بڑی تبدیلی گیتا اور رانی کے لیے
ناسازگار بھی ہو سکتی ہے۔ جیلیبر سے میرے فیض آباد منتقل ہونے
اور رانی اور گیتا کے وہاں جانے میں بڑا فرق ہے۔ صفدر بھائی کی
بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ گیتا اور رانی کا ابھی کچھ عرصے یہیں بستی
میں رہنا مناسب ہے۔ اتفاق سے صفدر بھائی نے چند دن ہوئے
اسی شہر میں ایک ایسا مکان حاصل کر لیا تھا جہاں سب سما سکتے ہیں
کسی محل سے کیا کم جگہ ہے وہ۔ آپ نے بھی اُسے خوب دیکھا ہے۔
نظر میری طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس بے خبری کا
سبب اُس کی نظر میں میری بے مائگی و بے بضاعتی کے سوا کیا ہو سکتا
تھا۔ آدمی اتنا گم تو نہیں ہو سکتا اور بھِل جیسا آدمی؟ جس کی بینائی
کے لیے آنکھیں کھلی ہونا ضروری نہیں تھا۔

باہر سبزے پر جمرو، شامو، ہاری اور ننگو کوئی نہیں تھا، گلی
میں بھی وہ نظر نہیں آئے۔ میں اِرد گرد کی گلیوں میں گھومتا رہا۔
دھوپ اُوپر لوٹ رہی تھی۔ گلیوں میں راہ گیروں کی تعداد اتنی ہی
تھی جتنی عموماً بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقے میں ہوتی
ہے۔ میں آگے نکل گیا۔

یہ میرا گمان نہیں تھا۔ شروع میں، گو میں نے اِسے واہمہ
ہی سمجھا تھا۔ ایک دو نہیں، یکے بعد دیگرے کئی راہ گیر مجھے دیکھ
کے ٹھٹکے، ممکن ہے، اباجان اور منیر علی اُس طرف اشارہ نہیں کرتے
تو مجھے کچھ احساس نہ ہو پاتا۔ میں اُن میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔
ظاہر ہے، وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، اُن کے جسم کھنچ سے گئے۔
اُن کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ دہشت کی آمیزش بھی تھی۔
بہت سے خوف کدورت کی طرف جاتے ہیں، عناد کی طرف۔ بھِل
جیسے اڈے پاڑے کے کسی آدمی کے لیے یہ علامتیں کسی تکدر کا باعث
نہیں ہوتیں۔ یہ تو معمول کی بات ہے، تماشے کا حصہ ہے۔ پھر
اڈے پاڑے کا آدمی ہونے سے کیا حاصل؟ بھِل پیرو کے گھر میں بیٹھا
تھا ورنہ اُسے اتنا کچھ سننے کی عادت نہیں تھی۔ کون جانے کہ جسم سے

آزادی کے بعد روح کا اپنے متعلقین سے سروکار بھی ہوتا ہے یا
نہیں، نہ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ انسانوں کو یہی یاد رکھنا
چاہیے کہ ایسا ہوتا ہے اور ہوتا ہے تو روحیں اپنے پُرسانِ حال کے
اثبات سے یقیناً آسودہ ہوتی ہوں گی۔ اور پیرو تو گیتا اور رانی کی
صورت میں ویسے بھی موجود تھا۔ رُوح کی خوشی و ناخوشی کا خیال تو
ایک اَن دیکھی چیز ہے۔

گلیوں سے گزرتا ہُوا میں بہت دُور چلا آیا۔ اندھیرا پھیل چکا
تھا۔ اندھیرا ہو جانے پر مجھے کچھ سکون سا ملا۔ جیسے میں محفوظ ہو گیا ہوں
یا میرا کوئی حصار ٹوٹ گیا ہے۔ آگے سڑکوں پر گو تیز روشنی تھی مگر دن
کی روشنی کی طرح تسلسل سے نہیں، کتنی ہی روشنیاں کر لی جائیں، رات
تو رات ہی رہتی ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے، اندھیرا کرنا آسان، روشنی
کرنا مشکل ہے۔ گھر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں چلتا رہا اور
جتنی دُور ہوتا گیا، مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم و جاں کے روزن کھل
رہے ہیں۔ آدمی بھی مکان کے مانند ہوتا ہے، دریچے دروازے
سب ہوتے ہیں اس میں۔ کبھی یہ ایسے بند ہوتے ہیں کہ کھلتے ہی
نہیں۔ بہت دنوں بعد مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے زمانوں بعد
میں یوں اکیلا صرف اپنے ساتھ سڑکوں پر چل رہا ہوں۔ نہ کوئی منزل
نہ مقصد۔ کہتے ہیں، منزلیں اور مقصد کبھی خود بہ خود پیدا ہو جاتے
ہیں۔ روزن کھلنا بھی ایک مقصد ہے، تازہ ہوا بھی۔ ہوا جو ازخود
در آئے۔ منزلیں بھی آدمی کی طرف آتی ہیں۔ گھر سے چلتے وقت
میری آنکھوں میں دُھند سی بھری تھی، سارے جسم میں۔ مجھے خیال
آیا، اگر میں اور دُور ہو جاؤں تو کیا ہوا یوں ہی چلتی رہے گی، مجھ
پر ایسی ہی مہربان؟ کچھ اور نہیں تو میرا بوجھ صرف میرے پیروں پر
ہوگا، دوسروں پر نہیں۔ میرا آزار مجھ تک محدود رہے گا، دوسرے
اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔ آدمی سب کچھ کتنا ہی خود تک رکھے،
دوسرے کسی نہ کسی طرح زد پر آ جاتے ہیں۔ آزار بھی وبائی مرض
کی طرح ہوتا ہے، متعلقین کو چھوت کی طرح لگ جاتا ہے اور یہ
بھی ہوتا ہے کہ کوئی اپنے آپ کو ہزار چھپائے، اُس سے نسبت
کے مدعیوں سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ وہ خود اس کا آزار جزوِ جاں بنا
لیتے ہیں ورنہ نسبت ہی کیسی! اس کی صرف ایک صورت ہے کہ
آدمی ان کے سامنے ہی نہ رہے پر یہ کہاں ممکن ہے، جنگل میں بھی
نہیں۔ جولین یہی کچھ تو کہہ رہی تھی، جنگل میں آدمی دوسروں سے ضرور
دور ہو جائے گا اور دوسروں کے لیے مزید آزار کا سبب نہیں بنے گا
لیکن وہ خود جو اپنے ساتھ بستیوں کا گرد و غبار، بستیوں کے خار و خس

ساتھ لے کے جائے گا۔ میں اپنے آپ سے جانے کیسی اُلٹی سیدھی،
بے سر و پا باتیں کرتا آگے بڑھتا رہا اور میں نے خود سے کہا، آدمی کو
اپنے نسبت داروں کے قرار کا ایسا ہی خیال ہے تو جنگل، بیاباں کیا
ایک مرتبہ خود ہی کو خاک بُرد کیوں نہ کر دے۔ کسی نہ کسی دن ویسے
بھی یہی فیصلہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ یہ فیصلہ خود کر لیتے ہیں۔ یوں
انھیں مستقل قرار آ جاتا ہے اور اُن کے ماتم گساروں کی آگ بھی بھڑکتے
بھڑکتے ایک وقت ٹھہر جاتی ہے۔ پر جو لوگ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے، اُن
کی ڈوری شاید مضبوط ہے، اُن کے کشکول میں آرزو کچھ باقی ہے۔ آنے
والے دنوں سے کسی رحم اور رعایت کی آس میں وہ ایسا نہیں کر پاتے۔
بدلتے موسم، اپنے اِرد گرد ہر لحظہ بدلتی چیزیں انھیں آسرے میں رکھتی
ہیں یا پھر انھیں اپنے آپ سے ضد ہو جاتی ہے، اذیت سہنے کی سرکشی۔
وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اُن میں کتنا حوصلہ، آسمان کا کتنا زور ہے۔
انھیں ہر دم یہ گداز رہتا ہے کہ نجات کا فیصلہ تو ایک آن کی دُوری
پہ ہے، اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے، کیا عجب کہ پتھر پگھلنے کا موسم
شروع ہو جائے۔

جانے کیا ٹھیک ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کیا ہوتا
ہے، کیا ہونا چاہیے۔ غالباً زندگی کا یہی طور سب سے زیادہ موزوں
ہے کہ آدمی اپنی سعی کرے، کچھ موسموں پر چھوڑ دے اور ہو سکے تو
سردیوں کے لیے آگ بچائے رکھے، گرمیوں کے لیے پانی۔ آدمی اپنی
بساط سے زیادہ کی طلب کیوں کرے۔ طلب کرے اور اصرار بھی لیکن
انکار کے لیے بھی آمادہ رہے۔ بھکاریوں کی طرح جو صدا لگاتے ہیں،
لگائے جاتے ہیں اور گھڑکیاں کھا کے اپنا رستہ لیتے ہیں۔ وہ ایک دہلیز
پر بیٹھ نہیں جاتے اور دروازہ توڑ کے اندر مکینوں کا گلا نہیں گھونٹ
دیتے۔ بھکاری کا کام صدا بلند کرنا ہے۔ کوئی ایک دروازہ تو کھلتا ہے
پر کوئی بھی نہ کھلے تو؟ میں نے خود سے پوچھا، تو آدمی ایسے ہی سو جائے
دوسرے دن صدا لگانے کی ہمت رہی تو ٹھیک نہ رہی تو انجام کو
پہنچ جائے گا۔ جولین کی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔
صبح وہ ایک اور بات کہہ رہی تھی کہ آدمی خود کیوں نہ دروازہ بن جائے
جن دروازوں پر صدا رسا ہوتی ہے، اُن میں بھی تو آدمی رہتے ہیں۔

مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں تو بس سر اُٹھائے چلتا
رہا۔ کسی چوراہے پر ایک شخص نے اچانک مجھے ایک طرف دھکا دیا تو
میری آنکھیں کھلیں۔ وہ ناتواں شخص جھپٹ کے مجھے ایک طرف دھکیل
نہ دیتا تو میں سامنے سے آتی ہوئی ٹم ٹم اور اُس کے منہ زور گھوڑے
کی لپیٹ میں آ جاتا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہو گیا۔ میرا جسم جھول
گیا تھا۔ کسی دوسرے راہ گیر نے بوڑھے آدمی کی مدد کی۔ دوسرے
لمحے میں اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ
عود کر آئی، پھیکی پھیکی۔ ایک آن میں فیصلہ ہو جاتا۔ میں نے دبے لفظوں
میں بوڑھے کا شکریہ ادا کیا تو وہ خفا ہو کے بولا "دارو پی ہے کیا؟"
میری خاموشی پر اُس کے لہجے میں کچھ نرمی آ گئی اور وہ میری کمر تھپ
تھپاتے ہوئے کہنے لگا "خدا نے خیر کر لی۔ یہ سڑک ہے میاں! جوان
آدمی ہو، ابھی کیا دیکھا ہے زندگی میں۔ آنکھیں کھلی رکھ کے چلا کرو،
گھوڑا بدک جاتا تو ایک تم ہی نہیں، اور لوگ بھی لپیٹ میں آ جاتے"
غلطی میری ہی تھی۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ ایک ہمدرد آدمی تھا، مجھ
سے پوچھنے لگا "کیا بات ہے، پریشان نظر آتے ہو؟" میں نے اُسے
یقین دلانا چاہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، بس چوک ہو گئی۔ میرے جواب
سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ میرا نام پتہ اور منزل پوچھنے لگا۔ پھر میں بھی
کچھ بتا نہیں پایا تھا کہ وہ مضطرب ہو کے بولا "کیا کام کرتے ہو؟"
میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں، کیوں کہ میں تو کوئی کام ہی نہیں
کرتا۔ میرے پس و پیش سے اُس نے جانے کیا سمجھا۔ میں نے نہیں
دیکھا تھا کب اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا۔ میرا سارا
جسم اکڑ گیا تھا۔ جب اُس نے اپنی بند مٹھی میرے ہاتھ میں کھولنی
چاہی۔ میں گھبراہٹ میں پیچھے ہٹ گیا۔ سکے فٹ پاتھ پر گر گئے

اور چھناکے کی آواز آئی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ ہاتھ کھینچ کے بوڑھے کے منہ پر طمانچہ رسید کروں لیکن اُس کی مسکین صورت دیکھ کے میرا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ زمین پر پڑے ہوئے سکے اُٹھا کے مجھ سے کچھ کہتا، میں تیز قدمی سے آگے بڑھ گیا۔ اُس کی آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر ٹریفک کے شور میں گم ہو گئیں۔ میں نے بھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی اور چیخ پکار بھی بہت تھی۔ اب مجھے سب کچھ سنائی اور دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اتنی دیر میں بند آنکھوں اور بند کانوں سے راستہ طے کرتا رہا تھا۔ صوت و صورت کی موجودگی سماعت و بصارت سے مشروط نہیں ہے۔ گرد و پیش میں اُٹھنے والا شور اور سامنے کی چیزوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ انھیں دیکھا اور سنا بھی جا رہا ہے۔ میرے دست و بازو دیر تک سنسناتے رہے۔ اُس وقت مجھے اِس کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے بیتتے ہوئے منظر کا ہر نقش اب شکلیں بدل بدل کے میری آنکھیں خیرہ کر رہا تھا۔ زندگی باقی رہتی تو ہاتھ پیر سلامت نہ رہتے۔ میری جیب میں پڑا ہوا چاقو یوں ہی دھرا رہ جاتا۔ فٹ پاتھ سے اُتر کے میں نے سڑک پر ایک دو قدم بڑھائے تھے کہ عین وقت پر بوڑھے کی نظر پڑ گئی اور اُس نے مجھے آ لیا۔ وہ مجھے پہلے سے دیکھ رہا تھا۔ غلطی ٹرام والے کی بھی کم نہیں تھی۔ اُسے گھنٹی بجانی چاہیے تھی۔ ممکن ہے، اُس نے بجائی ہو اور میں سن نہ سکا ہوں یا وہ بھی میری طرح کسی اور شور، کسی اور خیال میں منہمک ہو۔ آدمی کو اپنے پیش منظر سے کبھی اتنا بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں، موت کو ایک بہانہ چاہیے، حالاں کہ موت کو کسی بہانے کی کیا ضرورت ے۔ ہر لمحہ، موت کا لمحہ ہے۔ ٹل جائے تو دوسری بات ہے، ٹل جائے تو زندگی ہے۔ موت کا نظر انداز کیا ہوا لمحہ زندگی ہے یا یوں کہیے کہ زندگی موت کی رعایت ہے، رسی کی ڈھیل ہے جو پلک جھپکتے میں کھینچ لی جاتی ہے۔ زندگی بھی بس ایک پل ہے۔ پل پل جڑ کے تی ہے اور ایک اشارے میں ساری پونجی لُٹ جاتی ہے۔ بوڑھا ٹھیک کہتا تھا۔ مجھے کچھ ہو جاتا تو ایک میرا ہی کچھ نہ جاتا۔ یہ خبر جنگل ک پہنچتی، ابا جان، جولین، فرخ، فریال، فاریہ، اکبر تک تو کیسا ہرام مچتا۔ کون اپنا منہ نوچتا، کون دیواروں سے سر پھوڑتا۔ میں ں کا تصور ہی کر سکتا تھا۔ زریں، خانم، شہ پارہ، نیساں، جہاں گیر، ن کون، سب اُجاڑ ہو جاتے۔ پیرو کی موت پر کسی نے کہا تھا کہ ت کا اصل عذاب تو زندہ رہ جانے والے پسماں دگان پر ٹوٹتا ہے۔ ایک آدمی کی موت جانے کتنوں کو ویران کر دیتی ہے، ایک آدمی کتنے آدمیوں میں زندہ رہتا ہے۔ اپنے لیے نہیں تو اُسے دوسروں کے لیے زندگی پر اصرار کرنا چاہیے۔ جولین کا یہی مطلب تھا کہ اپنے اختیار کی نہیں، اپنے لیے کارگر نہیں تو ایسی زندگی دوسروں کے اختیار پر چھوڑ دینا چاہیے، دوسروں کی امانت سمجھ کے برتنا چاہیے۔

میں جولین سے بہت کچھ نہیں کہہ سکا تھا کہ کسی کی زندگی پہلے ہی گروی رکھی جا چکی ہو، کوئی اپنا اختیار پہلے ہی ترک کر چکا ہو، پہلے ہی سے کسی دوسرے کی زندگی گزار رہا ہو تو وہ کیا کرے؟ ابھی کچھ دیر پہلے اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو سبھی پر پہاڑ سا ٹوٹ پڑتا مگر ایک دوسرے کے غم گسار بہت تھے، ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹ لیتے۔ کسی دن انھیں صبر آ ہی جاتا۔ یہ کوئی گلہ نہیں، یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے مگر ایک شخص کا کیا ہوتا! یہ تو میں جانتا ہوں، وہ جہاں بھی ہے، میری وجہ سے وہ اِس اجیرن زندگی پر مُصر ہوگی۔ اِس دربدری میں کوئی آرزو ہی کورا کی قوت، اُس کی سپر بنی رہی ہوگی۔ مولوی صاحب اُس سے یہی کہتے ہوں گے کہ میں بہ ہمہ ہوش و حواس موجود ہوں اور وہ ایک دن مجھے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مولوی صاحب نے اتنے دنوں میں خوب سمجھ لیا ہوگا کہ کوئی تسلی دلاسا، کوئی عیش آرام اُس کے لیے اِس سے بڑا نہیں ہوگا جتنا میرے نام کا دلاسا اور میرے ذکر کا آرام اور مولوی صاحب بھی اُس سے اتنا نہ کہہ پاتے ہوں گے، جتنا وہ خود سے کہتی ہوگی۔ آدمی کا دل خود ایک صدا اور روشنی ہے۔ پہلی بار کلکتے کے ہوٹل میں جب ہم چند کمینے لوگوں کی نظر میں آ گئے تھے اور وہ اُسے مجھ سے جُدا کرنے کے درپے تھے تو وہ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں گھبرا گھبرا کے کہتی تھی کہ بس میرے قریب رہو، مجھے چھوڑ کے کہیں مت جانا۔ میں سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہتا تھا، حالاں کہ میری سمجھ میں خود نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں، کون سے گوشے میں سر چھپاؤں، اُسے دُنیا کی نگاہوں سے کیوں کر محفوظ رکھوں۔ ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں بند باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجھے اُس کا ایک ایک لفظ یاد ہے، اُسے بھی سب ازبر ہوگا۔ ہم نے بہت سے عہد کیے تھے۔ یہ عہد ہی اُس وقت ہمارے لیے تقویت کا باعث بنے تھے۔ بعد میں اِنھی نے مجھے زندہ رکھا، اُس کے لیے بھی یہی زندگی رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے پر اعتماد سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ اُسے مجھ پر ایسا ہی یقین تھا جو اُس نے اندھیری رات میں بُدھ گیا سے بھاگ کے سیدھے میرے گھر کا رُخ کیا تھا اور آبا جان کا بے اعتنائی کا رویہ دیکھ

کے بے سروساماں میرے ساتھ گھر سے نکلنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ مجھ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ پناہ اُس کے لیے کوئی نہیں ہے۔ اُس نے میری آنکھیں دیکھی تھیں جو ہر دم اُسی کی جستجو میں رہتی تھیں اور میرا چہرہ، جو اُس کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اُس کا دل گواہی دیتا ہوگا کہ میری نگاہیں اب بھی اُس کے لیے بھٹکتی ہیں۔ میں جو کچھ سوچا کرتا تھا امیر علی کی بیٹی زہرہ نے بالکل وہی مجھے بتایا تھا۔ زہرہ نے اُسے خوب دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھی، کورا کے چہرے پر بادل سے منڈلاتے رہتے ہیں۔ ہر لمحے آنکھوں میں اُمڈتی ہوئی کوئی گھٹا، ذرا چھیڑو تو برس پڑے۔ وہ آہٹوں پر چونک پڑتی تھی۔ زہرہ نے مجھے اُس کا سارا حال بتایا تھا۔ زہرہ کے بہ قول اُس نے کئی مرتبہ کریدنے کی کوشش کی۔ کورا نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ بتاتی بھی کیا۔ اپنا ارادہ توانا رکھنے کے لیے آدمی اپنا حال خود میں چھپائے رکھتا ہے۔ میرا بھی کچھ یہی ہے، جولین کو میں کیا بتاتا کہ اُس کی ہر دلیل کسی بھی معیار و اعتبار کی رُو سے درست ہے مگر جواب تو کچھ اور آتا ہے، نتیجہ تو کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دلیلیں تو میں خود کو بھی دیتا ہوں۔ میرا ان سارے لوگوں کے درمیان کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں کے ساتھ رہنا اِس کا ایک ثبوت ہے۔ مجھے تو چلتے رہنا، بڑھتے رہنا چاہیے تھا، زمین کے آخری سرے تک، اپنے حصے کے وقت کے اختتام تک۔ پھر کہیں رُک کے، میرے بیٹھ جانے سے اور کیا مراد ہے۔ جتنا کچھ میرے پاس ہے، میں نے اُس میں پس و پیش کب کیا ہے۔ میں اپنی سی کوشش بہت کرتا ہوں لیکن وہی ٹھیرے ہوئے پانی میں کنکر ڈال دینے کے مصداق کوئی کنکر کہیں سے آ جاتا ہے اور سب منتشر ہو جاتا ہے۔ اچانک اُس کا سوالی سراپا میرے سامنے آ جاتا ہے، جیسے وہ مجھے بلاتی ہو اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھ سے کچھ چھینا جا رہا ہو، جیسے مجھ سے کوئی بھول ہو رہی ہو۔ جانے کتنے لوگ یوں ہاتھ پیروں سے ثابت نظر آتے ہیں۔ بہت سارا وزن اُٹھا لیتے ہیں، ضرورت پڑنے پر دیوار بن جاتے ہیں، کوئی آمر کسی جانب اُٹھے، تلوار بن جاتے ہیں، اندھے کی لاٹھی بن کے راستہ پار کرا دیتے ہیں۔ پر کون جانے اِن شہ زوروں میں خود کتنا اندھیرا ہے، کتنی پسپائی، کیسی ٹوٹ پھوٹ ہے۔

آگے سڑک کی مرمت کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کتنا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے راستہ پہچاننے کے لیے اطراف میں نظریں گھمائیں۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ جوہو کا علاقہ تھا۔ میں بہت دُور نکل آیا تھا، وقت بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی کثرت تھی مگر شام کی طرح افراتفری نہیں تھی۔ جوہو سے مجھے کیلاش اور رما کی یاد آئی۔ اُن کا گھر زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی بات ہی ہوگی جو وہ دو دن سے نہیں آ سکے تھے۔ میں نے سوچا، مجھے جا کے پوچھنا چاہیے۔ میں تنگ راستے سے گزر گیا لیکن دیر ہو جانے کے خیال سے میرے پاؤں سُست پڑنے لگے۔ میں نے سامنے نکڑ پر بنے ہوئے ہوٹل میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مجھے گھر سے چلے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ واپسی کے سفر میں اور وقت لگتا۔ میں کسی سے کہہ کے بھی نہیں آیا تھا۔ اتنی دیر میری غیر حاضری پر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ سو میں نے گھر واپس جانے اور جلد پہنچنے کے لیے سواری پکڑنے کا ارادہ کیا۔ سامنے سے آتی ہوئی گھوڑا گاڑی میری آواز پر رُک گئی لیکن اچھا ہوا، گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے میں نے پیسوں کے بارے میں اطمینان کر لینا مناسب سمجھا۔ میں نے ابھی کوچوان سے کچھ نہیں کہا تھا، مجھے جیب ٹٹولتے دیکھ کے اُس نے چابک مار کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے یاد تھا، کئی روز پہلے جولین نے چند روپے میرے کُرتے میں ڈال دیے تھے۔ صبح کپڑے بدلتے ہوئے یا تو میں جیب خالی کرنا بھول گیا یا پیسے کہیں گر گئے، خرچ کرنے کا تو کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب اتنا لمبا سفر مجھے پیدل طے کرنا تھا۔ کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا، میں تیز تیز قدموں سے بڑھتا رہا۔ شارعِ عام نہ ہوتی تو شاید میں بھاگ کے راستہ طے کرتا۔ جلد ہی میں نے ایک بڑا فاصلہ گزار دیا۔ پھر ابھی ایک چوراہے سے نکل کے پان کی کسی دکان کے نزدیک آیا تھا کہ مجھے رُکنا پڑا۔ "راجا دادا!" کسی کی چہکتی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ دو آدمی تھے۔ ایک دُبلے پتلے چھریرے جسم کا بیس اکیس سالہ، بڑی مونچھوں والا، دوسرا اُس سے کچھ بڑا اور کسی قدر فربہ۔ اُس کی مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ میں نے پلٹ کے انھیں غور سے دیکھا۔ اُن کے چہرے شناسا معلوم ہوتے تھے، نام ذہن میں نہیں آ رہے تھے۔ میں جیسے ہی ٹھیرا، انھوں نے لپک کے میرے پیر پکڑ لیے۔ پاٹے ہی کے آدمی لگتے تھے۔ "اپن کو پہچانا دادا؟" چھریرے آدمی نے کہا۔ "اپن جگنو ہے اور یہ، یہ تمھارا غلام۔" وہ اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ مار کے اضطراب سے بولا۔ "یہ دیا ہے۔"

میں نے جلدی سے سر ہلایا۔ اُن کے نام بھی میرے لیے نئے نہیں تھے لیکن کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ انھیں کس پاٹے پر دیکھا ہے۔ میرا تذبذب وہ بھانپ گئے۔ "اپن کو بھول گیا دادا!

اپن چھنگا دادا کے پاڑے پر.....۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیسے ہو تم لوگ؟"

"اپن ٹھیک ہے، ایک دم بالکل ٹھیک۔" جگنو نامی شخص بے تابی سے بولا۔ "تم کو ابھی اُدھر پیرو دادا کی ارتھی پر دیکھا تھا، پھر اکھا تین دن، ہم پاڑے پر بیٹھا رہا، ایک بار کو تم بھی اپن کی طرف بھی آنکھ گھما کے دیکھے..... اپن سلام بھی دیا تھا۔"

"مجھے دھیان نہیں رہا۔" میں نے معذرتی لہجے میں کہا۔

"کدھر کو رہتا، اپن کو سارے کا پتہ تھا، اس واسطے بڑھ کے آگے کو نہیں پہنچا۔" دیوا نے اضطراری انداز میں کہا۔ "قسم سے، اپن تم کو بہت یاد کیا دادا!" اُس کی آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں نے مسکرا کے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میں بمبئی میں نہیں تھا، بہت دنوں بعد آنا ہوا تھا، پھر یہاں آ کے کہیں آنے جانے کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی نہیں مل پایا۔"

"اپن کو پتہ پڑا تھا کہ ابھی تم ادھر بمبئی آ گیا ہے۔ کئی بار سلام کرنے کو اُدھر ہم پاڑے کا پھیرا لگایا، تم نئیں دکھائی دیا، پھر ملا تو ایسا..... اکھا اُلٹا پلٹی کے بعد.....۔" دیوا سر جھٹکنے لگا اور چونک کے بولا۔ "ابھی تھوڑا ہوٹل میں بیٹھنے کا ہے، چائے پانی.....۔"

"نہیں نہیں، مجھے کچھ جلدی ہے، پھر کبھی سہی۔"

"صرف ایک کپ چائے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

جتنا میں کہہ سکتا تھا، میں نے اُن سے کہا مگر وہ بہ ضد ہو گئے کہ مجھے ایسے نہیں جانے دیں گے۔ ناچار مجھے آمادہ ہونا پڑا۔ ہم تینوں نزدیک کے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل میں بھیڑ زیادہ تھی لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح جگہ تلاش کر لی۔ میرے لیے کرسی صاف کی۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کب انھوں نے بیرے کو اشارہ کیا تھا۔ بیرے نے ملائی بھری چائے کے ساتھ مکھن ڈبل روٹی، بسکٹ اور سموسوں کی پلیٹیں بہ عجلت میز پر سجا دیں۔ اُن دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہوٹل میں دست یاب ساری چیزیں منگوا کے میرے سامنے رکھ دیں۔ مجبوراً مجھے کچھ نہ کچھ ہاتھ چلانا پڑا۔ اس دوران وہ حسرت آمیزی سے چھنگا کے پاڑے کے بارے میں بتانے لگے، گدی پر میرے وہاں بیٹھنے اور جانے کے بعد کے واقعات۔ میں انھیں اب اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ پہلے دن جب میرے اور چھنگا استاد کے درمیان دیر تک زور آزمائی ہوئی تھی، یہ دونوں موقع پر موجود تھے۔ تیواڑی کی سرکوبی کے لیے جو منتخب آدمی اکٹھے کیے گئے تھے، اُن میں بھی یہ شامل تھے اور سارے واقعے کے شاہد تھے۔ پیرو کے پاڑے پر جب تیواڑی کو پکڑ کے لایا گیا تھا اور جھل حجت بسیار کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا تھا اور دُوسرے ہی لمحے تیواڑی کی ناک اُس کی ہتھیلی پر تھی۔ چھنگا کے پاڑے پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے چند دن چاقو بازی سکھائی تھی، یہ دونوں سیکھنے میں پیش پیش تھے۔ اُنھی دنوں کا یہ ذکر کر رہے تھے، اتنا وقت نہیں گزرا تھا مگر اُن کے لہجے کی آزردگی سے لگتا تھا، ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ چند دنوں کی مشق کے بعد میں اور وقت نہیں دے پایا تھا، اسی کا دونوں افسوس کر رہے تھے۔ کہنے لگے، اس کے بعد انھوں نے کئی پاڑوں کا رُخ کیا اور مختلف داداؤں کی جی جان سے خدمت گزاری کی لیکن کسی جگہ اُن کا دل نہیں لگا اور وہ گویا ایک قدم بھی نہ بڑھ سکے۔ بار بار کھونٹے بدلنا دادا کو راس نہیں آتا، اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وہ پھر اپنے پُرانے علاقے میں آ گئے۔ جہاں چھیدا، اُن کا پُرانا ساتھی، چوکی پر بیٹھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میری تلاش میں وہ کلکتے بھی گئے تھے۔ وہاں جھل کے اڈے پر میں موجود نہیں تھا۔ جھل بھی نہیں تھا۔ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اُن دنوں ہم ابا جان کے تعاقب میں تبت کی گھاٹیوں اور پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ کلکتے میں انھیں میرے دوسرے ٹھکانے فیض آباد کی بھی سُن گُن ملی۔ وہ فیض آباد نہیں گئے کیوں کہ انھوں نے وہاں میری ناموجودگی کے بارے میں تسلی کر لی تھی۔ ایک مہینے تک وہ میرا انتظار کرتے رہے اور بمبئی میں کسی ایک دن میری آمد کی اُمید باندھے کلکتے سے لوٹ آئے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ پیرو بھی ہمارے ساتھ گیا ہے۔ چناں چہ میری بمبئی واپسی کے بارے میں وہ اور پُرامید تھے۔ اس دوران وہ مسلسل پیرو کے پاڑے پر آتے جاتے رہے۔ پھر بمبئی میں جیسے ہی انھیں میری آمد کی خبر ملی اور میں پیرو کے پاڑے پر نہ مل پایا تو انھوں نے میرا پتہ یعنی باندرے میں جولین کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ گھر ڈھونڈنے میں کام یاب ہو گئے تھے تاہم کاٹنے کی اطلاع سُن کے انھوں نے کسی اور بہتر وقت کے لیے اپنا ارادہ موخر کر دیا۔ کہہ رہے تھے، آج قسمت نے یاوری کی اور میں انھیں یوں اچانک نظر آ گیا۔ شاید اُن کے عزم نے مجھے اس طرف کھینچ لیا تھا، ورنہ میرا تو گھر سے نکلنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ مجھے تنہا دیکھ کے وہ اور خوش تھے کہ کھل کے دل کی بات کر سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے دُور سے دیکھ لیا تھا اور انھیں یقین نہیں آیا تھا کہ میں ہی اُن کے سامنے ہوں۔

مجھے بھی اپنے سُنے ہوئے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں حیرتی آنکھوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ "ابھی کیا بولے راجا دادا!" جگنو عاجزی سے کہنے لگا۔ "اپن لوگ کو ابھی تھوڑا ٹیم دیو دادا!"

میں سمجھ رہا تھا کہ وقت دینے سے ان کا کیا مقصود ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا تعلق کسی پاڑے سے نہیں ہے اور نہ آئندہ کسی پاڑے پر بیٹھنے کا ارادہ ہے۔

"اپن کو پتہ ہے، کل اپن اُدھر ماہم کے پاڑے پر ہی بیٹھا تھا جب جھل دادا تھانے سے پلٹ کے آیا تھا اور آ کے پانڈے دادا کے سر پر تاج لوٹ دیا تھا۔ اپن اُدھر منہ بند اکھا ناٹک دیکھا تھا۔"

"وہ ناٹک نہیں تھا۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"جانتا ہے۔" دیوا نے جلدی سے کہا اور خفت آمیز لہجے میں وضاحت کرنے لگا کہ میں کچھ اور نہ سمجھوں، جگنو کا مطلب یہ ہے کہ جھل تھانے سے خوب تیار ہو کے آیا تھا کہ اُسے بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔ اُس طرح پانڈے دادا کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ دونوں خاصے معاملہ فہم تھے، ذہین بھی۔ دیوا ٹھیک طرح اپنے ساتھی کے طرز کی وضاحت نہ کر سکا تو اُس نے موضوع بدل دیا، آواز دھیمی کر کے بولا، خیر جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ پانڈے اب پیرو کی جگہ بیٹھا ہے۔ بالے کو اُس کا نائب یا دستِ راست بنا دیا گیا ہے۔ پانڈے، پیرو کا دوست تھا، بالے پروردہ ہے۔ یہ اشتراک جاری رہے تو بہت اچھا ہے لیکن اِس کا امکان نظر نہیں آتا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے رُکھائی سے کہا۔

"جھل دادا کو اب کاٹے کو پاڑے پر بیٹھنے کا تھا۔ ماری نے اُس سور کے بچے جارجی کو خلاص کر کے جھل دادا کے واسطے کام ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

ایک ثانیے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ ان کا تعلق پولیس سے نہ ہو۔ دونوں باخبر بھی اچھے لگتے تھے مگر یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اُن کے انداز و اطوار میں بڑی لپک اور بے قراری تھی۔ آلودگی میں ایسی بے ساختگی نہیں ہوتی۔ جگنو نے کہنی مار کے دیوا کو ٹوکا اور تاسف سے بولا کہ ظاہر ہے جھل نے ہر طرح سوچ سمجھ کے پاڑا پانڈے کے حوالے کرنے اور خود علیحدہ ہو جانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اُسے بھی اندازہ ہوگا کہ پیرو کا اتنا بڑا پاڑا منتشر ہو سکتا ہے، ختم ہو سکتا ہے۔

"پیرو دادا ختم ہو گیا تو اب پاڑے کا کیا.....۔" میں نے زہر خند سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دادا پر اپن کو تھوڑا معاف کرو تو بولے۔" جگنو نے لجاجت سے کہا۔ "تم جیسا بولتا ہے، ایک دم ٹھیک ہے۔ پر تم کو کچھ فرق نہیں پڑتا، تم راجا لوگ ہو، ابھی جو بی پاس بیٹھا لوگ سے پوچھو۔ ماہم پاڑے پر اور اکھا بمبئی جنگل میں پیرو دادا کا ایک دو بال تو نئیں ہے۔ ابھی اِدھر چھوٹا بڑا بیس کتا ہے جس کا گردن میں اُس کا پٹا ڈلا تھا، جو اُس کا مارا کھاتا تھا اور دُم ہلاتا تھا۔ وہ کیا بولتا ہے سالا، کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اپنے کو جاستی دن نئیں جانے گا، تم خود دیکھ لے گا، سب اُلٹا ہو جانے کا ہے۔ ادھر ایک سے ایک حرامی دادا پڑا ہے۔ ابھی سب آگے کو بڑھ کے بولتا۔ اونچا اونچا سُر میں، اپن پاڑا نئیں مانگتا، اپن دادا کا غلام ہے، ماہم پاڑے ساتھ چمٹا رہنے کو مانگتا ہے، ہاں، ایک دم سالا حرام کا.....۔" دیوا کی آواز گھٹنے لگی۔ چائے کے گھونٹ سے اُس نے خشک گلا تر کیا اور جیسے وقت نکل جائے گا، ایسے بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا کہ کچھ دنوں کی بات ہے، پیرو کی موت کو چند دن ہوئے ہیں کہ کھچڑی پکنی شروع ہو گئی ہے۔ داداؤں کے گروہ بن رہے ہیں۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ ابھی تو دادا لوگ خود حیران و پریشان تھے کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ جیسے جیسے وقت ٹھہرتا جائے گا اور جس دن انھیں یہ یقین ہو جائے گا کہ جھل لوٹ کے نہیں آئے گا یا وہ بمبئی سے چلا جائے گا اور اس دوران چند سرکردہ دادا اپنے گٹھ جوڑ سے کسی خوش گمانی کا شکار ہو گئے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، یہاں شہر میں پھر کیسا خون خرابا ہوگا۔ دیوا کم و بیش وہی کچھ دہرا رہا تھا، جس کا اندیشہ کل رات شکلا نے ظاہر کیا تھا اور جس کا اظہار پاڑے سے جھل کی دست برداری کے وقت داداؤں نے کیا تھا۔ پانڈے نے جھل سے کہا تھا کہ اُسے پیرو کی بیوی اور بیٹی کی اتنی فکر ہے لیکن جو لوگ زندگی بھر پیرو کے ساتھ رہے، اُس کا دم بھرتے رہے، اُس کے ایک اشارے پر جو اپنی زندگیاں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، وہ کہاں جائیں۔ کہاں جا کے سر چھپائیں؟ میں نے دیوا سے کہا، یہ محض اتفاق ہے کہ پیرو اور ماہی کی پیٹھ پر کسی ناہنجار نے گولی پھونک دی مگر دونوں کا ویسے بھی تو وقت آ سکتا تھا۔ ہم یہاں نہ ہوتے اور اُس کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا تو وہ کیا کرتے؟ دیوا نے کسی جھجک کے بغیر وہی جواب دیا جو جھل کو کسی دادا نے دیا تھا کہ پھر اور بات تھی لیکن اب تو ہم موجود ہیں۔ پیرو دادا کی نسبت سے ہم پر اُس کے نمک خوارں کی نگہبانی کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ بھی ہر اعتبار سے پیرو کے پسماندگان ہیں۔ دیوا دہائی دینے کے انداز میں نظر ثانی کے لیے کہنے لگا کہ زیادہ عرصے کے لیے نہیں تو کچھ وقت کے لیے ہمیں ماہم کے پاڑے پر رہنا چاہیے۔ اگر پہلے پولیس کی نظروں میں مشکوک ہونے کے

کسی اندیشے میں ہم باہم کے پاڑے کی گدی سے اجتناب کر رہے تھے تو ماری کے اعتراف کے بعد یہ صورت بھی نہیں رہی ہے۔

"ماری کے اقرار کے بعد جھل بھائی نے پاڑا چھوڑنے کا اعلان کیا تھا؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"بالکل دادا! ایک دم، پھر کیا بات ہے، یہی تو اپن بھی بول رہا ہے۔" دیوا کچھ بددلی ہو گیا اور افسردگی سے بولا کہ پیرو کا اتنا بڑا پاڑا کسی بدترین انجام سے دوچار نہ ہو جائے اسی لیے وہ اتنا کہہ رہا ہے۔ "تھوڑا ٹیم کے لیے دادا!" اُس نے بچوں کی طرح مچل کے کہا۔

"تھوڑے اور زیادہ وقت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں اس شہر میں نہیں رہنا، کچھ اور کام ہیں، اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ بعد میں، ہمارے جانے کے بعد وہ کچھ نہیں ہو گا جواب ہو سکتا ہے۔" میں نے جھڑکتی آواز میں اُس سے پوچھا۔

"نہیں ہوئیں گا ایسا۔" جگنو سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "اپن جانتا ہے ابھی اتنا نہیں ہونے کا، جھل دادا کسی دن پھر خالی پیلی تالی بجانے کو پاڑے پر بیٹھنے کا کیا، آدمی بنا کے جائیں گا، تیار کر کے۔"

"آدمی ایسے نہیں بنتا، چاقو کی ہیرا پھیری اور ہاتھ پیر کی زور زوری سے۔ پاڑے کی گدی کے لیے اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے راجا دادا!" جگنو بے کلی سے بولا۔ "پر آدمی لوگ سے آدمی نکلتا ہے۔" وہ کٹی پھٹی سی آواز میں کہنے لگا کہ انھیں اپنی نو آموزی اور ناپختہ کاری کا اچھی طرح علم ہے لیکن جھل کے سلسلے میں اُن کی آنکھ نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ ہر چند کہ انھیں اُس کی قربت کا موقع کم ملا ہے مگر جتنا بھی میسر ہوا، انھوں نے اُسے ضائع نہیں کیا۔ جگنو کے کہنے کے مطابق، وہ پورے تین دن تک پیرو کی ارتھی کے جلوس اور باہم کے پاڑے پر جھل کے نزدیک تر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ جھل کا سایہ بنے رہے تھے۔ جب میں نے چھنگا کا پاڑا حاصل کر کے وہاں چوکی پر بیٹھنا شروع کیا تھا اور ایک دن جھل کی اچانک آمد پر میں نے اُس کے لیے چوکی خالی کر دی تھی، مجھے دیکھ کے انھیں جھل سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اُس کا قرب اُن کے لیے کسی خواب کی تعبیر کا درجہ رکھتا تھا۔ جگنو کے بہ قول، اُسے اور دیوا کو جھل کا جسم دبانے، حقہ تیار کرنے اور اُس کی جوتیاں اٹھانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ جھل کی آمادگی شرط ہے۔ جگنو آہ بھر کے بولا۔ "اپن کو پتہ ہے، جھل دادا کے ہاتھ میں پڑ کے پتھر بھی ہیرا بن جانے کا ہے، ایسا نہیں ہے کیا؟"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جھل کے ذکر پر دونوں کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ دیوا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جگنو نے اُسے روک دیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "آپ اچھا سمجھتے ہو دادا! ابھی ناراض مت ہونا، اپن کا من میں جو بات تھا، ابھی منہ پر آ گیا۔ اپن نے سالا کسی پاڑے شاڑے کا ٹھیکا نہیں لیا پڑا ہے۔"

میں نے صراحت کرنی چاہی لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی؛ وہ خود ہی چپ ہو گئے۔ دیوا نے میرے آگے سموسوں کی پلیٹ بڑھا دی۔ میں نے اُن کی خاطر ہر پلیٹ سے کچھ نہ کچھ لیا۔ پیالی میں بچی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مجھ سے پوچھے بغیر بیرے نے گرم چائے کی ایک اور پیالی میرے سامنے لا کے رکھ دی۔ کچھ کھا پی کے مجھے کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ معاً میری نظر گھڑی پر گئی اور میں مضطربانہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی ہڑبڑا گئے، پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟

"بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"گھر ہی تو جانے کا ہے دادا!"

"ہاں ہاں پر..." میں تیزی سے ہوٹل سے نکل گیا۔

"اپن کے لیے ابھی کیا حکم ہے؟" دیوا نے بھی عجلت کی اور ہوٹل کے باہر آ کے میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

"کیسا حکم؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اپن ابھی کدھر کو جائے؟" جگنو کتراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کدھر کیا؟" دوسرے لمحے اُن کا مدعا میری سمجھ میں آیا۔ "میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ اڈے پاڑے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو کیا ہوا دادا!" جگنو نے لپک کے میرے پیر پکڑ لیے۔ "تم تو خود اکھا پاڑا ہے۔ اپن کو یاد ہے، ایک بار تم بولا تھا، کوئی پاڑا دادا سے بڑا نہیں ہوتا۔ بولا تھا تم نے ایسا؟"

"ہاں" میں نے اُلجھ کے کہا۔ "ضرور کہا ہو گا۔"

"اپن جانتا ہے، ابھی تم چاہے تو اکھا بمبئی کا پاڑا تمھارا پاڑا ہو۔ تم جدھر جائیں گا، پاڑا تمھارے ساتھ چلیں گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں مائی باپ، بس ایک بار کو اپن کا ہاتھ پکڑ لو۔" دیوا منت سے بولا۔ "اپن تمھارا بہت انتظار کیا ہے۔"

"بے شک کیا ہو گا لیکن شاید اب وقت گزر گیا ہے۔ اڈے پاڑے سے میرا تعلق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اُن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اور بات تھی، اور وقت تھا، مجھے کسی سبب سے چھنگا کے پاڑے کی ضرورت تھی، اسے تھوڑا بہت تم بھی سمجھتے ہو گے۔ چھنگا کوئی ایسی دادا نہیں تھا، اُستاد آدمی تھا۔ چاقو پکڑنا اُسے بہت اچھا آتا تھا، دم میں البتہ کچھ کم زور پڑ گیا تھا۔ یہ جان کے ہی میں اُس کے

پاڑے پر گیا تھا۔ میرے متعلق تمھیں کچھ زیادہ خوش فہمی ہے۔ چھنگا کے پاڑے کے بعد میں دو اور پاڑوں پر گیا تھا، وہ بہت چھوٹے تھے۔ انھی دو تین چھوٹے موٹے پاڑوں کے سوا میں نے کبھی پاڑا نہیں چلایا اور وہ بھی کتنے عرصے کے لیے۔ یقین کرو، میں نے بہت دنوں سے چاقو کھول کے نہیں دیکھا ہے۔ بہتر ہے، تم کسی اچھے دادا کی تلاش کرو۔ یہاں بمبئی میں ایک سے ایک کھرا اُستاد دادا پڑا ہے۔"

"ہوئے گا، اپن کے لیے نہیں ہے، اپن کو کدھر بھی نہیں ملا۔ تم جیسا کدھر بھی نہیں ہے۔ ابھی کچھ بولے دادا! اپن کو پتہ ہے، تم نے چھنگا دادا سے جان کے دیری لگایا تھا۔ تم پہلے ہی اُس کا چاقو گروا سکتا تھا۔ تم نے اُس کو خلاص بھی نہیں کیا، چھوڑ دیا اُس کو۔ اپن نے اکھا تماشا اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ یہی کچھ تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایسے نہیں جائیں گے۔ اُن سے حجت میں اور دیر ہو جاتی۔ میں نے نرمی سے کہا کہ اچھا دیکھیں گے۔ ممکن ہے، جلد ہی بمبئی سے جانا پڑ جائے۔ پھر آنا ہوا اور فراغت ہوئی تو جو تھوڑا بہت آتا ہے، میں تمھیں ضرور بتاؤں گا۔

"نہیں دادا! ابھی اپن تم کو نہیں چھوڑنے کا ہے۔"

اُن کے منت گزار لہجے کے باوجود میں نے انھیں گھور کے دیکھا۔ دونوں نے سر جھکا لیا۔ "کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"اپن کا ابھی بہت خواری ہو گیا ہے۔" جگنو بلبلاتی آواز میں بولا۔ "نہیں معلوم، پھر تم کب ملے؟"

"مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" میں نے بے ربطی سے کہا۔ "لیکن بمبئی آنا جانا رہے گا۔ تم نے اتنا انتظار کیا ہے تو کچھ اور سہی..."

میری بات جیسے انھوں نے سُنی ہی نہیں۔ جگنو گھگھیاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپن سے ابھی انتظار نہیں ہوئے گا دادا! اپن مر جائیں گا۔"

"پھر تم، تم..." میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھ جاتا لیکن یا تو مجھے شبہ تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے یا اُن کی انفعالی حالت نے میرے پیر جکڑ لیے تھے۔ میں نے اُن دونوں کے شانے پر ہاتھ رکھ کے مسکرانے کی کوشش کی اور انھیں مطمئن کرنے کی بھی۔ وہ اور بے قرار نظر آنے لگے۔ "تمھیں کوئی پاڑا چاہیے؟" میں نے بہ ظاہر خوش دلی سے پوچھا۔

"نہیں دادا! اپن پاڑا نہیں مانگتا۔" دونوں نے تقریباً ایک ساتھ جواب دیا۔

"پھر کیا ہے؟ کسی دادا کو بھگتنا ہے؟"

دونوں نے سر ہلا کے انکار کیا۔ جگنو کسی قدر تامل کے بعد دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کو اپنے سے بھگتنے کا ہے۔"

"اپنے سے!" میں نے تعجب سے کہا۔

جگنو نگاہیں جھکاتے ہوئے بولا۔ "اپن، اپن اکھا دادا بننا مانگتا ہے۔"

لگتا ہے، کسی بے پناہ خلش کے بغیر آواز میں یہ سوز نہیں ہوتا۔ میں نے نسبتاً ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھو! پاڑا کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ہو سکے تو پاڑے کا خیال چھوڑ دو۔"

"تم بولیں گا تو اپن لوٹ کے پاڑے کا منہ نہیں دیکھیں گا۔"

"پھر دادا بننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہے دادا!" دیوا نے بے تابی سے کہا۔ "اپن پاڑے واسطے نہیں، بس ابھی دادا بننا مانگتا ہے۔"

"میں یہی پوچھ رہا ہوں، جب تمھیں پاڑے پر نہیں بیٹھنا تو دادا بننے سے حاصل؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جگنو جھجکتے ہوئے بولا۔ "تمھارے جیسا، تم بھی تو سب جانتا ہے اور پاڑے پر نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں..." میں کچھ اور نہ کہہ سکا۔

"بل صرف پاڑے کا لوگ دادا نہیں ہوتا دادا۔" دیوا نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بتانے کی کوشش کی کہ اپنی ذات کے اعتبار کے لیے بھی کوئی کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، حفظ ماتقدم کے لیے اور اپنے لیے نہیں تو کسی دوسرے یا دوسروں کے لیے پاڑے کے سوا بھی تو زندگی میں ہر قدم، ہر موڑ پر بل کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں نے کہا۔ "ہاں کیوں نہیں، ٹھیک ہے۔ تمھاری یہی ہے تو میں ضرور تمھارا ساتھ دوں گا اور مجھے خوشی ہو گی، اگر تم جیسا کہہ رہے ہو واقعی اسی لیے کچھ جاننے کی خواہش مند ہو، ویسے تمھاری مرضی۔"

"نہیں دادا!" جگنو اضطراب سے بولا۔ "تم تم جیسا بولیں گا۔"

دیوا نے شدت سے اُس کی تائید کی اور کہنے لگا۔ "ایسا ابھی ایک بیچ بول دے دادا!"

"کیا بات ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"تم سے بات کرنے سے پہلے اپن کا من میں تھوڑا میلا تھا، ابھی تم سے ایک دم نہیں چھپانے کا، اپن کا من کرتا تھا کہ ابھی ایک بار، صرف ایک بار کو کسی پاڑے کا گدی پر بیٹھے۔" جانے کیوں یہ کہتے ہوئے دیوا کی آواز پھٹنے لگی۔ اُس نے جلد ہی خود پر قابو پایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "پر ابھی کبھی پاڑے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو اپنی ماں کا جنا نہیں۔"

"نہیں! میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی شرط نہیں، میں نے تو صرف ایک مشورہ دیا تھا۔"

اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی زبان کھولتا، میں نے اجازت چاہی۔ وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ میں نے قدم بڑھائے تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگے۔ شروع میں تو میں نے یہ سوچ کے احتراز نہیں کیا کہ ممکن ہے، اُن کی منزل بھی اسی سمت ہو لیکن خاصی دُور آنے کے بعد بھی اُنھوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تو میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟

"تمھارے ساتھ دادا!" دیوا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے ساتھ! مگر میں تو گھر جا رہا ہوں۔"

"اپن بھی ساتھ چل رہا ہے۔"

میرا سر گھوم گیا جیسے جسم میں یک بارگی آگ بھڑک اٹھی ہو۔ میں نے وہیں ٹھہر کے خشمگیں نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ اُن کی وہی کیفیت تھی جو دست و بازو توڑ دے۔ دونوں پر کوئی ندامت سی طاری تھی، سراپا تسلیم و اقرار۔ خنکی کے باوجود اُن کے چہروں پر پسینہ چمک رہا تھا۔ میں درشتی سے کچھ کہہ دیتا مگر مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بر بنائے وضع تو میری ہم رکابی پر مُصر نہیں ہیں؟ میں نے دوبارہ اُنھیں تاکید کی کہ وہ اپنے ٹھکانے واپس جائیں، میں چلا جاؤں گا۔ جواب میں وہ خاموش کھڑے رہے۔ میں نے اُنھیں سمجھایا کہ وہ غیر ضروری تکلف نہ کریں، رات ہو گئی ہے اور مجھے دُور پیرو دادا کے گھر جانا ہے۔ اُن کے لیے واپسی مشکل ہو جائے گی۔

"اپن واپس نہیں آئیں گا۔" دیوا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں! کیا تم بھی اُسی طرف جا رہے ہو؟"

"اپن تمھارے، ابھی تمھارے ساتھ ..." دیوا لفظ چبانے لگا۔ ظاہر ہے، اب کسی قسم کی رُو رعایت کا جواز نہیں رہا تھا۔ میں نے طے کیا، مجھے صاف طور پر کہہ دینا چاہیے کہ اپنا راستہ لو۔ تاہم میں نے جبر کیا اور کہا۔ "ٹھیک ہے، چلتے رہو پھر۔"

"ابھی راستہ دُور ہے دادا! بولے تو وکٹوریا کر لے؟"

"نہیں!" میں نے اُنھیں جھڑک دیا۔ "مجھے پیدل ہی جانا ہے۔" میں نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بھی لوٹ کے نہیں پوچھا کہ مجھے تو گھر پہنچنے کی بہت جلدی تھی، وہ چلتے رہے اور میری تیز رفتاری کا ساتھ دیتے رہے۔ دیر تک میں نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی کچھ نہ بولے۔ شاید میں اُن سے اتنا کبیدہ اور برگشتہ نہیں تھا جتنا خود سے تھا۔ جانے کیوں میں ہوٹل میں اُن کے ساتھ چائے پینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اب تو یقیناً اُدھر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کسی نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایسی بات نہیں تھی۔ دادا کے واقعے کے بعد سب کا اعتبار متزلزل ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے، جمرو، شامو وغیرہ میری تلاش میں نکل بھی چکے ہوں۔ بہر حال جتنی تیزی سے ممکن تھا، میں فاصلہ کم کرتا رہا۔ ٹانگیں کھنچنے لگی تھیں۔ آگے سارے راستے میں نے اُن دونوں سے لاتعلق رہنے کی کوشش کی لیکن وہ تو ہمہ جاں ہمہ نفس میرے ہم قدم تھے۔ اُن کا بوجھ بھی جیسے مجھ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس دوران میں بار بار خود کو تلقین کرتا رہا کہ حرج بھی کیا ہے، یہ آخر میرا کیا نقصان کر رہے ہیں اور میں انھیں زبردستی کس طرح روک سکتا ہوں۔

گھر اب اتنی دور نہیں رہ گیا تھا جتنی دُور ہم آ چکے تھے۔ ہوٹلوں اور پان کی دکانوں کے سوا تقریباً ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی تعداد بھی برائے نام تھی۔ راستے میں کئی جگہ مجھے پولیس والے دکھائی دیے۔ پولیس کا پہلا کام شک ہے۔ تین آدمیوں کو اتنی تیز رفتاری سے بڑھتے دیکھ کے انھیں بے کلی ہو سکتی تھی۔ وقت بھی مناسب نہیں تھا۔ دکانیں بند ہو جانے کی وجہ سے روشنی خاصی کم ہو گئی تھی۔ پولیس کے علاوہ درمیان میں ہم تینوں کے جاننے والے باڑے کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا۔ بمبئی میں اب میں کوئی ایسا گم نام دادا بھی نہیں رہا تھا۔ قدم قدم پر مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کچھ اور نہیں تو وقت اور نکل جائے گا مگر وقت کے نکان ہوتے ہیں ... آنکھیں ... ہیں، وہ کسی ضدی بچے کی طرح ہے یا کسی خود سر حاکم کی طرح۔ اپنی مرضی سے روپ بدلتا رہتا ہے۔ چلتے چلتے دیوا فٹ پاتھ پر اُبھرے ہوئے کسی پتھر سے چوٹ کھا کے اوندھے مُنھ گر پڑا۔ مجھے پھر رکنا پڑا۔ وہ جلدی سے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ گیا۔ اُس لمحے میرے جی میں آیا کہ میں چلتا رہوں لیکن دیوا کی چھلی ہوئی ٹھوڑی سے خون چھلک رہا تھا۔ میں نے اُس کی چیخ بھی سُنی تھی۔ چھوٹی موٹی چوٹ ہوتی تو دیوا اتنا مرا گرا نہیں تھا، پی جاتا۔ میں نے جگنو کے ساتھ دیوا کے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ پچھلے دن کا کچھ حصہ گیلا تھا جس پر پہلے دیوا کا پاؤں رپٹا، پھر سنبھلنے کی کوشش میں اُس کا توازن اور بگڑ گیا۔ میں نے جولین کا رومال جیب سے نکال کے دیوا کا چہرہ صاف کیا۔ اُس کی ٹھوڑی سے خون بہنے لگا تھا۔ چند لمحوں میں اُس کے ہونٹ بھی خون سے بھر گئے۔ پتھر نے دانتوں اور مسوڑھوں کو بھی زک پہنچائی ہوگی۔ گھٹنے بھی محفوظ نہیں رہے ہوں گے۔ دیوا لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا تھا۔

اور ہر چند کہ اُس نے دوسرے ہی لمحے مستعدی کا مظاہرہ کیا لیکن

میں نے اُس کے انکار کے باوجود اُسے سامنے کی بند دکان کے چبوترے پر بٹھایا اور اُس کی ٹھوڑی کا جائزہ لیا۔ خون نہیں رُک رہا تھا۔ خون سے رومال بھی تر ہو گیا۔ جگنو بدحواسی سے کبھی اُسے تسلی دیتا، کبھی مجھے۔ میں نے اُس سے کسی قریبی حکیم ڈاکٹر وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑا کے رہ گیا۔ گیلے فرش کی کیچڑ خون میں مل گئی تھی۔ کہیں سے پانی مل جاتا تو اچھا تھا۔ میرے اشارے پر جگنو بھاگتا ہوا ایک طرف گیا، پھر لوٹ آیا اور قریب کی ایک عمارت میں گھس گیا۔ اچھا گنجان علاقہ تھا۔ اتنی دیر میں کئی راہ گیر ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ اُنھیں مدد کرنے کے بجائے پہلے تفصیل جاننے کی بے چینی تھی۔ وہ بہت مشکل سے میری التجا پر چُپ ہوئے۔ جگنو فوراً کہیں سے پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے آیا۔ لوٹے کا مالک بھی چادر اوڑھے اُس کے پیچھے لپکتا ہوا آیا تھا۔ ٹھوڑی صاف کرنے پر زخم کی صورت نظر آئی۔ اتنا گہرا نہیں تھا لیکن بیچ میں گچّی سی بن گئی تھی۔ خون روکنے کے لیے الگ سے کوئی کپڑا نہ میرے پاس تھا، نہ جگنو کے پاس۔ اپنا یا جگنو کا کُرتا پھاڑے بغیر چارہ نہیں تھا۔ لوٹے والا آدمی سب سے زیادہ مشورے دے رہا تھا، اُسی نے اپنی چادر اتاری۔ چادر کے اندر وہ دبلا پتلا شخص بنیان پہنے ہوئے تھا۔ شرافت کا شکل و قامت، جثہ و حیثیت سے تعلق نہیں ہے۔ اِس سے پہلے کہ اور راہ گیر اکٹھے ہوتے اور اپنی اپنی بولیاں بولتے، لوٹے والے کی ہدایت پر ہم وہاں سے چل پڑے۔ کوئی ایک فرلانگ کی دُوری پر وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا، پھر ایک دوسری تنگ گلی میں۔ وہ کسی ڈاکٹر رستوگی کا ٹوٹا پھوٹا سا مطب تھا۔ لوٹے والے نے بے دریغ دروازہ کھٹ کھٹانا اور آوازیں لگانا شروع کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح اُس نے نیند خراب ہونے پر ناراض ڈاکٹر کو منا بھی لیا۔ دیوا کو ڈاکٹر کے حوالے کر کے میں پیچھے ہٹ گیا، اچانک مجھے اپنی خالی جیب کا خیال آ گیا تھا۔ اگر دیوا اور جگنو کی جیبوں میں بھی مرہم پٹی کے پیسے نہ ہوئے تو؟ میں اس پشیمانی کا اندازہ ہی کر سکتا تھا۔ روپے پیسے کے بغیر آدمی اپاہج سے کم نہیں ہوتا۔ گھر سے چلتے وقت یہ لاٹھی ضرور ساتھ رکھنی چاہیے۔ جب تک جگنو نے اپنی جیب سے ڈاکٹر کی فیس ادا نہ کر دی، میں اپنی انگلیاں توڑتا، ہونٹ کاٹتا رہا۔

ڈاکٹر پندرہ بیس منٹ تک اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ دیوا کے چہرے پر جا بہ جا لال دوائی کے دھبے پڑ گئے تھے۔ اُس کے نیچے کے دو دانت بھی ہل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اُنھیں نکالا نہیں۔ دوا لگا کے خون روک دیا۔ ہم مطب سے باہر آئے تو سڑکیں اور سنسان ہو چکی تھیں۔ کئی منزلہ عمارتوں کے دروازوں اور کھڑکیوں کی روشنیاں بھی بیشتر بجھ چکی تھیں۔ فٹ پاتھ پر ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے چوسر اور تاش کے شوقین بھی اِکّا دُکّا ہی کہیں نظر آ رہے تھے۔ دکانوں کے چھجوں کے نیچے سوئے ہوئے لوگوں کی تعداد بھی اس نسبت سے بڑھ گئی تھی۔ میری رفتار اب اتنی تیز نہیں تھی۔ اب جو کچھ بھی ہو، گھنٹے بھر پہلے پہنچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایک گھوڑا گاڑی قریب آنے پر جگنو نے میری طرف دیکھا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی خاموش رہا۔ میرا خیال تھا، اب کسی جگہ اُنھیں ارادہ بدل دینا چاہیے۔ ممکن ہے، یہ میری طرف سے اشارے کے منتظر ہوں۔ دیوا اب لنگڑا کے نہیں چل رہا تھا لیکن لازماً اُسے تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میں نے جلدی نہیں کی تاکہ اُنھیں اس غیر ضروری زحمت کا مزید احساس ہو سکے۔ کچھ دور جا کے پھر میں نے زبان کھولی اور دیوا سے کہا کہ اُسے سرِ دست آرام کی ضرورت ہے۔ اردگرد دکانوں کے تھڑوں پر چھاں اور سبت سے لوگ سوئے ہوئے ہیں، اُسے بھی کہیں جگہ مل سکتی ہے۔ میری توقع کے خلاف خود کو چاق و چوبند ظاہر کرنے کے لیے دیوا اپنے بازو پھیلانے اور جسم کو جھٹکے دینے لگا۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اس عالم میں اُن کا اصرار وضع و مروّت سے سوا تھا، عزت سے بیش، رُتبہ کسی لوب و محترم سے اظہارِ التفات کا یہ قرینہ نہیں ہوتا۔ یہ جس شخص کو کسی منزلت کا سزاوار سمجھ رہے ہیں، اُس کی پیشانی پر بھی اُن کی فکر ہونی چاہیے۔

میری رفتار سست پڑ گئی۔ اور مجھے از سرِ نو اپنے حواس مجتمع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے میں اخذ نہیں کر پا رہا ہوں یا ٹھیک طرح سُن نہیں سکا ہوں۔ یہ کسی موقع کے منتظر ہیں جو اُنھیں مل نہیں پایا ہے یا میں نے نہیں دیا ہے۔ اِس دیوانہ واری کا سبب محض فشارِ اعصاب ہی نہ ہوگا۔ اپنی گفتگو اور طور طریق سے یہ ایسے سادہ اور بے ارادہ بھی نہیں لگتے۔ جو کچھ یہ کہہ نہیں پا رہے ہیں یا میں سُن نہیں پا رہا ہوں، وہ مجھے اِن سے پوچھنا چاہیے۔ سو میں نے دیوا کو براہِ راست مخاطب کیا۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ دیوا کے ہونٹ پھیل گئے اور اُس نے بکھری ہوئی آواز میں جواب دیا کہ اب اُن کا کوئی گھر نہیں ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ میں نے کہا کہ پھر مجھے گھر تک پہنچانے کے لیے اتنی زحمت کیوں کر رہے ہو؟

دیوا نے دزدیدہ نظروں سے پہلے مجھے دیکھا، پھر جگنو کو اور برجستہ جواب دیا کہ وہ تو میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ یہی شبہ میرے رگ و پے میں کھٹک رہا تھا۔ میرا سر پھر گھومنے لگا۔ تاہم میں نے ضبط کیا اور اُن سے پوچھا۔ "میرے ساتھ کہاں؟"

"جدھر ابھی تم کو جانے کا ہے دادا!" جگنو سراسیمہ لہجے میں بولا۔

"مَیں، مَیں تو پیرو دادا کے گھر مہمان ہوں۔"

"اپن کو بھی اُدھر ہی لے چلو دادا!"

"تمھیں!" اپنی آواز مجھ سے سنبھل نہیں رہی تھی۔ "مَیں تمھیں وہاں کیسے لے چل سکتا ہوں۔ تمھارا دماغ ٹھکانے پر نہیں لگتا۔ مَیں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میری حیثیت خود وہاں مہمان کی ہے۔"

"اپن تمھارا نوکر ہے دادا! ابھی اُدھر ہی کہیں کو پڑا رہے گا۔" جگنو گڑگڑایا کہ اُن دونوں کو دروازے پر جگہ مل جائے تو بھی اُن کے لیے بہت ہے۔ وہ وہاں سب کی خدمت کریں گے۔ میری، مَنجھل کی، پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی کی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے، ایسا کہاں ہوتا ہے۔" میری زبان سٹ پٹانے لگی۔ مَیں نے اُنھیں یاد دلایا کہ پیرو دادا کا گھر موت کا گھر ہے۔ وہاں پہلے سے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ مَیں نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُنھوں نے میرے پیر پکڑ لیے اور وہی رٹ لگاتے رہے۔

دوسروں پر قابو پانے میں کبھی اتنی مشکل پیش نہیں آتی، جتنی خود پہ پانے میں پیش آتی ہے۔ میرے بازو اکڑنے لگے، جی میں آیا، دونوں کو گُدّی سے پکڑ کے ان کے سر ٹکرا دوں۔ تھکے ہوئے دو ایک ہاتھوں میں یہ کچھ دیر کے بچے بے سُدھ ہو سکتے تھے۔ گھر اب اتنا دُور نہیں رہ گیا تھا۔ مَیں آسانی سے باقی راستہ طے کر سکتا تھا اور مَیں اتنی دیر میں مجھ عقل کے اندھے کو سجھائی دیا کہ میں گھوڑا گاڑی تو بہت پہلے کر سکتا تھا۔ گھر اُتر کے بس اندر جا کے پیسے لانے پڑتے۔ دونوں میری ٹانگوں سے چمٹے اپنے سر میرے پیروں پر رگڑ رہے تھے۔ مَیں نے بے اختیار اُن کے بال پکڑ کے اُنھیں جھٹکے سے اُٹھایا۔ اُنھوں نے نہ کوئی مزاحمت کی نہ غُل مچایا۔ میں جانے کیا کرتا لیکن دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ چند لمحوں تک مَیں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا کیا کروں۔ مَیں نے اُن جیسے آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ مَیں نے اُنھیں چھوڑ دیا۔ جہاں ہم تھے، یہ جگہ نہ اتنی اندھیری تھی نہ روشن۔ مَیں ایک دکان کے چبوترے پر آ کے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی آہستہ آہستہ میرے پاس آ گئے اور زمین پر سر جھکائے میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

مجھے اپنے آپ کو سمیٹنے میں وقت لگ گیا۔ "کیا بات ہے؟" مَیں نے بگڑی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ مَیں نے دوبارہ پوچھا۔

"اپن کو ابھی اپنے سے الگ مت کرو دادا!"

"کیا، کیا چاہتے ہو تم؟" مَیں نے شکستگی سے ۔ ۔ ۔

"اپن پہلے اِکھّا بول دیا ہے۔"

"کیا بولا ہے تم نے؟ اور مَیں نے، مَیں نے تم سے کچھ نہیں کہا، کچھ نہیں کہا۔ کاہے کی جلدی ہے تمھیں۔ آخر ایسی کیا بات ہے، صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

"اپن تمھارا بہت انتظار کیا ہے۔"

"مَیں نے سُن لیا ہے۔" مَیں نے جھنکارتی آواز میں کہا۔

"ابھی اپن کو مت چھوڑو دادا، مر جائیں گا اپن۔"

"ہا۔" مَیں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔ "اِس وقت میں تمھیں نہ مل پاتا تو تم زندہ رہتے۔"

"کدھر کو دادا! اپن زندہ ابھی کدھر کو ہے۔" جگنو کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہنے لگا کہ دادا کی موت کی وجہ سے وہ رُکے ہوئے تھے کہ ابھی میرے پاس اُن کا آنا مناسب نہیں ہے، نہ وہ کچھ کہہ پائیں گے نہ مَیں سُن پاؤں گا۔ وہ قسم کھانے لگا اور وہی سب دُہرانے لگا کہ ایک ایک لمحہ اُنھوں نے گن گن کے کاٹا ہے۔ اُن کی قسمت تھی کہ آج میں اُنھیں مل گیا اور تنہا مل گیا۔ جیسا کہ اُن کی آرزو تھی۔ ورنہ مجھ سے ملنے کے بعد بھی جانے کب اُنھیں اس طرح اپنا احوال بیان کرنے کا موقع مل پاتا۔

"مگر کیوں، صرف دادا بننے کے لیے؟"

"ہاں دادا!" جگنو نے سانس کھینچ کے کہا۔

"کیوں، دادا بننے کی ایسی وحشت کیوں ہے تمھیں؟"

"ایک بار کو۔" دلیا ملتجی لہجے میں بولا۔ اُس کی عاجزی میں تپیدگی نمایاں تھی۔ کہنے لگا کہ وہ صرف ایک مرتبہ کے لیے مکمل دادا بننا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے اُن کے ہاتھ پیر توڑ دیے جائیں۔

"مگر کیوں؟"

"اپن پر ابھی بہت اُدھار ہے دادا!"

"کیسا اُدھار؟" مَیں نے اضطراب سے پوچھا۔

"بنارسی کا۔" جگنو سرد مہری سے بولا۔

"بنارسی کون؟ بنارسی دادا؟"

"دادا نئیں، ابھی کُتّا بولو۔"

"بنارسی سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"بہت ہے دادا!" جگنو کی آواز تڑخ رہی تھی۔ "بس ایک بار کو اپن کا ہاتھ پکڑ لیو، اپن کو پتہ ہے، اگلا آگے پیچھے کا ابھی۔۔۔"

"کیا بات ہے، کھل کے بتاؤ۔" اُس کی بات کاٹ کے مَیں نے بے چینی سے کہا۔

"کیا بولے دادا! ابھی کیا بولے۔" جگنو نے اپنا منہ چھپا لیا۔

وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔ پہلے دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔ میرے اصرار اور تسلی تشفی پر جگنو نے زبان کھولی اور جو کچھ اُس نے بتایا، وہ ایسا دل دوز تھا کہ آدمی سنّارہ جائے۔ جگنو کے کہنے کے مطابق وہ بچپن میں سوتے جاگتے ایک خواب دیکھا کرتے تھے، ایک بڑے مکان کا آنگن اور آوازیں اور چہرے۔ وقت کے ساتھ وہ سب دھندلاتا گیا اور اُنھیں صرف اتنا یاد رہا کہ ایک عورت اُن کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اُس کا نام نولکھی تھا۔ نیلی بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال اور رنگ سونے جیسا۔ اُس کی آواز بہت میٹھی تھی اور لہجہ بہت نرم تھا۔ وہ اوسط قد اور متناسب بدن کی ایک عورت تھی۔ اُس نے ایک ماں کی طرح جگنو اور دلیا کی پرورش کی اور بہت دنوں تک وہ اُسے اپنی ماں ہی سمجھتے رہے۔ نولکھی کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی رہتی تھی، برس ہوئے اُس کے مرنے کے بعد نولکھی اکیلی رہ گئی۔ جگنو بتا رہا تھا کہ شروع میں اُس کے گھر کئی مردوں کی آمد و رفت تھی۔ بعد میں ایک شخص رہ گیا تھا۔ اُس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔ جگنو، دلیا سے عمر میں کچھ اور کم تھا۔ نولکھی کے پاس آنے والا شخص جب بھی گھر آتا، گھر کے واحد کمرے میں چلا جاتا۔ جب تک وہ اندر رہتا، نولکھی بھی اُس کے پاس رہتی۔ نولکھی کی کوشش ہوتی کہ دلیا اور جگنو اُس آدمی کی نظروں سے دور رہیں۔ جس دن اُس کے آنے کا وقت ہوتا، نولکھی پہلے ہی جگنو اور دلیا کو کہیں چھپا دیتی یا باہر بھیج دیتی۔ وہ درشت چہرے، کرخت آواز اور بلّی جیسی آنکھوں والا شخص بنارسی تھا۔ پاڑے کا دادا، دُور دُور اُس کی پھرتی، ایک اور چاقو بازی کا شہرہ تھا۔ بعد میں نولکھی کو جگنو اور دلیا سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بنارسی کی آمد پر وہ خود کسی کونے میں دُبک جاتے یا باہر گلی میں چلے جاتے۔ کبھی اتفاقاً آمنا سامنا ہو جاتا تو اُنھیں ہمیشہ بنارسی کی گالیاں سننی پڑتیں۔ وہ اُنھیں پلّے کہتا تھا، بڑا پلّا، چھوٹا پلّا۔ پلّوں کو دیکھ کے کسی کا منہ اتنا نہ بگڑتا ہوگا جتنی بنارسی کی شکل بگڑ جاتی تھی۔ اُس کی آہٹ پر دونوں کا دل ڈوبنے لگتا۔ نولکھی کا بھی کچھ یہی حال تھا، پہلے وہ بنارسی سے ذرا کھل کے، اونچی آواز میں بات کر لیتی تھی، ہوتے ہوتے اُس کی زبان بھی لکنت کرنے لگی۔

وہ بستی کسی جیل خانے کے مانند تھی جہاں آدمی کو زندگی کی سزا ملتی تھی۔ وہ خود ہی صید، خود ہی صیّاد تھے جیل سے یہ سزا بس اتنی مختلف تھی کہ آدمی لوٹ کے پھر وہیں آ جاتا تھا۔ بہت بھاگنے کی کوشش کرتا مگر لوٹ کے وہیں آنا پڑتا۔ مرد صبح گھروں سے نکل جاتے، شام ڈھلے واپس آتے، بہت سی عورتیں مزدوری کرتیں اور اپنے بچوں کو کرائے کی عورتوں کی تحویل میں دے جاتیں۔ چند پیسوں کے عوض یہ بوڑھی عورتیں دن بھر اُن کے بچوں کی رکھوالی کیا کرتیں۔ یہ بچوں کی حفاظت کا طریقِ کار تھا، تربیت کا نہیں۔ غریب بچوں کو کسی تربیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اتنی سزاؤں کے بعد آدمی بچوں کی خواہش کیوں کرتا ہے، پیدا ہو جاتے ہیں تو اُنھیں ختم کیوں نہیں کر دیتا۔ زنداں میں قیدیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خود آزاری ہے یا کوئی انتقام، جانے کیا ہے، آدمی اپنی زندگی سے کچھ نہیں سیکھتا۔ بہرحال جگنو اور دلیا کو رکھوالی کرنے والی کرائے کی عورتوں کے پاس نہیں جانا پڑا کیوں کہ نولکھی سارا دن گھر ہی رہتی تھی۔ جگنو اور دلیا کے ساتھی گلی کے بچے تھے جو صبح و شام گلیوں میں شور مچاتے، چھینا جھپٹی کرتے رہتے۔ جس کے پاس زیادہ طاقت ہوتی، وہ زیادہ مستحق سمجھا جاتا۔ آئے دن گلی کے بچوں میں سر پھٹول ہوتی، اُن کا اُدھورا کام اکثر رات کو اُن کے والدین نمٹاتے۔ نولکھی، جگنو اور دلیا کو گلی کے بچوں میں شامل ہونے سے منع کرتی تھی مگر یہ تو بڑے مکانوں میں ممکن تھا، بستی کے گھروں اور گلی میں امتیاز ہی کتنا تھا۔ جگنو اور دلیا ایک دوسرے کے لیے ہم جان و ہم دل تھے۔ دونوں کی یہ یک جائی اُنھیں گلی کے بچوں میں برتر کر دیتی تھی۔ نولکھی نے شروع شروع میں اُنھیں پڑھانے کے لیے ایک استاد کا بھی انتظام کیا تھا۔ وہ جلد ہی حرف و عدد کا کرتب سیکھ گئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اُنھیں الفاظ و اعداد کی اچھی شکلیں بنانا بھی آ گیا تھا کہ ایک دن یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک روز توقع کے خلاف بنارسی اُس وقت آ دھمکا جب استاد موجود تھا، دلیا اور جگنو کتابوں سے سر کھپا رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں، بنارسی کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔ اُس نے استاد کو دھکّے دے کے باہر نکال دیا اور ساری کتابیں کاپیاں پھاڑ دیں۔

اُن دنوں گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا تھا، ایک لڑکی کا۔ نولکھی پھولی نہیں سماتی تھی، وہ لازماً بنارسی کی بیٹی تھی۔ اُنھیں یاد نہیں کہ بنارسی نے کبھی اپنی بچّی پھول وتی کو نظر بھر کے دیکھا ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ پھول وتی سے اُس کا رویّہ ایسا خار دار نہیں تھا۔ پھول وتی پھولوں کی طرح تھی، بالکل اپنی ماں پر گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی ماں کی آنکھوں کی طرح نیلی تھیں۔ جیسے جیسے جگنو اور دلیا پر وقت گزرتا گیا، وہ بہت کچھ سمجھتے گئے کہ نولکھی اُن کی ماں نہیں ہے اور بنارسی اُن کا باپ نہیں ہے اور نولکھی بنارسی کی زوجیت میں بھی نہیں ہے۔

البتہ نوکھی کا سارا خرچ بنارسی کے ذمّے ہے اور خرچ کی کمی بیشی بنارسی کی خوشی و ناخوشی پر ہے۔ بنارسی سے پہلے کوئی اور تھا جو نوکھی کے پاس آتا تھا، بنارسی کا بڑا بھائی، نام اُس کا کچھ اور تھا مگر سب کاشو دادا کہتے تھے۔ وہی شاید جگنو اور ردیوا کو نوکھی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ کاشو بھی باڑے کا دادا تھا اور کوئی بہت بڑا اثر رسوخ والا۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ بنارسی اپنے بڑے بھائی کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ جگنو اور ردیوا نے کئی بار نوکھی کو کریدنے کی کوشش کی۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ یہ ذکر نوکھی کے لیے دُکھ کا باعث بنتا ہے۔ وہ کوئی مُناسب جواب نہ دے پاتی۔ نوکھی ہی دُنیا میں اُن کی ایک پناہ تھی اور اُنھیں وہ کچھ دیتی تھی جو کوئی اور نہیں دیتا تھا' عزت، پیار اور چھاؤں۔ وہ بھی اُسے یہی سب کچھ دینے کے لیے بے تاب رہتے تھے، سو وہ نوکھی کی اداسی اور ویرانی کے عوض اپنے بارے میں کچھ جاننے سے اجتناب کرتے تھے۔ تاہم نوکھی کی زبانی اتنا معلوم ہوا تھا کہ بنارسی کا بھائی' کاشو اُن کا باپ تھا۔ وہ کسی لڑائی میں مارا گیا۔ اُن کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ کاشو دادا اُن دونوں کو نوکھی کے پاس چھوڑ گیا۔ اس سے زیادہ نوکھی کچھ نہیں بتا پاتی تھی یا اُسے واقعتہً کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال اُنھیں نوکھی کے بیان پر یقین نہیں تھا۔ خود کو بنارسی جیسے کمینے شخص کا رشتے دار تسلیم کرنا اُن کے لیے نہایت روح فرسا بات تھی۔ اُنھیں شبہ تھا کہ نوکھی نے اُن سے بہت کچھ چھپایا ہے اور اُنھیں خوف تھا، اُن کے زیادہ تنگ کرنے پر نوکھی کوئی ایسی بات نہ کہہ ڈالے جسے سننا اُن کے بس میں نہ ہو۔

پھر بنارسی کی آمد میں تواتر نہیں رہا۔ کبھی ہفتے میں دو بار آجاتا، کبھی ایک بار۔ وقت بھی طے نہ رہا۔ جب بھی آتا، شراب میں جھومتا، دندناتا ہوا آتا یا وہیں شراب منگوا کے پیتا۔ جگنو اور ردیوا سامنے ہوتے تو اُنھیں حکم پہ حکم دیتا۔ شراب پی کے وہ اور بدمست ہو جاتا۔ جگنو اور ردیوا کے لیے وہ طرح طرح کے حقارت آمیز القاب تراشتا، حرامی، حرام خور کے لقب تو مسلسل اُس کی زبان کا ورد ہوتے۔ کبھی وہ اُنھیں طیش میں آ کے ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل جانے کا حکم صادر کرتا۔ جگنو اور ردیوا نے منافقت بھی کرنی چاہی لیکن اُن کی خوشامد کا اثر صرف کچھ دیر رہتا، بنارسی پھر اپنی خصلت پر اُتر آتا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ آخر ایک دن اُنھوں نے عاجز آ کے گھر چھوڑ دیا۔ نوکھی اُن کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی۔ بمبئی بڑا شہر تھا۔ وہ چند روز تک اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے ہوئے اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب رہے مگر پھر بنارسی کے باڑے کے آدمیوں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ وہ اُنھیں پکڑ کے مارتے پیٹتے گھر لے آئے۔ نوکھی کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں کو پیٹنے سے چھڑاتے روتی رہی۔ اُس نے منتیں کر کے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ آیندہ کبھی اُسے اکیلی چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔ اُنھوں نے اب کے ایسا کیا تو وہ زندہ نہیں رہے گی، پھول وتی بھی مر جائے گی۔ جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بنارسی گھر آیا تو اُنھیں دیکھ کے پاگل ہو گیا۔ اُس نے نوکھی اور پھول وتی کی بھی پروا نہ کی، دونوں کو ننگا کر کے اتنا مارا کہ جگنو بے ہوش ہو گیا۔ ردیوا جسم کا توانا تھا، وہ بلکتا' دھاڑیں مارتا سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ پھول وتی سُن ہو گئی تھی۔ نوکھی نے مداخلت کی تو بنارسی نے اُس پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ جگنو اور ردیوا کو یہ کہنے کی مجال نہیں تھی کہ گھر سے نکل جانے کا حکم بنارسی ہی نے اُنھیں دیا تھا۔ پھر اُنھوں نے طے کیا کہ اب وہ اس شہر ہی میں نہیں رہیں گے۔ وہ پھر گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہفتے عشرے تک وہ شدید مشقتیں کر کے اپنا پیٹ بھرتے رہے۔ رات ہوتی تو ریلوے اسٹیشن کے ڈھکے کھلے مسافر خانے میں جا پڑتے۔ وہاں بھی لوگ اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک دفعہ تو اسٹیشن سے پانچ چھ شہدے اُن کی مدد کرنے، اُنھیں پناہ دینے کے بہانے کسی ویرانے میں لے گئے۔ یہ بات بتاتے ہوئے جگنو کی حالت ہذیانی ہو گئی۔ وہ اپنا منہ نوچنے لگا۔ اُن کے لڑکپن اور شکستہ حلیے کی وجہ سے سب اُن پر شک کرتے اور گھر سے مفرور کہیں سے کچھ چُرا کے بھاگے ہوئے لڑکے سمجھتے۔ یہ جہنّم گھر سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جتنے دن وہ سورت میں رہے، نوکھی اور پھول وتی اُن کا تعاقب کرتی رہیں' وہ اُن کی آنکھوں میں بیٹھی آہ و بکا کرتی رہیں۔ ہر لمحے وہ خود کو ملامت کرتے کہ نوکھی اور پھول وتی کو بے آسرا چھوڑ کے آ گئے، اُنھوں نے یہ کچھ ٹھیک نہیں کیا، نوکھی کو کسی کل چین نہ ہو گا۔ سو وہ ایک دن خاموشی سے گھر واپس آ گئے۔ اُنھوں نے صحیح فیصلہ کیا تھا، لگتا تھا، وہ کسی اور گھر میں آ گئے ہیں۔ نوکھی اور پھول وتی پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ اب کے وہ تیار تھے کہ واپسی پر اُنھیں پھر بنارسی کا سامنا کرنا پڑے گا مگر اُن کی قسمت اچھی تھی کہ اپنے علاقے میں ہونے والی قتل کی کسی واردات میں بنارسی پولیس کو مطلوب ہو گیا تھا۔ وہ شدت سے آرزو مند تھے کہ کاش بنارسی کو بھی سزا ہو جائے، اُسے پھانسی کی سزا ہو لیکن کچھ نہیں ہوا۔ بنارسی پورے ایک ہفتے بھی جیل میں نہیں رہا۔ جیل سے چھوٹ کے وہ سیدھا نوکھی کے پاس آیا۔ نوکھی نے اُسے رات بہت شراب پلا دی اور یوں جگنو اور ردیوا بنارسی کی نظروں سے اوجھل رہے مگر یہ تو ایک رات کی بات تھی۔ بنارسی تو موجود تھا اور وہ سب اُس کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ زنجیر کا حلقہ کبھی ڈھیلا ہو جاتا' کبھی اتنا تنگ کہ بس دم نہ نکل پاتا۔

کسی جواز کے بغیر بنارسی نے اچانک خرچا کم کر دیا تھا۔ نوکھی کا ہاتھ کُھلا ہوا تھا۔ کوئی مانگنے آتا تو جو اُس کے پاس ہوتا، دے دیتی۔ سب سے زیادہ پیسے وہ جگنو اور ردیوا پر خرچ کرتی تھی تاکہ اُنھیں کسی طور محرومی کا احساس نہ ہے' وہ اچھے کپڑے پہن سکیں اور پاس پڑوس میں بات بنی رہے۔ یہ محض نوکھی کی خوش گمانی تھی۔ اُس نے عزت داری کو اتنا ارزاں سمجھ لیا تھا۔ گھر سے باہر تو یہ اور مہنگی ہو جاتی ہے۔ عام بچوں کی طرح ردیوا اور جگنو نے کبھی اُس سے جیب خرچ میں اضافے کے لیے ضد نہیں کی۔ اُنھیں گھر کا حال معلوم تھا کہ نوکھی خود ہی کتنا بچا کے رکھتی ہے تاہم اُس کی خوشنودی کے لیے وہ چند پیسے قبول کر لیتے تھے۔ بنارسی کی طرف سے خرچا کم کر دینے پر نوکھی کی پریشانی میں اضافہ ہوا تو جگنو اور ردیوا کو کچھ سکون ملا۔ وہ سمجھے کہ اب شاید بنارسی نے اُن کے گھر میں دل چسپی لینا کم کر دیا ہے' خرچ کی کمی سے گھر پر بنارسی کے استحقاق کا جواز بھی کم ہو جاتا ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ کیا ہی اچھا ہو' بنارسی خرچ بالکل ہی بند کر دے۔ وہ بوجھا ڈھو لیں گے، ایک وقت کا کھا لیں گے، کچھ بھی کر لیں گے۔ بنارسی سے اُنھیں نجات مل جائے گی مگر یہ تو بنارسی کے ستم کا ایک طور تھا۔

وہ اُسی طرح سینہ پُھلائے آتا رہا۔ نوکھی کے لیے گھر چلانا مشکل ہو گیا تھا، کھانے پینے تک کی تنگی۔ ہاں اب بنارسی گھر آنے کے بعد خاص اہتمام کرتا۔ وہ جگنو اور ردیوا کو پیسے دے کے کھانے پینے کی چیزیں افراط سے منگانے کی شاہ خرچی کرنے لگا۔ صبح اس کا پس خوردہ اُن کے کھانے کے لیے بہت ہوتا۔ خرچ میں کمی کی بات جگنو اور ردیوا کی سمجھ میں کچھ عرصے بعد آئی۔ بنارسی نوکھی سے کچھ اور چاہتا تھا۔ ایک رات اُس نے پہلی بار نوکھی کو اپنے ساتھ باہر چلنے کا حکم دیا۔ نوکھی نے بہت پس و پیش کیا، بچّوں کے تنہا رہ جانے کی تاویل پیش کی مگر اُسے جانا پڑا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر بعد واپس آ جائے گی مگر وہ رات بھر اُس کا انتظار کرتے رہے اور چھوٹی پھول وتی کو بہلاتے رہے۔ صبح سویرے نوکھی واپس آئی تو اُس کی حالت بہت شکستہ تھی۔ کسی نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا' پھول وتی نے بھی نہیں۔ پھر تو مہینے دو مہینے بعد بنارسی نے یہ معمول بنا لیا۔ باہر باڑے کا کوئی آدمی منتظر کھڑا رہتا۔ بنارسی آ کے نوکھی کو تیار ہو جانے کا حکم دیتا۔ وہ کتنی ہی منتیں کرتی، بچّوں کا واسطہ دیتی، بنارسی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ نوکھی نے صاف انکار کر دیا۔ بنارسی نے اُس کی چٹیا پکڑ کے اتنے طمانچے مارے کہ وہ دُہری ہو گئی۔ نوکھی کے باہر جانے پر عموماً بنارسی رات گھر میں گزارتا اور دارو پیتا رہتا۔ وہ تینوں دھڑکتے کانپتے ہاتھوں سے بنارسی کے گینڈے جسم کو تیل پلاتے رہتے۔ جب تک بنارسی کے خرّاٹے شروع نہ ہو جاتے، وہ وہاں سے نہ ہٹتے۔ پھر نوکھی نے عذر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ خاموشی سے باہر کھڑے باڑے کے آدمی کے ساتھ چلی جاتی۔ صبح واپسی پر بنارسی اُسے طلب کرتا تو وہ اُس کے پاس چلی جاتی۔ پھر بنارسی نے از خود پیسوں میں دوبارہ اضافہ کر دیا۔ جس رات نوکھی باہر جاتی، واپسی پر اُس کے پاس بھی کچھ نہ کچھ رقم ہوتی۔ پیسوں سے گھر کی حالت کچھ سُدھر گئی مگر نوکھی کے چہرے میں خراشیں پڑنے لگی تھیں۔ وہ زیادہ تر خاموش رہنے لگی۔ تینوں اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتے، وہ اُنھیں آغوش میں بھینچ کے بس رونے لگتی اور روتی رہتی۔

وہ بارہا سوچا کرتے کہ آخر اُنھوں نے بنارسی کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو جب بھی موقع ملتا ہے، اُسے خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کیا جیسا کہ بنارسی کہتا ہے، واقعی وہ آدمی کے تخم سے نہیں ہیں۔ اُن میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کون سی کجی ہے، کیا کمی ہے۔ کیا اُنھیں ٹھیک طرح دیکھنا، سننا اور بولنا نہیں آتا؟ کیا اُن کا چہرہ وہ نہیں جو آئینہ اُنھیں دکھاتا ہے؟ وہ گھُوڑے پر پیدا ہوئے تھے؟ پھر یہ سلسلہ کہاں جا کے ختم ہو گا، کیا وہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے؟ کیا بنارسی کے پاس کوئی جادوئی طاقت ہے؟ کیا اُسے علم ہو جاتا ہے کہ وہ اُس سے کس قدر نفرت کرتے ہیں؟ وہ خود سے بہت سے سوال کرتے تھے۔ تمام سوالوں کا ایک ہی جواب آتا تھا، بنارسی! وہ روز و شب بنارسی کے تسلّط سے نوکھی کو نکالنے کے خواب دیکھا کرتے۔ کئی بار اُنھوں نے اُسے مشورہ دیا کہ زمین بہت بڑی ہے کیوں نہ وہ سب کسی دوسرے شہر میں جا کے بس جائیں، کسی دوسری جگہ جا کے وہ جیسے تیسے محنت مزدوری کر کے گزر بسر کر لیں گے۔ نوکھی ہامی بھر لیتی مگر پھر جانے اُسے کیا ہو جاتا، وہ عذر کرنے لگتی کہ اور بڑے ہو جاؤ، اچھے دن آتے دیر نہیں لگتی، جہاں اتنا وقت گزارا ہے، کچھ اور ٹھیر جاؤ۔ وہ یہی سنتے رہتے اور اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ نوکھی بنارسی کے آگے اس قدر بے بس کیوں ہو جاتی ہے۔ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو وہ نہیں جانتے۔ نوکھی کی کوئی کمزوری بنارسی کے پاس ہے۔ سب سے بڑی کمزوری تو عورت ہونا ہے مگر عورتیں تو اور بھی ہیں۔ وہ کچھ کر نہ پاتے تو اُنھیں نوکھی پر غصہ آتا، نفرت کی حد تک۔ دونوں اُس سے بات چیت بند کر دیتے۔ نوکھی اُنھیں مناتی رہتی پھر اُنھیں خود خیال آ جاتا کہ نوکھی

تو اُن سے زیادہ مجبور رہے۔ کئی بار جگنو اور دیوا کے دل میں آئی کہ وہ کسی روز بنارسی کا کام تمام کر دیں۔ جس وقت وہ نشے میں چور ہو، وہ اُس کے سینے میں رسوئی کی بڑی چھری گھونپ دیں یا کہیں سے زہر لا کے اُس کی شراب میں ملا دیں۔ جس رات گھر میں نولکھی نہ ہو، اُس رات یہ کام اور آسان ہو گا۔ کوئی الزام آیا تو نولکھی محفوظ رہے گی، صرف اُنھیں سزا ہو گی۔ جیل کی زندگی اس زندگی سے بہتر ہو گی۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ کم عمر قاتلوں سے رعایت برتی جاتی ہے۔ اُنھیں زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال کی سزا ہو گی، ٹھیک ہے، سات سال گزر جائیں گے مگر اس عرصے میں نولکھی اور پھول وتی کا کیا ہو گا؟ اُن کے بغیر تو وہ ویران ہو جائیں گی۔ نولکھی اور پھول وتی کے خیال سے جگنو اور دیوا کے ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے۔

گلیوں کے لڑکوں سے اُنھوں نے بہت سے ہنر سیکھ لیے تھے۔ تاش، چوسر اور دوسری بازیاں، اٹھائی گیروں اور اچکوں کے کرتب، تمباکو نوشی۔ بعد میں اُنھوں نے جیب کاٹنے کی بھی مشق کی اور ابھی ہاتھ صاف نہیں ہوا تھا کہ دیوا پکڑا گیا۔ پہلی بار وہ جگنو سے جُدا ہوا۔ دونوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر کتنے نامکمل ہیں۔ دونوں تڑپتے رہے، نولکھی الگ دیوانی بنی رہی۔ دیوا کئی ہفتے جیل میں رہا پھر نولکھی کے اصرار پر بنارسی نے ہیر پھیر کر کے اُسے چھڑا لیا۔ بنارسی اُسے چھڑا کے لایا تھا۔ گھر آ کے اُس نے دیوا کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اپنے ہم راہ آنے والے باڑے کے آدمی کو اشارہ کیا۔ بنارسی کے حکم پر وہ دیوا کے ناخن کھینچتا، کانوں کی لویں رگڑتا رہا جتنا دیوا چیختا بلکتا، بنارسی کی آنکھوں کی چمک اتنی ہی گہری ہو جاتی۔ دیوا کا حال بہت بگڑنے لگا تو کونے میں دُبکے ہوئے جگنو نے ہمت کر کے بنارسی کے پیر پکڑ لیے کہ خدا کے واسطے اب وہ بس کرے۔ بنارسی کی توجہ ہٹانے کے لیے اُس نے خود پر ذمے داری لینی چاہی، کہا کہ دیوا کا کوئی قصور نہیں، میں نے اِسے اُکسایا تھا۔ بنارسی نے اُسے بھی دیوا کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

جگنو نے مجھے اپنا اور دیوا کا ہاتھ دکھایا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ دونوں کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلیوں کے پورے کٹے ہوئے تھے۔ بنارسی نے اُنھیں تنبیہ کی تھی کہ جتنی بار وہ جیب تراشی کے جُرم میں پکڑے جائیں گے، یہی ہوتا رہے گا۔ جگنو کے بہ قول بعد میں اُنھوں نے بنارسی کو کوئی ایسا موقع نہیں دیا۔ دوسری بار بھی دیوا ہی جیل گیا مگر اب کے نولکھی نے بنارسی سے سفارش نہیں کی۔ دیوا دو ڈھائی مہینے بعد خود چھوٹ کے آ گیا۔

سڑک پر سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ دور و نزدیک بھونکتے کتوں کا شور سناٹے کا احساس اور دلاتا۔ جگنو ٹھیر گیا۔ اُس کی آواز گھٹنے لگی تھی، اُسے پانی کی ضرورت تھی اور پانی کا امکان نہیں تھا۔ اُس نے بیڑی جلانے کی اجازت چاہی۔ بیڑی کے چند کش لگا کے وہ بولا کہ اُن کے خیال میں اُن کے گھر پر بنارسی کے تسلط کا بہ ظاہر ایک ہی بڑا سبب تھا اور ایک ہی صورت میں وہ یہ غلبہ ختم کر سکتے تھے کہ کسی طرح نولکھی کو بے فکری کا یقین دلا دیں۔ اتنا کما کے لائیں کہ نولکھی کو کوئی اندیشہ یا خدشہ لاحق نہ رہے پھر وہ اُسے کہیں بھی لے جا سکتے ہیں چناں چہ اُنھوں نے ہوٹل میں بیرا گیری کی، سڑکوں پر بوجھ اُٹھایا، پھیری لگائی، سامان اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے والی گاڑیاں کھینچیں۔ دونوں ساتھ مل کے کھینچتے تو وزن زیادہ اُٹھا لیتے تھے لیکن وہ بہت کم پیسے اکٹھے کر پاتے تھے۔

پیسوں کی اُنھیں شدید طلب تھی۔ کہیں کوئی درخت مل جائے جس پر پیسے کا پھل آتا ہو، کوئی خزانہ، کوئی نسخۂ کیمیا، زندگی میں پیسے کی کرشمہ سازی کے جلوے۔ وہ صبح و شام دیکھا کرتے تھے۔ سیٹھ لوگ، صاحب لوگ، ناک بھوں چڑھاتی ہوئی ریشم کی سی شیشے کی سی عورتیں، گاڑیاں، عمارتیں۔ پیسے کا مطلب ہے کہ آدمی کے کئی ہاتھ، کئی آنکھیں، کئی جسم ہو گئے دگنا، چار گنا، ہزار گنا آدمی، ایک زندگی میں کئی زندگیوں کا لطف، ایک جنم میں کئی جنم۔ پیسے کا مطلب ہے، رنگ، روشنی، خوشبو، سب کو پیسہ مرعوب ہے۔ پیسہ آدمی کی رفتار تیز کر دیتا ہے۔ چوری، جیب تراشی اور جوئے وغیرہ میں کسی وقت بھی قسمت یاوری کر سکتی ہے۔ دن بھر کے کمائے ہوئے پیسے رات کو جگنو اور دیوا داؤ پر لگا دیتے۔ کبھی کچھ فائدہ ہوتا، کبھی سارے گنوا دیتے۔ مگر اب اُنھیں اتنا غم نہ ہوتا، بھوک سے بھی اُنھیں ایسی بے کلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ میلوں پیدل چلنے اور کئی دن تک فاقہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

وہ دن دن بھر اور رات رات بھر گھر سے غائب رہنے لگے۔ نولکھی بھی اُن سے کچھ نہ پوچھتی۔ اسٹیشن پر وہ مسافروں کی تاک میں رہتے، جہاں بھی موقع ملتا، کوئی چیز اُٹھا کے بھاگ کھڑے ہوتے اور اونے پونے بیچ دیتے۔ پھر اُنھیں اندازہ ہوا کہ کسی باقاعدہ دادا کے سہارے بغیر جیب تراشی اور چوری وغیرہ میں کام یابی ممکن نہیں۔ اُنھوں نے چھوٹے موٹے داداؤں کا رُخ کیا اور بنارسی سے دُور دُور کے باڑوں کے چکر لگانے شروع کیے۔ اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی دہشت اور اُن کے چہروں پر برستی وحشت۔ اُن کی نوعمری اور جسمی ناتوانی ہر جگہ رکاوٹ بنی رہی۔ دادا اُن سے زرخریدوں جیسا سلوک کرتے، کبھی بہت گندے اور اوچھے مذاق۔ جگنو اور دیوا اچھی طرح جان گئے تھے کہ باڑے میں کوئی جگہ حاصل کرنے کے لیے یہ سلوک پہلے مرحلے کا درجہ رکھتا ہے۔ سو وہ وہاں ہر کام کے لیے تیار رہتے۔ چائے بنانا، حقہ تیار کرنا، مالش، باڑے کی جھاڑو، داداؤں کے دیگر کام۔ وہ ٹِک جاتے مگر ابتدا ہی میں دو ایک باڑوں پر بنارسی کے آدمیوں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ وہاں اُن لوگوں نے جانے کیا کچھ کہا، سُنا تھا کہ جگنو اور دیوا کا باڑوں پر مزید ٹکے رہنا دشوار ہو گیا۔ باڑوں کے دادا بھی کم و بیش اُنھی خطابات سے اُنھیں نوازنے لگے جو بنارسی کا وظیفہ تھے۔ بہت سے دادا نولکھی کے بارے میں اُن سے کرید کرید کر پوچھتے، بنارسی اور نولکھی کے بارے میں ایسی ناروا باتیں ہوتیں جن کا جواب دینا تو کجا، سُننا بھی جگنو اور دیوا کو گوارا نہیں تھا۔

جگنو کہہ رہا تھا، وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ وہ کیوں زندہ ہیں، دُنیا میں تو اُن کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ کبھی اُنھیں اپنا وجود اتنا حقیر لگتا کہ وہ موت ڈھونڈا کرتے۔ موت بھی اُنھیں نہیں آتی تھی جو اُنھوں نے سنا تھا اور جس کی تردید کے لیے وہ ہمہ دم ہمہ جا سرگرداں رہے تھے، وہ اُنھیں سارا سچ لگتا تھا، نامرادوں کے لیے ایک جواز کا گداز کہ سب کچھ لکیروں اور ستاروں پر منحصر ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہی ٹھکرائے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ نالی کے کیڑوں اور خارش زدہ کتوں کی طرح۔ زمین ہر کسی کو راس نہیں آتی۔ یہ زمین اُن کے لیے نہیں ہے تو وہ کیوں اصرار کر رہے ہیں۔ کبھی اُنھیں ہر رنگ اور ہر آواز ایک جیسی لگتی، اُنھیں معلوم تھا کہ موت کی دُوری بس ایک ارادے کے فاصلے پر ہے لیکن یہ فاصلہ اُن سے عبور نہیں ہو پاتا تھا۔ اس کے درمیان اُن کا گھر پڑتا تھا، جہاں نولکھی اور پھول وتی رہتی تھیں۔ وہ جب گھر لوٹ کے آتے تو نولکھی کی پھیلی ہوئی باہیں کچھ دیر کے لیے اُنھیں سب کچھ بھلا دیتیں۔ پھول وتی اُن کے بازوؤں میں جھول جاتی۔ اُنھیں سب خواب سا لگتا، کوئی طلسم سا، اسی خواب اور طلسم کی تعبیر کی تلاش میں وہ پھر گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ روز اُن سے یہی تماشا سرزد ہوتا تھا۔

بعد کے دنوں میں بنارسی کی آمد میں فصل بڑھ گیا۔ پندرہ بیس روز میں ایک بار۔ اسی نسبت سے جگنو اور دیوا کو کسی قدر فراغت نصیب ہوئی۔ پھول وتی چپکے چپکے اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اُنھیں کسی کی نظر لگ جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی، باتیں ہی نہیں، سفید و سیاہ کی پرکھ بھی اُسے خوب ہو گئی تھی۔ جس رات بنارسی گھر آتا، وہ جگنو اور دیوا کو اُس سے دور رکھنے کے لیے گھر کے دروازے پر کسی کیل، کنڈے میں کوئی کپڑا اٹکا دیتی، جگنو اور دیوا دروازے ہی سے لوٹ آتے اور رات کسی فٹ پاتھ پر گزار دیتے۔ اُن کی موجودگی میں بنارسی آ جاتا تو بات دوسری تھی پھر وہ تمام آگ سینے میں دبائے اُس کی خدمت کرتے اور کسی بھی حکم کی تعمیل کے لیے ہر لمحے مستعد رہتے۔ ایک رات بنارسی انگوچھا پہنے چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔ نولکھی اُس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ اب جگنو اور دیوا کے ہاتھ مالش میں طاق ہو چکے تھے۔ بمبئی کے پیشہ ور مالشیوں سے اُنھوں نے بہت سی نازک رگیں چھونا، چھیڑنا، یوں کہیے کہ رگوں کے تار ہلانا سیکھ لیا تھا۔ کم سے کم وقت میں مساموں کو زیادہ سے زیادہ تیل پلانا بھی اس فن میں شامل ہے۔ یہ جگنو اور دیوا کی مالش کا نشہ تھا یا دارو کا کرشمہ، بنارسی اُس رات بہت خوش نظر آتا تھا۔ اُن کا جی نہیں چاہتا تھا تاہم اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کے زبان کھولی اور کسی قدر ناز بردارانہ، تمام تر نیاز مندانہ لہجے میں پہلی بار بنارسی سے فرمائش کی کہ وہ اُسے اپنے باڑے میں جگہ دے دے۔ وہ وہاں دوسرے داداؤں کی طرح اُس کی خدمت کرتے رہیں گے۔ کوئی اُن سا وفادار، خدمت شعار بنارسی کو شاید نہ ملا ہو۔ جگنو اور دیوا کو دوسرے باڑوں کا اچھا تجربہ ہو چکا تھا۔ دوسرے کسی باڑے سے وابستہ ہونے سے اُن کا جو مقصد تھا، وہ بنارسی کے باڑے پر بھی پورا ہو سکتا تھا۔ اتنے گرم و سرد موسم گزارنے کے بعد آدمی میں یہ شاطری و زمانہ سازی آ جاتی ہے۔ جوا کھیلنا اُنھیں آ گیا تھا۔ یہ ایک ایسی بازی تھی جس میں جیت سے بہت فرق پڑتا تھا، ہار سے کچھ نہیں۔ جتنا وہ ہار چکے تھے، اس سے زیادہ اُن کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ جگنو کے بہ قول اُنھیں ذرا وقت درکار تھا جو اُنھیں کبھی نہیں ملا، سانس لینے کا وقت۔ ورنہ دوسرے باڑوں میں وہی ہوتا رہے گا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔ تمام ذلتوں کے باوجود، بنارسی کے باڑے میں بڑی امان تھی۔ وہاں وہ کم از کم نولکھی کے بارے میں رسوا کُن باتیں سننے سے محفوظ ہو جاتے تھے، وہ باتیں جو اُنھیں بہت ڈسا کرتی تھیں۔

اُن کی التجا سُن کے بنارسی ہنکاریاں بھرتا رہا۔ اُنھوں نے تکرار نہیں کی تاکہ خر خراتا ہوا گتا بھڑک نہ جائے، بس کسی طرح چپکے سے راستہ مل جائے۔ لوچ صرف آواز کا نہیں، نگاہ کا بھی ہوتا ہے رفتار کا بھی اور ہاتھوں کا بھی۔ دیر تک وہ چپ چاپ اُس شکرے کے جسم پر اپنے ہاتھوں کا لوچ، اپنی انگلیوں کی مہارت آزماتے رہے۔ اُنھوں نے اُس فیل بدست کی خاموشی نشانِ خسروی پر محمول کی۔ آخر وقت بہت گزر گیا تو بنارسی نے انگڑائی لی اور ڈوبی ڈوبی، بہکی بہکی آواز میں پوچھا

کرنولکھی کہاں ہے۔ وہ اُلٹے قدموں کمرے سے چلے آئے۔ چند لمحوں بعد نولکھی کمرے میں چلی گئی۔

بہت عرصے بعد اُنھوں نے ایک نرم و نیک رات گزاری۔ آدھی رات تک وہ اور پھول وتی سرگوشیاں کرتے رہے، دُنیا جہان کی باتیں۔ پھول وتی اپنے چہکتے لہجے میں اُنھیں آس پاس کے قصّے سُناتی رہی۔ پھر اُنھیں نیند آگئی۔ بنارسی علی الصباح چلا گیا تھا۔ اُس روز اُنھوں نے بہ طورِ خاص غسل کا اہتمام کیا، صاف کپڑے پہنے۔ وہ اپنی طرف سے پوچھنا نہیں چاہتے تھے، بار بار اُن کی نظریں نولکھی کی طرف اُٹھتی تھیں کہ شاید بنارسی نے اُن کے بارے میں اُس سے کوئی بات کی ہو۔ نولکھی بہت تھکی ہوئی تھی، سُوجی سُوجی آنکھیں۔ تاہم اُس نے اُن کے لیے سبزی کا پراٹھا بنایا اور بالائی والا چائے کا پیالہ۔ ناشتہ کر کے وہ گھر سے نکل گئے۔ اُس وقت دس بج رہے تھے۔ کچھ اور وقت گزارنے کے لیے وہ اِدھر اُدھر سڑکوں پر گشت کرتے رہے۔ اُن کا رُخ بہر حال پاڑے کی طرف تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی جب اُنھوں نے دھڑکتے قدموں سے پاڑے پر قدم رکھا۔

دالان کے وسط میں کئی داداؤں کے درمیان بیٹھا، بنارسی اُدا چوسر کھیل رہا تھا۔ دونوں کو دیکھ کے اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ جگنو اور دیوا چند قدم آگے جا کے ٹھہر گئے اور نظریں جھکائے کھڑے رہے۔ بنارسی کی شعلہ بار نظروں اور دھمکتی آواز پر وہ پہلے ہی متزلزل ہو گئے۔ اُن سے کچھ کہا نہیں جا سکا۔ بنارسی کو جیسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اُس نے پھنکارتے لہجے میں اُن سے پوچھا کہ کون سی پریشانی اُنھیں یہاں لائی ہے۔ جگنو نے جیسے تیسے ہمّت کی اور رٹ پٹاتے ہوئے رات کی بات یاد دلائی۔ بنارسی کا مُنہ پھیل گیا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف منہ کر کے وہ یک دم ہنسنے لگا، جیسے جگنو اور دیوا نے کوئی لطیفہ سنایا ہو یا کوئی بہت ہی مضحکہ خیز بات کہی ہو۔ بنارسی کے ساتھیوں نے بھی اُس کی ہم نوائی کی۔ ساری عمارت اُن کے قہقہوں سے گونجنے لگی۔ وہ دونوں ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی صورت دیکھا کیے۔ بنارسی اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کے چھچھلے پن سے بولا: "لو بھئی مُننا! چھٹّی ہو گیا سالا۔ ابھی الّھا چاقو چھرا پھینکنے کا ہے راجا لوگ کے آگے..." جگنو نے صرف نظر کیا اور عاجزی سے کہا کہ وہ دونوں پاڑے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ بنارسی برہم ہو گیا اور گالیاں بکتے ہوئے بولا کہ اُنھوں نے کیا سوچ کے اُس کے پاڑے پر قدم رکھنے کی جرأت کی ہے۔ جس ہتھے پکے، اُٹھائی گیرے کا جی چاہے، مُنہ اُٹھائے چلا آئے؟ ایں! یہ اصیلوں کا پاڑا ہے،

چونڈوں لچاروں کا نہیں۔ اُنھوں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے؟ یہاں داخلے کے لیے.... وہ جو مُنہ میں آیا، بکتا رہا۔ جگنو اور دیوا کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائیں۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں کی جیبوں میں چاقو تھے اور جی یہی کرتا تھا کہ زقند بھر کے بنارسی کے سر پر جا پہنچیں اور اِس سے پہلے کہ وہ اور اُس کے حاشیہ بردار کچھ سنبھلیں، ہم بنارسی کا جسم چیر پھاڑ ڈالیں، پھر چاہے ہمارے ساتھ جو بھی ہو۔

لیکن اِس سے پہلے کہ بنارسی کے آدمی اُنھیں دھکّے دے کے پاڑے سے نکالتے، وہ وہاں سے چلے آئے۔

بنارسی کے اِس برتاؤ کے بعد جگنو اور دیوا نے کسی پاڑے سے وابستگی کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ جہاں جیسا کام مل جاتا، کر لیتے، جہاں جیسا موقع ہاتھ آتا، ہاتھ کی صفائی دِکھا دیتے۔ بنارسی کی آمد میں بتدریج کمی کے سبب گھر کے خرچ میں بہت تنگی ہونے لگی تھی۔ اب بہت کچھ اُنھی پر منحصر تھا۔ کبھی گھر میں روٹی نہ پک پاتی تو نولکھی اور پھول وتی خود مزدوری کی غرض سے باہر جانے کے لیے اصرار کرتیں۔ گھریلو کاموں اور زیرِ تعمیر عمارتوں میں عورتوں کو روزگار مل جاتا تھا۔ شاید یہ نام کا اثر تھا، پھول وتی کپڑے پر ایسے ایسے گُل بُوٹے تراش لیتی تھی کہ نگاہیں دھوکا کھا جائیں۔ جگنو اور دیوا نے دونوں کو گھر سے نہیں نکلنے دیا اور خود شب و روز ایک کرتے رہے۔ بے شمار نامرادوں کی طرح لکشمی کی مسیحائی پر اُن کا یقین تھا۔ لکشمی کا کچھ طے نہیں ہے، کس آن بھی مہربان ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ رنگ، ذات، قد کاٹھی، ناتواں، توانا کے امتیازات سے لکشمی کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اُن کی گلی سے ایک گلی آگے کاٹھ کباڑ کا کام کرنے والا، تھل تھل کرتا موٹا اور کالا سیٹھ نرائن برسوں سے لکشمی کی نگاہِ خاص کا زندہ ثبوت تھا۔ وہ لوگ ابھی موجود تھے جنھوں نے ایک زمانے میں اُسے سڑکوں پر بے حال دیکھا تھا اور ہوا کے جھونکے سے بل کھا جانے والا سیٹھ فیروز، لکشمی کو جانے اُس کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ ہزار جان سے فریفتہ تھی۔ بنارسی جیسے آدمی سیٹھ فیروز کی دہلیز پر ہڈّی کے لیے منڈلایا کرتے تھے۔ جگنو اور دیوا نے جوئے کے علاوہ ٹونے ٹوٹکے بھی بہت کیے کہ کوئی ایک لمبا ہاتھ پڑ جائے، صرف ایک بار۔ اُس کے بعد تو وہ لکشمی کو ایسا روک کے، باندھ کے رکھیں گے، ایسی اطاعت گزاری اور پرستار داری کریں گے کہ دُنیا دیکھے مگر وہی بات، لکشمی کی اپنی پسند اور ترجیح ہوتی ہے۔ یہ بھی گمان ہے کہ کوئی اُسے روک کے،

باندھ کے رکھ سکتا ہے۔ ٹھیرنا نہ ٹھیرنا سب اُس کی مرضی پر ہے۔ جگنو اور دیوا جتنا اُس کی جستجو میں رہتے تھے، اُتنا ہی وہ اُن سے بے نیاز تھی، اور اُن کا وہی حال تھا جو اُن جیسے بے شمار لوگوں کا تھا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ لکشمی کا ظرف اتنا کشادہ نہیں ہے۔ وہ معدودے چند، سو میں سے چند ایک ہی پر اپنی نوازشیں اُنڈیل کرتی ہے۔ باقیوں کی آسرے میں گزر جاتی ہے۔ غالباً یہی رمز ہے کہ کسی آسرے میں زندگی آسانی سے کٹ جاتی ہے۔

نولکھی کے بدن میں کوئی مکڑی چھپ کے بیٹھ گئی تھی اور لگتا تھا، اُس کی بیٹی پھول وتی جیسے مسلسل اپنی ماں کا خون چوس رہی ہو۔ اپنی ماں کا سارا رنگ روپ اُس نے چُرا لیا تھا۔ نولکھی کے پتّے گرنے شروع ہوئے تو دیکھتے دیکھتے صرف شاخیں رہ گئیں اور شاخیں دیمک کو مرغوب ہوتی ہیں۔ بنارسی کی آمد کبھی کبھار کی رہ گئی، مہینوں مہینوں کے وقفے سے۔ جگنو اور دیوا کی اُس سے مہینوں ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ ہر چند کہ اب وہ زیادہ وقت گھر ہی گزارتے تھے، بیمار نولکھی کی خاطر اور اپنی پھول وتی کی خاطر، وہ ان کی جزوِ جاں تھی، اندھیروں میں کسی چراغ کے مانند، صحرا میں پھول کی طرح۔ وہ اُسے چھپا کے رکھتے تھے کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے، کہیں کوئی دیکھ نہ لے کہ اُن کے گھر میں ایک شہزادی چھپی ہے۔ رات کو وہ ٹوٹے ٹوٹے بکھرے بکھرے گھر آتے تو اُس کا چہرہ دیکھ کے اُن کی ساری کلفتیں کافور ہو جاتیں۔ نولکھی کے علاج کے لیے وہ اپنی بساط سے زیادہ کوششیں کرتے رہے۔ کچھ دن کے لیے وہ بھلی چنگی ہو جاتی، پھر پہلے سے بھی بدتر....

برس بیت گیا، بنارسی نہ پلٹا، پھر کوئی چھ مہینے اور گزر گئے، بنارسی نے لوٹ کے خبر نہیں لی مگر ایک رات وہ راستہ بھول گیا۔ جگنو اور دیوا گھر میں تھے۔ سب اُسے دیکھ کے دم بہ خود رہ گئے۔ نولکھی کے حال سے بنارسی کا رنگ کچھ متغیّر ہوا اور اُس نے جگنو اور دیوا ہی پر الزام دھرا کہ اُنھوں نے نولکھی کی علالت کے بارے میں اُسے مطلع کیوں نہیں کیا۔ جگنو اور دیوا کیا جواب دیتے؟ بنارسی نے علاج کے لیے اچھی خاصی رقم نولکھی کے حوالے کی۔ یہ مہربانی جگنو اور دیوا کے لیے حیرت انگیز تھی۔ وہ بنارسی سے ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے لیکن رقم واپس کرنے میں بنارسی سے ربط ضبط کا پہلو نکلتا تھا اور اُس کے کاٹ کھانے کا خدشہ الگ تھا۔ وہ چپ رہے۔ اُنھیں اطمینان تھا کہ بنارسی اب بار بار نہیں آئے گا کیوں کہ نولکھی کے بدن میں خون نہیں رہا ہے

اور اُس کی آنکھوں کا نیلا رنگ گدلا گیا ہے مگر یہ اُن کا واہمہ تھا۔ بنارسی تواتر سے آتا رہا اور توقع کے خلاف اُس نے روپے پیسے کی اعانت بھی جاری رکھی۔ ایک روز وہ کسی وید کو بھی ساتھ لایا۔ گھر میں اُس کی دوبارہ آمد و رفت جگنو اور دیوا کو بہت شاق گزرتی تھی۔ وہ حیران و پریشان سب کچھ دیکھتے رہے، تماشائی کی طرح۔ بنارسی کا یہ رویّہ اُس کی خود غرضی اور سخت گیری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ پشیمانی اور مجبوری آدمیوں کو ہوتی ہے، یہ آدمیوں کا شیوہ ہے۔ بنارسی میں آدمیوں کی خو بو ہی نہیں ہے، وہ اُن سے بھی بہ ظاہر کوئی پرخاش نہیں رکھتا تھا لیکن اُس کا رویّہ دوستانہ بھی نہیں تھا۔ سڑک پر صدائیں لگاتے ہوئے بھکاریوں کو دیکھے بغیر جس طرح راہ گیر گزر جاتے ہیں، جگنو اور دیوا سے بنارسی کا سلوک بھی کچھ یہی تھا۔ چند دنوں میں وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئے تھے اور اُن دونوں کا بھی یہی حال تھا، نولکھی اور پھول وتی کا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے عرصے میں بنارسی کا شمار بمبئی کے نامی گرامی داداؤں میں ہونے لگا تھا۔ اُس کا پاڑا شہر کے بڑے بڑے پاڑوں میں گنا جاتا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے دادا تیواڑی سے اُس کے خصوصی مراسم تھے۔

تیواڑی کے نام پر میں سید ھا نہ بیٹھا رہ سکا۔ اُسی وحشی نے کرشنا جی کو ختم کیا تھا۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے اتنے دن نہیں گزرے تھے کہ تیواڑی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اُس کے بہت سے حواری بھی چلے گئے تھے لیکن کرشنا جی اتنے ارزاں نہیں تھے۔ جب بھی تیواڑی کا خیال آتا، میری رگوں میں خون جلنے لگتا۔ اُس وقت بمبئی کے متعدد پاڑے اُس کے حاشیہ بردار تھے، پیرو دادا کے پاڑے کی طرح آپس میں بٹے ہوئے تو نہیں تھے مگر کوئی تیواڑی سے الگ نہیں تھا۔ اختلاف ویسے بھی منصب داروں کو پسند نہیں آتا۔ تیواڑی تو آدھی بمبئی کا راجا تھا۔ میں نے دخل نہیں دیا اور خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ جگنو نے بتایا کہ بنارسی نے گھر کے خرچ ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ اُس نے اُس مختصر گھر میں رنگ و روغن کرایا۔ کئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ نئی مسہری، بستر، چادریں، میز کرسی، نئے طرز کے برتن وغیرہ۔ دوائیں، پھل، وید حکیم کا خرچ مستزاد تھا مگر نولکھی اور زیادہ ہمّت کھونے لگی۔ اب اُس کے چہرے پر آنکھیں ہی رہ گئی تھیں۔ پھول وتی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ہر وقت سہمی سہمی رہتی تھی جیسے تیز دھوپ میں گلاب فریادی سا لگتا ہے' اپنے رنگ اور خوشبو کے لیے اصرار کرتا رہتا ہے۔ بنارسی کے آنے پر اُس

کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ بنارسی نے پہلے کبھی ایک باپ کی طرح اُس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تھا مگر اب اچانک وہ اُس کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ اُس نے پھول وتی کے لیے نئے کپڑے بنوائے، چاندی کے کئی زیور، طلائی بالیاں اور نتھ۔

پھول وتی بچی نہیں رہی تھی جو کھلونوں سے بہل جاتی اور جو اپنے جلوہ و منظر میں خود مزین و مرصّع ہوں، اُن میں ایک استغنا بھی لازم ہے۔ جگنو کے مفہوم کے مطابق، پھول وتی تو خود سر تا پا ایک ملبوسِ بہار تھی، ترشے ہوئے مجسّمے کے مانند۔ لباس و زیور اُس کی چھب کیا بڑھاتے، اور نشاطِ قلب کے بغیر تو یوں بھی سب اکارت ہے۔ آدمی کا وجود بھی اکارت۔ ممکن ہے، نولکھی نے اپنی بیٹی کو بنارسی سے اُس کی نسبت کے بارے میں کچھ باور کرایا ہو۔ پھول وتی کی عزتِ نفس کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تو اُس نے دیا ہی ہوگا۔ نولکھی کچھ نہ بتا پائی ہوگی تو ہوش مند پھول وتی نے خود اخذ کر لیا ہوگا، مگر اصل نسبت تو تعلقِ خاطر کی ہوتی ہے، دل داری و دل ستانی کی، غم گساری اور دردِ مشترک کی۔ پھول وتی نے شیر خواری سے آغازِ شباب تک بنارسی کا ایک ہی روپ دیکھا تھا یا بنارسی نے اپنا ایک ہی رنگ دکھایا تھا، پاڑے کا دادا، جو سینگ نکالے، ڈکراتا ہوا اُس کے گھر آنے کا حق رکھتا ہے، جس کی آمد پر اُس کی ماں بے دست و پا ہو جاتی ہے، بار بار اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں۔ پھول وتی کے رگ و ریشے میں پیوست اپنے نقش کھرچنے میں بنارسی کے لیے کوئی بھی مدت بہت کم تھی۔ بعض نقش مٹائے نہیں مٹتے، آدمی کے ساتھ جاتے ہیں۔ سب کچھ اتنا گہرا تھا کہ بنارسی کی ہر مہربانی صاف اُس کے ستم کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے روز افزوں لطف و کرم سے پھول وتی بہت ہراساں تھی۔ اُس نے جگنو اور ردیوا سے التجا کی کہ جتنی جلد ہو سکے، وہ کسی طرف بھاگ نکلیں۔ حکیم ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے نولکھی کو کسی طرح اسٹیشن لے جائیں گے اور کسی بھی گاڑی میں بیٹھ کے جتنی دُور ہو سکے گا، چلے جائیں گے مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ اب یہ ایسا آسان نہیں رہا تھا۔ نولکھی طویل سفر کے قابل نہیں تھی۔ جگنو اور ردیوا نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ انھوں نے گھر کے آس پاس اکثر بنارسی کا کوئی نہ کوئی آدمی منڈلاتے دیکھا ہے۔ بنارسی نے یہ اہتمام کچھ جان کے ہی کیا ہوگا۔ یہ سُن کے پھول وتی اور پریشان ہو جاتی۔

ایک روز بنارسی شام کو آ کے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نولکھی کا حال کچھ اور ابتر ہو گیا۔ بنارسی کی موجودگی کے سبب جگنو اور ردیوا گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ پھول وتی نے پڑوسیوں سے منت سماجت کر کے انھیں تلاش کرایا۔ دونوں قریب ہی مل گئے۔ گھر پہنچے تو پھول وتی کی آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ نولکھی کراہ رہی تھی۔ دونوں کسی ڈاکٹر کے لیے گھر سے نکلنا چاہتے تھے مگر نولکھی نے روک لیا اور کہا کہ وہ اُن سے چند باتیں کرنا چاہتی ہے، پھر وقت ملے نہ ملے۔ اُس نے پھول وتی کو ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے کمرے سے چلی جائے۔ پھول وتی پاس سے ہٹ گئی تو نولکھی نے جگنو اور ردیوا سے کہا کہ وہ کسی طرح پھول وتی کو لے کے یہاں سے دُور چلے جائیں، بمبئی شہر سے بہت دُور۔

یہ نولکھی کیا کہہ رہی ہے؟ دونوں ہکا بکا اُس کی صورت دیکھنے لگے۔ نولکھی نے اُن سے کہا کہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اور بہتر ہے کہ کوئی حیل و حجت نہ کرو۔ اب وقت بالکل نہیں رہا۔ اگر پھول وتی کو محفوظ کرنا چاہتے ہو تو میرا خیال کیے بغیر یہاں سے بھاگ نکلو، پھر مجھے زیادہ سکون سے موت آئے گی۔

یہ کیسے ممکن تھا۔ جگنو اور ردیوا سناٹے میں آ گئے۔ نولکھی نے پھر اُن سے منت کی اور انھیں بتایا کہ بنارسی کے ارادے اُسے اچھے نہیں لگ رہے۔ بنارسی سے کچھ بعید نہیں۔ ابھی موقع ہے۔ اُس کی (نولکھی کی) موجودگی میں وہ آسانی سے پھول وتی کو لے جا سکتے ہیں، پھر جانے کیا ہو جائے۔ اُن سے زیادہ کوئی اور پھول وتی کا محافظ نہیں ہو سکتا اور نہ وہ دونوں پھول وتی کے بغیر چین سے رہ سکیں گے۔ نولکھی نے اُکھڑی سانسوں میں اُن سے کہا کہ اُس نے پھول وتی اور جگنو ردیوا میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ پھول وتی کا بیاہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ کرے گی۔ اب تک اُس نے اِس خواہش کا اظہار یوں نہیں کیا تھا کہ ابھی یہ قبل از وقت تھا۔ دوسرے وہ پھول وتی کی مرضی بھی دیکھنا چاہتی تھی اور کوشش کے باوجود آج تک وہ یہ نہ جان سکی کہ جگنو اور ردیوا میں سے کون پھول وتی کو زیادہ عزیز ہے۔ دونوں بھائی بھی ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ ایثار پر آمادہ رہتے ہیں۔ نولکھی کو یقین تھا کہ پھول وتی کے معاملے میں بھی وہ یہی کریں گے، کوئی ایسا فیصلہ جس میں تینوں کے لیے سلامتی اور سکون ہو۔ نولکھی نے کہا اُسے اندازہ ہے کہ ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا کس قدر دشوار ہوگا لیکن اِسی میں تینوں کی بہتری ہے۔ کسی ایک کے پیچھے ہٹ جانے کا مطلب پھول وتی سے مکمل دست برداری نہیں ہے۔ اچھا ہوگا کہ اُن کے درمیان اس معاملے میں کوئی تلخی نہ ہو، ورنہ پھر یہی مناسب ہے کہ وہ پھول وتی کے لیے کوئی اور بَر ڈھونڈ لیں اور اچھی طرح جان لیں کہ اُن کے مابین رنجش کی صورت میں پھول وتی بھی کسی فیصلے کا حق رکھتی ہے۔ یوں

نہ وہ خوش رہیں گے، نہ پھول وتی اور نہ اُس کی ماں کی رُوح کو قرار آئے گا۔

دونوں سب سُن رہے تھے اور حیران تھے کہ نولکھی یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔ ابھی سہ پہر تو وہ اُسے بہت بہتر چھوڑ گئے تھے اتنی دیر میں یہ کیا ہو گیا۔ جگنو اور ردیوا یہ سب دیکھنے اور سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کیا واقعی، جیسا کہ نولکھی کہہ رہی ہے، وہ اُن سے جُدا ہو رہی ہے۔ اُن کے حواس کام نہیں کر رہے تھے کہ وہ کیا کریں، نولکھی کو کیا جواب دیں۔ اُن میں تو یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی کہ نولکھی اُن کا بھی کچھ خیال کرے، اُس کے بغیر تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ نولکھی نے ان کے لرزتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپانا چاہا اور کرب سے بولی، وہ وعدہ کریں کہ جو اس نے کہا ہے، اُسی پر عمل کریں گے۔ جگنو اور ردیوا کو رونے کا بھی یارا نہیں تھا، دونوں نے دیوانہ وار اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بلکتی آواز میں دہرانے وہی کچھ کہنے کی کوشش کی، جو بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی اپنی ماں، بہن یا اپنے کسی جزوِ جاں کے لیے کوئی کہہ سکتا ہے۔ نولکھی کے زرد ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے اشارے سے دونوں کو قریب ہونے کے لیے کہا اور اُن کی پیشانیاں چوم کے بولی کہ وہ اُسے معاف کر دیں، وہ اُن کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ بہت آرزوئیں تھیں اُس کے دل میں، کہنے لگی، وقت نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ شروع کے دن اِس خوف میں گزر گئے کہ وہ دونوں کہیں اس سے چھن نہ جائیں۔ نولکھی نے اُن سے کہا کہ وہ سینے پر کوئی بوجھ لیے مرنا نہیں چاہتی۔ پہلی بار اُس نے انھیں بتایا کہ کاشو دادا اُن کا باپ نہیں تھا۔ یقیناً وہ کسی بڑے گھر کے کسی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں گے جہاں سے کاشو دولت کی لالچ یا دشمنی میں انھیں اُٹھا کے لے آیا تھا۔ اُس نے کاشو سے اصل بات جاننے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ کاشو کو بہت جلدی تھی۔ وہ کچھ روپیہ پیسہ نولکھی کے حوالے کر کے فوراً چلا گیا تھا۔ اُس نے نولکھی اور اس کی ماں کو بچوں کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، اس کی امانت سمجھ کے دونوں بچوں کی نگرانی کی جاتی رہے۔ جگنو کو اس وقت تیز بخار تھا۔ ماں بیٹی نے اس کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیے۔ کاشو کی خصلت سے وہ واقف تھیں۔ جگنو کو اگر کچھ ہو جاتا تو وہ درندہ اُن کی زندگی اجیرن کر دیتا۔

کاشو واپس نہیں آیا۔ نولکھی اور اس کی ماں انتظار کرتی رہیں تا آں کہ انھیں اُس کی موت کی خبر ملی۔ کسی نے بتایا کہ ناگ پور کے قریب کاشو مارا گیا۔ نولکھی کو یقین نہیں آتا تھا کہ کاشو جیسا گراں ڈیل، چست و چالاک، چاروں طرف آنکھیں کھلی رکھنے والا شخص اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ اس نے انتظار کیا۔ رفتہ رفتہ کاشو کے دیے ہوئے پیسے اور کچھ اپنی جمع پونجی سب کچھ وقت کی بازی گری میں چھو ہو گیا۔ ماں کو بمبئی کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ پیروں کو سمندر کی ہوا نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ بچوں کی دیکھ بھال وہ اپنی مستعدی سے نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم فاقوں سے تنگ آ کے نولکھی نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ اُس کے پاس ایک ہی ہنر تھا، جو بے چہرہ لوگوں میں نہیں ہوتا۔ آس پاس کے چند لوگوں نے شروع شروع میں اُس کی مدد کی۔ پھر وہ مطالبے کرنے لگے۔ نتیجتہً نولکھی کو چند لوگوں سے رسم و راہ رکھنی پڑی۔ اِس طرح ایک روز بنارسی اُن کے گھر آ گیا۔ کاشو نے نولکھی سے اپنے چھوٹے بھائی کا بہت تذکرہ کیا تھا۔ دونوں میں کوئی عداوت نہ تھی تو یگانگت بھی نہیں تھی، دونوں اپنے اپنے راستے چلتے تھے۔ حالاں کہ کاشو ہی بنارسی کو بمبئی لایا تھا۔ یہاں آ کے کاشو کے بہ قول، وہ وقت سے پہلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ نولکھی نے جگنو اور ردیوا کے بارے میں بنارسی کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر بدقسمتی سے ایک روز اُس کی بوڑھی ماں کی زبانی نکل گیا کہ دونوں بچوں کو کاشو ان کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ ماں نے اپنی دانست میں احتیاط کی تھی کہ بعد

میں کسی وقت بنارسی کو سچ کا علم ہوا تو نہ جانے کیا قیامت برپا کرے۔ یہ سُن کے بنارسی کئی دن غائب رہا، واپس آیا تو بہت کشیدہ و کبیدہ تھا۔ نولکھی نے ٹوہ لینے کی کوشش کی لیکن بنارسی کی مرضی کے بغیر اُس سے کچھ جان لینا کارے دارد تھا۔ ابتدا ہی میں نولکھی کو دونوں بھائیوں کے فرق کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ گنے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے مختصر یہ کہ بنارسی کسی طور اپنے بھائی کا ہمسر نہیں تھا۔ کاشو کو بات سننا آتا تھا، بنارسی صرف اپنی بولی سنتا، اپنی بولی سمجھتا تھا۔ نولکھی نے کہا کہ کاشو کی موت اور بنارسی کی آمد کے دوران وہ بمبئی چھوڑ کے کہیں چلی جاتی تو شاید سب بدلا ہوا ہوتا لیکن ادھر کاشو کی موت کی خبر دیر سے آئی، اُدھر جگنو اور دیوا، دو چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ کہیں اور جا کے قسمت آزمانے کا حوصلہ نہ کر پاتی، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز بنارسی آ جائے گا اور اپنا ہی گھر نولکھی کے لیے زنداں بن جائے گا۔

جگنو اور دیوا الگ بیٹھے تھے، آج پہلی مرتبہ نولکھی نے اُن کے اور اپنے بارے میں اتنا کچھ کہا تھا۔ جگنو اور دیوا پر متضاد کیفیتیں طاری تھیں۔ خوف، رنج، خوشی، غصہ، حیرت۔ طرح طرح کے سوال اُن کا سینہ متلاطم کیے ہوئے تھے مگر اُنھوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ غالباً اِس اندیشے سے کہ نولکھی کی زبان میں لکنت نہ آ جائے یا وہ کوئی ایسی بات نہ پوچھ بیٹھیں جس کا جواب دینا، اپنے آپ سے نبرد آزما شکستہ جاں نولکھی کے لیے مشکل ہو یا جو جواب سننا خود ان کے لیے عذاب۔ وہ بتوں کی طرح گم سُم بیٹھے سنتے رہے۔

سب کی نظر شمع پر رہتی ہے۔ خود شمع کتنے اندھیروں سے دوچار ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ نولکھی نے اُنھیں بتایا کہ بچپن ہی سے اندھیروں نے اُس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ چند سال کی تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا، کچھ عرصے بعد اکلوتا بڑا بھائی ملیریا میں چل بسا۔ وہ غازی پور کے ایک چھوٹے سے زمیں دار یا ایک بڑے کسان کی بیٹی تھی جس کے پاس اپنا ایک معقول قطعۂ اراضی تھا۔ باپ گوشہ نشین آدمی تھا، اُدھر قریب میں کوئی غیرت مند عزیز نہیں تھا جو ماں بیٹی کا سہارا بنتا۔ شوہر اور بیٹے کے صدمے سے نیم جاں نولکھی کی ماں نے ناچار کاشت کاری کے کاموں کی نگرانی شروع کی لیکن زمین کو غالباً مردوں سے کوئی خاص رغبت ہے جبھی اس زنِ نادار کے ہاتھ سے نکلتی گئی۔ ایک چھوٹا سا قطعہ گزر اوقات کے لیے رہ گیا۔ وہ بھی نکل جاتا مگر ایک رات کاشو اُن کے گھر آ دھمکا۔ نولکھی جوان ہو چکی تھی اور ماں کو اس کی بہت فکر تھی۔ ایک چینی کہاوت ہے، حسین لڑکی کی منگنی اس کے پالنے میں ہو جاتی ہے، نولکھی کے کئی رشتے آئے۔ جگنو اور دیوا اندازہ کر سکتے تھے کہ اردگرد کے کتنے لوگوں نے نولکھی کو گھر لانا چاہا ہوگا۔ ماں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ کون سا گھر اور کون سا بر نولکھی کے لیے موزوں رہے گا کہ کاشو آ گیا۔

اُس رات ماں بیٹی اپنی ایک قدیم ملازمہ کے ساتھ گھر میں سو رہی تھیں۔ ملازمہ کا عمر رسیدہ شوہر غازی پور سے باہر کسی میلے میں گیا ہوا تھا۔ وہ موجود ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔ بہرحال تینوں عورتیں گھر میں اکیلی تھیں کہ پہلے کھٹکے پر نولکھی کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، اپنے سامنے ایک خشم ناک، خنجر بدست شخص کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ وہ کاشو تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے، جب تک پولیس کا خطرہ ٹل نہیں جاتا، وہ گھر میں چھپا رہے گا۔ کوئی بھی مطلق پریشان نہ ہو۔ اس کے ساتھ اعانت کی گئی تو وہ خاموشی سے چلا جائے گا اور اس خدمت کا صلہ الگ دے گا۔ اس نے ان تینوں کو ایک گوشے میں بیٹھ جانے کا حکم دیا، اسی اثنا میں اس کی نظر نولکھی پر پڑی۔ نولکھی کی ماں اور خود نولکھی نے اپنے آپ کو بہت چھپانا چاہا، حسن و جمال بھی مال و زر کی طرح ہوتا ہے، ڈھکا چھپا ہے تو بد نگاہی سے محفوظ رہتا ہے۔ کاشو اپنے آپے میں نہ رہا۔ نولکھی کو دیکھ کے وہ سب کچھ بھول بیٹھا کہ کہاں ہے۔ اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ اُنھی لوگوں نے پناہ دی ہے مگر پناہ تو اس نے خود حاصل کی تھی، خنجر کے زور پر، اور خنجر اسی کے پاس تھا۔ وہ خود بھی کسی خنجر سے کیا کم تھا۔ ملازمہ کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ کاشو کی ایک ضرب سے وہ بے سُدھ ہو گئی۔ نولکھی کی ماں نے مزاحمت کرنی چاہی مگر کاشو جیسے قوی ہیکل کے سامنے وہ کتنی دیر ٹکتی۔ نولکھی ویسے ہی اَدھ موئی ہو چکی تھی۔

نولکھی کے بہ قول، وہ اسی رات مر گئی تھی۔ موت اور کیا ہوتی ہے۔ یہ دوسری نولکھی ہے جس نے اُس سیاہ رات کو ایک اور جنم لیا تھا۔ کاشو نوٹوں کی گڈّی اور سونے کی چوڑیاں اس کے سرھانے ڈال کے کسی وقت چلا گیا۔ نولکھی کو چپ لگ گئی۔ ماں اور ماں جیسی ملازمہ نے بہت منت سماجت کی کہ جو لکھا ہوتا ہے، اُس سے مفر نہیں ہے، کوئی بھی اسے ٹال نہیں سکتا، آدمی تو بہت بے بس ہے۔ ماں نے اپنے لیے بیٹی سے زندگی کی بھیک مانگی۔ نولکھی کہہ رہی تھی، اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ خود کو ختم کر لیتی۔ یہ اس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے مرنے نہیں دیا اور اپنی بیٹی پر اور ستم کیا۔ ایک شورہ پشت اجنبی۔ کے گھر

میں داخل ہونے کے واقعے سے صرف ملازمہ واقف تھی جس کی ایثار پیشگی اور وفا خوئی پر ماں بیٹی کا ایمان تھا۔ اُس کے سوا پھر کون تھا جس نے باہر جا کے نولکھی اور اُس کی ماں کے دیے ہوئے کسی پرانے زخم کا قرض وصول کیا۔ دو تین روز میں پاس پڑوس کا ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتا پھر رہا تھا کہ تم نے کچھ سُنا ہے۔ ماں بیٹی نے خود کو گھر میں محبوس کر لیا۔ ماں کس کس سے جا کے کہتی کہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا، انھوں نے کسی کو اپنے گھر نہیں بلایا تھا۔ یہ بجلی تو کسی کے بھی گھر گر سکتی تھی، اُس رات اُن کا آشیانہ زد پر آ گیا۔ ماں بہت متوحش تھی کہ وہ ہر ایک کے پاس جا کے اپنی صفائی کیا پیش کرے۔ لوگ کہنے پہ آئیں تو سننا ہی نہیں چاہتے۔ اپنے پرائے سب بیگانے نظر آتے تھے۔ اپنا آپ بھی بیگانہ، ایسی بے بسی کہ آدمی کو اپنا سایہ بھی پرایا لگے مگر نولکھی کو جیسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ کوئی گلہ نہ شکوہ، دعوا نہ مطالبہ۔ گھر کی دیواروں کے باہر اپنی رسوائیوں سے اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ماں نے زندگی کی نیرنگیاں افراط سے دیکھی تھیں سو اُس میں تھوڑی بہت استقامت تھی، استقامت اور اُمید لازم و ملزوم ہیں۔ آنے والے اندھے لمحوں سے روشنی کی اُمید رکھتے ہیں یہ اثبات محض گمان بھی نہیں، کبھی بہت سی روشنی مل جاتی ہے۔ آدمی کو اپنے محبس میں کوئی ایک روزن کھلا رکھنا چاہیے۔ نولکھی کی ماں کو ویسے بھی آسرے اور آس کی عادت تھی۔

کوئی چوتھے دن، آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کاشو پھر آ گیا، ملازمہ اور اس کے شوہر کی رفاقت کا اب کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اکیلی تھیں۔ لٹنے کے لیے اب اُن کے پاس اور تھا بھی کیا۔ کاشو کو دیکھ کے نولکھی کے سراپا میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ ماں البتہ ٹھٹھر کے رہ گئی۔ کاشو کے ہاتھ میں اس وقت خنجر نہیں تھا۔ خنجر کی بے اثری کا اب شاید اُسے اندازہ تھا، آتے ہی اس نے حواس بحال رکھنے کو کہا اور تسلی دی کہ وہ کسی اور ارادے سے نہیں آیا ہے۔ اُس کے لہجے میں حکم بھی تھا، معاملہ فہمی بھی تھی۔ اُس نے کہا کہ دونوں اچھی طرح اُس کی بات سنیں اور سمجھ لیں کہ اُسے زیادہ بات کرنا اور تکرار کرنا نہیں آتا۔ اس نے حتمی آواز میں کہا کہ وہ انھیں لے جانے آیا ہے، یہاں سے دُور۔ جو کچھ اُن کے پاس نقدی زیور ہے، وہ سمیٹ لیں اور باقی سارے گھر بار اور زمین وغیرہ کا خیال چھوڑ کے اُس کے ساتھ چلیں اور خاطر جمع رکھیں، بعد میں سب چیزوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ اُس رات اس سے بڑی چوک ہو گئی تھی۔ اُسے معلوم ہے کہ اس کے بعد اُن کے لیے زندگی کتنی تنگ ہو گئی ہے۔ وہ اُن کے بارے میں ساری واقفیت حاصل کر کے آیا ہے اور ندامت کا اظہار کرنے نہیں آیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔ یہ زبان اُسے نہیں آتی۔ اس کی دوبارہ آمد محض نولکھی کی وجہ سے ہے کیوں کہ وہ نولکھی سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔ وہ فقرہ جو ہر سرکش اور کج رَو کے وردِ زباں ہوتا ہے، کاشو نے بھی دُہرایا کہ ایک بار کوئی چیز اُسے پسند آ جائے تو ہر قیمت پہ وہ اُسے حاصل کر لیتا ہے۔ سو وہ نولکھی کو لینے آیا ہے۔ جو ہو چکا، اُسے بھول جانا ہی مناسب ہے۔ گیا وقت لوٹ کے نہیں آتا لیکن آنے والے دن نولکھی کے ہوں گے۔ اُس نے کہا، کاشو جب کچھ کہتا ہے تو اس کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ نولکھی خوش رہے گی اور نولکھی کی خاطر، نولکھی کے لحاظ میں وہ اُس کی ماں کو بھی ساتھ لے جانے کو کہہ رہا ہے۔ اچھا ہے کسی چون و چرا کے بغیر وہ اُس پہ اعتماد کریں۔ اس کے سوا اُن کے پاس کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ وہ خوش اسلوبی سے آمادہ ہو جائیں گی تو اُنھی کے حق میں بہتر ہوگا ورنہ اُس کے آدمی اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بمبئی میں نولکھی کے پاس اُس کے گھر جیسا گھر تو نہیں تھا لیکن سر چھپانے کے لیے بہت تھا۔ گھر شاید اسی کو کہتے ہیں جہاں مکینوں کی عمل داری ہو۔ شروع میں در و دیوار سے ماں بیٹی کا رویہ مغائرت کا تھا لیکن جلد ہی اُنھیں احساس ہو گیا کہ یہ گھر اُنھی کا ہے اور اُنھیں کہیں اور نہیں جانا، اور جلد ہی اُنھیں یہ تجربہ بھی ہوا کہ پڑوسی بولیاں، طور طریقے کتنے ہی مختلف ہوں، آدمی ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نئی زمین اور نئے لوگوں سے اُن کی مفاہمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے پاس کاشو کے بہ قول کوئی راستہ نہیں رہا تھا بلکہ اس کی وجہ خود کاشو تھا جس نے اُن کے لیے سارے دروازے کھلے رکھے تھے اور کوئی سمت اب اُنھیں خود نظر نہیں آتی تھی۔ کاشو کبھی روزانہ کبھی ناغوں سے وہاں آتا تھا مگر کسی گھر ہی کی طرح۔ اُس نے کبھی اُن کی عمل داری میں دخل نہیں دیا۔ بمبئی آ کے نولکھی اور اُس کی ماں کو کاشو کے بارے میں اور بھی باقی کچھ معلوم ہوا تھا کہ کاشو پاڑے کا آدمی ہے، اس کا ایک علاقہ ہے جہاں کوئی دوسرا کاشو سر اُٹھا کے نہیں چل سکتا۔ نولکھی کی ماں کاشو کے گھر آنے پر کونوں میں سمٹ جاتی تھی اور بیٹی کو اشاروں اشاروں میں احتیاط کی تلقین کرتی تھی کہ یہ شیوۂ محکومیت بھی ناگوارِ خاطر ہو سکتا ہے، گویا مطلق محکومیت یا ساکت و جامد محکومیت میں بھی ضرر کے اندیشے ہیں۔ ماں سمجھ نہیں سکی تھی کہ نولکھی کے کسی شغل و عمل میں اس کی نیت کی تنگی یا ارادے

کی کوتاہی شامل نہیں ہے۔ یہ شیوۂ تسلیم و رضا تو کسی خود کار عمل کی طرح ہے اور کسی خوف کا حاصل نہیں۔ نولکھی کو کاشو سے بالکل خوف نہیں آتا تھا۔ کاشو ہی کیا، نولکھی کو اب کسی چیز سے خوف نہیں آتا تھا، اندھیری رات، بچھو، آسمان کی گرج چمک، پتھروں پر جس طرح سب گزر جاتا ہے۔ معلوم نہیں، ایسی اطاعت جو خوف پر قائم ہو، حاکم کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کاشو میں سوجھ بوجھ کی کمی نہیں تھی۔ اُسے بھی علم ہوگا کہ نولکھی کی محکومیت، نولکھی کے ارادے کی تابع نہیں ہے بلکہ نولکھی کے پاس اب کوئی ارادہ ہے ہی نہیں۔ یہ صورت کاشو کو کسی اذیت سے دوچار کرتی تھی یا سرخوشی کا باعث تھی۔ یہ کاشو ہی بہتر جانتا تھا۔ بمبئی آنے کے بعد بہر حال، کاشو نے اونچی آواز میں کبھی نولکھی سے بات نہیں کی۔ اس کی آمد پہ نولکھی اُس کے سامنے حاضر ہوجاتی اور خاموش ہی رہا کرتی۔ اُسے کاشو پہ غصہ آتا تھا نہ کاشو کے قرب سے اُس کے چہرے پر غم کی گھٹائیں جھلکتی تھیں۔ کاشو اُس کے لیے نئے کپڑے، زیور، خوشبو اور پھول لاتا۔ نولکھی انھیں اپنے بدن پر سجا لیا کرتی۔ کاشو کی خوشنودی کے لیے نہیں، کاشو کے جانے کے بعد بھی وہ ایسی سجی بنی رہتی تھی اور اس کے قدم آئینے کی طرف نہیں اُٹھتے تھے۔ کسی شخص کا آئینے سے واسطہ نہ رہے تو یہ زندگی کا کون سا درجہ ہے، یہ سوال جگنو نے مجھ سے نہیں کیا تھا، جگنو کی باتوں سے خود بخود میرے ذہن میں منڈلایا۔

کئی سال گزر گئے اور نولکھی کو پہلی بار کاشو سے اُس وقت خوف آیا جب وہ جگنو اور دیوا کو اس کے پاس چھوڑ گیا۔ کاشو کی ہدایت کے بموجب نولکھی نے پہلے پہل انھیں کاشو کی امانت ہی کے طور پر برتا لیکن جگنو اور دیوا کو ہمہ وقت نولکھی اور اس کی ماں کی ضرورت تھی۔ بچوں کو اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کا فن آتا ہے۔ وہ انھیں ہمکتی نگاہوں سے دیکھتے تھے، حسرت بھری، اشتیاق بھری نظروں سے۔ وہ ہر دم جاری و ساری زندگی کی علامت تھے، ایک مسلسل سویرا، ایک مستقل مداوا، یہ وہی تھے جو نولکھی کے گم گشتہ اجالے کی بازیابی کا سبب بنے۔ وہ اتنے سادہ و معصوم، ایسے چینی کے گڈوں کے مانند تھے کہ نولکھی کا بس نہیں چلتا تھا، انھیں اپنی آنکھوں میں بسا لے۔ جگنو اور دیوا کو چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر مشتمل زبان آتی تھی، جگنو کو تو اور بھی کم، مگر نولکھی اُن کی ہر جنبشِ لب سے ایک جہان معانی اخذ کر لیا کرتی۔ اُن کا بھی یہی حال تھا، کہتے ہیں بچے بہت کچھ آنکھوں سے سنتے ہیں جو انھیں نہیں آتا تھا۔ نولکھی کا سارا کہا ہوا دونوں خوب سنتے، خوب سمجھتے تھے۔ رات دن وہ ایک دوسرے سے کسی راز و نیاز میں محو رہتے۔

جگنو اور دیوا نے نولکھی کو بہت پریشان، بہت ہلکان کیا انھوں نے دوبارہ اُسے خوف آشنا کیا۔ کسی وقت بھی کاشو واپس آسکتا تھا۔ اُس کی آمد کے خوف نے نولکھی کو بہت مضطرب اور منتشر کیا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بناتی کہ کاشو آئے گا تو وہ انھیں واپس نہیں کرے گی، صاف انکار کر دے گی۔ کاشو کسی سوغات کے لیے بہت پوچھا کرتا ہے۔ وہ اُس سے کہہ دے گی کہ کوئی زیور، لباس کوئی سوغات نہیں چاہیے۔ جانے وہ کیا کیا سوچا کرتی، کاشو نے تو اُسے زہر کیوں نہ دے دے۔ اس کے آنے سے پہلے وہ سب کہیں بھاگ کیوں نہ جائیں۔ اتنی بڑی دُنیا ہے، کاشو اُسے کہاں کہاں ڈھونڈے گا۔ دو چار دن کی بات ہوتی تو نولکھی کے لیے جگنو اور دیوا کی جدائی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ دن بہت ہو گئے تھے، اور جتنا وقت بڑھتا جا رہا تھا، کاشو کی آمد کی ہیبت سے نولکھی اتنی ہی ناتواں ہوتی جا رہی تھی۔ تمام خوف زندگی کی طلب سے عبارت ہے۔ نولکھی کو اب زندگی کی شدید طلب تھی

بہت دن گزر گئے۔ کاشو نہیں آیا، اس کی موت کی خبر آئی۔ یہ سُن کے نولکھی پر جانے کیوں سکوت طاری ہوا اور وہ پہروں آنسو بہاتی رہی۔ ادھر ماں نے اُسے ٹوکا کہ کاشو کا نہ آنا، جگنو اور دیوا کے لیے کسی اور کے نہ آنے کی ضمانت نہیں ہے۔ نولکھی بھی اس حقیقت سے واقف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کاشو کی موت کے تیقن کے باوجود دروازے پر ہلکی آہٹوں سے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، دروازے پر بار بار اُسے اجنبی دستکوں کا گمان ہوتا۔ کچھ دن اور بیت گئے مگر کوئی نہیں آیا۔ نولکھی کو کسی قدر قرار آنے لگا لیکن اس نے دوسری طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ماں کی پس انداز پونجی وقت برد ہو گئی۔ کچھ عرصے تک زیوروں نے ساتھ دیا لیکن جب وقت ہی ساتھ نہ دے! نولکھی کو اپنی فکر نہیں تھی، جگنو اور دیوا کے لیے ایک ذرا سی دھوپ بھی اُسے گوارا نہ تھی۔ انھیں چھاؤں دینے کے لیے نولکھی کو گھر سے نکلنا پڑا۔ نہ معلوم آگے اُسے اور کہاں تک جانا پڑتا کہ اس اثنا میں بنارسی آگیا۔

زندگی بھر کا ساتھ بھی بسا اوقات فاصلے کم نہیں کرتا اور بعض لوگ بہت دور ہوتے ہوئے، بہت وقت گزرنے کے بعد بھی ہمدم ساتھ رہتے ہیں۔ آدمی سے آدمی کے فاصلے کی پیمائش کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کا تعلق وقت سے ہے نہ منزلوں سے۔ کاشو کم سے کم جب تک گھر میں ہوتا، اُن کے ساتھ رہتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ اتنی گرہوں کے لیے ایک جنگ کی گرد بھی کم ہے۔ بمبئی آنے کے چند دنوں

بعد نولکھی کی آزمودہ کار ماں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس نے اپنی قدیم ملازمہ سے بُرا سلوک کیا۔ ملازمہ نے باہر جا کے افترا پردازی نہیں کی تھی کہ اُس رات اُن کے گھر ایک خنجر بدست شخص آیا تھا اور اس نے سب کو بے بس کر دیا تھا، اُس نے نولکھی سے اُس کی متاع چھین لی۔ یہ کاشو تھا جس نے عملاً پاس پڑوس میں اپنی ستم رانی کی داستان عام کرائی۔ ملازمہ نے نولکھی کو بیٹی کی طرح پالا تھا۔ اس نے نمک کا حق ادا کرنے کی ہر طرح کوشش کی ہوگی مگر سب کو جزئیات کے ساتھ سارا کچھ معلوم تھا۔ ملازمہ قسمیں کھاتی کہ پڑوسیوں کی زبانی یہ تفصیل جان کے اُسے خود حیرت ہوئی تھی۔ لوگ اس سے تصدیق چاہتے تھے۔ اس کے بقول اُس نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن مبالغے کی تردید کرنا اس کے بس میں نہیں رہا ہوگا۔ اُس وقت نولکھی کی ماں کے ہوش و حواس یک جا نہیں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ملازمہ کے سوا گھر میں اور کون موجود تھا؟ بمبئی میں نولکھی کے تئیں کاشو کی وارفتگی دیکھ کے ماں کی عقل میں آیا کہ اس رات کوئی فوج پولیس کاشو کے پیچھے نہیں تھی، سب دکھاوا تھا۔ وہ پورے ارادے سے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا کیوں کہ یقیناً اُس نے پہلے کہیں نولکھی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ دوبارہ کبھی اُس گھر کا رُخ نہ کرتا لیکن اُس رات اُس نے نولکھی کو بہت قریب سے دیکھا تھا، پھر نولکھی سے دور ہونا اس کے لیے ممکن نہ رہا اور نولکھی کے حصول کے لیے ایک ہی دردناک طریقہ اس بے درد کے دماغ میں آیا کہ وہ ہر طرف کانٹے بچھا دے۔ شوہر اور بیٹے کی جدائی سے شکستہ حال عورت، نولکھی کی ماں، جو کسی نہ کسی طرح تیز ہواؤں کا سامنا کرتی رہی تھی، چند دنوں میں حوصلہ ہار بیٹھی۔ صیاد ایک اور سوانگ بھر کے پھر آیا تھا۔ نولکھی کی ماں کے پاس انکار کے لیے تنکے کا بھی سہارا نہ تھا۔ وہ نظر دوڑاتی تو اردگرد کوئی ایسا نہ تھا جو چند لفظوں کے گداز کی فیاضی کرتا۔ کاشو نے جیسے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ نولکھی کی ماں خزاں ختم ہونے کے آسرے میں وہاں ٹھہر جاتی، کچھ عرصے میں، ممکن ہے یہ بے اماں بے سرو ساماں نہ رہتی مگر نولکھی کی ماں کب تک وضاحتیں کرتی رہتی، اپنی بیٹی کے لیے وہ کس کس کے آگے درگزری کی بھیک مانگتی۔

نولکھی کہتی تھی کہ مرتے دم تک اس کی ماں کی زبان پر ملازمہ کا ذکر تھا۔ اُسے یہی خلش تھی کہ غازی پور جا کے وہ اپنی ملازمہ سے معافی نہ مانگ سکی۔ نولکھی نے ماں کی دل بستگی کے لیے وعدہ کیا تھا کہ وہ چوری چھپے سہی، کسی طرح، ایک بار غازی پور ضرور جائے گی۔ نولکھی کو ماں سے کیے ہوئے وعدے کی تکمیل کی مہلت نہ مل سکی۔ کاشو ہوتا تو شاید یہ کبھی ممکن ہو جاتا مگر بنارسی کا رنگ ڈھنگ اپنے بھائی سے بالکل الگ تھا۔ نولکھی کہتی تھی، یہ وہی تھا جس کے آنے کے بعد اس کی ماں کی کمر ڈھے گئی۔ وہ زیادہ دنوں تک اپنی بیٹی کا ساتھ نہ دے سکی۔ بعض لوگ اوجھل ہو جانے کے بعد زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کاشو کے چلے جانے کے بعد ماں بیٹی کو اس کے اندھیرے اُجالے کا اندازہ ہوا۔ بنارسی نے یہ احساس اور سوا کیا۔ کاشو میں جتنا غضب تھا، اتنا تحمل بھی تھا۔ اسے ہر طرح کی زبان آتی تھی، نرمی کی، سختی کی۔ یہی نہیں کہ کاشو نے اپنے ایک دو مقرب ترین ساتھیوں کے سوا کسی سے بمبئی میں نولکھی اور اپنے اس گھر کا تذکرہ نہیں کیا تھا، بلکہ نولکھی کا کہنا تھا، اُسے یقین ہے، اُسے ایک نئے گھر میں بسانے کے بعد بمبئی میں کاشو کا کوئی دوسرا گھر نہیں تھا۔ ہو بھی تو اس نے کبھی نولکھی سے اس بابت کوئی اشارہ نہیں کیا۔ بنارسی کے آنے پر نولکھی کو بہت کچھ یاد آتا تھا۔ لگتا تھا، بنارسی بھی یہی کچھ جتانے آیا ہے، لگتا تھا جیسے وہ اپنے بڑے بھائی کا کوئی قرض وصول کر رہا ہو مگر ایسا نہیں تھا۔ بنارسی کو کاشو سے ایسا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو کبھی اپنے آپ کو بھول جاتے ہوں، جو کبھی اپنے سوا، دوسروں کے بارے میں بھی فکر مند ہوتے ہوں، اپنے بھائی ہی کے لیے سہی۔

نولکھی ہانپنے لگی۔ جگنو اور دیوا اُس کے دائیں بائیں بیٹھے وحشت زدہ آنکھوں سے سب کچھ سُنا کیے۔ نولکھی اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مسلسل بولتے رہنے سے اس کے سینے میں دم نہیں رہا، اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ نولکھی نے بے شک جگنو اور دیوا کو باہر نہیں جانے دیا تھا، خود انھیں بھی اپنے دل و دماغ کے سناٹے میں کسی وید حکیم کے پاس جانے کا ہوش نہیں رہا۔ نولکھی کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ ذرا بھی دیر کی جائے۔ وہ اندر کمرے سے پھول وتی کو بلانے کے لیے آواز دینا چاہتے تھے مگر پھول وتی تو اُن کے قریب ہی موجود تھی۔ جانے وہ کب سے سامنے، کونے میں کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ اُسے دیکھ کے دونوں یک لخت اُٹھ گئے۔ وہ دروازے تک نہیں پہنچے تھے کہ نولکھی کی کرب ناک صداؤں نے ان کے قدم لڑکھڑا دیے۔ "نہیں نہیں، میری بات سنو، اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ لرزتی ڈوبتی آواز میں بولی کہ کیوں وقت ضائع کرتے ہو، پھول وتی کو لے کے فوراً یہاں سے نکل جاؤ، جب تک تم نہیں جاؤ گے، میں تڑپتی رہوں گی۔ نولکھی نے ان سے کہا کہ وہ اُسے پُرسکون موت دینا کیوں نہیں چاہتے۔

جگنو اور دیوا بچوں کی طرح سسکنے لگے، عاجزی سے بولے کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اُسے نہیں مرنے دیں گے اور یوں چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔

جگنو کہہ رہا تھا کہ نولکھی اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کے بولی کہ اب اُسے کوئی دوا نہیں چاہیے۔ دوا کا وقت گزر چکا ہے۔ اُس نے اُن سے کہا کہ وہ سمجھتے کیوں نہیں، اُس کے لیے اس سے بڑا دکھ کیا ہوگا کہ آخری وقت میں اس کے جگر گوشے سرہانے نہ ہوں مگر وہ کچھ جان کے ہی اُن سے یہ بنتی کر رہی ہے، بنتی نہیں تو اسے اُس کا حکم سمجھا جائے کہنے لگی کہ وہ پھول وتی کو دوسری نولکھی بنانا نہیں چاہتی۔ وہ بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ نولکھی کی کہانی کسی طور دہرائی جائے۔

نولکھی مسلسل اُن سے التجا کرتی رہی۔ جگنو اور دیوا نے اسے سمجھانا چاہا کہ ایسا اندھیر نہیں ہے۔ وہ وقت اور تھا اور یہ غازی پور نہیں، بمبئی ہے۔ وہ آخر دم تک پھول وتی کی حفاظت کریں گے۔ وہ اُسے جانے کیا کیا تسلیاں دلاسے دیتے رہے مگر اُن کی آواز خود اُنھیں مطمئن نہ کر رہی تھی، نولکھی پہ کیا اثر ہوتا۔ نولکھی کے چہرے پر اور وحشت اُتر آئی، وہ بے کلی سے بولی کہ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی، کوئی تاویل، کوئی دلیل۔ سب سے بڑی دلیل بنارسی ہے۔ جگنو اور دیوا بنارسی کو اُس سے زیادہ نہیں جانتے۔ بنارسی کا ٹھوٹھ نہیں ہے، اُس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بنارسی کا اپنے سوا کسی سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔ بہتر ہے کسی پس و پیش کے بغیر جگنو اور دیوا نولکھی کی خواہش کی تکمیل کریں، یہی سمجھ کے کہ یہ اس کی آخری خواہش ہے یا وہ نولکھی کا کوئی حق ادا کر رہے ہیں، اس پہ کوئی احسان کر رہے ہیں۔

جگنو اور دیوا اس طرح کیسے جا سکتے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بنارسی نے پھول وتی کے لیے کوئی اُلٹی سیدھی بات ضرور کہی ہوگی جو نولکھی اس قدر بے چین ہے۔ اُن کی سمجھ میں اور بھی بہت کچھ آ رہا تھا جو نولکھی کہہ نہیں پا رہی تھی، مگر نولکھی سے آنکھیں پھیر کے گھر سے نکل جانے کی استطاعت اُن میں نہیں تھی۔ پھول وتی بھی سب سُن رہی تھی۔ دونوں بھائیوں نے مضطربانہ اُس کی طرف دیکھا، اُن کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ پھول وتی سے اُس کی رائے پوچھیں لیکن کچھ پوچھنے کی ضرورت کیا تھی، پھول وتی کوئی اُن سے الگ تو نہیں تھی۔ وہ ماں کے سینے سے لپٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نولکھی اپنے ناتواں بازوؤں میں کبھی اُسے سمیٹ لیتی، کبھی پرے دھکیلنے کی کوشش کرتی۔ وہ ہذیان بکنے لگی تھی کہ پھول وتی اُسے چھوڑ دے، سب اُسے چھوڑ کے چلے جائیں۔ وہ آرام سے مر جائے گی۔ اب دیر بھی کتنی رہ گئی ہے، چند سانسوں کا پھیر ہے۔ کہنے لگی، سب اُسے مرا ہوا دیکھنے ہی پر کیوں مُصر ہیں۔ بعد میں جانے کیا ہو جائے، کیا نہ ہو جائے، نولکھی پر خفقان طاری تھا۔ آخر وہ بے حال ہو گئی۔ پھر دیوا کسی کو بتائے بغیر باہر نکل گیا۔ بھاگتا بھاگتا وہ قریب کے ایک معمر وید کے پاس پہنچا۔ وید پہلے اُن کے گھر آ چکا تھا۔ وہ نولکھی کو دیکھ کے بڑبڑانے لگا کہ اسے یہ کیا ہو گیا ہے، ابھی کچھ عرصے پہلے تو خاصی بہتر تھی۔ وید طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ کس کے زیرِ علاج ہے، کیا کھاتی پیتی رہی ہے۔ دیر تک وہ نولکھی کی نبض ٹٹولتا رہا۔ اس نے چند دوائیں تجویز کیں اور اپنے چوبی کھیسے سے کچھ مشروبات نکال کے بمشکل نولکھی کو پلائے۔ وہ ایک تُند مزاج شخص تھا۔ اُس نے کچھ خیال نہیں کیا کہ اُن تینوں پر کیا گزر جائے گی، کہنے لگا کہ دوا اپنی جگہ مگر اب دُعا کی زیادہ ضرورت ہے۔ صبح تک دیکھ لیں ورنہ اب یہی چارہ رہ گیا ہے کہ سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیں۔ ممکن ہے، ولایتی علاج میں نولکھی کے لیے شفا لکھی ہو۔ جاتے جاتے وید دروازے سے پلٹ آیا اور انھیں ہدایت کی کہ مریض کی دل جوئی بھی دوا کا کام کرتی ہے۔ وہ نولکھی کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے، سُکھ پہنچانے کی کوشش کریں، اُس کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی نہ کریں۔ دیوا وید کے ساتھ جا کے مزید دوائیں لے آیا۔ دونوں وہیں، نولکھی کی چارپائی کے گرد بیٹھے رہے۔ پھول وتی ماں کی پائنتی پر سر رکھے سسکیاں بھرتی رہی۔ نولکھی کی جب بھی آنکھ کھلتی، اُس کا نحیف و نزار سراپا پھڑکنے لگتا، اُس کی ویران آنکھیں بے قراری سے انھیں دیکھتیں اور لرزیدہ ہونٹوں پہ کوئی شکوہ سا مچلتا آتا اور وہ بے سُدھ ہو جاتی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں